تحریکِ پاکستان



پروفیسر محمد اسلم

تحریکِ پاکستان

از

پروفیسر محمد اسلم

سابق صدر شعبہ تاریخ پنجاب یونیورسٹی

ریاض برادرز ۳۱ اردو بازار، لاہور

فون : ۷۲۳۴۹۸۹

اِنتساب

اگر پاکستان کے تیرہ کروڑ عوام
مُسلم لیگ
کو چھوڑ جائیں تو بھی آخری مُسلم لیگی
میرے عمِّ مکرّم
حاجی محمد اقبال چوہدری
ساکن جڑانوالہ ہوں گے۔
میں اپنی یہ کاوش ان کے نام معنون کرتا ہوں

فہرستِ ابواب

گزارشِ احوالِ واقعی

راقم الحروف نے رُبع صدی تک شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں تاریخ کے متعدد پرچے پڑھائے ہیں۔ اس کے علاوہ شعبۂ کشمیریات پنجاب یونیورسٹی، اَپوا ایوننگ کالج لاہور، ہیلی کالج آف کامرس، پاکستان انجنیئرنگ اکیڈمی نمو کر نیاز بیگ اور ادارہ کیمیکل انجنیئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی پنجاب یونیورسٹی میں بھی تحریکِ پاکستان پر لیکچرز دیئے ہیں۔ اس وقت پنجاب کی تمام جامعات اور کالجوں میں میرے تلامذہ درس و تدریس میں مصروف ہیں۔ گزشتہ چھبیس سالوں میں اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم سے راقم نے درجن بھر کتابیں لکھی ہیں لیکن تحریکِ پاکستان پر کچھ نہیں لکھا۔ اس وقت بازار میں اس موضوع پر جتنی کتابیں دستیاب ہیں ان میں زیادہ تر کتابوں کے مصنفین ذہنی اور عملی طور پر ایسی سیاسی جماعتوں سے وابستہ ہیں جنہوں نے قیامِ پاکستان کی شدید مخالفت کی تھی اور اب تک ذہنی طور پر تقسیمِ ہند کو قبول نہیں کیا۔ اس لئے ان کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھ کر قیامِ پاکستان کا مقصد ذہنوں میں اُجاگر نہیں ہوتا۔ راقم الحروف،اس کے والدِ بزرگوار چوہدری طفیل محمد اور جدِ امجد حاجی عمر الدین چوہدری،قائداعظم کی مسلم لیگ سے وابستہ تھے۔ ہم تینوں نے ۱۹۴۳ء میں کراچی میں منعقد ہونے والے مسلم لیگ کے اکتیسویں سالانہ جلسے میں شرکت کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ راقم نے ملک خضر حیات ٹوانہ، وزیرِ اعظم پنجاب (اس زمانے میں یہی اصطلاح استعمال ہوتی تھی) کے خلاف اُٹھنے والی تحریکِ سول نافرمانی میں بھی حصہ لیا۔

گزشتہ دو سال سے میاں نوید احمد صاحب مجھ پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ میں تحریکِ پاکستان کے موضوع پر ایک مستند کتاب لکھوں، میں ہر بار انہیں کسی نہ کسی بہانے سے ٹال دیتا تھا۔ دسمبر ۱۹۹۳ء کے وسط میں راقم نے ان کے بڑھتے ہوئے اصرار کی بنا پر ان کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔

اس کتاب کے پہلے دو باب عام ڈگر سے ہٹ کر لکھے گئے ہیں۔ اس سے

اساتذہ اور طلبہ کے ذہنوں میں قیامِ پاکستان کی ضرورت کا تصور اُبھرے گا ۔ راقم نے محاورہ زبان کا بھی خیال رکھا ہے ۔ اس کتاب میں بعض نئی اصطلاحات بھی ملیں گی مثلاً لوگ Sub-Continent of Indo-Pakistan کا ترجمہ برِصغیر پاک وہند کر دیتے ہیں ۔ حالانکہ اس میں بنگلہ دیش بھی شامل ہے ۔ ثانیاً (Continent) کا ترجمہ برِّاعظم کرتے ہیں تو پھر Sub - Continent کا ترجمہ برِصغیر کیونکر صحیح ہے ۔ اعظم کا اسم تصغیر عظیم ہے ، صغیر نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے شہرۂ آفاق مؤرخ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے اپنی تصنیف کا نام ۔ برِعظیم پاک وہند کی ملّتِ اسلامیہ ۔ رکھا ۔ اس وقت تک بنگلہ دیش کا وجود نہ تھا ۔

راقم نے اپنی طرف سے بڑی کوشش کی ہے کہ واقعات ، سنین ، اماکن اور رجال میں کوئی غلطی نہ رہنے پائے ۔ جہاں بھی شبہ وارد ہوا ، فوراً اصل کتاب کی طرف رجوع کیا ہے ۔ پھر بھی کہیں نہ کہیں غلطی رہ سکتی ہے کیونکہ اغلاط سے مبّرا تو صرف کتاب اللہ ہے ۔

میری بیٹی نے اس کتاب کا مسودہ بغور پڑھا ہے ۔ وہ میرے اور ناشر کی جانب سے شکریئے کی مستحق ہے ۔ اُمید ہے کہ اساتذہ ، طلبہ اور عام قاری اس کتاب کو یکساں مفید پائیں گے ۔ اللہ کریم کی مہربانی سے کتاب کا پہلا ایڈیشن چند ماہ میں ختم ہو گیا اور اب یہ دوسرا ایڈیشن پیش خدمت ہے ۔

سبحان ربک رب العزۃ عمایصفون ۝ و سلام علی المرسلین ۝

والحمد للہ رب العلمین ۝

ندوۃ المصنفین ۱۸ دسمبر ۱۹۹۳ء

خادم الابرار

محمد اسلم

باب (۱)

حضرت مُجدّدِ الفِ ثانیؒ

امام ربّانی مُجدّدِ الفِ ثانی بدرالدین ابُوالبرکات شیخ احمد فاروقی سرہندی کابلی نقشبندی ناٹریدیؒ ۲۶ ۔ جون ۱۵۶۳ء کو مشرقی پنجاب کے تاریخی قصبے سرہند میں پیدا ہوئے ۔ آپ کے والدِ بزرگوار مخدوم عبدالاحدؒ ایک جیّد عالم تھے اور انہیں شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے فرزند حضرت رکن الدینؒ سے شرفِ خلافت حاصل تھا ۔

تعلیم و تربیت:

حضرت مُجدّدؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے والدِ ماجد سے پائی اور بعدازاں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے سیالکوٹ تشریف لے گئے ۔ وہاں آپ نے معقولات کا درس مولانا کمال کشمیری سے لیا اور حدیث کی سند مولانا یعقوب کشمیری سے لی ۔ آپ کے اساتذہ کی فہرست میں اس عہد کے ایک نامور عالم قاضی بہلول بدخشانی کا نام بھی نظر آتا ہے جن سے آپ نے تفسیر اور حدیث کی کتابیں پڑھیں ۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے سرہند میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور مدت تک تشنگانِ علم کو اپنے فیوض و برکات سے سیراب کرتے رہے ۔

قیامِ آگرہ:

سرہند میں چند سال قیام کے بعد آپ آگرہ تشریف لے گئے اور جلد ہی وہاں کے علمی و ادبی حلقوں میں متعارف ہوگئے ۔ آگرہ کے قیام کے دوران حضرت مُجدّدؒ کی ابُوالفضل اور فیضی سے بھی آشنائی ہو گئی ۔ آپ کے قریباً سبھی سوانح نگار اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت مُجدّدؒ نے " سواطع الالہام " کی تصنیف کے دوران کئی موقعوں پر فیضی کی راہنمائی کی ۔ مغلیہ حکومت کا دارالحکومت ہونے کی وجہ سے آگرہ میں جاہ پسند اور

خود غرض علما کی اکثریت تھی اس لئے حضرت مجددؒ جلد ہی وہاں کے ماحول سے متنفر ہو گئے۔ ادھر حضرت مجددؒ کے والدِ بزرگوار ان کی جدائی برداشت نہ کر سکے اور انہیں واپس وطن لانے کے لئے آگرہ پہنچ گئے۔ حضرت مجددؒ اپنے والد کی معیت میں سرہند روانہ ہوئے۔ واپسی پر راستے میں تھانیسر کے رئیس شیخ سلطان کی صاحبزادی سے ان کا نکاح ہو گیا۔ سرہند واپس آکر آپ حسبِ سابق درس و تدریس میں مصروف ہو گئے۔

خواجہ باقی باللہؒ سے بیعت:

سرہند میں چند سال قیام کے بعد آپ حج بیت اللہ کے ارادے سے گھر سے نکلے۔ دہلی میں ان کا قیام ایک دوست کے ہاں ہوا۔ ایک روز اس نے خواجہ صاحب کا ذکر کچھ ایسے والہانہ انداز میں کیا کہ آپ کے دل میں ان کی زیارت کی خواہش پیدا ہوئی اور آپ اگلے روز خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ خواجہ صاحبؒ نے آپ کو چند روز اپنی خانقاہ میں رہنے کا مشورہ دیا۔ آپ کو وہاں رہتے ہوئے ابھی دو ہی روز گزرے تھے کہ خواجہ صاحبؒ کے آثار تصرف نمودار ہوئے اور خواجگانِ نقشبندیہ کی نسبت غلبہ کرنے لگی۔ چند روز بعد حضرت مجددؒ نے خواجہ صاحبؒ سے بیعت کی التجا کی جسے انہوں نے شرفِ قبول بخشا۔ خواجہ صاحبؒ نے آپ کو چند روز اپنے پاس رکھ کر سرہند واپس جانے کا مشورہ دیا۔

سرہند واپس آکر آپ نے منازلِ سلوک طے کرنا شروع کیں اور اس دوران میں دو بار دہلی جا کر خواجہ صاحبؒ سے فیض یاب ہوئے۔ آخری ملاقات میں خواجہ صاحب نے انہیں لاہور میں قیام کرنے کا مشورہ دیا۔ آپ کے لاہور میں قیام کے دوران ہی خواجہ صاحبؒ نے ۳۰ نومبر ۱۶۰۳ء کو وفات پائی۔ خواجہ صاحبؒ کے انتقال کی خبر سنتے ہی آپ دہلی پہنچے اور ان کی خانقاہ کا انتظام اور لواحقین کی خبر گیری خواجہ حسام الدین کو سونپ کر خود سرہند چلے آئے۔

ارشاد و ہدایت:

سرہند واپس آکر آپ نے اپنے اصلاحی اور تجدیدی کام کا آغاز کیا۔ سب

سے پہلے آپ نے اکبر کے بااثر درباریوں اور راسخ العقیدہ امراء سے تعلقات بڑھائے اور انہیں ترویجِ شریعت کی طرف توجہ دلائی۔ دوسری جانب آپ نے اسلامی ذہن رکھنے والے مریدوں کی ایک جماعت تیار کی جو آپ کے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ملک کے طول و عرض میں پھیل گئی۔

حضرت مجددؒ نے ان کارکنوں سے رابطہ قائم رکھنے کے لئے خطوط نویسی کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ کسی امیر یا مرید کے نام ایک خط تحریر فرماتے تو آپ کے مریدین اس کی سینکڑوں نقلیں تیار کر کے پورے ملک میں پھیلا دیتے۔ یہ خطوط ایک طرح سے خانقاہ مجددیہ کا گزٹ تھے اور ان کے ذریعے حضرت مجددؒ کو اپنے خیالات کی نشر و اشاعت کا موقع مل جاتا تھا۔ حضرت کے مکتوبات کا اسلامی ہندوستان کے لٹریچر میں بڑا اونچا مقام ہے۔

حضرت مجددؒ کی تحریک کا اثر اکبر کے آخری ایام حکومت میں ہی ظاہر ہونے لگا تھا۔ اکبر کے قدیم اور بے دین مصاحب ایک ایک کر کے لقمۂ اجل بن چکے تھے اور ان کی جگہ ان راسخ العقیدہ اُمراء نے پُر کی تھی جو حضرت مجددؒ کے دامنِ ارادت سے وابستہ تھے۔ انہیں اُمراء کی کوششوں سے شہزادہ سلیم کو تخت ملا تھا۔ جہانگیر کے عہد میں جو اسلام میں رونق پیدا ہونے لگی تھی وہ حضرت مجددؒ ہی کی تحریک کا اثر تھا۔

حضرت مجددؒ کی گرفتاری

جہانگیر اپنے ابتدائی دورِ حکومت میں راسخ العقیدہ اُمراء کے زیرِ اثر تھا اور وہ جو چاہتے تھے اس سے منوا لیتے تھے۔ نواب مرتضیٰ خان کی وفات کے بعد راسخ العقیدہ اُمراء کا زور گھٹ گیا اور ان کی جگہ ایرانی اُمراء برسرِ اقتدار آگئے۔ یہ ایرانی اُمراء حضرت مجددؒ کی اصلاحی تحریک کے سخت مخالف تھے اس لئے انہوں نے جہانگیر سے ان کی شکایتیں کرنا شروع کیں اور بالآخر حضرت مجددؒ کو قید کروا دیا۔ آپ اندازاً دو سال قلعۂ گوالیار میں قید رہے۔ اس دوران میں آپ نے قیدیوں کی اصلاح کی طرف توجہ دی اور بے شمار اخلاقی مجرموں سے توبہ کروائی اور بہت سے غیر مسلم قیدیوں کو مشرف باسلام کیا۔

دو سال کی نظر بندی کے بعد جب جہانگیر کو حضرت مجددؒ کی نیک نیتی کا علم ہو گیا تو اس

نے آپ کو باعزت رہا کر کے اپنا مشیر اور ندیم بنایا۔ حضرت مجددؒ اندازاً تین سال جہانگیر کے ساتھ رہے اور اس دوران میں آپ نے اسے قرآن کی تفسیر پڑھائی اور اسلام کے بنیادی عقائد سے رُوشناس کرایا۔ اس کا ذکر آپ کے مکتوبات میں موجود ہے۔ جہانگیر کے ساتھ تین سال رہنے کے بعد آپ سرہند چلے آئے جہاں ۱۰ دسمبر ۱۶۲۴ء کو آپ نے انتقال فرمایا۔

حضرت مُجددؒ کا تجدیدی کارنامہ

عُلمائے سُوء:

حضرت مُجدد الف ثانیؒ نے جن محاذوں پر جنگ لڑی ہے ان میں سے ایک محاذ علمائے سُوء کے خلاف تھا۔ اکبر کے عہدِ حکومت میں دین اسلام پر جو کچھ گزری تھی حضرت مُجددؒ نے علمائے سُوء کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ آپ اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں۔

حق تو یہ ہے کہ اس زمانے میں جتنی ڈھیل اور کمزوری شرعی امور میں نظر آتی ہے اور جو فتور ترویج دین اور ملت کے معاملات میں نظر آتا ہے یہ سب دنیا دار علماء کی بدبختی اور نیت کا ثمرہ ہے۔

ایک اور مکتوب میں حضرت مجددؒ علمائے سُوء کو "لصوصِ دین" کے لقب سے یاد کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

گزشتہ دَور میں جتنے فتنے پیدا ہوئے ہیں وہ دنیا دار علماء کی بدبختی کی بنا پر ظہور میں آئے ہیں۔ ان کا واحد مقصد طلب جاہ و ریاست اور عوام کی نظروں میں قدر و منزلت ہے۔

حضرت مجددؒ نے اپنے متعدد مکتوبات میں علمائے سُوء کے مزاعم کو بے نقاب کر کے عوام کو ان کی صحبت سے پرہیز کا مشورہ دیا ہے۔

صُوفیائے خام:

علمائے سُوء کی طرح صوفیائے خام نے بھی اکبر کے عہد میں عوام کو جادۂ حق سے منحرف کرنے اور ان کا اخلاق بگاڑنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اس عہد کی تاریخوں اور تذکروں کا مطالعہ کرنے سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ملک میں مجذوبوں کی بُھر مار تھی اور ہر شہر و قصبے میں ننگ دھڑنگ مجذوب چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ بد قسمتی سے یہ مجاذیب شریعت کی قید سے آزاد تھے اور ان کی آزاد مشربی اور خلافِ شریعت حرکات دیکھ کر عوام بھی آزاد مشرب اور بے شرع ہو گئے تھے۔ مجاذیب کے علاوہ ایسے پیشہ وَر صوفیوں کی بھی کمی نہ تھی جو قطبیت اور غوثیت کے دعوے کر کے محرمِ رازِ خفی و جلی بنے ہوئے تھے۔

حضرت مُجددِ الفِ ثانیؒ نے ان نام نہاد صوفیوں کے خلاف ایک باقاعدہ محاذ کھولا۔ آپ اپنے ایک مکتوب میں ان کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔ اس زمانے میں اکثر صوفی نُما جاہل علمائے سُوء کا حکم رکھتے ہیں۔ ان کا فساد بھی علمائے سُوء کے فساد کی طرح متعدّی ہے۔ حضرت مُجددؒ اپنے مکتوبات میں صوفیائے خام کی گمراہیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے عوام کو ان کی مُضر صحبت سے بچنے کی تلقین فرماتے ہیں۔

تصوّف کی اصلاح:

حضرت مُجددؒ کے اصلاحی کارناموں میں تصوّف کی اصلاح ایک اہم کارنامہ ہے۔ عہدِ اکبر سے پہلے برِّعظیم میں تصوّف کے جو سلسلے مروّج تھے ان پر ویدانت کا اثر غالب آگیا تھا۔ حضرت مُجددؒ نے ان غیر اسلامی عناصر کی نشان دہی کی اور برِّعظیم میں نقشبندیہ سلسلے کو فروغ دیا جس میں سالک کی ترقی کا دار و مدار شریعت کی پابندی میں ہے۔ حضرت مُجددؒ کے عہد تک صُوفیہ پر سُکر (بے ہوشی) غالب آگیا تھا آپ نے اس کی بجائے صَحو (ہوش) پر زور دیا اور صوفیوں کو متنبّہ کیا کہ یہ وقت بے ہوشی کا نہیں ہوش سے کام لینے کا ہے۔ اصلاحِ تصوّف کے ضمن میں نظریۂ وحدت الوجود کی جگہ نظریۂ وحدت الشہود کی اشاعت بھی حضرت مُجددؒ کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ اقبال نے وحدت الوجود کو

مسلمانوں کے لئے سمِ قاتل بتایا ہے حضرت مُجدّدؒ نے اس سمِ قاتل کی جگہ انہیں آبِ حیات سے رُوشناس کرایا۔

دینِ الٰہی کا خاتمہ:

حضرت مُجدّدؒ نے اکبر کی بے دینی اور الحاد کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ آپ نے اپنے مُریدوں اور احباب کے نام سیکڑوں کی تعداد میں خط لکھے جن میں اس عہد کے تمام فتنوں کی نشاندہی کی گئی تھی۔ آپ نے اکبر کے با اثر دیندار اُمراء اور درباریوں سے باقاعدہ خط و کتابت شروع کی اور انہیں شریعتِ اسلام پر کاربند رہنے کی نصیحت فرمائی۔ اگر آپ کو کہیں سے یہ اطلاع ملتی کہ ان کے کسی واقف کار نے اسلام کے دفاع میں کوئی خدمت انجام دی ہے تو آپ فوراً اسے مُبارک باد کا خط لکھتے۔ حضرت مُجدّدؒ کے تحریص دلانے پر اُمراء میں دین کی خدمت میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اکبر کے آخری ایامِ حیات میں امورِ حکومت انہیں اُمراء کے ہاتھ میں آ گئے جو حضرت مُجدّدؒ کے دامنِ ارادت سے وابستہ تھے۔ یہی وہ اُمراء تھے جنہوں نے شہزادہ سلیم کو کو یہ بتا دیا تھا کہ وہ صرف اسی شرط پر اس کی حمایت کریں گے کہ وہ تخت نشین ہو کر شریعتِ اسلام کو فروغ دے گا۔ اگر حضرت مُجدّدؒ کا کوئی اور کارنامہ نہ بھی ہوتا تب بھی دینِ الٰہی کا خاتمہ انہیں مجددِ الفِ ثانی منوانے کے لئے کافی تھا۔

رفض و تفضیل کے خلاف محاذ:

ہمایوں کی ایران سے واپسی کے بعد ایرانیوں کی برِّعظیم میں آمد و رفت شروع ہو گئی اور ان کی ایک بڑی تعداد برِّعظیم میں آباد ہو گئی۔ یہ لوگ اپنے ساتھ مخصوص نظریات اور عقائد لے کر آئے تھے جنہیں وہ اس ملک میں فروغ دے رہے تھے۔ جہانگیر کے عہد میں نُورجہاں اور آصف خان کی سرپرستی میں متعدد شیعی علماء شیعیت کے پرچار میں مصروف تھے۔ حضرت مُجدّدؒ نے بروقت اس کا نوٹس لیا اور اپنے مکتوبات میں صحابۂ کرام کے فضائل کی اس طرح سے وضاحت کی کہ عوام کو ان کے مقام کے متعلق

کوئی شُبہ باقی نہ رہا۔

ہندوؤں کے خلاف محاذ

اکبر کی ہندو نواز پالیسی سے ہندوؤں کے حوصلے اس قدر بڑھ گئے تھے کہ انہوں نے مسجدوں اور مقبروں کو مسمار کر کے ان کی جگہ مندر تعمیر کرنے شروع کر دیئے تھے۔ جن علاقوں میں ہندوؤں کی غالب اکثریت تھی وہاں انہوں نے مسلمانوں کا قافیہ تنگ کر رکھا تھا۔ حضرت مُجدّدؒ کے مکتوبات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ مسلمان اسلام کے شعائر بجا لانے سے قاصر تھے اور اگر وہ ایسا کرتے تو ہندو انہیں قتل کر ڈالتے تھے۔ ان حالات میں حضرت مُجدّدؒ نے ہندوؤں کے خلاف باقاعدہ ایک محاذ کھولا اور آپ نے اکبر اور بعدازاں جہانگیر کے دربار کے بااثر مسلمان اُمراء کی توجہ ہندوؤں کی چیرہ دستیوں کی طرف مبذول کرائی۔ حضرت مُجدّدؒ کی اس سعی و کاوش کا یہ نتیجہ نکلا کہ جہانگیر کے عہدِ حکومت میں اسلام میں دوبارہ رُونق پیدا ہو گئی۔

باب (2)

شاہ ولی اللہ مُحدّث دہلویؒ
اور
مسلمانانِ جنوبی ایشیاء کی نشاۃِ ثانیہ

شاہ ولی اللہ مُحدّث دہلویؒ کا شمار اُمتِ مُسلمہ کے ان مُحسنین میں ہوتا ہے جنہوں نے جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں کی سیاسی، مذہبی اور سماجی تاریخ میں اپنی سیرت اور کردار کے اَنمٹ نقوش چھوڑے ہیں ۔ برِّعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کے نامور عالم دین اور دانشور مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا یہ خیال ہے کہ شاہ صاحب سے زیادہ روشن دماغ عالم ہمارے ملک میں پیدا نہیں ہوا ۔

حسب و نسب:

شاہ ولی اللہ مُحدّث دہلوی حضرت امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد میں تھے ۔ ان کے بزرگ جب برِّعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش میں آئے تو انہوں نے ابتداء میں رُہتک میں سکونت اختیار کی ۔ بعد ازاں اس خاندان کے چند افراد دہلی اور سُونی پت میں جا بسے ۔ شاہ صاحب کی ننہال پُھلت ضلع مظفر نگر ہے ۔ اسی تاریخی قصبے کو شاہ صاحب کا مولد ہونے کا شرف حاصل ہے ۔

والدِ بزرگوار:

شاہ ولی اللہ کے والدِ محترم شاہ عبدالرحیم ایک جیّد عالم اور صاحبِ دل

بزرگ تھے ۔ ان کے اساتذہ میں خواجہ باقی باللہ دہلویؒ کے صاحبزادے خواجہ عبداللہ المعروف بہ خواجہ خورد سرفہرست ہیں ۔ شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی مشہور تصنیف انفاس العارفین میں اپنے والدِ محترم، ان کے اساتذہ کرام اور مشائخ عظام کے حالات تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں ۔

شاہ عبدالرحیم کو اورنگ زیب عالمگیر جیسے دیندار حکمران کا قُرب حاصل تھا اور انہوں نے " فتاویٰ عالمگیری " کی تدوین میں بھی حصہ لیا تھا ۔ موصوف فرقہ واریت سے بہت بلند تھے ۔ ایک بار دورانِ گفتگو ان کے مخاطب نے ان سے ان کے مذہب کے بارے میں استفسار کیا تو انہوں نے " سُنّی حنفی " کی بجائے:

خُذ ما صفا و دَع ما کدر

فرمایا ۔ (ترجمہ : جو چیز اچھی ہو، وہ لے لو اور جو خراب ہو، اسے چھوڑ دو) ۔ ان کے ان پاکیزہ خیالات نے شاہ ولی اللہ مُحدّث دہلوی کی کردار سازی میں بڑا اہم کردار ادا کیا ۔

ولادت اور ابتدائی زندگی:

شاہ ولی اللہ ۲۱ فروری ۱۷۰۳ء کو پُھلت میں پیدا ہوئے ۔ یہ اورنگ زیب عالمگیر کا آخری دورِ حکومت تھا اور شاہ صاحب کی ولادت کے پُورے چار سال بعد اورنگ زیب کا انتقال ہو گیا ۔ شاہ عبدالرحیم نے دہلی میں مدرسۂ رحیمیہ قائم کیا تھا جہاں وہ طلبہ کو درس دیا کرتے تھے ۔ جب شاہ ولی اللہ پانچ برس کے ہوئے تو شاہ عبدالرحیم نے ان کی تربیت شروع کر دی ۔ ابتدائی دو سالوں میں انہوں نے قرآنِ حکیم ختم کیا اور سات برس کی عمر میں انہوں نے نماز و رُوزے کی پابندی شروع کر دی ۔ انہوں نے اپنے والدِ بزرگوار کی نگرانی میں اپنی تعلیم مکمل کی اور ان کی نگرانی میں ہی منازلِ سلوک طے کرنا شروع کیں ۔ شاہ ولی اللہ نے اپنی زندگی کی سترہ بہاریں دیکھی تھیں کہ ان کے والدِ محترم کا انتقال ہو گیا اور انہوں نے اپنے والدِ بزرگوار کی مسند پر بیٹھ کر طلبہ کو پڑھانا شروع کیا ۔ درس و تدریس کا یہ سلسلہ ۱۷۳۰ء تک چلتا رہا ۔

شاہ ولی اللہ کا زمانہ:

شاہ صاحب چار برس کے تھے کہ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کا انتقال ہو گیا اور اس کی وفات کے ساتھ ہی فتنوں کے دروازے کھل گئے۔ اورنگ زیب کے تین بیٹوں کے درمیان حصولِ تخت کے لئے دو خونریز جنگیں ہوئیں جن میں درجنوں کی تعداد میں قابل جرنیل اور ہزاروں کی تعداد میں تجربہ کار سپاہی کام آئے۔ شہزادہ معظم، اپنے دو بھائیوں محمد اعظم اور کام بخش کو ٹھکانے لگا کر شاہ عالم بہادر شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔

اس کے عہد میں بندہ بیراگی نامی ایک سرکش سکھ نے دریائے جمنا سے لے کر دریائے راوی تک تباہی مچا دی۔ اس نے مسلمانوں کی ایک ایک بستی کو تباہ کر ڈالا اور مسلمانوں کو قتل کر کے چنگیز اور ہلاکو کی یاد تازہ کر دی۔

قریباً پانچ سال حکومت کرنے کے بعد ۱۷۱۲ء میں شاہ عالم بہادر شاہ کا لاہور میں انتقال ہو گیا جہاں وہ بندہ بیراگی کے مقابلے کے لئے انتظامات مکمل کرنے میں مصروف تھا۔ شاہ عالم بہادر شاہ کے چار بیٹے، عظیم الشان، معزالدین، جہاں شاہ اور رفیع الشان اس وقت لاہور میں موجود تھے۔ ان میں اول الذکر عظیم الشان اپنے دوسرے بھائیوں کی نسبت بڑا لائق و فائق تھا۔ درباری اُمراء نے اپنے ذاتی مفاد کے پیش نظر مختلف شہزادوں کی حمایت کی۔ لاہور میں شالا مار باغ اور لکھو ڈہر کے درمیان ان شہزادوں کے مابین حصولِ تخت کے لئے جنگ لڑی گئی۔ اس جنگ میں ذوالفقار خان نے سب سے نکمے شہزادے معزالدین کا ساتھ دیا اور بد قسمتی سے وہی کامیاب ہوا۔ دوسرے تینوں شہزادے لڑتے ہوئے اپنے کئی بیٹوں سمیت کام آئے۔

معزالدین نے جہاندار شاہ کا لقب اختیار کیا اور وہ لاہور سے اپنے ساتھ سترہ تابوت لے کر دہلی روانہ ہوا۔ اس کا سارا وقت لعل کنور نامی ایک مغنیہ کے ساتھ گزرتا تھا اس لئے کاروبارِ حکومت ذوالفقار خاں اپنی صوابدید سے چلاتا تھا۔ ان حالات میں عظیم الشان کے فرزند فرخ سیر نے، جو بنگال اور بہار کا صوبیدار تھا، فائدہ اٹھایا اور حالات کو ساز گار پاتے ہی اس نے پٹنہ سے دہلی کا رخ کیا۔ جہاندار شاہ نے اپنے بیٹے اعزالدین کو مقابلے کے لئے بھیجا لیکن اسے شکست ہوئی۔ اب جہاندار شاہ کی آنکھیں کھلیں اور وہ ذوالفقار خان کو ساتھ لے کر فرخ سیر کے مقابلے کو نکلا لیکن فرخ سیر نے

سادات بارہہ، سیّد حسین علی خان اور سیّد عبداللہ خان کی مدد سے اسے شکست دی۔ فرخ سیر نے جہاندار شاہ اور ذوالفقار خان کو قتل کروا دیا۔

فرخ سیر چونکہ سیّد برادران کی مدد سے کامیاب ہوا تھا اس لئے وہ کاروبارِ حکومت میں دخیل ہو گئے۔ اس پر فرخ سیر اور سیّد برادران کے مابین جھگڑا شروع ہو گیا۔ اس جھگڑے نے طول کھینچا اور بالآخر ۱۷۱۹ء میں سیّد برادران نے فرخ سیر کو تخت و تاج سے معزول کر کے نظر بند کر دیا اور جب اس نے قید سے فرار ہونے کی کوشش کی تو اسے مروا دیا۔

فرخ سیر کی معزولی کے بعد سیّد برادران نے رفیع الدرجات کو تخت پر بٹھایا۔ وہ دق کا مریض تھا۔ تین ماہ گزرنے کے بعد اس نے سیّد برادران سے درخواست کی کہ اسے معاف کر دیں اور اس کی جگہ اس کے بھائی رفیع الدولہ کو تخت پر بٹھا دیں۔ سیّد برادران نے رفیع الدرجات کی جگہ رفیع الدولہ کو تخت پر بٹھا دیا۔ اس کے تین رُوز بعد رفیع الدرجات فوت ہو گیا۔

رفیع الدولہ، شاہجہان ثانی کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ دو ماہ گزرنے کے بعد وہ اسہال کے مرض میں مبتلا ہو گیا۔ علاج معالجے کے باوجود پانچ ہفتے بیمار رہ کر اس نے وفات پائی۔ اس کی وفات کے بعد سیّد برادران نے شہزادہ روشن اختر کو محمد شاہ کے لقب سے تخت پر بٹھایا۔

محمد شاہ نے سیّد برادران سے جان چھڑانے کی کوشش کی تو انہوں نے یکے بعد دیگرے معین الدین، ابراہیم اور نکو سیر کو اس کے مقابلے میں کھڑا کر دیا۔ تاہم محمد شاہ سیّد برادران کو ٹھکانے لگانے میں کامیاب ہو گیا۔

شاہ ولی اللہ کی حجاز روانگی:

شاہ صاحب نے یہ تمام واقعات اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھے۔ اس لئے ملکی حالات سے ان کی طبیعت اُچاٹ ہو گئی اور انہوں حجاز جانے کا فیصلہ کر لیا۔ حرمین شریفین میں قیام کے دوران میں انہوں نے دو بار حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی اور شیخ ابُو طاہر مدنی سے حدیث کی سند لی۔ شاہ صاحب برِّعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کے

حالات سے اس قدر بد دل تھے کہ انہوں نے واپس آنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اسی زمانے میں انہوں نے خواب میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی اور آنحضورؐ نے فرمایا کہ وہ ہندوستان واپس جائیں کیونکہ وہاں ایک جماعت کی تربیت ان کے ذمے لگائی گئی ہے۔ آنحضرتؐ کا اشارہ پاتے ہی شاہ ولی اللہ ۱۷۳۲ء میں دہلی واپس آگئے۔

تحریکِ ولی اللہی:

شاہ ولی اللہ دہلوی نے واپس آنے کے بعد مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کے لئے ایک تحریک شروع کی جو "تحریکِ ولی اللہی" کے نام سے مشہور ہوئی۔ شاہ صاحب یہ جانتے تھے کہ قرنِ اوّل میں قرآنِ حکیم کے ذریعے لوگوں کی اصلاح ہوئی تھی اس لئے اب بھی قرآنِ حکیم سے ہی ہدایت لینا ہو گی۔

فتح الرحمٰن:

شاہ ولی اللہ جانتے تھے کہ عوام عربی زبان سے ناآشنا ہیں۔ وہ قرآنِ حکیم کی تلاوت محض ثواب سمجھ کر کرتے ہیں اور اس کے معانی اور مطالب سے بے خبر رہتے ہیں۔ شاہ صاحب نے فتح الرحمٰن کے عنوان سے قرآنِ حکیم کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ اگرچہ اس وقت علماء نے مخالفت کی لیکن بعد میں سب کو اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ یہ وقت کی ایک اہم ضرورت تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ فارسی زبان کا چلن بھی جاتا رہا تو عوام کے لئے قرآنِ حکیم کا فارسی ترجمہ سمجھنا مشکل ہو گیا۔ ان حالات میں شاہ صاحب کے دو فرزندوں شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالقادرؒ نے اپنے اپنے طور پر قرآنِ حکیم کے اُردو زبان میں ترجمے کئے۔ یوں خانوادہ شاہ ولی اللہ اور خدمتِ قرآنِ حکیم لازم و ملزوم ہو گئے۔ آج جہاں کہیں بھی درسِ قرآن ہوتا ہے اسے شاہ ولی اللہ کا فیض ہی سمجھنا چاہیے۔

مؤطاء امام مالکؒ:

امام مالکؒ کا شمار تابعین میں ہوتا ہے۔ موصوف امام نافع کے شاگرد رشید تھے اور امام نافع کو حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے شرف تلمذ تھا۔ اس طرح امام مالکؒ صرف دو واسطوں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث روائت کرتے ہیں جبکہ امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ترمذیؒ، امام نسائیؒ، امام ابُوداؤدؒ اور امام ابن ماجہؒ پانچ چھ واسطوں سے نبی کریمؐ سے حدیث روائت کرتے ہیں۔ ثانیاً، ان میں سے کوئی بھی مدینے کا رہنے والا نہ تھا اور یہ سب کے سب عجمی تھے، جبکہ امام مالکؒ کی تمام زندگی مدینہ منورہ میں ہی گذری تھی۔ انہوں نے مؤطاء میں وہی حدیثیں درج کی ہیں جن پر عمل کی اہلِ مدینہ کو ضرورت پڑتی تھی۔ شاہ ولی اللہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر کسی نے عہدِ رسالت اور عہدِ خلفاء راشدین کی ایک جھلک دیکھنی ہو تو وہ مؤطاء میں دیکھ لے۔ شاہ صاحب صحاح ستّہ پر مؤطاء کو ترجیح دیتے تھے۔ انہوں نے مؤطاء کو مقبول بنانے کے لئے مُصفّیٰ کے عنوان سے فارسی زبان میں اس کی تشریح لکھی اور پھر عربی دان طبقے کو ادھر توجہ دلانے کے لئے مُسویٰ کے نام سے مؤطاء کی عربی میں شرح لکھی۔

حُجۃُ اللہِ البالغہ:

یہ شاہ ولی اللہ کی معرکۃ آراء کتاب ہے۔ اگر موصوف اس کے علاوہ اور کوئی کتاب نہ لکھتے تو بھی یہی کتاب انہیں "امام الہند" منوانے کے لئے کافی تھی۔ اس کتاب میں انہوں نے اسرارِ دین، انسان کی دینی زندگی، ترقی کے مدارج اور سیاستِ ملی پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی کے بقول شاہ صاحب کے فکر کو سمجھنے کے لئے یہ بنیادی کتاب ہے۔ شاہ صاحب نے "البدور البازغہ" کے عنوان سے اس کا خُلاصہ بھی تیار کیا تھا۔

ازالۃ الخفاء، المقدمۃ السنیہ اور قُرۃُ العینین فی تفضیلِ الشیخین کا مضمون خلافتِ راشدہ ہے۔ شاہ صاحب خلافتِ راشدہ کو عہدِ رسالت کا تتمہ اور "مقصودِ قرآن" سمجھتے تھے۔ ان کا یہ خیال ہے کہ قرآنِ حکیم جیسا معاشرہ قائم کرنا چاہتا تھا وہ خلافتِ راشدہ میں ہمارے سامنے آیا۔ آنحضرتؐ کے آخری زمانے تک وحی نازل ہوتی رہی۔ ادھر دین مکمل ہوا ادھر تین ماہ بعد حضور نبی کریمؐ خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اس لئے تکمیل

دین کے بعد صحیح اسلامی معاشرے کی جھلک خلفاء راشدین کے عہد میں ہی ملتی ہے۔ اسی اسلامی معاشرے کو شاہ صاحب "مقصدِ قرآن" بتاتے ہیں۔ قرۃ العینین میں شاہ صاحب نے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ پر حضرات ابو بکرؓ و عمرؓ کی فضیلت ثابت کی ہے۔

فیوض الحرمین:

جس طرح شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ نے حرمین شریفین اور خصوصاً مدینہ منورہ میں قیام کے دوران میں اپنے مکاشفات "جذب القلوب" کے عنوان سے قلمبند کئے تھے اسی طرح شاہ ولی اللہ نے فیوض الحرمین کے نام سے وہاں کے مکاشفات تحریر کئے ہیں۔ شاہ صاحب کے فکر کو سمجھنے کے لئے یہ کتاب بھی حجۃ اللہ البالغہ کی طرح بڑی اہم ہے۔ بعض لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ حجۃ اللہ البالغہ اور فیوض الحرمین کو ملا کر پڑھنا چاہیے تاکہ شاہ صاحب کی اصل شخصیت پہچانی جا سکے۔

عقد الجید:

شاہ ولی اللہ کے زمانے میں تقلید اور عدمِ تقلید کا مسئلہ بڑی شدت اختیار کر چکا تھا۔ اضلاعِ پُورب (اعظم گڑھ، بنارس اور غازی پور) میں عدمِ تقلید شروع ہو چکی تھی اور لوگ کسی امام کی تقلید کی بجائے تمسک بالحدیث پر زور دے رہے تھے۔ شاہ صاحب نے عقد الجید میں تقلید اور اجتہاد کے موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔

الفوز الکبیر:

شاہ صاحب کی تصانیف میں الفوز الکبیر ایک اہم تصنیف ہے۔ اس کتاب میں شاہ صاحب نے اُصولِ تفسیر بیان کئے ہیں۔ انہوں نے یہ فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص قرآنِ حکیم کی تفسیر لکھے تو ان اُصولوں سے انحراف نہ کرے اور ہم ایسی کوئی تشریح قبول نہیں کریں گے جو صالحینِ سلف سے منقول نہ ہو۔

مسلکِ ولی اللہی:

شاہ صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اختلافی مسائل میں اپنا دامن بچاتے ہوئے ایک درمیانی راستہ تلاش کر لیتے ہیں۔ انہوں نے تقلید اور عدمِ تقلید کے درمیان اپنے لئے راستہ بنا لیا۔ جہاں انہیں صحیح حدیث مل جاتی تھی وہاں موصوف اس کے مطابق عمل کر لیتے تھے اور جہاں حدیث رہنمائی نہیں کرتی تھی وہاں وہ فقہ کے مطابق کام چلا لیتے تھے۔

وہ چاروں آئمہ اہلِ سُنّت کو برحق سمجھتے تھے اور ان میں سے کسی ایک کے فتوے پر، جو آسان ہوتا تھا، عمل کر لیتے تھے۔ وہ اس لحاظ سے مقلد تھے کہ وہ ان چاروں آئمہ کی فقہ سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ وہ اس اعتبار سے غیر مقلد تھے کہ وہ ان چاروں میں سے کسی ایک امام کی مکمل تقلید نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح انہوں نے وحدت الوجود اور وحدت الشہود میں بھی تطبیق کر لی تھی۔

شاہ صاحب کا سیاسی کارنامہ:

شاہ صاحب کے سامنے ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے کرنال کی جنگ میں محمد شاہ کو شکست دی اور دہلی میں قتلِ عام کرکے لوگوں کو دُھڑی دُھڑی کرکے لُوٹا۔ محمد شاہ کی شکست نے مغلیہ حکومت کی چُولیں ہلا کر رکھ دیں۔ صوبوں میں گورنروں نے موروثی حکومتیں قائم کر لیں اور مرہٹوں نے دوبارہ قوت فراہم کر لی۔ ۱۷۵۷ء میں دو مرہٹہ سرداروں ملہار راؤ ہولکر اور رگھو ناتھ راؤ نے دہلی پر حملہ کر دیا۔ نجیب الدولہ نے، جو دہلی کا انتظام سنبھالے ہوئے تھا، مرہٹوں کو کچھ دے دلا کر صلح کر لی۔ اس کے بعد مرہٹوں نے پنجاب کا رخ کیا اور آدینہ بیگ کی مدد سے ۲۱ اپریل ۱۷۵۸ء کو لاہور پر قبضہ کر لیا۔ مرہٹوں نے اپنی طرف سے آدینہ بیگ کو ۷۵ لاکھ روپے سالانہ کے عوض پنجاب کا گورنر مقرر کیا۔ لیکن ستمبر میں اس کا اچانک انتقال ہو گیا۔ آدینہ بیگ کی وفات کے بعد داتاجی سندھیا مرہٹوں کا لشکر لے کر لاہور کی جانب بڑھا اور اس نے سباجی سندھیا کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا۔ مرہٹوں کے ہراول دستے دریائے اٹک تک پہنچ گئے تاکہ شمال

مغربی جانب سے احمد شاہ ابدالی کے متوقع حملے کو روک سکیں ۔ یہ مرہٹوں کے انتہائی عروج کا دور تھا۔

مرہٹوں کے پنجاب پر قبضے کے بعد یہاں اسلامی شعائر مٹنے لگے ۔ ذبیحۂ گاؤ کی ممانعت کر دی گئی ۔ مساجد میں اذان دینے پر پابندی لگ گئی ۔ مرہٹے رات کو سؤر مار کر مسجدوں میں پھینک آتے تاکہ صبح جب مسلمان وہاں آئیں تو انہیں اذیت پہنچے ۔ پنجاب دارالاسلام سے دارالحرب میں تبدیل ہو گیا۔

ان حالات میں شاہ ولی اللہ نے افغانستان کے حکمران احمد شاہ ابدالی کو پنجاب پر حملہ کرکے مسلمانوں کو مرہٹوں کے تسلّط سے نجات دلانے کی دعوت دی ۔ دوسری جانب شاہ صاحب نے رُوہیل کھنڈ کے حکمران نواب نجیب الدولہ، فرخ آباد کے حاکم نواب احمد خان بنگش اور اُودھ کے والی شجاع الدولہ کو احمد شاہ ابدالی کی مدد کے لئے بلایا۔

احمد شاہ ابدالی ۱۷۵۹ء کے اواخر میں پنجاب آیا ۔ اس نے مرہٹوں کو لاہور سے نکال کر مسلمانوں کو ان کے تسلّط سے نجات دلائی ۔ احمد شاہ ابدالی دہلی کی جانب بڑھا تو تھانیسر کے مقام پر داتا جی سندھیا نے اسے رُوکنے کی کوشش کی لیکن مُنہ کی کھائی ۔ دہلی کے نواح میں براری گھاٹ کے مقام پر داتا جی سندھیا نے دوبارہ مقابلہ کیا اور مارا گیا ۔ اس کے بعد جنکو جی سندھیا اور ملہار راؤ ہولکر نے احمد شاہ ابدالی کی پیش قدمی رُوکنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔

جب مرہٹوں کے پیشوا کو ان حالات کا علم ہوا تو اس نے سداشیو بھاؤ کو، جس نے حال ہی میں نظام دکن کو شکست دے کر شہرت حاصل کی تھی، احمد شاہ ابدالی کے مقابلے کو بھیجا۔ سداشیو بھاؤ نے ۲ اگست ۱۷۶۰ء کو دہلی پر قبضہ کر لیا۔ دہلی کا انتظام درست کرکے سداشیو بھاؤ اور وشواس راؤ ۲۹ اکتوبر ۱۷۶۰ء کو پانی پت پہنچ گئے ۔ وہاں احمد شاہ ابدالی پہلے سے موجود تھا۔

۱۳ جنوری ۱۷۶۱ء تک طرفین میں چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوتی رہیں ۔ ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء کو طرفین میں فیصلہ کن جنگ ہوئی جس میں سداشیو بھاؤ اور وشواس راؤ درجنوں اعلیٰ فوجی افسروں سمیت مارے گئے ۔ یوں مرہٹہ سرداروں کی ایک پُوری نسل

آنِ واحد میں ختم ہو گئی ۔ اس جنگ میں تیس ہزار مرہٹے کام آئے اور بیس ہزار گرفتار ہوئے ۔ ان کے ہزاروں گھوڑے اور اُونٹ، پانصد ہاتھی اور دو لاکھ مویشی ابدالی کے ہاتھ لگے ۔ انہوں نے شمالی ہند سے جو مال و دولت لوٹی تھی، وہ بھی ابدالی کے ہاتھ لگی۔

پانی پت کی جنگ میں مرہٹوں کو فیصلہ کن شکست ہوئی اور وہ برّعظیم کی مرکزی سیاست سے ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئے ۔ مرہٹوں کا پیشوا بالاجی باجی راؤ اس غم میں مر گیا۔ مؤرخین کا یہ کہنا ہے کہ مہاراشٹر میں مرہٹوں کا کوئی گھر ایسا نہ تھا جہاں صفِ ماتم نہ بچھی ہو۔

شاہ ولی اللہ دہلوی اور اصلاحِ معاشرہ:

شاہ صاحب نے اپنے دور کے معاشرے کا بغور مشاہدہ کرنے کے بعد اس دور کے تمام طبقوں کو ان کے فرائض سے آگاہ کرنے کی کوشش فرمائی اور ان کی کمزوریاں اور خرابیاں بیان کرنے کے بعد انہیں راہِ راست پر چلنے کی تلقین فرمائی۔

اُمراء

کو خطاب کرتے ہوئے شاہ صاحب نے فرمایا کہ تم خدا سے نہیں ڈرتے اور دنیا کی لذتوں میں ڈوبے جا رہے ہو ۔ جن لوگوں کی نگرانی تمہارے سپرد کی گئی ہے تم ان سے غافل ہو چکے ہو ۔ تمہاری وہ ذہنی صلاحیتیں جو مسلمانوں کی بہتری کے لئے صرف ہونی چاہیں وہ لذیذ کھانوں کے مینو (Menu) تیار کرنے، اُونچے اُونچے مکانات تعمیر کروانے اور نرم و نازک عورتوں سے حظ اٹھانے میں ضائع ہو رہی ہیں۔

سپاہیوں

کو خطاب کرتے ہوئے شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ تم اتنی رُوزی پر قناعت کر لو جس سے تمہاری عاقبت سُدھر جائے ۔ اپنا خرچ اپنی آمدنی سے نہ بڑھاؤ اور جو رقم ضرورت سے زائد ہو اس سے مسکینوں، مسافروں اور ناداروں کی مدد کیا کرو اور کچھ رقم ناگہانی مصائب کے لئے پس انداز کیا کرو۔

واعظوں اور زاہدوں سے خطاب کرتے ہوئے شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ تم لوگوں نے یہ جبر اپنے اوپر دین کو عائد کر لیا ہے۔ ہر بری بھلی بات اور ہر رطب و یابس پر تمہارا ایمان ہے۔ تم لوگوں کو جعلی اور گھڑی ہوئی حدیثوں کا وعظ سناتے ہو۔ تم نے اللہ کے بندوں کے لئے زندگی تنگ کر دی ہے۔ حالانکہ تم تو اس لئے پیدا ہوئے تھے کہ لوگوں کو آسانیاں بہم پہنچاؤ گے لیکن تم نے لوگوں کو دشواریوں میں ہتلا کر دیا ہے۔ تم مغلوب الحال لوگوں کی باتیں دلیل کے طور پر پیش کرتے ہو۔ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ سب سے بڑی رحمت اور سب سے بڑا کرم اللہ کا وہ ہے جسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہنچایا ہے۔ ہدایت وہی ہے جو رسول کریمؐ اور ان کے صحابہ کرامؓ کیا کرتے تھے (مخلصاً از تاریخ دعوت و عزیمت)۔

(ایک زاہد نے تمام لذّات دنیاوی سے منہ موڑ لیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے بدن پر دُرّہ رسید کر کے فرمایا کہ ہمارے لئے کیوں مشکلات پیدا کر رہے ہو۔ شاہ صاحب ایسے تمام واعظوں، گوشہ نشین زاہدوں اور تنگ نظر مفتیوں کے خلاف تھے جنہوں نے اسلام جیسے آسان دین کو مشکل بنا دیا تھا)

پیروں کو مخاطب کرتے ہوئے شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ہم ایسے پیروں کو ہرگز پسند نہیں کرتے جو محض رقم بٹورنے کے لئے لوگوں کو مُرید کرتے ہیں۔ شاہ صاحب ایسے پیروں، مولویوں، شاعروں اور موسیقاروں کے بھی سخت خلاف تھے جو شاہی خزانے پر بوجھ بنے ہوئے تھے اور سرکاری وظائف پر اپنی زندگی بسر کر رہے تھے۔ شاہ صاحب نے مغلوں کے زوال کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے ان مُفت خوروں کو بھی مغلیہ حکومت کے زوال کا ایک بڑا سبب بتایا ہے۔

عام انسانوں کو مخاطب کر کے شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ بلاوجہ تکلّف سے کام نہ لیا کرو۔ اگر تم نے یہ عادت ترک نہ کی تو فسق و فجور میں ہتلا ہو جاؤ گے۔ صرف اتنا کمانے کی کوشش کرو جس سے تمہاری ضروریات پوری ہو جایا کریں۔ دوسروں پر بوجھ بننے کی

کوشش نہ کرو۔ خود کمانے کی عادت ڈالو تو اللہ تمہارے لئے آسائش پیدا کر دے گا۔ ہر آدمی کو روزی کمانے کے لئے کوئی نہ کوئی ذریعہ، معاش کے لئے ضرور اپنانا چاہیے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کے پاس رہنے کے لئے گھر ہو، جس میں وہ آرام سے رہ سکے۔ گھر میں پانی میسّر ہو اور اس کی اتنی آمدنی ہو جس سے بخوبی گذر بسر ہو سکے۔ پہننے کے لئے کپڑے ہوں اور گھر کو چلانے کے لئے بیوی ہو، تو ایسے شخص کو تو دنیا میں ہی جنّت مل گئی۔ اسے چاہیے کہ طمع چھوڑ کر خدا کا شکر ادا کرے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں: لوگو! تم نے ایسے بگڑے ہوئے رسوم اختیار کر لئے ہیں جن سے دین کی اصلی صورت بگڑ گئی ہے۔ عاشورہ کے دن جھوٹی باتوں پر اکٹھے ہوتے ہو۔ شب برات میں کھیل کود سے دل بہلاتے ہو۔ مُردوں کے لئے کھانے پکا پکا کر کھلانے کو اچھا سمجھتے ہو۔ کیا تم اس کی دلیل پیش کر سکتے ہو؟ تم نے بری بری رسمیں اپنا کر اپنی زندگی تنگ کر لی ہے۔ تم دعوتوں میں حد سے زیادہ تکلّف برتتے ہو۔ طلاق کو تم نے ناجائز ٹھہرا لیا ہے اور بیوہ عورتوں کو نکاح سے رُوکتے ہو۔ تم فرض نمازیں ترک کرتے ہو۔ اپنے دنیاوی کاروبار میں تمہیں نمازوں کا خیال نہیں رہتا۔ تم زکوۃ ادا کرنے سے کنّی کتراتے ہو۔ حالانکہ ہر دولت مند شخص کے رشتے داروں میں حاجت مند موجود ہوتے ہیں۔ تم نے رُوزے رکھنے بند کر دیے ہیں۔ خاص طور پر سپاہی پیشہ لوگ تو رُوزوں کی پرواہ نہیں کرتے۔

قوموں کے عروج و زوال کے بارے میں شاہ صاحب کی حتمی رائے

:

شاہ ولی اللہ دہلوی اپنی شہرہ آفاق تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں کہ اگر کسی قوم میں تمدّن کی مسلسل ترقی جاری رہے تو اس کی صنعت و حرفت اعلیٰ کمال پر پہنچ جاتی ہے۔ اس کے بعد اگر حکمران جماعت آرام و آسائش اور تزئین و تفاخر کی زندگی کو اپنا شعار بنا لے تو اس کا بوجھ قوم کے کاریگر طبقات پر اتنا بڑھ جائے گا کہ

سوسائٹی کا اکثر حصہ حیوانوں جیسی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گا ۔ انسانیت کے اجتماعی اخلاق اس وقت برباد ہو جاتے ہیں جب کسی جبر سے ان کو اقتصادی تنگی پر مجبور کر دیا جائے ۔ اس وقت وہ گدھوں اور بیلوں کی طرح صرف روٹی کمانے کے لئے کام کریں گے۔ جب انسانیت پر ایسی مصیبت نازل ہوتی ہے تو خدا تعالیٰ انسانیت کو ان سے نجات دلانے کے لئے ضرور الہام کرتا ہے ، یعنی ضروری ہے کہ قدرت الٰہیہ انقلاب کے سامان پیدا کر کے قوم کے سر سے اس ناجائز حکومت کا بوجھ اتار دے ۔ (ترجمہ پروفیسر خلیق احمد نظامی)۔

مغلوں کے زوال کے اسباب:

شاہ صاحب نے آج سے اڑھائی صدیاں پہلے مغلیہ حکومت کے زوال کے اسباب کا جو تجزیہ کیا ہے اس میں آج بھی شاید ہی کوئی اضافہ کیا جا سکے ۔ شاہ صاحب کے نزدیک مغلیہ حکومت کے زوال کے درج ذیل اسباب ہیں:

۱۔ مرکز کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر صوبے داروں نے نیم خود مختار حکومتیں قائم کر لیں جس سے مرکز کی آمدنی گھٹ گئی اور مرکز کے لئے بڑی فوج ملازم رکھنا مشکل ہو گیا جس کی وجہ سے شمال مغربی جانب سے حملے شروع ہو گئے ۔

۲۔ خزانے کی قلت کی بنا پر کاروبار حکومت چلانے میں مشکلات پیدا ہو گئیں ۔

۳۔ جاگیرداروں کی کثرت سے نظام حکومت تباہ ہو گیا۔

۴۔ اجارہ داری کے مسموم اثرات نے پورے معاشرے کو برباد کر کے رکھ دیا۔

۵ ۔ فوج کو بروقت تنخواہ نہ ملتی تھی جس کی وجہ سے فوجی لوٹ مار کر کے اپنی گذر بسر کرتے تھے ۔

۶۔ ملک میں ایک مفت خور طبقہ پیدا ہو گیا جو خزانے پر بوجھ بن گیا تھا ۔

شاہ صاحب کی وفات:

پانی پت کی تیسری جنگ میں مرہٹوں کی شکست کے بعد شاہ صاحب اس ملک میں کونسا نظام لانا چاہتے تھے ۔ یہ بات آج تک معلوم نہ ہو سکی ۔ شاہ صاحب کے نزدیک خلافت ، بادشاہت ، منصب داری سسٹم اور جاگیرداری نظام ناکام ہو چکے تھے ۔

وہ ان کی جگہ کوئی نیا نظام (New World Order?) لانا چاہتے تھے ، لیکن پانی پت کی جنگ کے جلد بعد ۲۲ اگست ۱۷۶۲ء کو ان کا انتقال ہو گیا ۔

شاہ صاحب کی وفات کے بعد ان کے فرزندوں نے ان کے مشن کو جاری رکھا ۔ شاہ عبدالعزیز ان کے بڑے فرزند تھے ۔ وہ اپنے والد کی مسند پر بیٹھے ۔ انہوں نے اپنے بھائیوں ، شاہ رفیع الدین ، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی کی تعلیم و تربیت مکمل کی۔ شاہ عبدالعزیز اولادِ نرینہ سے محروم تھے ۔ انہوں نے اپنے نواسے شاہ محمد اسحٰق اور اپنے دو بھتیجوں ، شاہ اسمٰعیل اور شاہ مخصوص اللہ کی تربیت پر بڑا زور دیا ۔ شاہ عبدالعزیز کی وفات کے بعد شاہ محمد اسحٰق ان کے جانشین ہوئے ۔

شاہ عبدالعزیز کے مرید خاص سید احمد بریلوی ، بھتیجے شاہ اسمٰعیل اور داماد مولانا عبدالحی بڈھانوی نے تحریک جہاد شروع کی ۔

باب (3)

سید احمد بریلویؒ کی تحریکِ جہاد

برِّعظیم پاک وہند اور بنگلہ دیش میں اُنیسویں صدی کے آغاز میں مسلمانوں کی سیاسی قوت بالکل ختم ہو چکی تھی اور مغل شہنشاہ کی حیثیت شاہِ شطرنج سے زیادہ نہیں رہی تھی۔ برِّعظیم کے بیشتر حصے پر ایسٹ انڈیا کمپنی قابض ہو چکی تھی۔ ۱۸۰۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے جرنیل لارڈ لیک نے دہلی پر قبضہ کر لیا۔ ان حالات میں شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی نے برِّعظیم پاک وہند اور بنگلہ دیش کے دارالحرب ہو جانے کا فتویٰ صادر کر دیا۔

مسلمانوں کی سیاسی قوت ختم ہوتے ہی مسلم معاشرے کو گھن لگ گیا اور انہوں نے اسلامی تعلیمات فراموش کر کے بہت سی ہندووانہ رسمیں اپنا لیں۔ ان حالات میں چند دردمند مسلمان میدانِ عمل میں نکلے اور ان کی سعی و کاوش اور جانی و مالی قربانیوں نے ناکامی اور مایوسی کے زمانے میں کامیابی کی کرن دکھائی۔

تحریکِ جہاد کے رُوحِ رواں سید احمد بریلویؒ ۱۷۸۶ء میں تکیہ شاہ علم اللہ رائے بریلی (اودھ) میں ایک دینی اور رُوحانی خانوادے میں پیدا ہوئے۔ ان کے اجداد و اَمجاد میں شاہ علم اللہ، حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خلیفۂ اعظم حضرت سید آدم بنوریؒ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ اسی دینی اور رُوحانی ماحول میں سید احمد بریلوی نے تربیت حاصل کی۔

سید صاحب کا پڑھائی میں جی نہیں لگتا تھا۔ خالقِ کائنات نے انہیں کسی

اور ہی کام کے لئے پیدا کیا تھا۔ ان کے والدین نے انہیں حصولِ علم کی خاطر لکھنؤ بھیجا لیکن وہاں ان کا جی نہ لگا۔ سید صاحب لکھنؤ سے دہلی چلے گئے۔ اس زمانے میں وہاں مدرسۂ رحیمیہ کی بڑی شہرت تھی جسے شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی اور ان کے برادران چلا رہے تھے۔ یہ مدرسہ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور افکار کا مرکز تھا۔ شاہ عبدالعزیز نے سید صاحب کو اپنے بھائی شاہ عبدالقادر کے سپرد کیا اور انہوں نے سید صاحب کو قرآن کا ترجمہ اور تفسیر پڑھائی۔ دہلی میں قیام کے دوران ہی سید صاحب اس نتیجے پر پہنچ کہ صرف جہاد کے ذریعے ہی انگریزوں اور سکھوں سے آزادی حاصل کی جا سکتی ہے اور اس کام کے لئے فنِ حرب میں مہارت ضروری ہے۔ اس زمانے میں ٹونک کے حکمران امیر خاں کی بہادری اور شجاعت کا بڑا شہرہ تھا۔ سید صاحب نے جنگ کی عملی تربیت حاصل کرنے کی غرض سے اس کی فوج میں ملازمت اختیار کر لی اور امیر خان کے ساتھ مل کر متعدد لڑائیوں میں حصہ لیا۔ سید صاحب نے چھ سال فوج میں ملازمت کی اور جب امیر خاں اور انگریزوں کے مابین صلح ہو گئی تو سید صاحب ملازمت ترک کر کے دہلی چلے گئے۔ دہلی جانے کے بعد سید صاحب نے شاہ عبدالعزیز کی بیعت کر لی اور ان کی نگرانی میں سلوک کی منزلیں طے کرنے لگے۔ اس رُوحانی سفر نے ان کے اندر ایک نیا ولولہ پیدا کیا۔

شاہ عبدالعزیز نے کچھ عرصے بعد انہیں خلافت عطا کی اور وہ لوگوں کو مُرید کرنے لگے۔ ان کی رُوحانی استعداد دیکھ کر شاہ عبدالعزیز کے داماد مولانا عبدالحی بڈھانوی اور برادر زادے شاہ اسمٰعیل دہلوی ان کے مُرید ہو گئے۔ ان دو عالموں کے مُرید ہونے کے بعد بڑی تعداد میں لوگ ان کے حلقۂ مُریدی میں شامل ہونے لگے۔

سید صاحب نے اپنے مُریدوں کے ساتھ مل کر اسلامی معاشرے کو غیر اسلامی عناصر اور فرسودہ رسموں سے پاک کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ شاہ اسمٰعیل دہلوی نے "تقویۃ الایمان" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جس میں توحیدِ خالص پیش کی اور شرک کی حقیقت بیان کی۔ تقویۃ الایمان نیم خواندہ مولویوں کے لئے ایک کڑوی گولی ثابت ہوئی جسے وہ ہضم نہ کر سکے اور بقول سید ابوالحسن علی ندوی اس دن سے لے کر آج تک کوئی دن ایسا نہیں گزرا جس دن (غیر اسلامی رسموں کے ذریعے اپنے پیٹ بھرنے والے) مولویوں نے انہیں گالیاں نہ دی ہوں۔

سیّد صاحب نے شرک و بدعت ترک کرکے اُسوۂ حسنہ اور صحابہ کرام کا طریقہ اپنانے پر زور دیا۔ انہوں نے اپنے مُریدوں کو سادہ زندگی اختیار کرنے کی تلقین کی اور بیاہ شادی کے موقعوں پر بے جا اسراف سے روکا۔ انہوں نے اپنے مُریدوں کو خصوصاً اور عام مسلمانوں کو عموماً یہ مشورہ دیا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو ولیوں اور پیروں سے منسوب نہ کریں اور قبر پرستی سے بچیں۔ سیّد صاحب نے دہلی سے لے کر سہارنپور تک اپنے رفقاء کے ساتھ تبلیغی سفر کیا اور وعظ و تلقین کے ذریعے انہیں صراطِ مستقیم پر چلنے پر آمادہ کیا۔

اسی زمانے میں برِّعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کے بعض مولویوں نے یہ فتویٰ صادر کیا کہ حرمین شریفین پر وہابیوں کا قبضہ ہو گیا ہے اس لئے فریضۂ حج ساقط ہو چکا ہے۔ ان حالات میں سیّد صاحب نے ۱۸۲۰ء میں حج کا عزم کیا اور چار صد مریدوں کے ہمراہ حجازِ مقدس جانے کے لئے دہلی سے کلکتہ روانہ ہو گئے۔ اثنائے سفر انہوں نے وعظ و تلقین کا سلسلہ جاری رکھا اور ہزاروں افراد کی زندگیوں میں انقلاب برپا کر دیا۔ پٹنہ میں علمائے صادق پُور کا خاندان ان کا مُرید ہوا۔ اس خاندان کا بہار کے عوام پر بڑا اثر تھا اس لئے بہت سے بہاری ان کے مُریدوں میں شامل ہو گئے۔ علمائے صادق پُور نے آگے چل کر بڑی قربانیاں دیں۔ ان کی جائدادیں ضبط ہوئیں۔ ان کو عبور دریائے شور قید کی طویل سزائیں بھگتنا پڑیں اور بیشتر افراد کو واپس وطن آنا نصیب نہ ہوا۔

سیّد صاحب نے تین سال عرب میں گزارے اور وہاں کے علماء اور عالمِ اسلام سے حج کے لئے آنے والے عالموں سے تبادلۂ خیال کا موقع ملا اور انہوں نے وطن واپس آکر جہاد کا عزم ظاہر فرمایا۔

اس زمانے میں پنجاب اور صوبہ سرحد پر رنجیت سنگھ کی حکومت تھی۔ ان علاقوں میں سکھ دندناتے پھرتے تھے۔ سکھا شاہی اور بُرچھا گردی کی اصطلاحات اسی زمانے میں رائج ہوئیں۔ سکھوں کی مملکت میں مسلمانوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک کیا جاتا تھا۔ لاہور کی بادشاہی مسجد میں رنجیت سنگھ کے گھوڑے باندھے جاتے تھے اور بھی کئی مساجد اصطبلوں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ اکثر مقامات پر مساجد میں اذان پر پابندی عائد تھی۔ لاہور میں کئی بزرگوں کے مقبروں میں سکھوں نے گولہ بارود کا ذخیرہ

کیا ہوا تھا۔ اکثر مقامات پر اسلامی شعار مٹ رہے تھے۔ ان حالات میں سیّد احمد بریلوی نے سکھوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔

رنجیت سنگھ بڑا طاقتور حکمران تھا۔ اس کے یورپین جرنیلوں، ونطورا، اینوی ٹیبل اور الارڈ نے سکھ فوج کو یورپی طریقے کے مطابق تربیت دی تھی۔ اس لئے انگریزی علاقے میں رہ کر اس کے خلاف لڑنا ممکن نہ تھا۔ لہٰذا سیّد احمد بریلوی نے جہاد شروع کرنے کے لئے صوبہ سرحد کا انتخاب کیا۔ وہ یہ جانتے تھے کہ جب وہ صوبہ سرحد پہنچ کر سکھوں کے خلاف لڑیں گے تو ان کی پُشت پر افغانستان، ایران، بخارا اور چینی ترکستان کے مسلم ممالک ہوں گے اور انہیں وہاں سے کمک ملنے کی بھی امید تھی۔

۱۸۲۵ء میں سیّد احمد بریلوی پانچ ہزار روپے نقد اور سات صد سر فروش مُریدوں کو لے کر دہلی سے نکلے۔ انہوں نے گوالیار میں مہاراجہ سندھیا سے ملاقات کی اور وہاں سے ٹونک پہنچے۔ سیّد صاحب اور ان کے بعض رفقاء نے اپنے بیوی بچے ٹونک میں چھوڑے اور خود شکارپور ہوتے ہوئے پیر محمد راشد پیر صاحب جھنڈا سے ملنے گوٹھ پیر جھنڈا تشریف لے گئے۔ پیر صاحب حُروں کے رُوحانی پیشوا تھے اور انہوں نے بھی اپنے مریدوں کو جہاد کے لئے تیار کیا تھا۔ ان سے مل کر سیّد صاحب کو رُوحانی مسرت ہوئی۔

پیر محمد راشد سے مل کر سیّد صاحب درۂ بولان کے راستے قندھار پہنچے اور وہاں سے غزنی ہوتے ہوئے کابل تشریف لے گئے۔ کابل سے انہوں نے پشاور کا رُخ کیا۔ انہوں نے دہلی سے پشاور تک پونے دو ہزار میل کا سفر نو ماہ میں طے کیا۔ کیمونسٹوں کی اصطلاح میں یہ ان کی Long March تھی۔ پشاور پہنچ کر سیّد صاحب نے آزاد قبائل کو جہاد کی دعوت دی اور اواخر ۱۸۲۶ء میں اکوڑہ خٹک کے مقام پر مدرسۂ حقانیہ کے عقب میں مجاہدین اور سکھوں کے مابین پہلا معرکہ ہوا۔ اتمامِ حُجت کے لئے سیّد صاحب نے سکھ جرنیل بُدھ سنگھ کو خط لکھا جس میں اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ اس کے انکار پر مجاہدین اور سکھوں کے مابین جنگ ہوئی جس میں سکھوں کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

ایک رات مجاہدین نے دریائے اٹک عبور کرکے حضرو کی فوجی چھاؤنی پر شبخون مارا اور سکھوں کو بھگا کر بہت سا مالِ غنیمت سمیٹا۔ انہی ایام میں سیّد صاحب نے

قریبی ممالک کے مسلمان حکمرانوں کو خط لکھ کر اپنی تحریک سے آگاہ کیا اور انہیں بھی جہاد میں شرکت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی ۔ سید صاحب کے یہ خطوط "مکاتیب سید احمد بریلوی" کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں ۔

مجاہدین کی سرگرمیوں سے ایک بڑا علاقہ سکھوں کے تسلط سے آزاد ہو کر مجاہدین کے قبضے میں آ گیا ۔ اس علاقے کا انتظام چلانے کے لئے ایک باقاعدہ حکومت کے قیام کی ضرورت پیش آئی تو ۱۰ جنوری ۱۸۲۷ء کو مجاہدین اور افغان سرداروں نے سید احمد بریلوی کے ہاتھ پر بیعت کر کے انہیں امیر المومنین منتخب کیا تاکہ ان کی نگرانی میں انتظام جہاد، تقسیم غنائم، اقامت جمعہ و عیدین اور ترویج شریعت ہو سکے ۔ حضرت مولانا عبیداللہ سندھی ، جو موجودہ صدی میں سب سے زیادہ روشن دماغ عالم تھے ، فرماتے ہیں کہ اگر وہ اس وقت وہاں موجود ہوتے تو سید صاحب کی بجائے کسی مقامی شخص کو امیر المومنین بناتے اور سید صاحب کو اس کا مشیر بنا دیتے ۔ سید صاحب کے امیر المومنین بننے سے مقامی لوگوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ سید صاحب اس علاقے پر حکومت کرنے کے لئے آئے ہیں ۔

اسی زمانے میں شیدو کی جنگ پیش آئی ۔ سکھوں نے پشاور کے درانی سرداروں سلطان محمد خان اور یار محمد خان کو سید صاحب سے بدظن کر دیا ۔ جو کام جنرل ونطورا اور بدھ سنگھ کی توپیں نہ کر سکیں وہ انہوں نے چالبازی سے مکمل کر لیا ۔ جس روز معرکۂ شیدو پیش آیا اس سے گزشتہ روز سید احمد بریلوی بیہوش پائے گئے ۔ ان کے منہ سے کف بہہ رہی تھی ۔ اطباء نے بتایا کہ انہیں زہر دیا گیا ہے ۔ اطباء کے علاج سے سید صاحب ہوش میں آ گئے اور کمزوری اور نقاہت کے باوجود میدان جنگ میں پہنچ گئے ۔ مجاہدین اور سکھ ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما تھے کہ سوچی سمجھی سازش کے مطابق یار محمد خان درانی نے "بھاگو بھاگو شکست ہو گئی" کا شور مچا دیا اور اپنے سپاہیوں کو لے کر پشاور کی جانب فرار ہو گیا ۔ اس کو یوں بھاگتے دیکھ کر مجاہدین کے بھی قدم اکھڑ گئے اور بنا بنایا کھیل بگڑ گیا ۔

اسی زمانے میں سردی شروع ہو گئی ۔ مجاہدین کے پاس رسد کی کمی تھی ۔ وہ اپنے وطن سے بہت دور تھے ۔ اسی زمانے میں مولوی محبوب علی ہندوستان سے پشاور

پہنچا اور وہ مخالفین کے پروپاگنڈے سے متاثر ہو کر بہت سے لوگوں کو اپنے ساتھ واپس لے گیا ۔ اس نے ہندوستان واپس جا کر تحریک کے خلاف پروپاگنڈہ شروع کر دیا جس سے امدادی رقوم اور رضاکاروں کی ترسیل رک گئی ۔ مولانا شاہ محمد اسحٰق اور مولانا محمد یعقوب نے بمشکل تمام اس فتنے کو فرو کیا ۔

اسی زمانے میں ۲۳ فروری ۱۸۲۸ء کو مولانا عبدالحئی بڈھانوی کا خبر کے مقام پر انتقال ہو گیا ۔ موصوف سید صاحب کے دست راست اور مشیر تھے ۔ ان کے انتقال سے سید صاحب ایک قابل اور مخلص مرید سے محروم ہو گئے ۔

رنجیت سنگھ نے اپنی طرف سے یار محمد خان کو پشاور کا گورنر مقرر کیا اور سید صاحب کو پیغام بھیجا کہ وہ آئندہ دریائے اٹک عبور نہ کریں ۔ ادھر رنجیت سنگھ نے اپنی ڈپلومیسی سے یار محمد خان کو سید صاحب کے خلاف کر دیا اور وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ سید صاحب کو اس علاقے سے بے دخل کرنے آیا ۔ یار محمد خان اور مجاہدین کے مابین باقاعدہ جنگ ہوئی جس میں رنجیت سنگھ کا یار وفادار یار محمد خان مارا گیا ۔ اس موقع پر سید صاحب سے ایک اور سیاسی غلطی ہو گئی ۔ ان کے مرید [illegible] ارباب بہرام خان نے ، جو تہ کال بالا پشاور کے ساکن تھے ، سید صاحب سے التجا کی کہ وہ پشاور کی حکومت دس لاکھ روپے سالانہ خراج کے عوض اس کے حوالے کر دیں ۔ سید صاحب نے اس کی درخواست مسترد کر دی اور یار محمد خان کے بھائی سلطان محمد خان کا قصور معاف کر کے پشاور کی حکومت اس کو سونپ دی ۔ سید صاحب کا یہ فیصلہ تحریک کے لئے بڑا نقصان دہ ثابت ہوا ۔

سید صاحب نے اپنے زیر اثر علاقے میں احکام شریعت سختی کے ساتھ نافذ کئے ۔ پشاور کے قاضی مولوی سید مظہر علی عظیم آبادی نے شہر میں بھنگ ، چرس اور افیون کا کاروبار بند کروا دیا تو موجودہ اصطلاح میں ڈرگ مافیا ان کے خلاف ہو گیا ۔ قاضی صاحب کے خوف سے زنان بازاری بازار حسن خالی کر کے فرار ہو گئیں ۔

سید صاحب اور ان کے رفقاء خصوصاً شاہ اسمٰعیل دہلوی نے نکاح بیوگان پر بڑا زور دیا اور اسی طرح انہوں نے دختر فروشی کے خلاف تحریک چلائی ۔ کاشتکاروں سے عشر اور عامۃ المسلمین سے زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے عاملین مقرر کئے ۔ عشر اور زکوٰۃ کی

آمدنی سیّد صاحب کے بیت المال میں جانے لگی۔ اس سے پہلے عشر اور زکوٰۃ اس علاقے کے مولوی لیا کرتے تھے۔ سیّد صاحب کے اقدام سے ان کے ذاتی مفاد کو نقصان پہنچا تو وہ بھی سیّد صاحب کے خلاف ہو گئے۔ مؤرخوں نے اس بات کا شکوہ کیا ہے کہ سیّد صاحب کے مقرر کردہ قاضی مجرموں کو سخت سزائیں دیتے اور بھاری جرمانے وصول کرتے تھے۔ پٹھان قبائلی رسم و رواج کے عادی تھے۔ انہوں نے اسلام کا مطالعہ شاہ اسمٰعیل دہلوی کی طرح نہیں کیا تھا اور نہ ہی ان کی تربیت اسلامی ماحول میں ہوئی تھی۔ ان کی قبائلی رسمیں اور رواج مجاہدین کے نزدیک بدعت اور شرک سمجھے جاتے تھے۔ اس لئے راعی اور رعایا کے نقطۂ نظر میں بعد المشرقین تھا۔ یہاں شاہ اسمٰعیل دہلوی سے بھی قدرے بے احتیاطی ہوئی۔ انہوں نے شریعت سے نابلد لوگوں میں رہتے ہوئے رفع الیدین اور امین بالجہر شروع کر دی۔ پٹھانوں کے لئے یہ باتیں بالکل نئی تھیں۔

اس صورتِ حال سے سردارانِ پشاور نے فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے پٹھانوں کو سیّد صاحب کے خلاف کھڑا کر دیا۔ اس کے علاوہ وہ یار محمد خان کا انتقام بھی لینا چاہتے تھے۔ انہوں نے سیّد صاحب کے زیرِ اثر علاقے میں اپنے ایجنٹوں کے ذریعے بغاوت کروا دی اور ایک مقررہ رات میں سیّد صاحب کے مقرر کردہ عاملین عشر و زکوٰۃ، قضاۃ اور آئمہ کو قتل کر دیا۔ اس فعلِ شنیع سے سیّد صاحب کی تحریک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا اور وہ دل برداشتہ ہو کر ایک نئے مرکز کی تلاش میں کشمیر روانہ ہوئے۔

سیّد صاحب کشمیر جاتے ہوئے بالا کوٹ میں خیمہ زن تھے کہ ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو اچانک نمازِ فجر کے وقت سکھ فوج مقامی لوگوں کی راہنمائی میں وہاں پہنچ گئی۔ سکھوں نے پہاڑوں کی چوٹیوں سے مجاہدین پر گولہ باری شروع کر دی۔ اس کے بعد سکھوں اور مجاہدین کے مابین دست بدست جنگ ہوئی جس میں سیّد صاحب، شاہ اسمٰعیل دہلوی اور مجاہدین کی بڑی تعداد شہید ہو گئی۔ جو مجاہدین دریائے کنہار پار کرنے میں کامیاب ہو گئے انہوں نے چرکنڈ اور اسمت میں اپنے مراکز قائم کر لئے اور قیامِ پاکستان تک انگریزوں کے خلاف نبرد آزما رہے۔

سیّد احمد بریلوی کی سیاسی تحریک تو ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو بالا کوٹ میں ختم ہو گئی لیکن ان کا رُوحانی فیض ہنوز جاری ہے۔ سیّد صاحب کے مُریدوں میں میانجیو نور محمد

جھنجھانوی نے بڑا نام پیدا کیا۔ میانجیو کے خلفاء میں حافظ محمد ضامن، شیخ محمد تھانوی اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی بڑے نامور ہوئے۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے خلفاء میں سے مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ سے فیض عام ہوا۔ حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ کے خلفاء میں سے مفتی محمد حسن، ڈاکٹر عبدالحی عارفی، مولانا مسیح اللہ خان، مُفتی محمد شفیع، سیّد سلیمان ندوی، مولانا خیر محمد جالندھری، مولانا فقیر محمد پشاوری اور مولانا شاہ ابرار الحق حقی سے ایک عالم فیض یاب ہوا ہے۔ اسی طرح سیّد احمد بریلوی سے فیض پانے والوں میں مولانا عبداللہ غزنوی، شاہ عبدالرحیم ولایتی، محمد علی رام پُوری، مولانا ولائت علی عظیم آبادی اور مُفتی الٰہی بخش کاندھلوی قابلِ ذکر ہیں۔

سیّد صاحب اور ان کے رفقاء اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے آیندہ نسلوں کے لئے ایک مثال قائم کر گئے۔ ان کی قربانیاں رائیگاں نہیں گئیں۔ ۱۸۵۷ء میں برِّعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کے باشندے پہلے سے زیادہ تیاری کے ساتھ ملک کو قبضۂ اغیار سے آزاد کرانے کے لئے اُٹھے۔ ان کی قربانیاں بھی رائیگاں نہیں گئیں۔ اس کے بعد سرسیّد احمد خاں، مُحسن الملک، وقار الملک، مولانا محمد علی جوہر اور قائداعظم کی قیادت میں مسلمان پاکستان حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

باب (4)

فرائضی تحریک

برِعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش میں ۱۸۵۷ء کے بعد جتنی تحریکیں چلیں ان سب کا مقصد کھوئے ہوئے مسلم اقتدار کی بحالی، مسلمانوں میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کرنا، انہیں فضول رسموں، توہمات اور غلط معتقدات سے نجات دلانا، صحیح اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرنا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انگریزوں اور ہندوؤں کے سیاسی غلبے اور استحصال سے بچانا تھا۔ انہی مقاصد کے لئے ایک تحریک حاجی شریعت اللہ رحمتہ اللہ علیہ نے بنگال میں چلائی۔

حاجی شریعت اللہ ۱۷۸۱ء میں ضلع فرید پور کے مشہور قصبے بندر کھولا کے نواحی گاؤں شمائل میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محترم عبدالجلیل ایک غریب شخص تھے اس لئے وہ اپنے بیٹے کی ابتدائی تعلیم و تربیت کی جانب مطلق توجہ نہ دے سکے۔ حاجی صاحب ابھی بچے ہی تھے کہ ان کی والدہ محترمہ اس جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف کوچ کر گئیں۔ حاجی صاحب ابھی اس صدمے سے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ آٹھ سال کی عمر میں سایۂ پدری سے بھی محروم ہو گئے۔ حاجی صاحب کا ایک چچا عظیم الدین لاولد تھا، اس نے چار سال تک اپنے یتیم بھتیجے کی کفالت کی لیکن وہ بھی اپنی غربت اور افلاس کی بنا پر انہیں تعلیم نہ دلا سکا۔

ایک روز عظیم الدین نے کسی وجہ سے ان کی سرزنش کی تو موصوف اپنے چچا کے گھر سے فرار ہو کر کلکتہ پہنچ گئے۔ جہاں ان دنوں مولانا بشارت علی کے مدرسے کا بڑا شہرہ تھا۔ حاجی صاحب کو وہاں داخلہ مل گیا اور وہ دو سال تک مولانا بشارت علی کے مدرسے میں پڑھتے رہے۔ دو سال بعد نامعلوم وجوہات کی بنا پر حاجی صاحب ضلع ہگلی کے ایک قصبے فرفرہ کے ایک دینی مدرسے میں داخل ہو گئے۔ انہوں

نے یہاں بھی دو سال تعلیم حاصل کی اور پھر اپنے ایک چچا عاشق میاں کے پاس مرشد آباد چلے گئے۔ عاشق میاں عدالت میں ملازم تھے اور ان کی مالی حالت قدرے بہتر تھی۔ انہوں نے حاجی صاحب کی ایک سال تک کفالت کی۔

۱۷۹۹ء میں ان کے چچا اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ عید منانے کے لئے بذریعہ کشتی شمائل روانہ ہوئے۔ اس سفر میں حاجی صاحب بھی ان کے ہمراہ تھے۔ بدقسمتی سے اثنائے سفر کشتی ایک حادثے کا شکار ہو گئی اور عاشق میاں اپنے اہلِ خانہ سمیت دریا کی تند و تیز لہروں کی نذر ہو گئے۔ اتفاق سے حاجی صاحب اس حادثے میں بچ گئے لیکن ان کے ذہن پر اس حادثے کا بڑا اثر ہوا۔ حاجی صاحب چاروں جانب سے مایوس ہو کر دوبارہ مولانا بشارت علی کی خدمت میں پہنچ گئے۔

۱۷۹۹ء برِعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں کے لئے بڑا منحوس ثابت ہوا۔ اسی سال انگریزوں نے ٹیپو سلطان پر کامیابی حاصل کر کے دکن کی اسلامی ریاست "سلطنتِ خداداد میسور" دوبارہ ایک ہندو راجہ کے حوالے کر دی اور اسی سال لاہور پر شکرچکیہ مسل کے سردار رنجیت سنگھ نے قبضہ کر لیا۔ لاہور اور اس کے ماتحت علاقے میں بسنے والے مسلمانوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ میسور اور پنجاب دارالحرب بن گئے۔ (اس واقعہ کے چار سال بعد ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے دہلی فتح کر لی تو فقہاء کرام نے ہندوستان کے دارالحرب بن جانے کا فتویٰ صادر کر دیا)۔

سلطنتِ خداداد میسور اور پنجاب پر کافروں کے عمل دخل اور بنگال میں انگریزوں اور ہندوؤں کی روز افزوں چیرہ دستیوں سے تنگ آ کر مولانا بشارت علی نے ہجرت کی نیت سے حجازِ مقدس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ مولانا کا عزمِ ہجرت دیکھ کر حاجی شریعت اللہ بھی ان کے ساتھ جانے پر آمادہ ہو گئے۔

حاجی شریعت اللہ نے ۱۸۰۰ء سے لے کر ۱۸۲۰ء تک پورے بیس سال مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں گزارے۔ انہوں نے اس طویل عرصے میں حرمین شریفین کے جیّد علماء سے استفادہ کیا اور شیخ طاہر سنبل کے دستِ حق پرست پر قادریہ سلسلے میں بیعت کر کے سلوک کی منازل طے کیں اور وہ خود ایک جیّد عالم اور شیخِ طریقت بن گئے۔

۱۸۲۰ء میں حاجی شریعت اللہ نے اپنے وطن واپس جا کر وہاں کے عوام کی رشد و ہدایت کا عزم ظاہر کیا اور موصوف بذریعہ جہاز کلکتہ روانہ ہوئے ۔ اس وقت ہندوستان میں اسلامی علوم و معارف کے دو بڑے چراغ ، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م ۱۸۲۳ء) اور حضرت شاہ غلام علی دہلوی (م ۱۸۲۴ء) بجھنے سے پہلے آخری ٹمٹماہٹ دکھا رہے تھے اور سید احمد بریلوی اپنے رفقاء کے ساتھ جہاد کی تیاری میں معروف تھے ۔

حاجی صاحب کی ہندوستان سے بیس سالہ غیر حاضری کے دوران انگریزوں کی سیاسی گرفت پہلے کی نسبت کہیں زیادہ مضبوط ہو چکی تھی اور وہ خلیج بنگال سے لے کر دریائے ستلج تک اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے ۔ اس زمانے میں یورپ میں نیل کی بڑی مانگ تھی اس لئے انگریزوں نے نیل کی کاشت اور برآمد میں بڑی دلچسپی لی اور اس صنعت میں بڑا سرمایہ لگایا اور اس پر خوب منافع کمایا لیکن نیل کاشت کرنے والے غریب مسلم کاشتکاروں کی مالی حالت بہتر بنانے کی جانب مطلق توجہ نہ دی۔ دوسری جانب ہندو سرمایہ دار بھی نیل کی کاشت میں دلچسپی لینے لگے اور وہ پیداوار بڑھانے کی خاطر غریب مسلمان کاشتکاروں پر ظلم ڈھانے لگے ۔ ہندوؤں کے زیرِ اثر مسلمان ہندوانہ رسم و رواج اپنانے لگے اور وہ اسلام کی بنیادی تعلیمات بھی فراموش کر بیٹھے ۔ مسلمان ہندوؤں کے مقروض تھے اور ان کی زمینیں ، مکانات حتیٰ کہ بیویاں اور بیٹیاں بھی ہندوؤں کے گھروں میں بطورِ رہن رہ رہی تھیں ۔

حاجی شریعت اللہ بیس سال بعد شمائل آئے تو اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا ۔ شمائل کی آبادی کے ایک سرے پر مسجد تھی لیکن انہیں وہاں انہیں کوئی نمازی نظر نہ آیا ۔ مسجد میں نہ وضو کے لئے پانی کا انتظام تھا اور نہ ہی جلانے کے لئے چراغ ۔ خدا معلوم یہ مسجد کب سے بے چراغ پڑی تھی ۔ حاجی صاحب نے سورج غروب ہوتے ہی نمازِ مغرب کے لئے اذان دی تو گاؤں سے کوئی شخص نماز ادا کرنے کے لئے مسجد میں نہ آیا ۔ انہوں نے اکیلے ہی نماز ادا کی اور بنگالی مسلمانوں کی اصلاح کا عزم بالجزم کیا ۔ بالفاظِ دگر حاجی صاحب نے اسی وقت اسی بے چراغ مسجد میں اپنی اصلاحی تحریک کی بنیاد رکھ دی ۔

حاجی صاحب ایک جید عالم اور خدا رسیدہ بزرگ تھے ۔ اس لئے گاؤں کے

لوگ ان کا دل و جان سے احترام کرتے اور ان کی باتیں بڑے غور سے سنتے تھے ۔ حاجی صاحب نے انہیں بتایا کہ ان کی تباہی اور تمام مشکلات کا سبب ان کی دین سے دوری ہے اس لئے انہیں چاہیے کہ اپنی دینی اور دنیاوی فلاح کے لئے اسلام کی تعلیم پر زور دیں اور ہر قسم کی غیر اسلامی رسموں سے اجتناب کریں ۔ حاجی صاحب نے چونکہ اسلامی فرائض پر سب سے زیادہ زور دیا اس لئے ان کی اصلاحی تحریک عوام میں فرائضی تحریک کے نام سے مشہور ہو گئی ۔

جس زمانے میں حاجی صاحب نے بنگال میں اپنی اصلاحی تحریک کا آغاز کیا قریب قریب اسی زمانے میں سید احمد بریلویؒ نے اپنے رفقاء شاہ اسمٰعیل دہلویؒ اور مولانا عبدالحی بڈھانویؒ کے ساتھ مل کر موجودہ صوبہ سرحد میں اسی طرح کی اصلاحی تحریک شروع کی ۔ اس طرح کی اصلاحی تحریک چلانا کوئی آسان کام نہیں ہے ۔ جب کوئی مصلح غلط رسموں اور توہمات کے خلاف آواز بلند کرتا ہے تو روائت پرست حلقے اور ان رسموں کے سہارے اپنا پیٹ بھرنے والے نام نہاد علماء ، اس کی مخالفت پر تل جاتے ہیں ۔ چنانچہ بنگال میں حاجی شریعت اللہ اور صوبہ سرحد میں سید احمد بریلوی کے خلاف ایسے ہی روائت پرست مولویوں نے شورش برپا کر دی ۔ سید احمد بریلوی کی تحریک تو روائت پرستوں کے ہاتھوں ختم ہو گئی لیکن حاجی شریعت اللہ سب و شتم کے باوجود اپنی دعوت لے کر آگے بڑھتے گئے ۔ حاجی صاحب کی اصلاحی تحریک کے سولہ نکات تھے جنہیں ان کی تعلیمات کا خلاصہ کہہ سکتے ہیں:

۱ ۔ اللہ تعالیٰ کو وحدہ لاشریک مانو ۔ اسی کی ذات پر بھروسہ کرو اور اس کی ذات اور صفات میں کسی کو شریک نہ کرو ۔

۲ ۔ احکام شریعت میں ڈھیل روا نہ رکھو ۔ اسلامی تعلیمات پر سختی کے ساتھ عمل کرو اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دو ۔

۳ ۔ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اس لئے مشکل وقت میں ایک دوسرے کی مدد کرو ۔

۴ ۔ ذات پات کی تقسیم اسلامی تعلیمات کی روح کے منافی ہے ۔ لہذا ذات اور برادری

کے بندھن توڑ کر یک جان ہو جاؤ۔

۵۔ اپنے آپس کے جھگڑے پنچائت کے ذریعے فیصل کراؤ اور انہیں لے کر انگریزوں کی قائم کردہ عدالتوں میں نہ جاؤ۔ وہاں تمہیں ہندو وکلا کو فیس بھی ادا کرنا پڑے گی اور مقدمے لڑتے لڑتے مالی اعتبار سے کمزور ہو جاؤ گے۔

۶۔ بیاہ شادی کی رسم بہت ہی سادگی کے ساتھ ادا کرو اور ایسے مواقع پر ہندوؤں سے رقوم قرض لے کر صرف نہ کرو۔

۷۔ بچے کی ولادت پر بے جا اور غیر اسلامی رسمیں بند کر دو۔

۸۔ اگر کسی کے ہاں مرگ ہو جائے تو اسلامی طریقے کے مطابق اس کی تجہیز و تکفین کرو اور تدفین کے بعد تمام رسمیں مثلاً سوئم، دسواں، بیسواں، چہلم، ششماہی اور برسی، جو ہندوؤں سے سود پر رقم قرض لے کر کرتے ہو، بالکل ختم کر دو۔

۹۔ ہندوؤں کے تہواروں اور میلوں ٹھیلوں میں چونکہ بت پرستی اور مشرکانہ رسمیں ہوتی ہیں اس لئے ان میں شرکت کرنا بند کر دو۔

۱۰۔ اولیائے اللہ کے مزاروں پر عرس اور میلے لگانے بند کر دو اور وہاں گانے بجانے، دھمالیں ڈالنے، رقص اور طوائفوں کے مجرے بند کر دو۔

۱۱۔ سادہ لباس استعمال کرو۔ ایک لنگی، کرتے اور ٹوپی پر اکتفا کرو اور لباس کے معاملے میں ہندوؤں کی تقلید سے بچو۔

۱۲۔ حضرت خضر کے نام کے بیڑے بنا کر دریاؤں میں بہانے کی رسم ختم کر دو۔

۱۳۔ کم علم مولوی کی صحبت کو اپنے لئے زہر قاتل سمجھو۔

۱۴۔ ذبیحۂ بقر اسلامی شعار ہے۔ اسے ضرور ادا کرو اور کم از کم عید الاضحیٰ کے موقع پر گائے کی قربانی ضرور دو۔

۱۵۔ ہندو زمیندار مسلمان کاشتکاروں سے دسہرہ، دیوالی، کالی پوجا، درگا پوجا، رتھ یاترا، رام نومی اور جنم اشٹمی جیسے ہندو تہواروں کے موقعوں پر جبراً ٹیکس وصول کرتے ہیں۔ ان تہواروں کے مواقع پر بتوں کی آرائش اور پوجا کی جاتی ہے، لہٰذا مسلمان ایسے ٹیکس ادا کرنے فوراً بند کر دیں۔

۱۶۔ ہندوؤں کے ساتھ میل جول سے مسلمانوں نے جو عقائد اور توہمات اپنائے ہیں،

انہیں ترک کر دیں۔

حاجی شریعت اللہ بنگال کے پہلے مبلغ ہیں جنہوں نے غلط عقائد و توہمات کے خلاف آواز بلند کی اور فرائض کی بجا آوری پر زور دیا۔ موصوف قادری سلسلے میں بیعت لیا کرتے تھے۔ وہ اپنے مریدوں سے گزشتہ برے اعمال سے توبہ کرواتے اور آئندہ نیک زندگی بسر کرنے کی تلقین فرماتے۔ حاجی صاحب خدا ترسی اور نیکو کاری پر بڑا زور دیا کرتے تھے۔

حاجی صاحب کی سعی جمیلہ بار آور ہوئیں اور ان کی زندگی میں ہی اضلاع ڈھاکہ، فرید پور، باقر گنج، میمن سنگھ، کومیلا، نواکھالی، باریسال اور کھلنا کی آبادی کا 1/6 حصہ ان کے حلقہ مریدین میں شامل ہو گیا۔ حاجی صاحب کے مریدوں نے ہندوؤں کو مشرکانہ رسوم کی ادائیگی کے لئے ٹیکس دینے بند کر دیئے اور بیگار دینی ختم کر دی۔ مسلمانوں کی جو بہو بیٹیاں ہندوؤں کے گھروں میں کام کرتی تھیں انہوں نے حاجی صاحب کے ترغیب دلانے پر کام چھوڑ دیا۔ بعض جوشیلے مسلمانوں نے کئی مقامات پر دیوی دیوتاؤں کے بت توڑ ڈالے۔ حاجی صاحب کی تعلیمات نے مسلمانوں میں عام بیداری پیدا کر دی۔

بنگالی مسلمانوں میں بیداری پیدا ہوئی تو انہوں نے اپنے جائز حقوق کے حصول کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ اس سے نیل کے انگریز تاجروں اور ہندو زمینداروں کے مفادات خطرے میں پڑ گئے اور انہوں نے فرائضیوں کے خلاف اپنی مہم کا آغاز کر دیا۔ انہوں نے حاجی صاحب پر یہ الزام لگایا کہ وہ اپنے مریدوں کے ذریعے حکومت کے خلاف بغاوت کرانا چاہتے ہیں۔ اتفاق سے اسی زمانے میں سید احمد بریلوی اپنے مریدوں کے ساتھ سکھوں کے خلاف مصروف جہاد تھے اس لئے انگریز زیادہ محتاط ہو گئے اور وہ بات بات پر حاجی صاحب سے الجھنے لگے۔

۱۸۳۱ء میں حاجی شریعت اللہ نے یہ فتویٰ صادر کیا کہ بنگال میں مسلمانوں کا مال، جان اور آبرو محفوظ نہیں رہے اور مظالم کی انتہا ہو گئی ہے۔ ان حالات میں بنگال دارالحرب بن گیا ہے اور یہاں جمعہ اور عیدین کا وجوب ساقط ہو گیا ہے۔

انگریزوں نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر بنگالی مسلمانوں میں بیداری کی

اس لہر کو دبانا چاہا۔ انہوں نے سرکردہ فرائضیوں کو گرفتار کر لیا اور انہیں جرمانے اور قید کی سزائیں دیں۔ ان سختیوں کے باوجود انگریز فرائضیوں کے دینی جذبات کو نہ دبا سکے۔ جب وہ قید کاٹ کر یا جرمانہ ادا کر کے واپس آتے تو ایک نئے ولولے کے ساتھ اپنے کام کو آگے بڑھاتے۔

ان حالات میں انگریزوں نے حاجی شریعت اللہ کی نگرانی شروع کر دی۔ انگریز ان پر یہ الزام لگاتے کہ وہ اپنے مریدوں کو سرکاری واجبات ادا کرنے سے روکتے ہیں لیکن ہر بار عدم ثبوت کی بنا پر موصوف عدالت سے رہا ہو جاتے۔ دن رات کی بھاگ دوڑ اور کثرت کار نے حاجی صاحب کی صحت پر بڑا اثر ڈالا اور وہ ۱۸۴۰ء میں صرف ۵۹ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ رحمۃ اللہ علیہ کثیراً واسعاً۔ حاجی صاحب کا جسدِ خاکی ان کے گھر میں دفن کیا گیا لیکن جلد ہی دریائے پدما کی ایک شاخ اریال خان ان کی قبر بہا لے گئی۔ اتفاق سے ان کی قبر کا کتبہ محفوظ رہ گیا اور وہ اب ڈھاکہ کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔

حاجی شریعت اللہ کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ انہوں نے مظلوم طبقوں میں اپنے حقوق کے لئے لڑنے کا حوصلہ پیدا کیا اور ذات برادری کی تقسیم ختم کر کے اُخوت اور مساوات کا جذبہ پیدا کیا۔ انہوں نے عوام میں اسلام کے ساتھ فریفتگی پیدا کی اور وہ دین کی خاطر جان قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

حاجی شریعت اللہ کی وفات کے بعد فرائضیوں نے ان کے فرزند محسن الدین احمد المعروف بہ دادو میاں کو ان کا جانشین منتخب کیا۔ اس وقت ان کی عمر اکیس برس تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنے عظیم والد کے کام کو آگے بڑھایا۔ دادو میاں نے بنگال کے طول و عرض میں اپنے خلفاء پھیلا دیئے۔ وہ فرائضیوں کے باہمی جھگڑے چکاتے اور مقامی ہندو زمینداروں کے ظلم و تشدد کی اطلاعات مرکز کو پہنچاتے۔

دادو میاں نے مرکز میں ایک بیت المال قائم کیا اور اپنے مریدوں سے کہا کہ وہ روزانہ ایک مٹھی چاول ایک خاص برتن میں ڈال دیا کریں۔ ہفتے عشرے کے بعد ان کا ایک کارندہ جا کر چاول اکٹھے کر لاتا۔ مرکز کے علاوہ اہم مقامات پر بیت المال کی جانب سے لنگر جاری کئے گئے جہاں مسافروں، ناداروں اور مستحقین کو مفت کھانا

فراہم کیا جاتا تھا۔

دادو میاں نے اپنے مریدوں میں حوصلہ پیدا کرنے کی خاطر انہیں فوجی تربیت دینا شروع کی اور انہوں نے اپنے مریدوں کو حکم دیا کہ جہاں جہاں ان پر ہندو زمیندار ظلم کر رہے ہیں وہاں سے ترکِ سکونت کر کے انگریزی مقبوضہ خاص محل میں جا بسیں۔ ہندوؤں کے زیرِ اثر علاقوں سے ان کے مریدین ہجرت کر کے خاص محل میں جا بسے تو ہندو زمینداروں کو مسلمان کاشتکار ملنا بند ہو گئے اور ان کی نیل کی کاشت خطرے میں پڑ گئی۔ انہوں نے مسلمان کاشتکاروں پر ظلم کی انتہا کر دی۔ وہ انہیں باندھ کر ان کی ناک میں مرچیں چڑھاتے، ان پر کوڑے برساتے، ان کے ننگے جسم پر چیونٹیاں، دیمک اور زہریلے کیڑے چھوڑتے اور انہیں سینے تک زمین میں گاڑھ کر ان کے ارد گرد بدبو دار کوڑا پھینک دیتے۔ ہندوؤں نے مسلمان کاشتکاروں پر داڑھی ٹیکس لگا دیا۔ اس کے باوجود فرائضیوں کے عزم اور جذبے میں کوئی فرق نہ آیا۔

دادو میاں نے بہادر پور میں اپنا مرکز قائم کیا اور ۸۰۰۰۰ افراد کو اپنے حلقہ مریدین میں شامل کر لیا۔ جب ۱۸۵۷ء میں جنگِ آزادی کا آغاز ہوا تو انگریز حکام نے حفظ ماتقدم کے طور پر دادو میاں کو دو سال کے لئے نظر بند کر دیا۔ ۱۸۵۹ء میں جب وہ قید سے رہا ہوئے تو ان کی صحت خراب ہو چکی تھی اور ان کے قویٰ جواب دے چکے تھے۔ ۲۴ ستمبر ۱۸۶۲ء کو دادو میاں انتقال کر گئے۔ ان کی عمر اس وقت ۴۲ برس تھی۔

دادو میاں کی وفات کے بعد ان کے بڑے فرزند غیاث الدین احمد نے فرائضیوں کی قیادت سنبھالی لیکن دو سال بعد ہی عین جوانی کے عالم میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بھائی عبدالغفور عرف نیا میاں فرائضیوں کے قائد چنے گئے۔ ان کے زمانے میں ہندو بلوائیوں نے بہادر پور پر حملہ کر کے ان کا مرکز اور رہائشی مکان مسمار کر دیئے۔ ان ناموافق حالات کے باوجود نیا میاں نے اپنے بزرگوں کے مشن کو جاری رکھا۔ نیا میاں نے ۱۸۸۴ء میں وفات پائی تو ان کی جگہ ان کے بھائی سعید الدین احمد فرائضیوں کے قائد مقرر ہوئے۔ ان کے زمانے میں حالات بہت حد تک تبدیل ہو چکے تھے اور انگریز قانون کے مطابق حکومت چلانے لگے تھے۔

سعید الدین احمد بڑے سخی رحمدل اور عالم تھے۔ ان کے ڈھاکہ کے

نواب سر سلیم اللہ خان کے ساتھ بڑے خوشگوار تعلقات تھے ۔ تقسیم بنگال کے موقع پر انہوں نے نواب صاحب کے موقف کی پُرزور حمایت کی تھی ۔ سعید الدین احمد کا انتقال ۱۹۰۶ء میں ہوا ۔ یہ وہی سال ہے جس میں شملہ وفد وائسرائے لارڈ منٹو سے ملا اور اس ملاقات کے دو ماہ بعد ڈھاکہ میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی ۔

سعید الدین احمد کی وفات کے بعد رشید الدین احمد عرف بادشاہ میاں نے فرائضیوں کی قیادت سنبھالی ۔ ان کے زمانے میں مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق ملا ، مسجد کانپور کی شہادت کا سانحہ پیش آیا ، جنگ عظیم اول شروع ہوئی ، میثاق لکھنؤ ہوا اور جلیانوالہ باغ کا حادثہ پیش آیا ۔ جب تحریک خلافت شروع ہوئی تو بادشاہ میاں اپنے مریدوں سمیت اس تحریک میں شامل ہو گئے ۔ بادشاہ میاں نے بنگالی مسلمانوں میں اپنے سیاسی اور معاشی حقوق کے لئے لڑنے کا حوصلہ پیدا کیا ۔ ان کا انتقال ۳ ستمبر ۱۹۵۹ء کو ہوا ۔

ہماری یہ دیانتدارانہ رائے ہے کہ مسلم لیگ کی بنیاد کسی اور شہر کی بجائے ڈھاکہ میں اس لئے رکھی گئی کہ فرائضی ایک طویل جدوجہد کے ذریعے بنگالی مسلمانوں میں دینی جذبہ اور سیاسی بیداری پیدا کر چکے تھے اور وہاں مسلمانوں کی ایک سیاسی تنظیم قائم کرنے کے لئے زمین ہموار ہو چکی تھی ۔

باب (5)

دو قومی نظریہ

قائداعظم محمد علی جناح نے کیا خوب فرمایا تھا کہ برّعظیم پاک و ہند میں جس روز پہلا غیر مسلم مشرف باسلام ہوا تھا ، اسی روز پاکستان کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی ۔ بظاہر یہ ایک چھوٹا سا فقرہ ہے لیکن اس کے اندر ایک قلزم سمٹا ہوا ہے ۔ کہنے کو تو اس غیر مسلم نے صرف لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہا تھا ، لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے جسم و جان میں ایک عظیم انقلاب برپا ہو گیا ۔ اس کی زندگی اور سوچ کا دھارا بدل گیا ۔ اس کی تاریخ بدل گئی اور اس کے ساتھ ہی اس کا جغرافیہ بھی تبدیل ہو گیا ۔ اس کے ہاں عبادت اور طہارت کا تصور بدل گیا ۔ اس کے لباس اور شکل و شباہت میں نمایاں تبدیلی آ گئی ۔ اس کا رسم الخط ، طرز زندگی اور طرز تعمیر بھی اسلام سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے ۔ بلکہ یہ کہنا بالکل بجا ہو گا کہ اس کی بے مقصد زندگی با مقصد بن گئی ۔ اب وہ حضرت ابراہیم علیٰ نبینا و علیہ السلام کے الفاظ میں ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العلمین پر کار بند ہو گیا ۔

طریقِ عبادت میں تبدیلی:

قبول اسلام سے قبل وہ لاتعداد دیوی دیوتاؤں کے علاوہ سانپ ، بندر اور گائے جیسے جانوروں ، پیپل ، برگد اور تلسی جیسے سایہ دار اور کار آمد پیڑوں ، چیچک جیسی خوفناک بیماریوں ، گنگا ، جمنا ، بھاگیرتی اور سرسوتی جیسے پہاڑوں سے زرخیز مٹی بہا کر لانے والے دریاؤں اور آگ جیسے جلا کر بھسم کر دینے والے عناصر کی عبادت کیا کرتا تھا ۔ قبول اسلام کے بعد وہ ان تمام خود ساختہ معبودوں سے بیزاری کا اظہار کر کے خدائے وحدہٗ لاشریک کی عبادت میں لگ گیا ۔ اس کی عبادت گاہ مندر کی بجائے مسجد ہو

گئی اور اس کے قبلہ کا رُخ متعین ہو گیا۔

طہارت کے تصور میں تبدیلی:

اسلام قبول کرتے ہی اس کے نزدیک طہارت کا تصور بدل گیا۔ پہلے اگر کنویں میں کوئی جانور گر کر مر جاتا تو وہ اس جانور کو باہر نکال کر کنویں کے پانی کو پاک کرنے کی غرض سے اس میں گائے کا پیشاب ڈال دیتا تھا۔ ہندو عورتیں حیض و نفاس سے پاک ہونے کے لئے نہاتے وقت اپنے سر اور جسم پر گائے کا پیشاب ڈالتی تھیں۔ ہندوؤں کی رسوئی (باورچی خانہ) میں اگر کسی غیر ہندو کا قدم پڑ جاتا تو جب تک وہاں گائے کے گوبر سے لیپ نہ دے لیتے اس وقت تک رسوئی کو ناپاک سمجھتے تھے۔ غیر مسلم استنجا اور طہارت کے مسائل اور تصور سے ناآشنا تھا۔ اس کی دھوتی یا لنگوٹی پیشاب میں بسی ہوئی ہوتی تھی۔ مسلمان ہونے کے بعد اس کی سوچ کا دھارا بدلا تو وہ گائے کے گوبر اور پیشاب کو ناپاک سمجھنے لگا۔ اب اگر اس کے کپڑوں پر گائے کے پیشاب کے چند چھینٹے پڑ جائیں تو جب تک وہ انہیں تین بار دھو کر پاک نہ کر لے اس وقت تک اس کی رُوح کو چین نہیں آتا۔ اب وہ مسنون طریقے کے مطابق طہارت کرنے لگا۔ اسے غسل جنابت اور وضو جیسی نعمتیں مل گئیں جو باری تعالیٰ نے اُمتِ مسلمہ کے علاوہ اور کسی اُمت کو عطا نہیں کیں۔

تاریخ میں تبدیلی:

جس وقت ایک ہندو مشرف باسلام ہوتا ہے تو اس کی تاریخ بدل جاتی ہے۔ پہلے وہ رام چندر، کوشلیا، لکشمن، کرشن کنہیا، رادھا، سروَن، پرتھوی راج، رانا پرتاپ، شیواجی، دیانند سرسوتی، گاندھی جی، جواہر لعل نہرو، ولبھ بھائی پٹیل اور مدن موہن مالوی کو اپنا ہیرو مانتا تھا اور ان کے کارناموں کا ذکر بڑے فخریہ پیرائے میں کیا کرتا تھا۔ قبولِ اسلام کے بعد وہ ان کا ذکر کرتے ہوئے کراہت اور استہزا کا اظہار کرتا ہے۔ اب حضرت عمر فاروقؓ، علی المرتضیٰؓ، خالد سیف اللہؓ، محمد بن قاسمؒ، محمود غزنویؒ، محمد غوری، صلاح الدین ایوبیؒ، اورنگ زیب عالمگیرؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، علامہ اقبالؒ،

قائداعظمؒ اور سردار عبدالرب نشترؒ اس کے ہیرو بن جاتے ہیں اور ان کے کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے وہ بڑے فخر کے ساتھ اپنا سر اونچا کرتا ہے۔ قبولِ اسلام سے قبل اس کے جو ہیرو تھے، قبولِ اسلام کے بعد وہ اس کے نزدیک وِلن (Villain) بن گئے اور جنہیں وہ پہلے وِلن سمجھتا تھا اب وہ اس کے ہیرو بن گئے۔

جغرافیے میں تبدیلی:

قبولِ اسلام کے بعد تاریخ کی طرح اس کا جغرافیہ بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ پہلے اس کی عقیدت کے مرکز پریاگ، بنارس، اَیودھیا، دوارکا، امر ناتھ جی، رشی کیش، لچھمن جھولا، کورو کشیتر، ہردوار اور متھرا تھے۔ اب وہ ان سے بیزار ہو کر مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، بغداد، نجف، کربلا، اجمیر، پاک پتن اور سرہند شریف کے ساتھ اپنا رشتہ استوار کرتا ہے۔ گنگا و جمنا کی جگہ دجلہ اور فرات لے لیتے ہیں۔ اَمرت کنڈ اور رشی کنڈ کی جگہ کوثر و تسنیم کو مل جاتی ہے۔

لباس میں تبدیلی:

مسلمان ہوتے ہی اس کا لباس بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ لنگوٹی، لانگڑ، دھوتی اور ساڑھی کی جگہ قمیض، شلوار، پاجامہ اور تہبند لے لیتے ہیں۔ وہ لکڑی کی کھڑاویں اتار کر چمڑے کا جوتا پہن لیتا ہے۔ اب اسے موزہ پہننے کا سلیقہ بھی آ جاتا ہے۔ اس کے سر پر عمامہ یا ٹوپی، بدن پر اچکن، شیروانی یا جُبّہ اور کندھے پر رُومال نظر آنے لگتے ہیں۔ اب وہ ایسا لباس پہننے لگا ہے جس سے اس کا ستر مکمل طور پر چھپ جاتا ہے، بالفاظِ دیگر اسے کپڑے پہنے اور پہننے کا سلیقہ آ جاتا ہے۔

کھانے پینے کے طریقے میں تبدیلی:

قبولِ اسلام سے پہلے وہ پتوں میں کھانا کھاتا، پیالی کی جگہ دُونہ استعمال کرتا اور اُوک سے پانی پیتا تھا۔ کبھی کبھی وہ برتن میں پانی ڈال کر ہونٹوں سے ذرا فاصلہ رکھ کر اسے اپنے حلق میں انڈیل لیتا تھا۔ اب وہ برتنوں میں کھانا کھانے اور گلاس میں پانی پینے کا سلیقہ سیکھ گیا۔ اب وہ جُوٹھ اور چھوت چھات کا قائل نہیں رہا۔ اب وہ محفل میں بیٹھ کر، مل جل کر کھانا کھانے میں مسرت محسوس کرنے لگا۔

غذا میں تبدیلی:

قبول اسلام کے ساتھ ہی اس کی خوراک میں بھی نمایاں تبدیلی آ جاتی ہے ۔ اب وہ دال ، بھجی ، بھنکا ، خشکہ ، پلاؤ ، پوری ، کچوری ، دہی بڑے ، پکوڑے اور کھیر کی بجائے قورمہ ، پلاؤ ، بریانی ، قلیہ ، مرغ مسلم ، کباب ، مچھلی ، نرگسی کوفتے ، زردہ ، متنجن ، فرنی ، تافتان ، شیر مال اور رومی نان استعمال کرنے لگتا ہے ۔ پہلے وہ لہسن اور پیاز کھانے سے مکمل پرہیز کرتا تھا اور اب یہ دونوں چیزیں اس کی خوراک کا جزو بن جاتی ہیں۔

طرزِ تعمیر میں تبدیلی:

قبول اسلام کے ساتھ ہی طرزِ تعمیر میں بھی نمایاں طور پر تبدیلی آجاتی ہے۔ اب وہ تنگ و تاریک کوٹھریوں والے مکانوں کی بجائے وسیع دالانوں اور کشادہ برآمدوں والے مکانوں میں رہنا پسند کرتا ہے ۔ اسی طرح تنگ و تاریک مندروں کی بجائے کشادہ دالانوں اور وسیع و عریض صحنوں والی مسجدیں تعمیر کرنے لگتا ہے ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر محمد مجیب مرحوم کے بقول کسی قوم کا فن تعمیر اس کے ذہن اور مزاج کی صحیح عکاسی کرتا ہے ۔ مساجد کے کھلے صحن مسلمانوں کی وسعت قلب اور بلند و بالا مینارے ان کے بلند حوصلوں کی غمازی کرتے ہیں ۔ دہلی میں قطب مینار اور طلائی مینار وہی قوم تعمیر کر سکتی ہے جس کا عزم و حوصلہ بھی اتنا ہی بلند ہو اور جامع مسجد دہلی ، شاہجہانی مسجد ٹھٹھہ اور بادشاہی مسجد لاہور کے کشادہ صحن وہی قوم تعمیر کر سکتی ہے جس کا دل بھی اتنا ہی کشادہ ہو ۔ ہندوؤں کے تنگ و تاریک مندر ان کے دلوں کی طرح تنگ و تاریک ہوتے ہیں ۔

جزاء و سزا کے تصور میں تبدیلی:

قبول اسلام کے ساتھ ہی مبداء و معاد اور جزاء و سزا کا تصور تبدیل ہو جاتا ہے ۔ پہلے اس کا یہ عقیدہ تھا کہ جب کوئی نیک آدمی فوت ہو جاتا ہے تو اس کی رُوح اسی وقت دوبارہ انسانی قالب میں آ جاتی ہے اور جب کوئی بدکردار انسان فوت ہوتا ہے تو اس کی رُوح کسی جانور کی شکل میں دوبارہ دنیا میں آ جاتی ہے ۔ وہ جانور ، انسانوں کے ہاتھوں بڑی تکلیفیں اُٹھاتا ہے اور یوں وہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرتا ہے ۔

مسلمان ہوتے ہی وہ آواگون یا تناسخ کے اس چکر سے نکل کر حشر و نشر اور عقبیٰ کا قائل ہو جاتا ہے ۔ اب یہ بات اس کے عقیدے کی اساس بن جاتی ہے کہ مرنے کے بعد وہ قیامت کے دن دوبارہ زندہ کیا جائے گا ۔ اس کی نیکیاں اور بدیاں میزان میں تولی جائیں گی ۔ وہ اب خوب جانتا ہے:

فاما من ثقلت موازینہ فھو فی عیشۃ راضیہ واما من خفت موازینہ فامہ ھاویہ ○

اب مرنے کے بعد اسے چتا میں نہیں جلایا جائے گا ۔ اب اس کا قریبی رشتہ دار یا "سعادت مند" بیٹا چتا میں جلتے ہوئے اس کے سر پر ڈنڈا نہیں مارے گا ۔ اب اسے پُورے احترام و تعظیم کے ساتھ مسنون طریقے سے نہلا دھلا کر ، کفن پہنا کر اور خوشبو لگا کر لحد میں قبلہ رُو لٹا دیا جائے گا ۔ ہندو کی میت جلا کر اس کی راکھ دریائے گنگا میں بہا دی جاتی ہے اور گنگا کی تیز و تند موجیں اسے بہا کر سرزمین ہند سے دور خلیج بنگال میں لے جاتی ہیں ۔ مسلمان مرنے کے بعد اسی ملک کی مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے ۔ ہم یہ کہتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں کہ پاک و ہند اور بنگلہ دیش کی دھرتی مسلمانوں کے اجسام سے تیار ہوئی ہے ۔ اس نے اس سرزمین پر مسلمانوں کا حق مقدم ہے ۔ ہندو مر کر اور جل کر لُونا چماری اور کلوا بیر کی طرح بھوت اور بد رُوح کی شکل اختیار کرکے مخلوقِ خدا کو ستاتا پھرتا ہے اور مرنے کے بعد مسلمان کا مزار بن جاتا ہے ۔ جس کی زیارت سے آنکھوں کو ٹھنڈک ، دل کو سرور اور رُوح کو تسکین ملتی ہے ۔ مرنے کے بعد بھی نیک بندوں کا فیض منقطع نہیں ہوتا ۔ اولیاء اللہ کے مزارات اس پر دال ہیں ۔

سُوچ میں تبدیلی:

مسلمان ہونے کے ساتھ ہی سُوچ کا دھارا بدل جاتا ہے ۔ پہلے وہ صرف اپنی ذات کے بارے میں سوچتا تھا ۔ زیادہ ہوا تو اپنی ذات اور گوت کے افراد کے بارے میں بھی سوچ لیتا تھا ۔ اب اس کی سُوچ آفاقی ہو جاتی ہے ۔ اب وہ تمام انسانوں کو خدا کا کنبہ سمجھنے لگتا ہے ۔ اسے الخلق عیال اللہ کی سمجھ آ جاتی ہے ، وہ ذات پات کے

بندھنوں کو توڑ کر نسلی امتیازات اور طبقاتی تقسیم ختم کر دیتا ہے ۔ مسلمان ہونے کے بعد وہ سلمانؓ بن اسلام اور عبید اللہ بن اسلام کہلانے میں فخر محسوس کرنے لگتا ہے ۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کیا خوب فرمایا تھا:

نحن قوم اعزنا اللہ بالا سلام

(ہم وہ قوم ہیں جسے اللہ نے اسلام کی وجہ سے عزت عطاء کی ہے)۔

قبول اسلام کے ساتھ ہی اُونچ نیچ کے بُت پاش پاش ہو جاتے ہیں ۔ حضرت بلال ، سلمان فارسی ، سالم مولیٰ ابُو حذیفہ اور نافع مولیٰ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم اکابرینِ قریش کے دوش بدوش کھڑے نظر آتے ہیں ۔ حضرت جعفرِ طیارؓ اور سیف اللہ خالدؓ بن ولید جیسے بزرگ صحابی حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کمان میں لڑنے کے لئے روانہ ہوتے ہیں ۔ ہندو[illegible] کی تاریخ ایسی مثالیں پیش کرنے سے قاصر ہے کہ کسی ادنیٰ ذات کے فرد کی زیرِ کمان اعلیٰ نسل کے برہمن یا کھشتری میدان میں لڑنے کے لئے نکلے ہوں ۔ ہندو مت دنیا کا واحد دین ہے جس میں اگر نیچ ذات کا شخص اعلیٰ ذات کے فرد کو چھُو لے یا اس کا سایہ کسی برہمن [illegible] جائے تو اعلیٰ ذات کے فرد پر نہانا اور کپڑے دُھونے فرض ہو جاتے ہیں ۔ انسان کو انسان سے کتنی زیادہ نفرت کا سبق پڑھایا گیا ہے ۔ ہمارے ہاں بسا اوقات غلام ابن غلام قدرو منزلت میں امراء پر سبقت لے جاتے ہیں ۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی تصنیفِ دلپذیر " غلامانِ اسلام " میں ایسی درجنوں مثالیں موجود ہیں ۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے صاحبِ سطوت خلیفہ حضرت بلال حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو " یا سیّدی بلال " کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے ۔

ذرا ملاحظہ فرمایئے کہ ایک غیر مسلم نے صرف کلمہ طیبّہ پڑھا تھا لیکن اس ایک کلمے نے اس کے اندر کتنا عظیم انقلاب برپا کر دیا ۔ اس ایک فقرے نے اس کی سُوچ و فکر تبدیل کر دی اور اس کی بے مقصد زندگی کو بامقصد بنا دیا ۔ پہلے وہ صرف اپنے لئے جیتا تھا ، اب دوسروں کے لئے جینے کا گُر سیکھ گیا جب اس نے لا الٰہ الا اللہ کہا تو اس کا مقصدِ حیات متعیّن ہو گیا اور اس کا مرنا ، جینا اللہ کے لئے ہو گیا اور جب اس نے محمد رسول اللہ کہا تو اس نے اپنا طرزِ زندگی متعیّن کر لیا اور اس نے یہ

عہد کیا کہ اب وہ اپنی زندگی محمد رسول اللہؐ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق گزارے گا ۔ اب غیر مسلموں کے ساتھ اس کا اشتراک اور مل جل کر رہنا نا ممکن ہو گیا ۔

اب ذرا غور کیجئے کہ قائداعظمؒ نے اس چھوٹے سے فقرے میں کتنی بڑی بات کی ہے کہ برِعظیم پاک و ہند میں جس رُوز پہلا غیر مسلم مشرف باسلام ہوا تھا اسی رُوز اس کے لئے الگ وطن کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی ۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہوا ہے:

یایھا الذین امنوا لاتتخذوا الکفرین اولیاء من دون المؤمنین

(اے ایمان والو! مسلمانوں کو چھوڑ کر غیر مسلموں سے دوستی نہ رکھو)۔

ہم اس آیتِ کریمہ کو دو قومی نظریے کی اساس سمجھتے ہیں ۔ برِعظیم پاک و ہند میں امامِ ربانی حضرت مجدّدِ الفِ ثانی شیخ احمد سرہندیؒ (م ۱۶۲۴ء) نے دو قومی نظریے کو پروان چڑھایا اور ہردے رام نامی ایک ہندو کے نام اپنے مکتوب میں متحدہ قومیت کی دھجیاں اُڑا کر رکھ دیں ۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (م ۱۷۶۲ء) نے مسلمانوں کو ہندوؤں کے تسلّط سے آزاد کرانے کے لئے احمد شاہ ابدالی سے مدد لی ۔ ان کے فرزندِ ارجمند شاہ عبدالعزیز محدّث دہلویؒ نے مسلمانوں کو اپنا تشخص قائم رکھنے کے لئے یہ مشورہ دیا کہ وہ پیتل کے برتن استعمال نہ کریں ، کیونکہ ہندو عموماً اس دھات کے برتن استعمال کرتے ہیں ۔ شاہ عبدالعزیزؒ (م ۱۸۲۳ء) اتنی مشابہت بھی برداشت نہ کر سکے کہ مسلمانوں کے استعمال میں پیتل کا برتن آئے ۔ سر سیّد احمد خان (م ۱۸۹۸ء) نے بنارس کے کمشنر مسٹر شیکسپیئر کو صاف صاف بتا دیا تھا کہ ہندو اور مسلمان مل کر نہیں رہ سکتے ۔ پنڈت موتی لعل نہرو نے ۱۹۲۸ء میں جو رپورٹ پیش کی وہ ہندوؤں کی تنگ نظری کی غماز ہے ۔ اسی رپورٹ کو دیکھ کر قائداعظمؒ نے فرمایا تھا کہ اب ہمارا راستہ الگ ہو گیا ہے ۔

مسلمانوں نے برِعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کو بہت کچھ دیا ہے ۔ ان کی خدمات کو آسانی کے ساتھ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ ان ممالک کی تہذیب و ثقافت رسم الخط ، فنِ موسیقی ، زبان و ادب ، تعلیم و تعلّم ، لباس ، رہن سہن ، طب اور طریقِ علاج ، طریقۂ زراعت ، رفاہی اور انتظامی اداروں کی تشکیل مسلمانوں کی مرہون منت ہے ۔ مسلمانوں کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں نے اس ملک میں توحید کا پرچار

کیا ۔ انہوں نے وسط ایشیاء اور ایران سے پھل، پھول اور آرائشی پودے لاکر یہاں کاشت کئے ۔ ان ممالک کے فنون مثلاً خطاطی، قالین بافی، پیپر ماشی، شال بافی اور کشیدہ کاری یہاں متعارف کرائے ۔ مسلمانوں نے اس ملک کو اپنا وطن بنا کر اس کی ترقی کے لئے ہر ممکن سعی کی ۔ ایک ہزار سال کے طویل قیام کی وجہ سے مسلمانوں کو اس ملک میں اجنبی اور غیر ملکی سمجھنا صحیح نہیں ہے ۔ اگر وہ اس ملک میں اتنے طویل قیام کے باوجود غیر ملکی ہیں تو پھر آریا بھی غیر ملکی ہیں اور وہ بھی غیر ملکیوں کے زمرے میں ہی شمار ہوں گے۔

باب (6)

مسلم دَورِ حکومت میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کی چیرہ دستیاں

محمد بن قاسم کی آمد (۷۱۲ء) سے لے کر حملۂ تیمور (۱۳۹۸ء) تک کے دور کو ہم برِ عظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش میں اسلام کی ترویج و نفوذ کا زمانہ قرار دیتے ہیں ۔ اس زمانے میں صوفیائے کرام اور مبلغوں کے ہاتھوں ان ممالک میں اسلام کی اشاعت ہوئی اور ان ملکوں کے طول و عرض میں خانقاہوں، مدرسوں اور رفاہی اداروں کا جال بچھ گیا۔ وسطِ ایشیاء اور خوارزم پر منگولوں کے حملوں کی وجہ سے وہاں کے علماء و مشائخ کی بڑی تعداد یہاں چلی آئی جنہوں نے عوام کی بڑی خدمت کی۔

جس طرح ہلاکو خان کے حملے سے بغداد کی مرکزیت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا تھا بعینہٖ حملۂ تیمور سے دہلی کی مرکزیت ختم ہو گئی ۔ جہاں ایک طرف مرکزی حکومت کا ڈھانچہ ہل کر رہ گیا، وہاں دہلی کے تہذیبی، روحانی اور علمی ادارے ختم ہو گئے۔

امیر تیمور برِ عظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش سے لوٹتے وقت یہاں سید خضر خان کو اپنا نائب مقرر کر گیا ۔ خضر خان اور اس کے جانشینوں نے دہلی اور اس کے اطراف پر قریباً نصف صدی تک حکومت کی اور اس خاندان کے آخری حکمران عالم شاہ کا دائرۂ اختیار سمٹ سمٹا کر دہلی سے پالم تک رہ گیا تھا۔ اس کی حکومت کے بارے میں کسی شاعر نے کیا خوب کہا تھا:

حکمِ خداوندِ عالم   از دہلی تا پالم

سید حکمرانوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ملک کے مختلف حصوں

میں ہندوؤں نے سرکشی اختیار کی ۔ جنوبی ہند کی ایک ریاست وجیانگر کے ہندو حکمرانوں نے بڑی قوت فراہم کرلی ۔ اس ریاست نے ہندو دھرم اور ہندوؤں کی تہذیب و ثقافت کو تحفظ فراہم کیا اور مسلمانوں کے زیرِاثر علاقوں سے ہندو اہلِ علم ترکِ وطن کر کے وجیانگر پہنچنے لگے ۔ وجیانگر کے حکمرانوں نے اپنی مملکت میں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا اور ہزاروں کی تعداد میں مسلمان وجیانگر سے ہجرت کر کے انڈونیشیا چلے گئے ۔ وجیانگر کے ہندو حکمرانوں نے جنوبی ہند کی طرف مسلمانوں کی پیش قدمی اور اسلام کی اشاعت رُوک دی ۔ یہ سلسلہ ڈیڑھ صدی تک ریاست وجیانگر کے خاتمے تک جاری رہا ۔

۱۴۵۱ء میں سید حکمران عالم شاہ کی تخت سے دستبرداری کے بعد بہلول لودھی تخت نشین ہوا ۔ اس وقت وہ بُوڑھا ہو چکا تھا ، اس لئے مرکز میں مضبوط حکومت قائم کرنے سے قاصر رہا ۔ اس کے جانشین سلطان سکندر لودھی کو ۲۵ سال عنانِ اقتدار سنبھالنے کا موقع ملا ۔ اس کے عہد میں مسلمانوں کو دہلی اور اس کے گرد و نواح میں قدرے سنبھالا ملا لیکن جو علاقے دارالحکومت سے دُور تھے ، وہاں ہندو کھل کھیلے ۔

تاریخ اس پر شاہد ہے کہ سکندر لودھی کے زمانے میں بہار کے علاقے میں ہندوؤں نے مسلمانوں کو زبردستی شُدھ کرنا شروع کر دیا ۔ عثمانی نسل کے جن مسلمانوں نے ارتداد اختیار کرنے سے انکار کیا ہندوؤں نے انہیں بڑی بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا ۔ ان میں سے ایک فرد کسی نہ کسی طرح جان بچا کر سکندر لودھی کے دربار میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ۔ اس نے سلطان کے حضور ہندوؤں کے مظالم کی رپورٹ پیش کی لیکن بعد مسافت کی بنا پر سلطان ظالموں کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھا سکا ۔

اسی زمانے میں موجودہ اُتر پردیش کے مشہور شہر کالپی کے ضابطہ دار نصیر خان نے اسلام ترک کر کے ہندو دھرم قبول کر لیا ۔ اس بدبخت نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کو مُرتد کرنے کے لئے ان پر مظالم ڈھانے لگا ۔

حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ (م ۱۵۳۷ء) اس زمانے میں بڑے نامور بزرگ ہو گزرے ہیں ۔ ان کا قیام اودھ کے مشہور قصبے رُدولی میں تھا جہاں حضرت احمد عبدالحق ، ان کے فرزند شیخ محمد عارف اور پوتے شیخ محمد بڑی رُوحانی فضا پیدا کر چکے تھے ۔

اس کے باوجود وہاں ہندوؤں کا عمل دخل شروع ہو گیا ۔ رُدولی کے بازاروں میں کھلے بندوں شراب اور سوّر کا گوشت فروخت ہونے لگے ۔ ان حالات میں حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ رُدولی کی سکونت ترک کر کے شاہ آباد مارکنڈا (موجودہ ہریانہ) چلے گئے ۔

سکندر لودھی کی وفات کے بعد ۱۵۱۷ء میں اس کا بیٹا ابراہیم لودھی تخت نشین ہوا ۔ اس کا دربار اُمرا٫ کی باہمی رقابتوں کی وجہ سے سازشوں کا مرکز بن کر رہ گیا اس کے دورِ حکومت میں بھوپال کے نواح میں رائے سین کے ہندو حکمران پُورن مل نے مسلمانوں کے لئے جینا دُوبھر کر دیا ۔ وہ بدبخت کئی مسلمان خواتین کو اُٹھا کر لے گیا ۔ ابراہیم لودھی کے دربار میں اس ظلم کے خلاف فریاد کی گئی لیکن وہ کچھ نہ کر سکا ۔

اسی زمانے میں راجستھان میں میواڑ کے حکمران رانا سانگا کو اپنی پوزیشن مضبوط بنانے کا موقع مل گیا ۔ اس نے ہندوستان میں ہندو راج قائم کرنے کا خواب دیکھا اور نوّے ہزار شہسواروں پر مشتمل ایک لشکر لے کر اس ملک سے مسلمانوں کے اخراج کے ارادے سے اپنی راجدھانی سے نکلا ۔ اس نے سب سے پہلے راجستھان کے قدیم اسلامی اور رُوحانی مرکز ناگور پر حملہ کر کے مسلمانوں کا قتلِ عام کیا اور جو چند خوش نصیب مسلمان اپنی جانیں بچا کر گجرات اور کاٹھیاواڑ پہنچنے میں کامیاب ہوئے ان میں ابُوالفضل اور فیضی کا والد شیخ مبارک بھی تھا ۔

رانا سانگا نے دوسرا حملہ ہندوستان کے سب سے بڑے رُوحانی مرکز اجمیر پر کیا ۔ حضرت شیخ عبدالحق مُحدّث دہلویؒ (م ۱۶۴۲ء) اپنی مشہور تصنیف " اخبارُ الاخیار " میں لکھتے ہیں کہ رانا سانگا نے اس مقدّس شہر کو جلا کر کھنڈروں میں تبدیل کر دیا اور وہ کھنڈر درندوں کا مسکن بن گئے ۔ اس زمانے میں کوئی زائر ان درندوں کے خوف سے حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے مزار کی زیارت کے لئے نہ جا سکتا تھا ۔

رانا سانگا اپنی کامیابی کے سُنہرے خواب دیکھ رہا تھا کہ ۱۵۲۶ء میں مغل حکمران بابر نے پانی پت کے تاریخی میدان میں ابراہیم لودھی کو شکست دے کر دہلی اور آگرہ پر قبضہ کر لیا ۔ رانا سانگا اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ بابر اپنے جدِ اُمجد امیر تیمور کی طرح لُوٹ مار کر کے کابل چلا جائے گا اور اس کے جاتے ہی وہ دہلی اور آگرہ پر قبضہ کر کے ہندو ریاست کی بنیاد رکھ دے گا ۔ جب بابر نے مستقل طور پر یہاں رہنے کا فیصلہ

کر لیا تو رانا سانگا کو اپنا منصوبہ خاک میں ملتا نظر آیا۔ وہ ۱۵۲۷ء میں بابر کو برعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش سے نکالنے کے ارادہ سے اپنے لاؤ لشکر سمیت فتح پور سیکری پہنچ گیا۔ وہاں سے بابر کا دارالحکومت آگرہ صرف بائیس میل دور تھا۔ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ اس موقع پر بابر جیسا غیر دل جرنیل بھی گھبرا گیا اور اس نے ناؤ نوش سے توبہ کی اور جہاد کی نیت سے راجپوتوں کا مقابلہ کیا۔ رانا سانگا جس نے میدان جنگ میں کبھی پیٹھ نہیں دکھائی تھی وہ اپنی راجپوتی آن بان کو خاک میں ملا کر میدان سے فرار ہو گیا۔ بابر کے سپاہیوں نے اس کا تعاقب کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

ہم ہمیشہ سے یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ لوگ اگر بابر کو کوئی اور کریڈٹ نہ دیں تو اتنا کریڈٹ ضرور دیں کہ وہ ۱۵۲۶ء میں برعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں کو ہندوؤں کا غلام بننے سے بچا گیا۔ رانا سانگا کو شکست دینا ابراہیم لودھی کے بس کی بات نہ تھی۔ یہ بابر ہی تھا جو اس کے عزائم کو خاک میں ملا گیا۔ راقم الحروف بابر کو مسلمانانِ برعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کا عظیم محسن سمجھتا ہے۔ نوّر اللہ مرقدہٗ۔

افسوس صد افسوس۔ بابر کو اس ملک پر چار سال سے زیادہ حکومت کرنے کا موقع نہ ملا۔ وہ ۱۵۳۰ء میں راہئ ملک بقا ہوا۔ اس کا جانشین ہمایوں بڑا پڑھا لکھا حکمران تھا لیکن شیر شاہ سوری کے ہاتھوں مات کھا گیا۔ ہمایوں کے بعد اس ملک کی باگ ڈور شیر شاہ سوری نے سنبھالی۔ وہ بڑا قابل حکمران اور اعلیٰ پایہ کا منتظم تھا لیکن اسے اس وقت حکومت ملی، جب اس کی زندگی کا آفتاب غروب ہونے والا تھا۔ وہ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر یہ کہا کرتا تھا کہ اسے نمازِ عصر کے بعد حکومت ملی ہے جب سورج غروب ہونے کے قریب ہے۔

چار ساڑھے چار سال حکومت کرنے کے بعد شیر شاہ سوری کالنجر کا قلعہ فتح کرتے ہوئے بارود سے جھلس کر جاں بحق تسلیم ہوا۔ اس کا جانشین سلیم شاہ نو سال تک اس ملک کا فرمانروا رہا۔ لیکن وہ اپنے عظیم باپ کے مقابلے میں صفر تھا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کے برادرِ نسبتی مبارز خان نے سلیم شاہ کے فرزند فیروز کو قتل کر کے تخت و تاج پر قبضہ کر لیا اور عادل شاہ کا لقب اختیار کر کے دادِ عیش دینے لگا۔ اسے

رقص و سرود کے علاوہ اور کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ اس کے دربار پر میوزک اکیڈیمی ہونے کا گمان گزرنے لگا۔ ایک معتبر روایت کے مطابق میاں تان سین راگ ودّیا میں عادل شاہ کا شاگردِ رشید تھا۔

عادل شاہ کی انتظامی امور میں عدمِ دلچسپی کی بنا پر ریواڑی کے ایک بنیے ہیم چند عرف ہیموں نے بڑا اقتدار حاصل کر لیا اور وہ شاہی لشکر میں نون تیل بیچتے بیچتے فوج کا سپہ سالار بن گیا۔ اس نے راجہ بکرماجیت کا لقب اختیار کر کے مشہور ہندو حکمران چندر گپت بکرماجیت کا رُوپ دھار لیا۔ غالباً وہ رانا سانگا کے ادھورے خواب کی تکمیل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اقتدار پر قبضہ کرتے ہی مسلمانوں کا ناطقہ بند کر دیا۔ اس عہد کے مورخ لکھتے ہیں کہ اس کے آبائی وطن ریواڑی میں ایک سید نے اپنے فرزند کی ولادت پر عقیقہ کی رسم بڑی دھوم دھام کے ساتھ منائی۔ اتفاق سے ایک کوّا ایک ہڈی لے کر دیوار پر جا بیٹھا۔ اتنے میں کوئی شخص پاس سے گزرا تو کوّا ڈر کر اڑ گیا اور وہ ہڈی ہمسایہ برہمن کے گھر میں گر گئی۔ اس برہمن نے اس کی شکایت ہیموں سے کی تو اس نے اتنی سی بات سے مشتعل ہو کر اٹھارہ سید ذبح کروا دیئے۔ اس واقعہ کے تھوڑے ہی عرصے بعد ہمایوں نے سرہند کے مقام پر سکندر سُور کو شکست دے کر دہلی اور آگرہ پر قبضہ کر لیا لیکن اسے چھ ماہ سے زیادہ حکومت کرنا نصیب نہ ہوئی۔

ہمایوں کی اچانک موت کے بعد ہیموں نے افغانوں کے ساتھ مل کر دوبارہ حصولِ اقتدار کی کوشش کی اور اس بار اس کا مقابلہ بیرم خان کے ساتھ پانی پت کے تاریخی میدان میں ہوا۔ بیرم خان نے ہیموں کو شکست دے کر قتل کر ڈالا۔ اگر وہ ہیموں کو شکست دینے میں ناکام ہو جاتا تو ہیموں نے کامیابی کے بعد اپنے مُربّی عادل شاہ کو ٹھکانے لگا کر تخت پر قبضہ کر لینا تھا۔ اس کے بعد وہ مسلمانوں کے ساتھ وہی سلوک کرتا جو ریواڑی کے سیدوں کے ساتھ کر چکا تھا۔ راقم الحروف کے خیال میں بیرم خان کو بھی اس کی بعض کمزوریوں کے باوجود مسلمانانِ برعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کا محسن تسلیم کر لینا چاہیے۔

سکندر لودھی کی وفات (۱۵۱۷ء) اور اکبر کی تخت نشینی (۱۵۵۶ء) تک ۳۹ سال کا عرصہ ہوتا ہے۔ اس عرصے میں سیاسی عدمِ استحکام کی وجہ سے ہندوؤں میں کئی

جارحانہ تحریکیں پیدا ہوئیں ۔ اس ضمن میں یہاں مشہور ہندو مصلح چے تنیہ کا ذکر بے جا نہ ہو گا ۔ وہ بنگال کے قدیم دارالحکومت ندیا کا رہنے والا تھا ۔ وہ اپنے وطن سے مسلمانوں کو ہندو بنانے کا عزم لے کر شمالی ہند کی جانب روانہ ہوا اور اپنے مشن کی تکمیل کرتے ہوئے متھرا پہنچ گیا ۔ اس نے راستے میں بہت سے ضعیف الایمان مسلمانوں کو ہندو دھرم میں داخل کیا ۔ ان بدبختوں میں بجلی خاں نامی ایک پٹھان قابلِ ذکر ہے جو اپنے دس ساتھیوں سمیت شدھ ہوا ۔ چے تنیہ نے ان پٹھانوں کی تربیت کرکے انہیں بیراگی بنا دیا اور پٹھانوں کو ہندو دھرم میں داخل کرنے کی مہم ان کو سونپی یہ پٹھان بیراگی جس تیرتھ پر جاتے وہاں پاتھوں ہاتھ لئے جاتے تھے ۔

چے تنیہ نے متھرا میں کئی مندر اور پاٹھ شالائیں تعمیر کیں ۔ کرشن جی کی جنم بھومی ہونے کی بنا پر متھرا ہندوؤں کا بڑا تیرتھ تھا اور دور دور سے ہندو یاتری وہاں آتے تھے ۔ چے تنیہ نے وہاں مستقل سکونت اختیار کرکے ہندو دھرم کو سنبھالا دیا ۔ ایک روایت کے مطابق وہ مسلمانوں کو ہندو دھرم میں داخل کرنے کے جنون میں پاگل ہو گیا تھا اور اسی عالم میں فوت ہوا ۔

اکبر کا وزیر مال راجہ ٹوڈرمل بڑا پکا ہندو تھا ۔ وہ جب تک ٹھاکروں کی پوجا نہ کر لیتا اس وقت تک ناشتہ نہ کرتا تھا ۔ "تاریخ بنارس" میں آلشکیر لکھتا ہے کہ اس نے بنارس میں ایک عالیشان مندر تعمیر کرایا اور اس میں شولنگ نصب کرنے کی تقریب میں ہندو راجوں اور پنڈتوں کو دُور دُور سے مدعو کیا ۔

اکبر کی مذہبی حکمتِ عملی سے برِّ عظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش میں اسلامی اقدار کو بڑا نقصان پہنچا ۔ اس نے باغی مسلمان گورنروں کی سرکوبی کے لئے ہندو راجوں کو بھیج کر ان کے دلوں سے مسلمانوں کا رُعب ختم کر دیا ۔ ہندو جو اب تک یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ مسلمان ناقابلِ شکست ہیں وہ اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہو گئے ۔ اکبر نے دینِ الٰہی جاری کرکے اسلامی شعائر کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ۔ ہندو رانیوں نے شاہی محلات میں دیوالی ، دسہرہ ، جنم اشٹمی ، رام نومی ، رکھشا بندھن اور شوراتری جیسے ہندووانہ تہوار بڑی دُھوم دَھام کے ساتھ منانے شروع کئے ۔ اس زمانے میں ہندوؤں نے مسلمانوں کے خلاف جو جارحانہ رویّہ اختیار کیا اس کی صدائے بازگشت حضرت مجدّد

الف ثانیؒ کے مکتوبات میں سنائی دیتی ہے ۔

حضرت مجدّد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ ہندو مسلمانوں کو دق کرنے کی غرض سے رمضان کے مہینے میں سرِعام کھاتے پیتے ہیں ۔ جس دن ان کا برت (روزہ) ہوتا ہے اس دن مسلمانوں کو کھانا پینا تو کجا ، اشیائے خور و نوش بھی فروخت نہیں کرنے دیتے ۔ کئی مقامات پر ہندو مسجدوں اور مزاروں کو شہید کرکے ان کی جگہ مندر تعمیر کر رہے ہیں ۔ کوروکھشیتر میں ایک بزرگ کا مزار تھا ، ہندوؤں نے اسے شہید کرکے اس کی جگہ مندر تعمیر کر لیا ۔ عبدالقادر بدایونی لکھتا ہے کہ متھرا میں مسلمانوں نے مسجد تعمیر کرنے کے لئے اینٹیں اور مسالہ جمع کیا تو ایک مُنہ زور پنڈت نے ، جو رانی جودھا بائی کا پروہت تھا ، اس سامان پر قبضہ کرکے مندر کی تعمیر میں لگا دیا ۔ جب مسلمانوں نے متھرا کے قاضی عبدالرحیم سے اس پنڈت کی شکایت کی تو وہ بدبخت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے پر اتر آیا ۔ بدایونی کی روایت ہے کہ ہندوؤں نے متعدد مقامات پر مسلمانوں کے قبرستان مسمار کر دیئے اور مسجدوں کو کلیسوں میں تبدیل کر دیا یا ان میں بُت نصب کر دیئے ۔ ہمارے ہاں ایک بزعمِ خویش ترقی پسند طبقہ بھی موجود ہے جو بدایونی کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھتا ۔ بابری مسجد کی شہادت کے بعد اس طبقے کو بدایونی کے بیانات تسلیم کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں کرنی چاہیے ۔ مزید برآں حضرت مجدّد الف ثانیؒ کے مکتوبات سے بھی بدایونی کے بیانات کی تصدیق ہوتی ہے ۔ ہندوؤں کی جارحیت کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مجدّد الف ثانیؒ رقمطراز ہیں :

> "آج مسلمانوں کی غربت اور بے بسی کا یہ عالم ہے کہ مسلمان شریعت پر عمل کرتے ہیں تو قتل کئے جاتے ہیں اور دشمنانِ اسلام دندناتے پھرتے ہیں ۔"

حضرت مجدّد الف ثانیؒ کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے بھگتی تحریک کی جو ہندو مت اور اسلام کو ملا کر ایک درمیانی راستہ نکالنا چاہتی تھی ، ڈٹ کر مخالفت کی ، ورنہ آج ہمارے نام راوندر خواجہ ، رام محمد سنگھ یا کرشن احمد جیسے ہوتے ۔ ان کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے ایران سے درآمد شدہ مجوسی ، ساسانی اور مزدکی نظریات اور تہذیب و ثقافت کی سختی کے ساتھ مخالفت کی ۔

اکبر کی وفات کے بعد ۱۶۰۵ء میں جہانگیر تخت نشین ہوا ۔ اس کے زمانے میں ہندو کافی مضبوط ہو چکے تھے ۔ دوسری جانب سکھوں نے امرتسر اور ترنتارن میں گوردوارے تعمیر کرلئے ۔ گورو ارجن کے جانشین گورو ہرگوبند (۱۵۹۵ء ۔ ۱۶۴۴ء) نے بادشاہوں جیسے طور طریقے اپنائے اور وہ سکھوں سے مالیہ اور دوسرے سرکاری واجبات وصول کرنے لگا ۔

جہانگیر کے جانشین شاہ جہان کے زمانے میں کشمیر میں مسلمانوں کی حالت بڑی پتلی تھی ۔ ایک بار شاہجہان کشمیر جاتے ہوئے بھنبر سے گزرا تو اسے معلوم ہوا کہ وہاں مسلمانوں کے گھروں میں ہندو عورتیں آباد ہیں اور ہندوؤں کے گھروں میں مسلمان عورتیں بستی ہیں ۔ ان کا یہ معاہدہ ہے کہ مسلمان کے گھر میں جو ہندو عورت فوت ہو گی اسے مسلمانوں کے طریقے کے مطابق دفن کیا جائے گا اور جو مسلمان عورت کسی ہندو کے گھر میں مرے گی اسے ہندوؤں کے رواج کے مطابق سپردِ آتش کیا جائے گا ۔ اس کے علاوہ پانچ ہزار کے قریب بے نکاحی مسلمان عورتیں ہندوؤں کے قبضے میں تھیں ۔ شاہجہاں نے ان ہندوؤں کو بلا کر کہا کہ وہ مسلمان ہو جائیں ورنہ ان عورتوں کو ان کے " قابض " خاوندوں سے آزاد کروا لیا جائے گا ۔ چنانچہ اس موقع پر بہت سے ہندو مسلمان ہو گئے اور ان کے نکاح پڑھوا دیئے گئے اور جنہوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا ان کی " بی بیوں " کو ان کے قبضے سے آزاد کروا لیا گیا ۔

اکبر کے زمانے میں ہندو اتنے منہ زور ہو گئے تھے کہ وہ اب بھی قابو میں نہیں آرہے تھے ۔ ایک بار جب شاہجہان گجرات پہنچا تو وہاں کے قضاۃ و سادات نے اس کی خدمت میں حاضر ہو کر فریاد کی کہ شہر کی بیشتر مساجد ہندوؤں کے قبضے میں ہیں ، خدا را انہیں واگزار کروا دیجئے ۔

لاہور سے گجرات کا فاصلہ صرف ستر میل ہے اور یہ شہر اس شاہراہ پر واقع ہے جو لاہور کو کابل سے ملاتی تھی ۔ لاہور میں مغل گورنر موجود تھا ۔ اس کے باوجود گجرات کی مساجد ہندوؤں کے تصرف میں تھیں ۔

شاہجہان دہلی جاتے ہوئے سرہند سے گزرا ۔ یہ وہ مقدس شہر تھا جہاں حضرت مجدد الف ثانیؒ ، ان کے فرزندوں خواجہ محمد سعیدؒ اور خواجہ محمد معصومؒ (م ۱۶۶۹ء)

نے بڑا کام کیا تھا ۔ اس کے باوجود مسلمانوں کی بے بسی کا یہ عالم تھا کہ دیپ نامی ایک ہندو غنڈہ چھ مسلمان خواتین کو اٹھا کر لے گیا ، ان میں ایک سیّد زادی زینب نامی بھی تھی ۔ دیپ نے اسے شدھ کر کے اس کا نام گنگا رکھا اور وہ ایک بچے کی ماں بھی بن گئی ۔ شاہجہان سے اس غنڈہ گردی کی شکایت کی گئی ۔

گجرات اور سرہند تو دہلی کو کابل سے ملانے والی شاہراہ پر واقع تھے وہاں مسلمانوں کی بے بسی کا یہ عالم تھا تو اس سے دُور دراز کے علاقوں میں مسلمانوں کی حالت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔

الہ آباد کے گرد و نواح میں ابدال نامی ایک سرکش ہندو نے مسلمانوں پر قیامت ڈھا رکھی تھی ۔ ہندوؤں نے وہاں ستّر کے قریب مندر بلا اجازت تعمیر کر لئے اور انہیں مسلمانوں کے خلاف سازشوں کے مراکز میں تبدیل کر دیا ۔

شاہجہان کے عہد میں اس کے ولی عہد شہزادہ داراشکوہ کا جھکاؤ نظریۂ وحدت الوجود کی طرف ہو گیا اور یہ نظریہ اسے وحدتِ ادیان تک لے گیا ۔ اس نے ہندوؤں کی متعدد مذہبی کتابوں کے فارسی میں تراجم کرائے اور یوں ہندوؤں کی دیو مالا مسلمانوں میں متعارف کرائی ۔ داراشکوہ کے مذہبی رجحانات نے مسلمانوں کو چونکا کر دیا اور وہ یہ سمجھنے لگے کہ اگر وہ شاہجہان کے بعد تخت پر بیٹھ گیا تو اکبر کے عہد کی یاد تازہ کر دے گا ۔ ان حالات میں صحیح العقیدہ مسلمان اورنگ زیب کے طرف دار ہو گئے ۔ حضرت مولانا شبلی نعمانیؒ نے اُپنشد کے فارسی ترجمے " سرِ اکبر " پر داراشکوہ کا لکھا ہوا دیباچہ پڑھ کر یہ کہا تھا کہ " وہ ہندو ہو چکا تھا " ۔

اورنگ زیب کے عہدِ حکومت میں دکن میں مرہٹوں نے سرکشی اختیار کی اور انہوں نے شیواجی کی قیادت میں ہندو ریاست قائم کر لی ۔ مرہٹوں نے یہ اقدام اورنگ زیب کی مذہبی حکمت عملی کے ردِ عمل کے طور پر نہیں کیا بلکہ اورنگ زیب کی تخت نشینی سے پہلے ان کے ہاں ایسے سنت اور بھگت پیدا ہونے لگے تھے جو مرہٹوں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کے بیج بونے لگے تھے ۔ شیواجی کے اُستاد نے اپنے شاگرد کے دل میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی ۔ مؤرخین نے ایسے تین درجن کے لگ بھگ ہندو مصلحین کی نشاندہی کی ہے ، جنہوں نے مرہٹوں میں

بیداری کی لہر پیدا کی۔

اسی زمانے میں نارنول، بھرت پور اور الور کے علاقے میں ستنامی فرقے کے ہندوؤں نے بغاوت کر دی۔ انہوں نے یہ مشہور کر دیا کہ جادو ٹونہ کی وجہ سے مسلمان سپاہیوں کے ہتھیار ان پر کارگر نہیں ہوتے۔ اورنگ زیب کے سپاہی ان کے مقابلے کو جانے سے کچھ کترانے لگے تو بادشاہ نے ان کا حوصلہ بلند کرنے کے لئے اپنے ہاتھ سے تعویذ لکھ کر سپاہیوں کے بازوؤں پر باندھے اور ستنامیوں کا قلع قمع کیا۔

اورنگ زیب کے زمانے میں پنجاب میں سکھوں نے شورش بپا کر دی۔ یہ فتنہ بھی راتوں رات نہیں اٹھا۔ جہانگیر کے عہد میں سکھوں کے پانچویں گورو ارجن دیو نے جہانگیر کے باغی بیٹے خسرو کی حمایت کرکے بادشاہ کو ناراض کر لیا۔ جہانگیر نے خسرو کی بغاوت فرو کرنے کے بعد گورو ارجن دیو کو گرفتار کر لیا۔ ان کا انتقال ان کے ایک مخالف ہندو کے ہاتھوں جیل میں تکالیف اٹھا کر ہوا۔ ان کے جانشین گورو ہرگوبند نے پیری کے ساتھ "میری" کا جھنڈا گاڑ کر ریاست کے اندر ریاست قائم کرلی اور بادشاہوں جیسے طور طریقے اختیار کرکے سیر و شکار میں دلچسپی کا اظہار کیا۔ یہاں سے سکھوں نے مغلوں کے خلاف صف آرائی شروع کر دی۔ نویں گورو تیغ بہادر کو کشمیری پنڈتوں نے اپنے مفادات کی خاطر حکومت کے مقابلے میں لاکھڑا کیا۔ گورو تیغ بہادر گرفتار ہو کر بجرم بغاوت ۱۶۷۵ء میں قتل ہوا۔ اس کے جانشین گورو گوبند سنگھ نے سکھوں کو ۳۰ اپریل ۱۶۹۹ء کو آنند پور میں خالصہ کا لقب دے کر فوجی تربیت دینا شروع کر دی۔ مجبوراً اورنگ زیب کو ہتھیار اٹھانے پڑے۔ گورو گوبند سنگھ (م ۱۷۰۸ء) نے کئی مقامات پر مغل فوج کا مقابلہ کیا، لیکن بالآخر اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

اورنگ زیب کی وفات کے جلد بعد گورو گوبند سنگھ کے ایک چیلے بندہ بیراگی نے مشرقی پنجاب میں مسلمانوں پر قیامت ڈھا دی۔ اس نے کیتھل سے لے کر بٹالہ تک مسلمانوں کی بستیاں جلا ڈالیں۔ وہ مسلمانوں کو زندہ جلانے میں روحانی سکون حاصل کرتا تھا۔ وہ چھوٹے بچوں کو ہوا میں اچھالتا اور جب وہ نیچے کی طرف آتے تو انہیں تلوار کی دھار یا نیزے کی انی پر لیتا۔ وہ حاملہ عورتوں کے پیٹ پھاڑنے میں خوشی محسوس کرتا تھا۔

سادھورہ کے جن سادات نے ایک آڑے وقت میں مغل سپاہیوں سے گورو گوبند سنگھ کی جان بچائی تھی، بندہ بیراگی نے انہیں بھی معاف نہیں کیا۔ اس کے مظالم کے سامنے چنگیز و ہلاکو کی داستانیں ماند پڑ گئیں۔ مغل حکمرانوں نے اس کے مقابلے کو کئی قابل جرنیل بھیجے لیکن وہ اسے زیر کرنے میں ناکام رہے۔ بالآخر فرخ سیر کے عہد میں کشمیر اور پنجاب کے شیر دل ناظم عبدالصمد خان نے اسے کئی معرکوں میں شکست دے کر گرفتار کیا۔

اورنگ زیب کی وفات کے جلد بعد مرکزی حکومت میں ضعف کے آثار نظر آنے لگے۔ مرکز کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے صوبے خود مختار ہو گئے۔ دکن میں انگریزوں اور فرانسیسیوں نے ایک بڑے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ بھرت پور اور الور میں جاٹوں نے بغاوت کرکے دہلی اور آگرے کے درمیان آمد و رفت بند کر دی۔ چورامن جاٹ، سورج مل جاٹ اور جواہر مل جاٹ کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ جاٹوں نے آگرے اور سکندرے پر حملہ کرکے ان شہروں کو لوٹ لیا اور اکبر کی ہڈیاں قبر سے نکال کر جلا ڈالیں۔ جاٹوں کی ان کارروائیوں کو اب تک "جاٹ گردی" کے نام یاد کیا جاتا ہے۔

۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے کرنال کے مقام پر مغل بادشاہ محمد شاہ کو شکست دے کر دہلی کی جانب پیش قدمی کی۔ اس نے دہلی سے اسّی کروڑ روپے مالیت کا سامان لوٹا اور شہر میں خون کی ندیاں بہا دیں۔ نادر شاہ (م ۱۷۴۷ء) کے جانشین احمد شاہ ابدالی (م ۱۷۷۳ء) نے دس بار پنجاب پر حملہ کیا اور مغل حکمرانوں کی ساکھ خاک میں ملا دی۔ ۱۷۵۳ء میں پنجاب کے ناظم میر معین الملک کی وفات کے بعد پنجاب کا امن تہ و بالا ہو گیا۔ سکھوں کی بارہ مسلوں نے پنجاب کے مختلف علاقوں میں اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ یہی وہ دور ہے جس میں لاہور پر تین سکھ حکمران لہنا سنگھ، سوبھا سنگھ اور گوجر سنگھ قابض تھے اور انہوں نے شہر کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہوا تھا۔

مرکز کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جنوبی ہند میں مرہٹوں نے دوبارہ قوت پکڑی اور وہ شمالی ہند کی طرف بڑھنے لگے۔ ۱۷۵۸ء میں انہوں نے لاہور پر قبضہ کرکے یہاں اپنا گورنر مقرر کر دیا۔ ان کے ہراول دستے دریائے اٹک تک پہنچ گئے۔ یہ

مرہٹوں کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔

دہلی، پنجاب اور دریائے گنگا و جمنا کے درمیانی علاقے پر مرہٹوں کے تسلط نے یہاں کے مسلمانوں کے لئے جینا دوبھر کر دیا۔ بساط الغنائم کا ہندو مصنف لچھمی نرائن شفیق رقمطراز ہے کہ مرہٹے مسلمانوں کو تنگ کرنے کی غرض سے سؤر مار کر مسجدوں میں پھینک آتے تھے۔ مرہٹوں کے زیر تسلط علاقوں میں اسلامی شعائر کو نقصان پہنچ رہا تھا۔ اس لئے شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے احمد شاہ ابدالی، نواب احمد خان بنگش (م ۱۷۷۱ء) والئ فرخ آباد، نواب نجیب الدولہ (م ۱۷۷۰ء) فرمانروائے رُوہیل کھنڈ اور نواب شجاع الدولہ تاجدارِ اُودھ (م ۱۷۷۵ء) کو مرہٹوں کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرنے کی دعوت دی۔ انہوں نے ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے تاریخی میدان میں مرہٹوں کو فیصلہ کن شکست دی اور وہ ہمیشہ کے لئے برعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کے سیاسی اُفق سے غائب ہوگئے۔ راقم الحروف شاہ ولی اللہ دہلویؒ کو مسلمانوں کا عظیم محسن تسلیم کرتا ہے جنہوں نے ۱۷۶۱ء میں مسلمانوں کو تنگ دل ہندوؤں کی غلامی سے نجات دلائی۔ شاہ صاحب نے احیائے دین کے لئے جو کوشش کی وہ ایک الگ موضوع کی متقاضی ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی کے جانشین شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے ملفوظات کا اُردو میں ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ ان ملفوظات میں آنجناب مسلمانوں کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ پیتل کے برتن استعمال نہ کریں کیونکہ ہندو پیتل کے برتن استعمال کرتے ہیں۔ شاہ صاحب کو مسلمانوں کی ہندوؤں کے ساتھ اتنی مشابہت بھی منظور نہ تھی، چہ جائیکہ اور امور میں وہ اشتراک عمل کو جائز سمجھتے۔ یہی ایک نقطہ احراریوں، ابوالکلامیوں، قوم پرستوں اور جمعیت العلماء ہند کے سیاسی موقف کو غلط قرار دینے کے لئے کافی ہے۔ مجھے اس پر سخت تعجب ہوتا ہے کہ جمعیت العلماء ہند کے رہنماؤں کو کشفِ قلوب اور کشف قبور ہوتا تھا لیکن انہیں کشفِ ہنود کبھی نہیں ہوا۔ وہ تاریخ کی روشنی میں ہندوؤں کی گھٹیا ذہنیت، اسلام دشمنی اور مسلم بیزاری کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے۔

احمد شاہ ابدالی مرہٹوں کو شکست دے کر افغانستان چلا گیا۔ مغل بادشاہ میں اتنی ہمت اور لیاقت نہ تھی کہ وہ یہاں پیدا ہونے والے سیاسی بحران کو پُر

کرتا۔ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ میں میر جعفر کی ملک و ملت سے غداری کی وجہ سے انگریزوں نے سراج الدولہ کو شکست دے کر بنگال، بہار اور اڑیسہ پر اپنا تسلط قائم کر لیا اور ۱۷۶۴ء میں بکسر کے مقام پر شاہ عالم ثانی، شجاع الدولہ اور میر قاسم کی مشترکہ فوج کو شکست دے کر انہوں نے شاہ عالم ثانی سے ۲۶ لاکھ روپے سالانہ کے عوض بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی حاصل کر لی اور یوں ان تین زرخیز صوبوں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا قبضہ ہو گیا۔ دکن میں نظام اور مرہٹوں کے ساتھ مل کر انگریزوں نے حیدر علی، ٹیپو سلطان کے عزائم ناکام بنا دیئے۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے ۱۷۵۳ء میں ناظم پنجاب میر معین الملک کی وفات کے ساتھ ہی پنجاب کا نظم و نسق تباہ ہو گیا۔ چند سال تک مرہٹوں، افغانوں اور مقامی قسمت آزماؤں کے درمیان رَسّہ کشی ہوتی رہی۔ اس کے بعد سکھوں کا عمل دخل ہو گیا۔ ۱۷۵۳ء سے لے کر ۱۷۹۹ء کا دور مسلمانوں کے لئے بڑی ابتلا کا دور تھا۔ سکھوں نے مسلمانوں پر بڑے مظالم ڈھائے اور انہیں طرح طرح کی اذیتیں دیں۔ اسی زمانے میں سکھا شاہی اور بُرچھا گردی کی اصطلاحیں وضع ہوئیں۔ ۱۷۹۹ء میں رنجیت سنگھ لاہور پر قابض ہو گیا۔ یہی وہ منحوس سال ہے جس میں سلطنت خداداد میسور کا چراغ گل ہوا، اور سلطان ٹیپو برعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کو انگریزوں کی غلامی سے بچاتے ہوئے جنت کو سدھارے۔ رنجیت سنگھ (م ۱۸۳۹ء) کا دور بھی مسلمانوں کے لئے اذیت ناک تھا۔ سکھوں نے بادشاہی مسجد لاہور کا تقدس پامال کرتے ہوئے اسے اصطبل بنا دیا۔ رنجیت سنگھ اپنی محبوبہ موراں کے ساتھ بادشاہی مسجد کے مینار پر داد عیش دیا کرتا تھا۔ سکھوں نے اپنے زیر اثر علاقوں میں مساجد میں اذانیں دینے پر پابندی لگا دی اور ذبیحۂ بقر کی سزا موت قرار پائی۔ اسی زمانے میں مسلمانوں سے بیگار لینے کا رواج ہوا۔ سکھ مسلمانوں سے تاوان وصول کرنے کی غرض سے انہیں محبوس کرنے لگے۔ رنجیت سنگھ کے عہد میں مسلمانوں کی زیرِ کاشت زمینوں پر سکھوں کا قبضہ ہو گیا اور سکھوں نے پنجاب میں مسلمانوں کو اقتصادی طور پر تباہ کر دیا۔

ان حالات میں سید احمد بریلویؒ نے سکھوں کے خلاف اعلانِ جہاد کیا۔ ابتداء میں انہیں کئی معرکوں میں کامیابی ہوئی اور انہوں نے اپنے زیر تسلط علاقے میں

احکامِ شریعت نافذ کر دیئے ۔ خراج و عشر کی وصولی کے لئے انہوں نے اپنے کارندے مقرر کئے ۔ اس علاقے کے عوام کی تربیت قبائلی نظام کے تحت ہوئی تھی اور وہ شریعت کے مطابق زندگی گزارنے کے عادی نہ تھے ۔ ادھر سیّد احمد بریلوی کے دستِ راست شاہ اسمٰعیل شہیدؒ سے بھی قدرے بے احتیاطی ہوئی اور انہوں نے چند ایسے مسائل چھیڑ دیئے جن سے مقامی لوگ ان سے بدظن ہوگئے ۔ اس صورتِ حال سے سکھوں نے فائدہ اٹھایا اور مقامی لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو بالا کوٹ میں سیّد احمد بریلوی اور ان کے ساتھیوں کو گھیرے میں لے کر جنگ شروع کر دی ۔ اس معرکے میں سیّد صاحب، شاہ اسمٰعیلؒ اور ان کے بہت سے ساتھیوں نے جامِ شہادت نوش کیا ۔

رنجیت سنگھ ۱۸۳۹ء میں فوت ہوا تو زمامِ اقتدار اس کے فرزند کھڑک سنگھ نے سنبھالی ۔ انتظامی امور میں وہ اپنے باپ کے مقابلے میں صفر تھا ۔ اس کے عہد میں سکھوں کی سرگرمیاں تیز ہو گئیں ۔ کھڑک سنگھ سوا سال حکومت کرنے کے بعد ۱۸۴۰ء میں فوت ہوا ۔ اس کا بیٹا نونہال سنگھ جب اپنے باپ کی نعش نذرِ آتش کرکے روشنائی دروازے سے حضوری باغ میں داخل ہو رہا تھا تو پتھر کی ایک سِل اس پر گری اور وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے فوت ہو گیا ۔

نونہال سنگھ کی وفات کے بعد کھڑک سنگھ کی بیوہ رانی چند کور ساڑھے تین ماہ تک برسرِ اقتدار رہی ۔ اسی دوران میں رنجیت سنگھ کا ایک بیٹا شیر سنگھ بٹالے سے فوج لے کر لاہور پہنچا ۔ اس نے رانی چند کور کو شکست دے کر زمامِ اقتدار سنبھال لی ۔ شیر سنگھ کو اقتدار سنبھالے ابھی بمشکل پونے دو سال گزرے تھے کہ وہ ۱۸۴۳ء میں سردارانِ سندھانوالیہ کے ہاتھوں قتل ہوا ۔ شیر سنگھ کے قتل کے بعد رنجیت سنگھ کا ایک نوعمر بیٹا دلیپ سنگھ تخت نشین ہوا ۔ اس کے عہد میں اس کے وزیر ہیرا سنگھ کے مشیر پنڈت جھلاّ نے سرکاری واجبات وصول کرنے کے سلسلہ میں بڑی سختی برتی ۔ مسلمانوں کے ساتھ اس کا رویّہ اور بھی سخت تھا ۔ اس کے ظلم و ستم کے بارے میں لوگ یہ کہا کرتے تھے :

اُوپر اللہ تے تھلّے جھلاّ

دلیپ سنگھ کے زمانے میں سکھ فوج بڑی خود سر ہو گئی تھی ۔ اس لئے

اس کا زور ختم کرنے کی غرض سے رانی جنداں اور اس کے مشیروں نے انگریزوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا ۔ سکھ فوج دریائے ستلج عبور کرکے انگریزی علاقے میں داخل ہو گئی ۔ انگریزوں نے اسے بھراؤں، مُدکی، فیروز شاہ اور علی وال کے مقامات پر شکست دی ۔ اس جنگ کے نتیجے میں انگریزوں نے ستلج اور بیاس کے درمیانی علاقے کو اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا ۔ لاہور میں انگریز ریذیڈنٹ کا تقرر ہوا اور سکھ فوج کی تعداد کم کر دی گئی، سکھوں پر تاوان ڈالا گیا لیکن خزانے میں مطلوبہ رقم موجود نہ تھی ۔ اس پر جموں کے حکمران گلاب سنگھ ڈوگرہ نے یہ پیش کش کی کہ اگر اسے جموں اور کشمیر کا موروثی حکمران تسلیم کر لیا جائے تو وہ پچھتّر لاکھ روپے اپنے ذاتی خزانے سے انگریزوں کو ادا کرنے کے لئے تیار ہے ۔ اس پر انگریزوں نے امرتسر کے مقام پر اس کے ساتھ ایک معاہدہ پر دستخط کرکے کشمیر اور کشمیری مسلمانوں کو گلاب سنگھ ڈوگرہ کے ہاتھ فروخت کر دیا ۔ کشمیری مسلمان ڈیڑھ صدی گزر جانے کے باوجود ابھی تک آزادی حاصل نہیں کر سکے ۔

۱۸۴۹ء میں سکھوں اور انگریزوں کے درمیان دوبارہ جنگ چھڑ گئی ۔ اس بار انگریزوں نے انہیں چیلیانوالہ کے مقام پر فیصلہ کن شکست دی اور پنجاب کو انگریزی مقبوضات میں شامل کر لیا ۔ دوسری جانب دہلی شہر کے اندر انگریز ریذیڈنٹ کا حکم چلتا تھا اور قلعۂ معلّیٰ کے اندر مغل بادشاہ پنشن خوار کی حیثیت سے زندگی گزار رہا تھا ۔ اس کی حیثیت شاہِ شطرنج سے زیادہ نہ تھی ۔

۱۸۵۷ء میں میرٹھ سے جنگِ آزادی شروع ہوئی ۔ دہلی، جھانسی اور لکھنؤ اس کے اہم مراکز تھے ۔ عوام میں بڑا جوش و خروش پایا جاتا تھا ۔ لیکن مرکزی قیادت نہ ہونے کی وجہ سے حریت پسندوں کا آپس میں کوئی رابطہ نہ تھا ۔ ان کے مقابلے میں انگریزوں کے پاس باقاعدہ فوج اور جدید اسلحہ تھا ۔ ذرائع آمد و رفت بھی ان کے کنٹرول میں تھے ۔ ان حالات میں انگریز تحریکِ آزادی کو دبانے میں کامیاب ہوگئے ۔

جنگ آزادی کو دبانے کے بعد انگریزوں کا نزلہ مسلمانوں پر گرا ۔ ہزاروں کی تعداد میں علماء و صلحاء اور حریت پسندوں کے سر قلم کئے گئے ۔ لکھنؤ میں اب تک ایک گندہ نالہ "سرکٹا نالہ" کے نام سے موسوم ہے ۔ میرے استفسار پر وہاں کے

باشندوں نے بتایا کہ جنگِ آزادی کے دوران گرفتار ہونے والے حریت پسندوں کے سر اس نالے پاس کھڑے کرکے اُڑائے جاتے تھے۔

مسلمانوں کی جاگیریں ضبط ہوئیں، ان کی جائداد انگریزوں کے قبضے میں چلی گئی۔ مہاراجگانِ پٹیالہ اور کپور تھلہ کو جنگِ آزادی میں انگریزوں کی مدد کرنے کے صلے میں اُتر پردیش میں جاگیریں عطاء کی گئیں جو ظاہر ہے کہ مسلمانوں سے چھینی گئی تھیں۔ انگریزوں نے سرکاری ملازمتوں کے دروازے مسلمانوں پر بند کر دیئے۔ بقول سرسیّد احمد خان مرحوم مسلمانوں کو چپڑاسی، پنکھاقلی، سائیس، کوچوان یا گھسیارہ کے علاوہ اور کوئی نوکری نہیں ملتی۔ ان کا کاروبار تباہ ہوا، عزتیں لُٹیں اور وہ نانِ شبینہ کے لئے محتاج بنا دیئے گئے۔

ہندوؤں نے بقول سرسیّد احمد خان مرحوم، گنگا میں نہا کر اپنے پاپ دھو لئے۔ انہوں نے انگریزوں کا ساتھ دے کر اسکولوں اور کالجوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور سرکاری ملازمتیں حاصل کیں۔ کاروبار پر ہندو چھا گئے اور مسلمان ہر میدان میں ان سے بہت پیچھے رہ گئے۔ سرسیّد احمد خان مرحوم کے زمانے میں ایک سال کلکتہ یونیورسٹی سے ۲۲۰ اُمیدوار بی۔ اے کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ ان میں صرف ایک اُمیدوار مسلمان تھا۔

اس کے بعد مسلمانوں پر جو کچھ گزری، اس کا ذکر ہم اگلے ابواب میں کریں گے۔

باب (7)

سرسیّد احمد خان اور علی گڑھ تحریک

مسلمانانِ پاک وہند اور بنگلہ دیش کے مُحسن اور قافلہ سالارِ آزادی سرسیّد احمد خان کا شمار ان عظیم ہستیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے تاریخِ اسلام میں اپنی سیرت اور کردار کے اَنمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

ولادت اور خاندان:

سرسیّد احمد خان ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلہ امام علی تقیؑ سے ملتا ہے۔ ان کے مورثِ اعلیٰ سیّد برہان، شاہجہان کے عہد میں ہرات کی سکونت ترک کرکے دہلی میں آبسے۔ سرسیّد کے دادا میر ہادی صوبہ دہلی کے افسرِ مال اور قاضیٔ عسکر تھے۔ شاہی دربار سے انہیں جوادالدولہ کا خطاب عطاء ہوا تھا۔

والدِ بزرگوار:

سرسیّد احمد خان کے والدِ بزرگوار سیّد متقی (م ۱۸۳۸ء) ایک درویش صفت انسان تھے۔ انہیں سرکاری ملازمت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کے والد میر ہادی کی وفات کے بعد انہیں اپنے والد کے منصب اور خطاب کی پیش کش ہوئی لیکن انہوں نے اسے قبول نہ کیا۔ مغل بادشاہ اکبر شاہ ثانی (م ۱۸۳۷ء) کے ساتھ ان کے ذاتی مراسم تھے۔ اس لئے سیّد متقی بلاتکلف دربار اور محل میں چلے جاتے تھے۔ ایسے کئی موقعوں پر سرسیّد احمد خاں بھی ان کے ساتھ ہوا کرتے تھے۔

سیّد متقی، نقشبندی مجدّدی سلسلے کے مشہور بزرگ حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ (م ۱۸۲۴ء) کے مرید خاص تھے۔ نقش بندی سلسلے میں وابستگی اور حضرت مجدّد

الفِ ثانی، شیخ احمد سرہندی کے ساتھ عقیدت کی بنا پر انہوں نے اپنے بیٹے کا نام "احمد" رکھا تھا۔ شاہ غلام علی زندگی بھر مجرد رہے۔ اس لئے انہوں نے سید متقی کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ اسی نسبت سے سرسید احمد خاں حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ کو "دادا ابا" کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ سرسید لکھتے ہیں کہ وہ بچپن میں ان کی گود میں بیٹھ کر خدا جانے کیسی کیسی گستاخیاں کیا کرتے تھے۔ لیکن شاہ غلام علی صاحب سید متقی کے ساتھ تعلق کی بنا پر ان کی حرکات برداشت کیا کرتے تھے۔ سرسید نے ان کی صحبت میں جو قیمتی لمحات گزارے وہ ان کی عمر عزیز کا حاصل تھے۔ اس صحبت کا اثر ان پر مرتے دم تک رہا۔

سرسید کے نانا:

سرسید احمد خان کے ننھیالی رشتے دار شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے عقیدت مند تھے۔ ان کے نانا خواجہ فرید الدین احمد، نقشبندی سلسلے کے مشہور بزرگ حضرت یوسف ہمدانی (م ۱۱۴۲ء) کی اولاد سے تھے۔ انہوں نے دہلی میں تعلیم حاصل کی اور لکھنؤ جا کر ماہر علوم ریاضی علامہ تفضل حسین خان سے ریاضی، الجبرا اور مثلثات کی کتابیں پڑھیں۔ تعلیم سے فراغت کے بعد خواجہ فرید الدین احمد دہلی چلے آئے لیکن جلد ہی اودھ کے حکمران نواب سعادت علی خان نے انہیں لکھنؤ بلا کر ایک اعلیٰ منصب پر فائز کیا۔ لکھنؤ میں قیام کے دوران ان کے چند انگریز افسروں کے ساتھ تعلقات قائم ہوئے اور ان کے ذریعے ان کی قابلیت کا شہرہ کلکتہ پہنچا۔ گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز نے کلکتہ میں مدرسۂ عالیہ کے نام سے مسلمان طلبہ کے لئے ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا تھا۔ کلکتہ کے حکام نے خواجہ فرید الدین احمد کو اس کا سپرنٹنڈنٹ مقرر کیا۔ انگریز حکام نے ایک بار انہیں سفارتی مشن پر ایران بھیجا۔ انہوں نے اپنے فرائض منصبی اس خوش اسلوبی سے انجام دیئے کہ انگریزوں نے خوش ہو کر انہیں شاہ برما کے دربار میں اپنا نمائندہ مقرر کیا۔ برما سے واپسی کے بعد خواجہ صاحب کا تقرر افسرِ مال کے طور پر ہوا۔

۱۸۱۵ء میں مغل حکمران اکبر شاہ ثانی نے انہیں منصبِ وزارت پر فائز کیا۔ ان دنوں خزانہ قریب قریب خالی ہو چکا تھا اور فوج کو کئی ماہ سے تنخواہ نہیں ملی تھی۔ ان کے منصبِ وزارت پر فائز ہونے سے پہلے مرہٹوں نے دہلی پر حملہ کر کے دہلی کے لال

قلعے کو خوب لوٹا تھا۔ شاہ جہان نے دیوان عام کی چھت تانبے کی چادروں سے بنوائی تھی۔ مرہٹوں نے وہ چادریں دکن لے جانے کی غرض سے اُتار لی تھیں لیکن وزنی ہونے کے سبب نہ لے جا سکے۔ خواجہ فرید الدین احمد نے ان چادروں کو ڈھلوا کر سکے مضروب کروائے اور فوج کے واجبات ادا کئے۔ ان حالات میں خزانہ، بادشاہ اور اس کے اہل خانہ کی فضول خرچیوں کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا، خواجہ صاحب نے غیر ضروری اخراجات پر قدغن لگائی تو اس پر بعض خود غرض افراد ان کے خلاف ہو گئے۔ ان حالات میں خواجہ صاحب منصبِ وزارت سے مستعفی ہو گئے۔

خواجہ فرید الدین احمد کی سبکدوشی کے بعد ان کا کوئی جانشین حالات پر قابو نہ پا سکا تو مجبوراً اکبر شاہ ثانی نے انہیں دوبارہ قلمدانِ وزارت سونپا۔ تین سال کے بعد ہلکر کا کوئی منظورِ نظر ان کی مخالفت پر اتر آیا تو انہوں نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ جب پنجاب کے حکمران رنجیت سنگھ کو اس کا علم ہوا تو اس نے خواجہ صاحب کو لاہور آنے کی دعوت دی لیکن ان کی بیٹی نے اصرار کر کے انہیں دہلی میں روک لیا۔

آخری عمر میں خواجہ فرید الدین احمد تصوّف کی طرف مائل ہو گئے تھے اور انہوں نے رسول شاہی سلسلۂ تصوّف میں باقاعدہ بیعت کر لی تھی۔ ان کا انتقال ۱۸۲۸ء میں ہوا۔ سرسید احمد خان نے "سیرتِ فریدیہ" میں ان کے سوانح حیات قلمبند کئے۔

سرسید نے کئی کتابیں اپنے نانا جان سے پڑھی تھیں۔ وہ ان کی سیرت و کردار کے بڑے مدّاح تھے۔ سرسید کی کردار سازی میں ان کے نانا کا بڑا ہاتھ تھا۔

سرسید کی والدہ محترمہ:

سرسید احمد خان کی والدہ ماجدہ عزیز النساء ایک پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ خواجہ فرید الدین احمد نے اپنی بیٹی کی تعلیم و تربیت اور کردار سازی پر خصوصی توجہ دی تھی۔ وہ بڑی نیک دل، منکسر المزاج، رسم و رواج اور توہمات سے متنفر اور مخیّر خاتون تھیں۔ ان میں عفو در گذر اور تحمل کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ سرسید لکھتے ہیں کہ انہیں خدا کی ذات پر کامل بھروسہ تھا۔ ایک بار بچپن میں سرسید نے گھر کے ایک قدیم ملازم کو تھپڑ دے مارا تو ان کی والدہ نے یہ کہتے ہوئے انہیں گھر سے نکال دیا کہ وہ

مہذب اور شائستہ لوگوں میں رہنے کے لائق نہیں ہیں۔ سرسید نے تین دن اپنی خالہ کے ہاں گزارے اور چوتھے رُوز خالہ کی وساطت سے انہیں اس شرط پر گھر میں رہنے کی اجازت ملی کہ پہلے وہ اس ملازم سے اپنا قصور معاف کرائیں۔ سرسید نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی۔ یہ وہ گھریلو ماحول تھا جس میں سرسید احمد خان نے آنکھیں کھولیں۔

تعلیم و تربیت:

سرسید احمد خان کے زمانے میں دہلی علم و ادب کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا۔ مفتی صدرالدین آزُردہ (م ۱۸۶۸ء)، فضل حق خیر آبادی (م ۱۸۶۱ء)، غالب (م ۱۸۶۹ء)، مُومن (م ۱۸۵۲ء)، ذوق (م ۱۸۵۳ء) اور شیفتہ (م ۱۸۶۹ء) جیسے نابغۂ رُوز گار دہلی میں موجود تھے۔ دوسری جانب شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فرزندوں نے علم کے چراغ روشن کئے ہوئے تھے۔ سرسید کے بچپن میں شاہ غلام علی دہلویؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ مُحدّث دہلویؒ بقیدِ حیات تھے۔ شاہ عبدالعزیزؒ کی وفات کے بعد ان کے نواسے شاہ محمد اسحٰق (م ۱۸۴۵ء) نے درس و تدریس کی ذمہ داری سنبھالی۔ دوسری جانب شاہ عبدالعزیزؒ کے بھتیجے اور شاہ رفیع الدینؒ (م ۱۸۱۸ء) کے فرزندِ ارجمند شاہ مخصوص اللہ (م ۱۸۵۵ء) نے اپنی خاندانی روایت زندہ رکھی۔ سیّد احمد بریلویؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ بھی سرسید کے بچپن میں دہلی میں مقیم تھے۔ سرسید نے اسی ماحول میں ہوش سنبھالا۔

سرسید احمد خان نے ابتدائی کتابیں پڑھنے کے بعد اپنے ماموں خواجہ زین العابدین سے ریاضی اور الجبرا کی تعلیم حاصل کی۔ ان کے نانا خواجہ فرید الدین احمد فرصت کے اوقات میں اپنے پُوتوں اور نواسوں کو سبق پڑھایا کرتے تھے۔ سرسید نے طب کی تعلیم حکیم غلام حیدر سے حاصل کی۔ ہنوز ان کی تعلیم مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ۱۸۳۶ء میں ان کے والدِ بزرگوار سید متقی انتقال کر گئے اور گھر کی تمام ذمہ داریاں ان کے نازک کندھوں پر آپڑیں۔

ملازمت کا آغاز:

والد کی وفات کے بعد سرسید احمد خان اپنے خالو خلیل اللہ خان صدر امین دہلی کے دفتر میں سررشتہ دار مقرر ہوئے۔ کچھ عرصے بعد ان کا تقرر آگرے کے کمشنر کے

دفتر میں بطورِ نائب منشی ہوا۔ اسی زمانے میں انہوں نے مُنصفی کا امتحان پاس کیا اور وہ مین پُوری میں مُنصف مقرر ہوئے۔ ان کے کام اور لگن سے متاثر ہو کر ان کے افسروں نے انہیں عدالتِ خفیفہ کا جج مقرر کیا اور اس حیثیت سے انہیں فتح پُور سیکری، دہلی، رُہتک، بجنور، مراد آباد، غازی پُور، علی گڑھ اور بنارس میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ ان شہروں میں انہوں نے مسلمانوں کی حالتِ زار کو بہت قریب سے دیکھا اور ان کی پس ماندگی دُور کرنے پر غور کرنے لگے۔

۱۸۴۲ء میں سرسید احمد خان دہلی آئے تو مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر (م ۱۸۶۲ء) نے انہیں شرفِ باریابی بخشا۔ اس موقع پر بادشاہ نے ان کے دادا کا خطاب جوادالدولہ اور اپنی طرف سے عارف جنگ کا اعزاز بخشا۔ ۱۸۴۶ء میں سرسید احمد خان کا تبادلہ دہلی ہو گیا۔ اسی سال ان کے بڑے بھائی سیّد محمد خان کا انتقال ہوا۔ وہ سرسید کے مونس و غمخوار اور دوست بھی تھے۔ ان کی وفات کا انہیں بڑا صدمہ ہوا۔ سرسید نے زندگی کی تمام آسائشیں ترک کر دیں اور داڑھی بڑھا لی۔ دہلی میں سرسید کا قیام آٹھ سال رہا۔ اس دوران میں انہوں نے وہاں کے نامی گرامی علماء کے درس میں بیٹھ کر اپنی ادھوری تعلیم مکمل کی اور درسِ نظامی کے اعلیٰ درجوں کی کتابیں پڑھیں۔ اسی زمانے میں انہوں نے آثار الصنادید تصنیف کی۔ ۳ جنوری ۱۸۵۵ء کو وہ ترقی پا کر صدر امین بنے اور ان کا تقرر بجنور میں ہوا۔ جولائی ۱۸۵۸ء میں سرسید صدر الصدور بن کر مراد آباد چلے گئے۔

۱۸۶۹ء میں ان کے فرزند سیّد محمود کو انگلستان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے وظیفہ ملا۔ سرسید نے اس موقع کو غنیمت جانا اور وہ بھی اپنے فرزند کے ساتھ انگلستان چلے گئے۔ سیّد محمود کو کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ ملا۔ سرسید نے وہاں کے نظامِ تعلیم کا قریب سے مشاہدہ کیا اور وطن واپسی کے بعد ایسا علمی ادارہ بنانے کا عزم کیا۔

۱۸۷۶ء میں سرسید احمد خان سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو گئے۔ ۱۸۷۸ء میں موصوف امپیریل کونسل کے رُکن نامزد ہوئے اور ۱۸۸۲ء میں انہیں ایجوکیشن کمیشن کا رکن بنایا گیا۔ ۱۸۸۷ء میں سرسید پبلک سروس کمیشن کے رُکن بنے۔ ۱۸۸۸ء میں انہیں سر کا خطاب ملا اور ۱۸۸۹ء میں سکاٹ لینڈ کی ایڈنبرا یونیورسٹی نے ان کی علمی اور سماجی خدمات کے اعتراف میں ڈاکٹر آف لاز کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

سرسید احمد خان ۲۸ مارچ ۱۸۹۸ء کو علی گڑھ میں اپنے ایک دوست حاجی محمد اسمٰعیل خان رئیس دتاولی (م ۱۹۲۱ء) کے گھر میں فوت ہوئے۔ وہ اپنی زندگی بھر کی پونجی کالج پر لٹا چکے تھے اور ان کے کفن و دفن کے لئے بھی ان کے گھر میں رقم نہ تھی۔ اس موقع پر ان کے جگری دوست نواب محسن الملک نے اپنی جیب سے کفن و دفن کے مصارف ادا کئے۔ سرسید کا جسدِ خاکی اپنے تعمیر کردہ کالج کی مسجد کے صحن کے شمالی حصے میں سپردِ خاک کیا گیا۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

سرسید احمد خان کی تصانیف:

سرسید احمد خان ایک بلند پایہ مصنف تھے اور انہوں نے مختلف موضوعات پر متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی تصنیفی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک دور انگلستان جانے سے پہلے کا ہے اور دوسرا انگلستان سے واپسی کے بعد کا۔ پہلے دور کی تصانیف پر حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ، سید احمد بریلویؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا رنگ غالب ہے اور دوسرے دور کی تصانیف میں تجدد پسندی کے علاوہ مذہبی مصالحت کا جذبہ کار فرما ہے۔

تمیقہ:

ابتدائی دور میں جب سرسید احمد خان پر شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی تعلیمات کا گہرا اثر تھا تو انہوں نے تمیقہ کے عنوان سے ایک کتابچہ لکھا جس میں تصورِ شیخ کا رد کیا گیا تھا۔ ان کی یہ تصنیف دراصل اصلاحِ تصوف کی طرف ایک جرأت مندانہ قدم تھا۔

کلماتِ الحق:

یہ عجیب سی بات ہے کہ سرسید احمد خان کے والد ماجد سید متقی حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ کے مریدِ خاص اور منہ بولے بیٹے تھے اور سرسید شاہ صاحب کے بے حد مداح تھے۔ ان کے نانا خواجہ فرید الدین احمد رسول شاہی سلسلۂ تصوف میں بیعت تھے۔ اس کے باوجود سرسید نے کلمات الحق کے عنوان سے ایک کتابچہ تحریر کیا جس میں پیری مریدی کی مذمت کی گئی ہے۔

جلاء القلوب بذکر المحبوب:

سرسید احمد خان نے اس بات کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا کہ پیشہ ور میلاد خوان، محافلِ میلاد میں ضعیف روایات بیان کرتے ہیں۔ سرسید نے جلاء القلوب بذکر المحبوب کے عنوان سے ایک کتابچہ لکھا جس میں مستند روایتیں نقل کیں اور میلاد خوانوں سے یہ استدعا کی کہ وہ ایسی پاکیزہ محافل میں صرف مستند روایات ہی بیان کیا کریں۔

راہِ سنّت در ردِّ بدعت:

مغلوں کے آخری دور میں مسلم معاشرے میں بہت سی بدعات شروع ہو گئی تھیں۔ ڈاکٹر محمد عمر نے مسلم معاشرے پر ہندو اثرات کے عنوان سے ایک بلند پایہ کتاب تصنیف کی ہے۔ اس کتاب میں ان تمام بدعات اور رسموں کی نشاندہی کی گئی ہے جو اس دور کے مسلم معاشرے میں جڑ پکڑ چکی تھیں۔ سرسید احمد خان نے انہی بدعات کا رد لکھا ہے اور مسلمانوں کو سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر چلنے کی تلقین کی ہے۔

ترجمہ تحفہ اثنا عشریہ:

تحفہ اثنا عشریہ کے عنوان سے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م ۱۸۲۳ء) نے فارسی زبان میں ایک ضخیم کتاب تصنیف کی تھی۔ اس کتاب میں انہوں نے شیعہ حضرات کے بعض عقائد پر بڑی سخت جرح کی ہے۔ سرسید نے اس کتاب کے دسویں اور بارہویں ابواب کا اُردو میں ترجمہ کیا تھا۔

ترجمہ کیمیائے سعادت:

کیمیائے سعادت امام غزالیؒ (م ۱۱۱۱ء) کی فارسی زبان میں ایک بلند پایہ تصنیف ہے جو ان کی ایک عربی تصنیف احیاء العلوم الدین کی فارسی زبان میں تلخیص ہے۔ سرسید احمد خان نے اس کے چند ابواب کا اُردو میں ترجمہ کیا تھا۔

قولِ متین در ابطالِ حرکتِ زمین:

یہ سرسید احمد خان کے انگلستان جانے سے پہلے کی تصنیف ہے۔ اس میں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ زمین ساکن ہے اور آسمان گردش کرتا ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ انگلستان سے واپس آنے کے بعد انہوں نے اس خیال سے رجوع کر لیا ہو۔

تسہیل فی جرّ الثقیل:

سرسید کی یہ تصنیف میکنکس کے موضوع پر ہے۔ اس فن کا تعلق علومِ ریاضی کے ساتھ ہے اور سرسید کو ریاضی کے ساتھ بڑی دلچسپی تھی۔ اس لئے اس فن پر لکھنے کا حق انہی کو پہنچتا تھا۔

فوائد الافکار فی اعمال الفرجار:

سرسید احمد خان کے نانا خواجہ فرید الدین احمد الجبرا، ریاضی اور مثلثات کے بہت بڑے عالم تھے اور انہوں نے یہ فن اس دور کے سب سے بڑے مسلم ریاضی دان علامہ تفضل حسین لکھنوی سے حاصل کیا تھا۔ ان سے ان کے فرزند خواجہ زین العابدین نے ریاضی پڑھی اور ان سے سرسید نے یہ فن سیکھا۔ سرسید کے نانا نے پرکار کے بارے میں ایک کتابچہ لکھا تھا۔ سرسید نے دو انگریز فاضلوں کی فرمائش پر اس کا اُردو میں ترجمہ کیا۔

سلسلۃ الملوک:

تاریخ کے موضوع پر یہ سرسید کی ایک مفید تصنیف ہے۔ انہوں نے مہابھارت کے زمانے کے ہندو راجہ یدھشٹر سے لے کر ملکہ وکٹوریا (م ۱۹۰۱ء) تک تمام حکمرانوں کی ایک فہرست تیار کر دی ہے۔

جامِ جم:

سرسید نے اپنی اس تصنیفِ لطیف میں امیر تیمور سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک تمام مغل حکمرانوں کے حالات قلمبند کئے ہیں۔

تاریخ ضلع بجنور:

جس زمانے میں سرسید احمد خان بجنور میں صدر امین کے منصب پر فائز تھے انہوں نے ضلع بجنور کی تاریخ قلمبند کی تھی۔

تاریخ سرکشی بجنور:

مئی ۱۸۵۷ء میں جب جنگ آزادی کا آغاز ہوا اس وقت سرسید احمد خان بجنور میں مقیم تھے۔ بجنور اور اس کے نواحی قصبات میں حریت پسندوں کی انگریزوں کے ساتھ جو جھڑپیں ہوئیں یا جہاں لوگوں نے انگریزوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ سرسید نے اس کا ریکارڈ اس کتاب میں محفوظ کر دیا ہے۔ اس میں مئی ۱۸۵۷ء سے اپریل ۱۸۵۸ء تک بجنور میں رونما ہونے والے واقعات درج ہیں۔

آئینِ اکبری:

یہ مغل بادشاہ اکبر کے عالم و فاضل وزیر اعظم علامی ابو الفضل (م ۱۶۰۲ء) کی ایک گراں قدر تصنیف ہے جس میں اس نے اکبر کے دور میں مروّج ضابطوں، امورِ انتظام سلطنت، شاہی حرم، بادشاہ کی نگرانی میں چلنے والے کارخانوں، مختلف علاقوں میں پیدا ہونے والی فصلوں، ان فصلوں سے ہونے والی آمدنی کے بارے میں مفید معلومات جمع کی تھیں۔ یہ کتاب ایک طرح سے اکبر کے عہد کے مالیے کا ریکارڈ ہے۔ سرسید احمد خان نے اپنے حواشی کے ساتھ اس کتاب کو شائع کرایا۔

تاریخ فیروز شاہی:

ضیاء الدین برنی تغلق دور کا ایک نامور مؤرخ تھا جس نے سلطان ناصر الدین محمود سے لے کر سلطان فیروز تغلق کے ابتدائی دورِ حکومت تک کے واقعات کو قلمبند کیا تھا۔ اگر وہ یہ تاریخ مرتب نہ کرتا تو ہمیں سلطان غیاث الدین بلبن کے سیاسی نظریات، سلطان علاء الدین خلجی کی قیمت بندی اور محمد بن تغلق کے منصوبوں کا علم بھی نہ ہوتا۔ سرسید احمد خان نے اس گراں مایہ تصنیف کو مرتب کر کے طبع کرایا۔

تزکِ جہانگیری:

مغل حکمران جہانگیر (م ۱۶۲۷ء) نے اپنے پڑدادا ظہیر الدین محمد بابر (م

۱۵۳۰ء) کی طرح تزک لکھی تھی ۔ سرسید احمد خان نے بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ اسے مرتب کیا اور غازی پور (مشرقی یوپی) میں قیام کے زمانے میں طبع کرایا ۔ ہمارے ہاں سرسید کا شائع کردہ تزک کا ایڈیشن ہی مستند سمجھا جاتا ہے ۔

آثار الصنادید:

سرسید احمد خاں ۱۸۴۶ء تک ملازمت کے سلسلے میں دہلی میں رہے تھے ۔ انہوں نے اس زمانے میں دہلی کی ۲۳۲ قدیم عمارات کی تاریخ لکھی اور ان عمارتوں پر نصب کتبے نقل کئے ۔ جس زمانے میں وہ قطب مینار کے کتبے نقل کر رہے تھے ، انہوں نے ہر کتبے کے متوازی بانسوں اور رسوں کی مدد سے جھینکے بندھوائے تھے جن میں بیٹھ کر وہ کتبوں کے چربے اُتارا کرتے تھے ۔ اس وقت مشہور شاعر امام بخش صہبائی (م ۱۸۵۷ء) نیچے کھڑے ہو کر سرسید کی سلامتی کے لئے دعائیں کیا کرتے تھے ۔ آثار الصنادید میں عمارتوں کی تاریخ کے علاوہ سرسید نے اپنے زمانے کے اہل علم و فضل کا بھی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے ۔ انہوں نے شاہ عبدالعزیز محدث ، شاہ غلام علی دہلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید کے لئے جو القاب استعمال کئے ہیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے دل میں بزرگوں کا بڑا احترام تھا ۔

سرسید احمد خان نے مسلمانوں کو جدید علوم سیکھنے اور سائنس پڑھنے کا مشورہ دیا ہے ۔ وہ اپنے رسالے تہذیب الاخلاق کے ذریعے انہیں جدید طور طریقے اپنانے ، جدید طرز کا لباس پہننے اور میز کرسی پر بیٹھ کر چھری کانٹے کے ساتھ کھانا کھانے کا مشورہ دیتے ہیں ، لیکن دوسری جانب ماضی کے ساتھ اپنا رشتہ برقرار رکھتے ہیں ۔ تاریخ فیروز شاہی ، آئین اکبری ، آثار الصنادید ، اور تزک جہانگیری ہمارے اس دعوے پر دال ہیں ۔

رسالۂ اسباب بغاوتِ ہند:

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے خاتمے پر سرسید احمد خان نے ایک کتابچہ لکھا ، جس میں انہوں نے ان حالات کا تجزیہ کیا ، جو جنگ آزادی کے آغاز کا سبب بنے تھے ۔ سرسید نے اپنی اس تصنیف میں انگریز حکام کو بتایا کہ حکومت نے کئی ایسے کام کئے جن

کی افادیت کو عوام نہ سمجھ سکے اور اس سے غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں ۔ دوسری جانب پادریوں نے اپنی تبلیغی سرگرمیاں تیز کر دیں اور انہوں نے انگریز افسروں کے نام سرکلر بھیج کر انہیں یہ باور کرایا کہ اب وقت آگیا ہے کہ مقامی باشندوں کو جبراً عیسائی بنا لیا جائے ۔ اس لئے مقامی باشندوں کے دلوں میں حکومت کے خلاف نفرت پیدا ہو گئی ۔

سرسید نے انگریز حکام کو یہ بھی بتایا کہ حکومت نے بعض ایسے قوانین نافذ کئے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے معتقدات کے خلاف تھے ۔ اسی طرح سرسید نے انگریز حکام پر یہ واضح کیا کہ وہ عوام کے مسائل سے ناواقف رہے ہیں اور عوام اور حکام کے درمیان جو رابطہ قائم رکھنا چاہیے تھا وہ انہوں نے قائم نہیں رکھا ۔ نیز انگریزوں نے ہندوستانی فوجیوں کے ساتھ ناروا سلوک کیا جس کی وجہ سے وہ بغاوت پر آمادہ ہو گئے ۔

جنگِ آزادی کے خاتمے پر انگریزوں کا عتاب مسلمانوں پر نازل ہوا ۔ ان کی جاگیریں ، ریاستیں اور تعلقے ضبط ہوئے ، ہزاروں افراد کی جائدادیں حکومت نے نیلام کر دیں اور ہزاروں افراد کو انتقامی جذبے کے تحت تختۂ دار پر چڑھا دیا ۔ سرسید نے انگریزوں پر یہ واضح کیا کہ تنہا مسلمان ہی اس ہنگامے کے ذمہ دار نہ تھے بلکہ ہندو بھی اس میں شامل تھے ۔ جنگ کے خاتمے پر وہ انگریزوں کے ساتھ مل گئے اور حکومت کا عتاب مسلمانوں پر نازل ہوا ۔

سرسید نے یہ کتابچہ برطانوی پارلیمنٹ کے اراکین اور کلکتہ میں اعلیٰ انگریز حکام کو ارسال کیا ۔ ان کے دوستوں کا یہ خیال تھا کہ اس کتابچے کی اشاعت پر انگریز سرسید کو گرفتار کر کے سخت سزا دیں گے لیکن بعض سمجھ دار انگریزوں نے ان کے تجزیے کی تعریف کی ۔

لائل محمڈنز آف انڈیا (Loyal Muhammadans Of India)

سرسید احمد خان نے اپنے اس کتابچے میں انگریزوں کو بتایا کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں تمام مسلمانوں نے حصہ نہیں لیا اس لئے پوری قوم کو موردِ الزام نہ ٹھہرایا جائے ۔ انہوں نے متعدد وفادار مسلمانوں کا اس کتابچے میں ذکر کیا ، جو اس ہنگامے سے بالکل الگ تھلگ رہے اور انہوں نے اپنی جانوں پر کھیل کر انگریزوں کی جانیں بچائیں ،

یا زخمی انگریزوں اور ان کے اہل و عیال کو اپنے ہاں پناہ دی اور جب ہنگامہ فرو ہوا تو انہیں محفوظ مقامات پر پہنچایا۔

تبیین الکلام:

سرسید احمد خان نے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان اختلافات کی خلیج پاٹنے اور مسلمانوں کو عیسائیوں کے بنیادی عقائد اور اسلام کے ساتھ قدرِ مشترک سے واقف کرانے کی غرض سے تین کتابیں لکھیں ان میں ایک تبیین الکلام بھی ہے جو انجیل مقدس کی تفسیر ہے۔ یہ کسی مسلمان کی طرف سے پہلی اور شاید آخری کوشش تھی کہ انجیل کی تفسیر لکھ کر مسلمانوں کو اس کی تعلیمات سے آگاہ کیا جائے۔

رسالہ احکام طعامِ اہلِ کتاب:

اس کتابچے میں سرسید احمد خان نے مسلمانوں کو بتایا کہ عیسائی اہلِ کتاب ہیں، اس لئے ان کا ذبیحہ اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا مسلمانوں کے لئے شرعاً جائز ہے۔ اس کتابچے کی تصنیف کا مقصد بھی کھانے پینے کے معاملے میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان پیدا ہونے والی بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ تھا۔

تحقیق لفظِ نصاریٰ:

قرآن حکیم میں عیسائیوں کے لئے نصاریٰ کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ سرسید نے اپنی اس تصنیف میں انگریزوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ یہ کلمہ تحقیر نہیں ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فلسطین کے ایک گاؤں ناصرہ کے رہنے والے تھے اس لئے انہیں مسیح ناصری کہتے ہیں اور اسی نسبت سے ان کے ماننے والوں کو نصاریٰ کہتے ہیں۔

تفسیر القرآن:

سرسید احمد خان نے قرآن حکیم کے پہلے سترہ پاروں کی تفسیر لکھی ہے۔ وہ اسے پُورا کرنا چاہتے تھے، لیکن ان کی زندگی نے وفا نہ کی۔ اس کتاب پر مذہبی حلقوں کی طرف سے بہت سے اعتراضات ہوئے ہیں، کیونکہ تفسیر لکھتے وقت سرسید احمد خان

نے فرشتوں اور جنّوں کے ظاہری وجود اور معجزات سے انکار کیا ہے۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ جن امور کو لوگ معجزہ کہتے ہیں وہ معجزہ نہیں بلکہ عین فطرت ہے، مثال کے طور پر قرآن حکیم میں کئی جگہوں پر یہ ذکر آیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب یہودیوں کو فرعون کی غلامی سے نجات دلا کر ارضِ مقدس (فلسطین) کی طرف روانہ ہوئے تو وہ ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں آگے سمندر تھا۔ اسی دوران میں فرعون اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ یہودیوں کو قتل کرنے کی غرض سے وہاں پہنچ گیا۔ اس وقت یہ معجزہ رونما ہوا کہ سمندر کا پانی اتر گیا اور حضرت موسیٰ اپنی قوم کو لے کر پار نکل گئے اور جب فرعون ان کا تعاقب کرتے ہوئے وہاں پہنچا تو سمندر کا پانی اُوپر چڑھ گیا اور وہ اپنے لشکر سمیت ڈوب کر ہلاک ہو گیا۔ سرسید احمد خان اس معجزے کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ سمندروں میں دن میں دو بار مد و جزر ہوتا ہے۔ جب موسیٰ علیہ السلام وہاں پہنچے تو وہ جزر کا وقت تھا اور سمندر پایاب تھا اس لئے وہ اپنے ساتھیوں سمیت پار نکل گئے۔ جب فرعون نے ان کا تعاقب کیا تو اس وقت مد شروع ہو گئی اور پانی کی سطح اونچی ہونے کے باعث فرعون اور اس کے لشکری ڈوب کر ہلاک ہو گئے۔ سرسید لکھتے ہیں کہ یہ معجزہ نہیں بلکہ فطرت کے عین مطابق ہے۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام طُورِ سینا پر خدا کا جلوہ دیکھ کر بے ہوش ہو گئے تھے۔ سرسید لکھتے ہیں کہ طُور دراصل ایک آتش فشاں پہاڑ تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام آگ دیکھ کر اُوپر گئے اور جب آتش فشاں کے دہانے سے زبردست گڑگڑاہٹ کے ساتھ لاوا نکلا تو اس خوفناک آواز کو سن کر وہ بے ہوش ہو گئے۔ پہاڑوں پر اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے۔ یہ فطرت کے عین مطابق ہے اس لئے وہ اسے معجزہ نہیں مانتے۔ سرسید وحشی اور جنگلی انسانوں کو جن سے تعبیر کرتے ہیں اور نیک فطرت انسانوں کو فرشتہ کہتے ہیں۔

اس تفسیر کی بنا پر علماء نے انہیں "نیچری" ہونے کا طعنہ دیا اور ان کے بعض عقائد کی بنا پر ان کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کیا لیکن وہ اس کی پرواہ کئے بغیر اپنے کام میں لگے رہے۔ انہوں نے اپنے ایک شعر میں، جو ان کے لوحِ مزار پر کندہ ہے، ان کی مخالفت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

خدا دارم دلے بریاں ز عشق مصطفےٰ دارم

ندارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم

(ترجمہ) : میں خدا پر ایمان رکھتا ہوں اور میرا دل نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عشق میں کباب بن چکا ہے۔ کیا کسی کافر کے پاس ایسا سامان ہوتا ہے، جو میرے پاس ہے؟)

خطباتِ احمدیہ:

یو۔پی کے گورنر سرولیم میور (م ۱۹۰۵ء) نے "لائف آف محمدؐ" کے عنوان سے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ لکھی تھی۔ اس کتاب میں مصنف نے آنحضرتؐ کی شان میں بڑی گستاخیاں کی تھیں اور بعض مقامات پر ان کے بارے میں بڑے رکیک الفاظ استعمال کئے تھے۔

جب سرسید احمد خان اس کتاب کے مندرجات سے آگاہ ہوئے تو ان کا خون کھولنے لگا۔ وہ اس کا جواب لکھنا چاہتے تھے لیکن حوالے کی کتابیں یہاں موجود نہ تھیں۔ اتفاق سے ۱۸۶۹ء میں جب ان کے فرزند سید محمود اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے انگلستان جانے لگے تو سرسید بھی ان کے ساتھ ہو گئے۔ انگلستان کے کتاب خانوں میں بیٹھ کر انہوں نے سیرتِ طیبہ پر مواد جمع کیا۔ ایک بار وہ مالی طور پر بڑے پریشان ہو گئے۔ انہوں نے اس موقع پر اپنے دیرینہ رفیق نواب محسن الملک کو خط لکھا کہ وہ ان کے گھر کا اسباب اور تانبے کے برتن بیچ دیں اور اگر ضرورت پڑے تو کسی ہندو مہاجن سے قرض لے کر انہیں کچھ رقم بھجوائیں، تاکہ وہ اپنا کام پورا کر سکیں۔ سرسید نے محسن الملک کو اس خط میں یہ بھی لکھا کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ قیامت کے روز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں سے یہ کہیں کہ اس احمد کو ان کے حضور پیش کیا جائے جو ان کا دفاع کرتے ہوئے مقروض ہو گیا تھا۔

سرسید احمد خان نے "خطباتِ احمدیہ" کے عنوان سے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ لکھی اور اس میں سرولیم میور کے اعتراضات کا تشفی جواب دیا۔

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ:

سرسید احمد خان نے غازی پور میں قیام کے زمانے میں سائنٹیفک

سوسائٹی قائم کی تھی جس کا مقصد سائنس کے موضوع پر انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کر کے شائع کرنا اور سائنسی علوم پر اہلِ قلم سے مضامین لکھوا کر عوام و خواص کو یورپ میں ہونے والی سائنسی ترقی سے متعارف کرانا تھا۔ جب سرسید کا تبادلہ غازی پور سے علی گڑھ ہوا تو وہ سوسائٹی کا دفتر اور پریس بھی علی گڑھ لے آئے۔ ان دنوں علی گڑھ یونیورسٹی کا اجمل خان طبیہ کالج اسی عمارت میں چل رہا ہے جو سرسید نے سائنٹیفک سوسائٹی کے لئے بنوائی تھی۔ سرسید احمد خان نے سوسائٹی کی سرگرمیوں سے اہلِ علم کو روشناس کرانے کے لئے ایک مجلّہ سائنٹیفک سوسائٹی میگزین کے نام سے شائع کرنا شروع کیا۔ بعد ازاں اس مجلّے کا نام علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ہو گیا۔

تہذیب الاخلاق:

سرسید احمد خان نے ۱۸۷۰ء میں علی گڑھ سے تہذیب الاخلاق کے نام سے ایک مجلّہ جاری کیا جو کسی نہ کسی طرح ۱۸۹۷ء تک جاری رہا۔ اس مجلّے میں لکھنے والوں میں سرسید کے علاوہ نواب محسن الملک، خواجہ الطاف حسین حالی، نواب وقار الملک، شمس العلماء ذکاء اللہ (م ۱۹۱۰ء) مولوی فارقلیط اللہ، ڈپٹی نذیر احمد (م ۱۹۱۲ء) اور مولوی چراغ علی جو بعد میں اعظم یار جنگ (م ۱۸۹۵ء) کے لقب سے ملقب ہوئے، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ سرسید یہ چاہتے تھے کہ برِعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کے عوام اور خصوصاً مسلمان کھانے پینے اور رہنے سہنے کے لئے یورپین طور طریقے اپنائیں۔ اپنے بچوں کو انگریزی زبان اور جدید سائنسی علوم کی تعلیم دلوائیں اور انہیں سکولوں اور کالجوں میں داخل کرائیں۔ سرسید احمد خان اپنے قیامِ انگلستان کے دوران میں وہاں سائنس میں ہونے والی ترقی اور وہاں کی طرزِ معاشرت سے برِعظیم کے باشندوں کو متعارف کرانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لئے سرسید اور ان کے ساتھیوں نے سلیس زبان استعمال کی، جو علی گڑھ تحریک کا طرۂ امتیاز بن گئی۔ سرسید احمد خان کے خطوط چھپ چکے ہیں جو غالب کے خطوط کی طرح سلیس زبان میں لکھے گئے ہیں۔

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ:

سرسید احمد خان کے نزدیک اعلیٰ تعلیم کا حصول مسلمانوں کے تمام

مسائل کا حل تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد مسلمان اقتصادی طور پر تباہ ہو گئے۔ ان کی جائدادیں نیلام ہو گئیں، ان کی جاگیریں ضبط ہو گئیں اور ہزاروں افراد کو انگریزوں نے انتقامی جذبہ کے تحت تختۂ دار پر چڑھا دیا۔ لاکھوں کھاتے پیتے افراد نانِ شبینہ کے لئے محتاج ہو گئے۔

ہندوؤں کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ انگریزوں کے ساتھ ہر قسم کا تعاون کرنے لگے۔ انہوں نے انگریزی زبان پڑھ کر سرکاری ملازمتیں حاصل کر لیں۔ مسلمان تعلیم میں بہت پیچھے رہ گئے۔ سرسید کے زمانے میں ایک سال کلکتہ یونیورسٹی سے ۲۴۰ اُمیدوار بی اے کے امتحان میں کامیاب ہوئے، ان میں فقط ایک مسلمان تھا۔ سرسید لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو پنکھا قلی، سائیس، گھسیارے اور کوچوان کے علاوہ اور کوئی ملازمت نہیں ملتی۔ وہ تجارت اور تعلیم میں ہندوؤں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں اور ان کا بال بال قرض میں پھنسا ہوا ہے۔ وہ فضول رسمیں ادا کرنے اور رواج پُورے کرنے کے لئے مہاجنوں سے سُود پر بڑی بڑی رقمیں لے رہے ہیں۔ وہ یہ قرض واپس نہیں کر سکتے اس لئے ان کی جائداد ہندو مہاجن قرق کروا لیتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے آخر میں حالات اس قدر گھمبیر تھے کہ سرسید احمد خان نے برِعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کی سکونت ترک کر کے مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ میں مستقل رہائش اختیار کر لینے کا ارادہ ظاہر کیا۔ ایک رُوز ان کے ضمیر نے انہیں جھنجھوڑا کہ وہ تو وہاں جا کر گوشۂ عافیت میں بیٹھ جائیں گے لیکن یہاں بسنے والے مسلمانوں کی رہنمائی کون کرے گا؟ اس خیال کے آتے ہی انہوں نے اپنے دل میں یہ کہا کہ مسلمانوں کو اس حال میں چھوڑ کر گوشۂ عافیت میں بیٹھ جانا مردانگی کے خلاف ہے۔ انہیں یہیں رہ کر ان کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرنا چاہیے۔ اس خیال کے دل میں جاگزیں ہوتے ہی انہوں نے ہجرت کا ارادہ ترک کر دیا اور خود کو مسلمانوں کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔

سرسید حصولِ تعلیم کو مسلمانوں کے تمام مسائل کا حل سمجھتے تھے۔ اس لئے وہ جہاں بھی رہے انہوں نے تعلیمی ادارے قائم کئے۔ مراد آباد میں قیام کے زمانے میں انہوں نے وہاں ایک مدرسہ قائم کیا اور جب ان کا تبادلہ غازی پُور ہوا تو انہوں نے

وہاں بھی ایک مدرسہ قائم کیا۔ یہ انگلستان جانے سے پہلے کی باتیں ہیں ابھی ان کے ذہن میں کالج کا تصور نہیں اُبھرا تھا۔

۱۸۶۹ء میں سرسید کے فرزند سید محمود کو انگلستان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے سرکاری وظیفہ ملا تو سرسید بھی ان کے ساتھ چلے گئے۔ سید محمود کو کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ ملا۔ یہ اقامتی یونیورسٹی ہے۔ ہر طالب علم کے لئے یونیورسٹی کی حدود میں رہنا ضروری ہے۔ طلبہ ایک میز پر ناشتہ کرتے، ایک ہی جگہ دوپہر کا کھانا کھاتے، شام کی چائے مل کر پیتے اور رات کے کھانے پر ایک میز پر بیٹھتے۔ ان کا لباس بھی ایک سا ہوتا تھا۔ اقامتی یونیورسٹی میں اُستاد اور طالب علم کا بڑا قریبی تعلق ہوتا ہے وہاں طالب علم کو ہمہ وقت علمی ماحول ملتا ہے۔ سرسید احمد خان اس نظام تعلیم سے بے حد متاثر ہوئے اور انہوں نے برِعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش میں بھی اسی طرز کا ایک علمی ادارہ قائم کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ سرسید نے انگلستان سے اس مجوزہ تعلیمی ادارے کا خاکہ "التماس خدمت اہلِ اسلام و حکام ہند درباب ترقیٔ تعلیم مسلمانانِ ہند" کے عنوان سے تیار کر کے اپنے دیرینہ رفیق اور دستِ راست نواب محسن الملک کی خدمت میں ارسال کیا اور انہیں اس تجویز کو عام کرنے کا مشورہ دیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد سرسید نے اپنی اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے ایک مجلس "کمیٹی خواستگار ترقیٔ تعلیم مسلمانان" کے نام سے تشکیل دی۔ سرسید اور ان کے رفقاء نے ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو ایک سکول کی بُنیاد رکھی، جو ترقی کر کے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج بن گیا۔ اس کے قیام کے ساتھ ہی سرسید احمد خان نے اپنی تمام صلاحیتیں کالج کو پروان چڑھانے کے لئے وقف کر دیں۔

سرسید نے انگلستان سے ماہرینِ تعلیم کو بلا کر کالج میں تدریس پر مامور کیا اور مشہور انگریز ماہر تعلیم پروفیسر تھیوڈر بیک (م ۱۸۹۹ء) پرنسپل مقرر ہوئے۔ سرسید یہ چاہتے تھے کہ یہاں ایسے طالب علم تیار کئے جائیں کہ جب وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے عملی زندگی میں قدم رکھیں تو ان کے ایک ہاتھ میں سائنس ہو اور دوسرے ہاتھ میں قرآن۔ ان کے سر پر لا الٰہ الا اللہ کا تاج ہو۔ سرسید نے کالج کے احاطے میں ایک شاندار مسجد تعمیر کرائی اور اپنے پُرانے ہم سبق مولانا محمد قاسم نانوتوی (م ۱۸۸۰ء) بانیٔ

دارالعلوم دیوبند کو لکھا کہ وہ طلبہ کی دینی تعلیم و تربیت کے لئے کسی اچھے عالم کو بھیجیں تو انہوں نے اپنے داماد مولانا عبداللہ انصاری کو ناظم دینیات بنا کر علی گڑھ بھیجا۔ مولانا شبلی نعمانی اور پروفیسر آرنلڈ جیسے فضلاء کالج سے وابستہ ہوئے۔ نماز کے اوقات میں پروفیسر آرنلڈ (م ۱۹۳۰ء) ہوسٹل کے برآمدے میں گھومتے اور طلبہ کو مسجد میں جا کر نماز ادا کرنے کی تلقین کرتے۔ اسی بنا پر وہ طلبہ کے حلقے میں "مولانا آرنلڈ" کے نام سے مشہور ہو گئے۔

جب سرسید نے ایم اے او کالج کی بنیاد رکھی تو بعض حلقوں سے ان کی پُرزور مخالفت کی گئی۔ اکبر الہ آبادی (م ۱۹۲۱ء) اور محرم علی چشتی لاہوری (م ۱۹۳۴ء) نے خود کو صرف اسی کام کے لئے وقف کر دیا۔ چشتی نے تو سرسید کی مخالفت میں "رفیق ہند" کے نام سے باقاعدہ ایک مجلّہ جاری کیا۔ لیکن سرسید بھی اپنی دھن کے پکّے تھے اور وہ مخالفت کی پرواہ کئے بغیر اپنے عظیم مشن کی تکمیل میں لگے رہے اور بالآخر ان کے مخالفین کو بھی ان کے کام کو سراہنا پڑا۔ ایم اُو کالج کی دیکھا دیکھی لاہور میں اسلامیہ کالج، پشاور میں اسلامیہ کالج، لکھنؤ میں شیعہ کالج اور امرتسر میں ایم اے اُو کالج (جو اب لاہور میں کام کر رہا ہے) قائم ہوئے۔ رفتہ رفتہ کئی شہروں میں اسلامیہ کالج قائم ہوئے اور مسلمانوں میں مغربی علوم کی تحصیل کا شوق پیدا ہوا۔

سرسید احمد خان کا سیاسی کردار:

۱۸۸۵ء تک برِّعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش میں کوئی سیاسی جماعت قائم نہیں ہوئی تھی۔ اسی سال انڈین سول سروس کے ایک ریٹائرڈ افسر اے او ہیوم کے دل میں یہ خیال گزرا کہ یہاں کے باشندوں کو سیاسی خیالات کے اظہار اور حکومت تک اپنی بات پہنچانے کے لئے ایک پلیٹ فارم مہیا کرنا چاہیے۔ بصورتِ دیگر ۱۸۵۷ء جیسے حالات دوبارہ پیدا ہو سکتے ہیں۔ ہیوم ایک سیاسی جماعت بنانے کا خیال لے کر وائسرائے لارڈ ڈفرن (Dufferin) سے ملا اور اس نے وائسرائے کو قائل کر کے سیاسی جماعت بنانے کی اجازت لے لی۔

ہیوم نے انڈین نیشنل کانگرس کے نام سے ایک سیاسی جماعت قائم کی

اس جماعت کے قائم ہوتے ہی ہندو کثرت کے ساتھ اس میں شامل ہو گئے۔ وہ تعلیم اور تجارت میں مسلمانوں سے بہت آگے تھے۔ دوسری جانب مسلمان ابھی ۱۸۵۷ء میں ہونے والے نقصان کی تلافی بھی نہ کرنے پائے تھے۔ سرسید یہ بھی جانتے تھے کہ اس ملک میں ہندوؤں کی واضح اکثریت ہے اس لئے کانگرس ہندوؤں کی نمائندہ جماعت بن کر رہ جائے گی۔ ان حالات میں سرسید نے مسلمانوں کو کانگرس میں شامل نہ ہونے اور سیاست سے الگ تھلگ رہنے کا مشورہ دیا۔ سرسید یہ چاہتے تھے کہ مسلمان خود کو تحصیلِ علم کے لئے وقف کر دیں اور جب تک ان میں سیاسی شعور پیدا نہ ہو جائے اور ۱۸۵۷ء میں ان کے بارے میں انگریزوں کے دلوں میں پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کا ازالہ نہ ہو جائے اس وقت تک وہ سیاست میں حصہ نہ لیں۔

سرسید احمد خان نے مسلمانوں میں سیاسی شعور پیدا کرنے اور انہیں کانگرس سے دور رکھنے کی غرض سے پیٹریاٹک ایسوسی ایشن (Patriatic Association) قائم کی۔ یہ ایسوسی ایشن مسلمانوں کی نمائندہ جماعت سمجھی جاتی تھی اور وہ گاہے ماہے مسلمانوں کے حقوق کے لئے آواز بلند کرتی رہتی تھی۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس:

مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف مائل کرنے، اہم شہروں میں انگریزی طرز کے مدارس قائم کرنے، اس کام کے لئے عوام کی حمایت اور چندہ حاصل کرنے کی غرض سے سرسید احمد خان نے ۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء کو علی گڑھ میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانگرس کی بنیاد رکھی۔ کچھ عرصے بعد آل انڈیا کے الفاظ ہٹا دیئے گئے اور کانگرس کی جگہ کانفرنس لکھنا منظور ہوا۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس مختلف شہروں میں منعقد ہوتے اور ان میں ملک بھر کے مسلم عمائدین شرکت کرتے۔ عوام اپنے قائد کی اپیل پر دل کھول کر چندہ دیتے اور ان کے خیالات سنتے۔ رفتہ رفتہ اس کانفرنس پر سیاسی رنگ غالب آنے لگا اور تعلیم کے ساتھ ساتھ قومی مسائل اور سیاسی امور پر بھی تقریریں ہونے لگیں۔ پھر ایک ایسا وقت بھی آیا جب اس کانفرنس کے پلیٹ فارم سے اٹھنے والی آواز کو

مسلمانوں کی نمائندہ آواز سمجھا جانے لگا۔ جب تک مسلم لیگ قائم نہیں ہوئی تھی اس وقت تک محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ہی مسلم سیاسی زعما کو اپنا پلیٹ فارم مہیا کرتی رہی۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ دسمبر ۱۹۰۶ء کے آخری ہفتے میں ڈھاکہ میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا اور ملک بھر کے مسلم رہنما وہاں جمع تھے۔ اس موقع پر مسلمانوں کو اپنی الگ سیاسی نمائندہ جماعت قائم کرنے کا خیال آیا اور ۳۰ دسمبر کو ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی۔

سرسید اور دو قومی نظریہ:

آغاز کار میں سرسید نے بلا تفریق مذہب و ملت برعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کے باشندوں کی خدمت کا بیڑا اٹھایا تھا۔ ان کے دوستوں میں ہندو بھی شامل تھے۔ وہ جگہ جہاں آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی شاندار عمارت کھڑی ہے یہ مشہور انقلابی رہنما راجہ مہندر پرتاپ (م ۱۹۷۹ء) کے بزرگوں کی ملک تھی۔ جب سرسید نے علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم قائم کرنے کا ارادہ کیا تو ہندو مالکان نے زمین سرسید کی نذر کر دی۔ اس زمانے میں سرسید ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دلہن کی دو خوبصورت آنکھوں سے تشبیہ دیا کرتے تھے۔

۱۸۶۷ء میں ہندوؤں نے خود افتراق کی بنیاد ڈالی۔ اس کا آغاز بھی یو۔ پی سے ہوا۔ اس وقت اُردو سرکاری دفاتر کی زبان تھی۔ لوگ اُردو زبان میں ہی سرکاری محکموں میں درخواستیں پیش کرتے اور اسی زبان میں انہیں جواب دیا جاتا تھا۔ دفاتر کا ریکارڈ بھی اُردو میں رکھا جاتا تھا۔ یکایک بنارس کے تنگ نظر اور عاقبت نا اندیش ہندوؤں نے حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ سرکاری دفاتر میں اُردو کی جگہ ہندی کو سرکاری زبان کا درجہ دیں اور اس زبان کے لئے دیوناگری رسم الخط کو اپنائیں۔ اس مطالبے نے جلد ہی ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی اور ہندو رہنما گورنر سے ملنے اور اس پر دباؤ ڈالنے لگے۔ سرسید احمد خان، نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک جیسے اصحاب فکر و نظر جو ہندو مسلم اتحاد کا خواب دیکھ رہے تھے وہ ہندوؤں کے اس غیر دانشمندانہ مطالبے پر بڑے حیران ہوئے اور وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے کہ ہندوؤں نے

افتراق کی پہل کر دی ہے۔ اس لئے اب ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں گی۔

جن دنوں سرکاری دفاتر میں ہندی زبان بخطِ دیوناگری رائج کرنے کا مطالبہ زور پکڑ رہا تھا سرسید احمد خان کسی کام کے سلسلے میں بنارس کے کمشنر مسٹر شیکسپئر سے ملے۔ گفتگو کے دوران سرسید نے مسلمانوں کی تعلیمی حالت کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا۔ مسٹر شیکسپیر بڑے تعجب کے ساتھ ان کی گفتگو سنتا رہا۔ جب سرسید نے اپنی بات ختم کی تو مسٹر شیکسپئر نے کہا یہ پہلا موقعہ ہے کہ وہ ان سے صرف مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سن رہا ہے۔ اس سے قبل تو وہ ہمیشہ ہندوستانیوں کی فلاح و بہبود کے بارے میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ اس پر سرسید نے کہا "اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گے۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے بھی زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب، جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں، بڑھتا نظر آتا ہے"۔ اس پر مسٹر شیکسپئر نے کہا "اگر آپ کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی تو یہ ایک افسوسناک امر ہو گا"۔ سرسید نے جواب دیا "مجھے بھی اس پر افسوس ہو گا، تاہم مجھے اپنی پیشین گوئی پر پورا یقین ہے"۔ اس کے بعد سرسید نے اپنی تمام تر توانائی اور صلاحیت مسلمانوں کی فلاح و بہبود پر لگا دی اور جب ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگرس کا قیام عمل میں آیا تو سرسید اور ان کے رفقاء نے مسلمانوں کو ہندوؤں کی اس سیاسی تنظیم سے الگ تھلگ رہنے کا مشورہ دیا۔

علی گڑھ تحریک کا علمی پہلو:

علی گڑھ تحریک اور سرسید احمد خان میرے نزدیک مترادف الفاظ ہیں۔ بالفاظِ دیگر علی گڑھ کا دوسرا نام سرسید احمد خان ہے اور سرسید احمد خان کا دوسرا نام علی گڑھ تحریک ہے۔ یہ دونوں اس قدر مربوط ہیں کہ انہیں الگ کرنا ممکن نہیں ہے۔

علی گڑھ تحریک بہت جلد ایک قومی تحریک بن گئی۔ اس تحریک نے قومی یک جہتی کے لئے بڑا کام کیا۔ صوبہ سرحد، بلوچستان، پنجاب، سندھ، مدراس، بنگال، گجرات، بہار، آسام، کرناٹک، سی۔ پی، راجستھان اور بمبئی وغیرہ سے طلبہ

علی گڑھ پڑھنے کے لئے آتے تھے اور وہاں تمام صوبائی اختلافات ختم کرکے ۔ علیگ ۔ بن کر نکلتے تھے ۔ علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہونے والے طلبہ پورے ملک پر چھا گئے ۔ ان میں خود اعتمادی اور قوم کا درد تھا ۔ انہوں نے سرکاری حلقوں میں مسلمانوں کے خلاف غلط فہمیاں دُور کیں ۔

ایم اے او کالج علی گڑھ کا اثر جلد ہی ملک کے طول و عرض میں محسوس ہونے لگا ۔ کلکتہ میں نواب عبداللطیف (م ۱۸۹۳ء) نے محمڈن لٹریری سوسائٹی قائم کی ۔ اس سوسائٹی کے ہفتہ وار اجلاس ہوتے تھے جن میں یورپین اور ہندوستانی مل کر علمی مباحث میں حصہ لیتے ۔ بنگال میں جدید یورپی علوم حاصل کرنے کا رجحان بڑھا ۔ کلکتے سے کئی انگریزی اخبارات و جرائد شائع ہونے لگے ، جس سے انگریزی زبان کو فروغ ملا ۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکام نے ۱۸۳۸ء میں بنگال کے ۸۰ مسلم اوقاف اپنی تحویل میں لے لئے تھے ۔ مسلمانوں کے مطالبے پر حکومت نے یہ اوقاف واگزار کر دیئے ان اوقاف کی آمدنی سے ڈھاکہ ، چٹاگانگ اور راجشاہی میں مسلم طلبہ کے لئے سکول قائم کئے گئے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے طلبہ کو وظائف دیئے گئے ۔

مولوی ابوالقاسم فضل الحق (م ۱۹۶۲ء) نے کلکتہ میں اسلامیہ کالج قائم کیا ۔ ۱۸۷۷ء میں سید امیر علی نے سنٹرل محمڈن ایسوسی ایشن قائم کی ۔ اسی ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام انہوں نے " دی سپرٹ آف اسلام " (The Spirit of Islam) لکھی جو علمی حلقوں میں بڑی مقبول ہوئی ۔ اس کا اُردو ترجمہ " روح اسلام " کے عنوان سے چھپ چکا ہے ۔

پنجاب میں میاں شاہ دین (م ۱۹۱۸ء) نے ینگ مینز محمڈن ایسوسی ایشن (Young Men's Muhammadan Association) کی بنیاد رکھی ۔ اس ایسوسی ایشن کے باقاعدہ اجلاس ہوتے جن میں علمی اور سماجی مسائل زیر بحث آتے ۔ ۱۸۸۴ء میں مسلمانوں کے چند بہی خواہوں نے تعلیمی ادارے کھولنے اور عیسائی مشنریوں کا مقابلہ کرنے کی غرض سے لاہور میں انجمن حمایتِ اسلام کی بنیاد رکھی ۔ انجمن حمایتِ اسلام نے لاہور میں متعدد ہائی سکول ، اسلامیہ کالج ریلوے روڈ اور طبیہ کالج قائم کئے ۔ کچھ عرصے بعد کوپر روڈ پر طالبات کے لئے کالج کھولا گیا ۔ انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ

جلسوں نے بڑی شہرت حاصل کی ۔ ان جلسوں میں ملک بھر سے مسلم عمائدین شرکت کرتے ، علامہ اقبال اپنا کلام سناتے اور خونِ مسلم کو گرماتے ۔ ان جلسوں میں سرسید ، وقار الملک ، ڈپٹی نذیر احمد (م ۱۹۱۲ء) مولانا شبلی ، مولانا حالی اور نواب حمید اللہ خان والئ بھوپال (م ۱۹۶۰ء) شرکت کر چکے ہیں ۔

خان بہادر ، ڈپٹی برکت علی خان (م ۱۹۰۵ء) اور پٹیالہ کے خلیفہ محمد حسین (م ۱۹۰۸ء) نے انجمن اسلامیہ پنجاب کی بنیاد رکھی ۔ پہلے اس کا صدر دفتر امرتسر میں تھا لیکن جلد ہی وہ لاہور منتقل ہو گیا ۔ متصل دروازہ لاہور سے باہر برکت علی محمڈن ہال تعمیر کیا گیا جہاں علمی اور سماجی مسائل پر مذاکرات ہوتے ۔ یہ انجمن بادشاہی مسجد کا نظم و نسق بھی چلاتی رہی ۔

امرتسر میں انجمن اسلامیہ امرتسر قائم ہوئی جس نے امرتسر میں ایم ۔ اے ۔ او ہائی سکول اور ایم اے او کالج قائم کئے ۔ قیامِ پاکستان کے بعد یہ کالج لاہور منتقل ہو گیا ۔ جالندھر میں بھی ایک اسلامیہ کالج قائم ہوا ۔ گجرات میں نواب سر فضل علی نے زمیندار کالج قائم کیا ۔ دہلی میں اینگلو عربک کالج نے علمی شعبے میں بڑی خدمت انجام دی ۔ لکھنؤ میں شیعہ کالج قائم ہوا اور اٹاوہ میں مولوی بشیر الدین نے اسلامیہ ہائی سکول کو ایک مثالی ادارہ بنا دیا ۔ علی گڑھ میں شیخ عبداللہ عرف پاپا میاں نے گرلز کالج کی بنیاد رکھی ۔

کراچی میں خان بہادر حسن علی آفندی (م ۱۸۹۵ء) نے ۱۸۸۵ء میں وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن کے ہاتھوں سندھ مدرسہ کی بنیاد رکھوائی ۔ اس مدرسے کے طلبہ میں قائدِاعظم اور قیامِ پاکستان کے بعد سندھ کے پہلے مسلم گورنر غلام حسین ہدایت اللہ (م ۱۹۴۸ء) کے نام قابلِ ذکر ہیں ۔ اس ادارے نے سندھ کے مسلمانوں کی بیداری میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے ۔ اب اس ادارے کو یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا ہے ۔

صوبہ سرحد بھی سرسید کے کام سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا ۔ ۱۸۹۰ء میں مفتی فدا محمد خان بیرسٹر نے انجمن حمایتِ اسلام پشاور قائم کی اور ایک پرائمری سکول کھولا جو ترقی کرتے ہوئے ہائی سکول بن گیا ۔ اسی بزرگ نے پشاور میں اسلامیہ کلب قائم کیا ، جس کے زیر اہتمام مسلم طلبہ کے لئے ہاسٹل اور عوام کے لئے لائبریری

تعمیر کی گئی۔

صاحبزادہ عبدالقیوم خان (م ۱۹۳۷ء) نے جو "سرسید سرحد" کے نام سے پہچانے جاتے ہیں پشاور میں ایک سکول کھولا اور ۱۹۱۳ء میں علی گڑھ کے نمونے پر اسلامیہ کالج قائم کیا۔ اسی کالج نے پشاور یونیورسٹی کو جنم دیا ہے۔ اسلامیہ کالج پشاور نے طلبہ کی ایک کھیپ تیار کی، جس نے سرحد کے مسلمانوں کی بیداری میں ناقابل فراموش کردار ادا کیا ہے۔

یو۔ پی کے متعدد شہروں میں مسلمانوں نے اپنی تنظیمیں قائم کیں اور تعلیمی ادارے کھولے۔ اس کا تمام تر کریڈٹ سرسید احمد خان کو جاتا ہے۔

تحریک علی گڑھ کا ادبی پہلو:

سرسید احمد خان کا ایک بڑا اہم کام یہ ہے کہ انہوں نے اُردو زبان کو ذریعہ خیال بنایا اور مقفع اور مسجع عبارات کی جگہ سادہ و سلیس طرز زبان کو مقبول بنایا۔ ان کے سامنے مرزا غالب کے خطوط موجود تھے جن کی سلاست پر جان قربان کرنے کو جی چاہتا ہے۔ سرسید نے ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط کی مخالفت کی اور اُردو کو مقبول بنانے کے لئے اپنی تمام تر صلاحیت صرف کر دی۔ سرسید نے اُردو میں مضمون نگاری کا مذاق پیدا کیا۔ انگریزی اخبارات و جرائد میں جس طرح کے مضامین چھپتے تھے ویسے مضامین اُردو اخبارات و جرائد میں لکھنے اور چھپوانے کا رواج نہ تھا۔ سرسید نے تہذیب الاخلاق کے ذریعے اس ذوق کو عام کیا۔ سرسید نے نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولوی چراغ علی، الطاف حسین حالی، شمس العلماء ذکاء اللہ، ڈپٹی نذیر احمد، شبلی نعمانی اور محمد فارقلیط اللہ جیسے مضمون نگاروں کی ایک ٹیم تیار کی۔

علی گڑھ تحریک نے سوانح نگاری کا صحیح مذاق پیدا کیا۔ ایک بار راقم الحروف کی موجودگی میں ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم (م ۱۹۸۶ء) نے ایک علمی جلسے میں فرمایا کہ وہ حالی کی بجائے شبلی کی جماعت کے فرد ہیں۔ اس کے باوجود وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جس انداز سے حالی نے سرسید کی سوانح عمری "حیات جاوید" کے عنوان سے لکھی ہے ویسی سوانح عمری بعد میں کسی نے نہیں لکھی۔

مولانا الطاف حسین حالی نے سرسید کے مشورے پر ہی روایتی قسم کی گل و بلبل اور ساغر و پیمانہ کی شاعری ترک کر کے نیچرل شاعری اپنائی اور مدو جزر اسلام لکھی جو عوام میں "مسدس حالی" کے نام سے مشہور ہے۔ یہی مدو جزر اسلام علامہ اقبال (م ۱۹۳۸ء) کے شکوہ و جواب شکوہ کی خشتِ اوّل بنی۔ سرسید اس کے بارے میں یہ کہا کرتے تھے۔ "جب روزِ قیامت اللہ تعالیٰ مجھ سے یہ سوال کرے گا کہ دنیا سے میرے لئے کیا لائے ہو تو میں یہ عرض کروں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا کر لایا ہوں"۔

سرسید کے سوانح نگار اس پر متفق ہیں کہ انیسویں صدی کے اُردو ادب کو جتنا سرسید نے متاثر کیا ہے، اتنا اور کسی نے نہیں کیا۔ ان کے مقالات متعدد ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ مولوی عبدالحق اور حسرت موہانی دونوں سرسید کے زمانے میں علی گڑھ میں پڑھتے تھے۔ ان دونوں نے خود کو اُردو زبان کی ترویج اور ترقی کے لئے وقف کر دیا۔ اگر مولانا شبلی سرسید سے نہ ملتے تو وہ ضلع اعظم گڑھ کے کسی دیہاتی مدرسے میں حنفی فقہ پڑھانے میں ہی عمر صرف کر دیتے۔ یہ سرسید ہی تھے جنہوں نے ان کی توجہ المامون، شعر العجم، سیرت النعمان، علم الکلام اور موازنہ انیس و دبیر کی جانب مبذول کرائی۔ محسن الملک سرسید کے زیر اثر نہ آتے تو آیات بینات جیسی مناظرانہ کتابیں لکھنے میں ہی زندگی گزار دیتے۔ وقار الملک مشتاق حسین کلرکی سے ترقی کر کے ہیڈ کلرک یا کسی دفتر کے سپرنٹنڈنٹ بن جاتے تھے۔ سرسید بڑے مردم شناس تھے اور انہوں نے اہل قلم کی ایک ٹیم جمع کر لی تھی، یہ عجیب اتفاق ہے کہ سرسید نے درجن بھر قد آور شخصیتیں پیدا کیں، حالانکہ کسی تناور درخت کے سائے میں کوئی چھوٹا پودا نہیں پھلتا پھولتا۔

علی گڑھ تحریک کا مذہبی پہلو:

سرسید اور ان کے رفقاء نے مسلمانوں کو قرآن پر غور کرنے کا مشورہ دیا وہ یہ کہتے ہیں کہ قرآن اپنے قارئین کو بار بار غور و فکر کی دعوت دیتا ہے، مسلمان کیوں غور و فکر سے عاری ہو گئے ہیں۔ سرسید احمد خان نے عقلیات پر زور دیا اور ضعیف روایات اور قصے کہانیوں کو یکسر مسترد کر دیا۔ انہوں نے قرآن حکیم کے سترہ پاروں کی

جو تفسیر لکھی اس میں اسرائیلیات کی بجائے عقلی توضیح کو ترجیح دی ۔ انہوں نے تفسیر لکھتے وقت سائنسی نظریات کو مدِ نظر رکھا اور معجزات کی سائنٹیفک توضیح کی ۔ انہیں تنگ نظر علماء نے کافر، کرستان کے علاوہ نو معتزلی کہنے سے بھی گریز نہیں کیا ۔ یہاں یہ بات مدِ نظر رکھی چاہیے کہ سرسید کا قرآن حکیم پر کامل ایمان تھا اور یہی مسلمان ہونے کی شرط ہے ۔ اب رہی تفسیر، تو سیکڑوں تفسیریں ہمارے ہاں متداول ہیں ۔ ان تمام مفسّروں نے اپنی اپنی بساط اور عقائد کے مطابق قرآن حکیم کی تفسیریں لکھی ہیں، کیا یہ سب کافر تھے ؟ تفسیر میں اختلاف کی گنجائش موجود ہے، خود صحابۂ کبار میں بعض آیات کی تفسیر کے بارے میں اختلاف موجود تھے ۔

سرسید نے مذہبی رواداری کا عملی ثبوت دیا ۔ کالج کی مسجد میں شیعہ سُنّی اپنے اپنے طریقے پر نماز ادا کرتے تھے ۔ آج بھی یہ واحد مسجد ہے جہاں پہلے سُنّی جمعہ کی نماز ادا کرتے ہیں اور ان کے مسجد خالی کرنے کے بعد شیعہ نمازِ جمعہ ادا کرنے کے لئے آتے ہیں، سرسید کے زمانے میں مسلمان طلبہ کے لئے پانچوں وقت کی نماز ادا کرنا ضروری تھی ۔ ان کی مذہبی تعلیم کے لئے ناظمِ دینیات کا عہدہ قائم کیا گیا اور اس عہدے پر مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے داماد، مولانا عبداللہ انصاری کا تقرر ہوا ۔ مولانا عبداللہ انصاری کا شمار اس عہد کے نامور علماء میں ہوتا تھا ۔ انہوں نے علی گڑھ میں شعبۂ دینیات کی بنیاد رکھی جو وقت گذرنے کے ساتھ مکمل فیکلٹی بن گئی ۔ سرسید نے مسلمانوں کو توہمات سے نکالنے کے لئے بڑی تگ و دو کی اور اسی طرح مذہب کے نام پر ہونے والی رسموں کو ترک کرنے کا مشورہ دیا ۔

علی گڑھ تحریک کا سماجی پہلو :

زندگی کے متعلق سرسید کا نظریہ ترقی پسندانہ تھا ۔ تہذیب الاخلاق کے مضامین اس پر دال ہیں کہ سرسید اور ان کے جانشین مسلمانوں کا معیار زندگی بلند کرنا چاہتے تھے ۔ وہ مسلمانوں کو یہ مشورہ دیتے تھے کہ انگریزوں سے اچھی باتیں سیکھیں اور ان پر عمل کریں ۔ خود سرسید میز، کرسی پر بیٹھ کر کھانا تناول کرتے اور اپنے مہمانوں کو بھی میز کرسی پر بٹھا کر کھانا پیش کرتے تھے ۔ ان کے ہاں چینی کے برتن، شیشے کے

گلاس اور چھری کانٹے استعمال ہوتے تھے ۔ وہ دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے کہ وہ کھانے پینے میں شائستگی اختیار کریں ۔ لباس کے معاملے میں اسلام بڑا فراخ دین ہے ۔ موسم کے اعتبار سے مختلف ممالک کے عوام کو مختلف قسم کے لباس استعمال کرنے پڑتے ہیں، اس لئے تمام لوگوں کا لباس ایک سا نہیں ہو سکتا ۔ سرسید اور ان کے رفقاء انگریزی لباس استعمال کرنے کے حق میں تھے ۔ وہ اور ان کے ساتھی انگریزی طرز کا کوٹ پہنتے تھے لیکن اس کے ساتھ وہ اسلامی تشخص کے بھی زبردست حامی تھے ۔ سرسید اور ان کی ٹیم ترکی ٹوپیاں استعمال کرتے تھے، وہ بے جا نمود و نمائش کے سخت خلاف تھے ۔ وہ اپنی تقریروں میں مسلمانوں کو کفایت شعاری اور سادہ زندگی بسر کرنے اور بیاہ شادی، عقیقے اور ختنے کے موقعوں پر فضول خرچی بند کرنے کی تلقین کیا کرتے تھے ۔ مسلمان عام طور پر ایسے موقعوں پر ہندو ساہو کاروں سے سود پر رقمیں لے کر خرچ کیا کرتے تھے ۔ سرسید اس کے بھی خلاف تھے کہ مسلمان ہندو ساہو کاروں کے پاس اپنی جائداد گروی رکھ کر قرض لیں اور انہیں فضول اور بیہودہ رسمیں پوری کرنے میں صرف کر دیں ۔

مختصر یہ کہ ہماری قومی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو علی گڑھ تحریک سے متاثر نہ ہوا ہو ۔ مسلم لیگ کی بنیاد بھی علی گڑھ والوں نے رکھی اور انہوں نے ہی اسے پروان چڑھایا ۔ تحریک آزادی میں علی گڑھ والے ہی قافلہ سالار تھے ۔ مولانا محمد علی جوہر (م ۱۹۳۱ء)، شوکت علی (م ۱۹۳۸ء)، حسرت موہانی (م ۱۹۵۱ء)، لیاقت علی خان (م ۱۹۵۱ء) اور سردار عبدالرب نشتر (م ۱۹۵۸ء) علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے ۔

باب (8)

محسن الملکؒ

مسلمانانِ پاک وہند اور بنگلہ دیش کے عظیم محسن اور سرسیّد احمد خان کے دستِ راست محسن الملک سیّد مہدی علی ۹ دسمبر ۱۸۳۷ء کو یوپی کے مشہور شہر اٹاوہ میں پیدا ہوئے ۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے نانا مولوی محمد علی سے حاصل کی اور اس کی تکمیل پھپھوند میں مولوی عنایت حسین سے کی ۔ تعلیم سے فراغت کے بعد انہوں نے بطور محرّر ملازمت کا آغاز کیا ۔ اپنی دیانت ، لگن اور خداداد قابلیت کی بدولت ان پر ترقی کے دروازے کھلتے چلے گئے اور وہ مختلف اوقات میں اہلمد ، پیش کار ، سر رشتہ دار ، تحصیلدار اور ڈپٹی کلکٹر کے عہدوں پر متعین رہے ، انہوں نے ہر جگہ کارہائے نمایاں انجام دیئے اور اپنی سیرت اور کردار کے اَنمٹ نقوش چھوڑے ۔ ۱۸۶۲ء کے قحط میں انہوں نے فاقہ کش عوام کی خدمت بڑے احسن طریقے سے کی ۔

نظام حیدر آباد کی حکومت ایسے مخلص اور باصلاحیت افراد کی ٹوہ میں لگی رہتی تھی ۔ جب محسن الملک کی دیانت اور اپنے کام میں لگن کا شہرہ حیدر آباد پہنچا تو انہیں ایک بڑے منصب کی پیش کش ہوئی ۔ محسن الملک نے بڑی سوچ بچار کے بعد یہ پیش کش قبول کرلی اور وہ ۱۸۷۴ء میں حیدر آباد چلے گئے ۔

۱۸۸۸ء میں وہ ایک سرکاری کام کے سلسلے میں لندن گئے ۔ سرسیّد کی طرح انہوں نے بھی انگریزوں کے نظامِ تعلیم اور ان کی معاشرتی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ۔ انہوں نے یہ جان لیا کہ ان کے ہم وطنوں کی پس ماندگی صرف اور صرف اعلیٰ تعلیم کے حصول سے ختم ہو سکتی ہے ۔

محسن الملک نے پوری لگن اور دیانت کے ساتھ اپنے فرائضِ منصبی انجام دیئے اور نظام کی حکومت نے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں محسن الملک

کے خطاب سے نوازا ۔ ۱۲ جولائی ۱۸۹۳ء کو انہوں نے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور پنشن لے کر سرسیّد احمد خان کے پاس علی گڑھ چلے گئے ۔

سرسیّد احمد خان کے ساتھ ان کا تعارف ۱۸۶۳ء میں ہوا تھا ۔ بعض مذہبی مسائل میں اختلاف کے باوجود محسن الملک ، سرسیّد احمد خان کے بڑے مدّاح تھے ۔ انہوں نے دل و جان کے ساتھ سرسیّد کا ساتھ دیا اور ان کے دستِ راست بن گئے ۔ انہوں نے تہذیب الاخلاق کے اجراء میں سرسیّد کا ہاتھ بٹایا اور اس مجلّے میں اپنے بہت سے مضامین شائع کرائے ۔ موصوف " کمیٹی خواستگارِ تعلیم مسلمانان " کے سرگرم رُکن تھے ۔ سرسیّد نے قیامِ انگلستان کے دوران مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں انہیں خط لکھ کر اپنا ہمنوا بنا لیا تھا ۔ ایم اے او کالج کے لئے چندہ جمع کرنے کے لئے بھی وہ بڑے سرگرم رہے اور جب کالج قائم ہوا تو سرسیّد نے ان کا نام بھی ٹرسٹیوں میں شامل کر لیا ۔

سرسیّد احمد خان کی وفات کے ساتھ ہی کالج کے سیکرٹری کی آسامی خالی ہو گئی ، اس کے لئے محسن الملک موزوں ترین شخص تھے ، لیکن جب انہیں [illegible] معلوم ہوا کہ سرسیّد کے فرزند سیّد محمود اس آسامی میں دلچسپی رکھتے ہیں تو انہوں نے سرسیّد کے ساتھ اپنے تعلقات کی بناء پر انتخاب میں حصہ لینا پسند نہ کیا ۔ ٹرسٹیوں نے سیّد محمود کو اپنے والدِ بزرگوار کی جگہ سیکرٹری مقرر کیا ، لیکن وہ اپنی بے اعتدالیوں کی وجہ سے اس منصب کی ذمہ داریاں احسن طریقے سے انجام نہ دے سکے تو مجبوراً ٹرسٹیوں نے یہ ذمہ داری محسن الملک پر ڈالی ۔

کالج کا سیکرٹری بننے کے بعد محسن الملک کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ۔ کالج کا یورپین سٹاف بہت خود سَر ہو چکا تھا اور وہ سیکرٹری کے احکام کی پرواہ نہ کرتا تھا ۔ اسی زمانے میں طلبہ نے بعض مطالبات منوانے کے لئے سٹرائیک کر دی ۔ سیّد محمود (م ۱۹۰۳ء) سیکرٹری کے عہدے سے سبکدوشی کے بعد محسن الملک کے مخالف ہو گئے ۔ جس کا محسن الملک کو بجا طور پر رنج ہوا ۔

۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء کو یوپی کے مسلم آزار گورنر سر انٹونی میکڈونل نے ہندوؤں کے یکطرفہ مطالبے کو منظور کرتے ہوئے سرکاری دفاتر میں اُردو کی بجائے ہندی زبان رائج کر دی ۔ حکومت کے اس فیصلے سے مسلمانوں کے اقتصادی اور ثقافتی

مفادات پر کاری ضرب تھی۔ اسی روز لکھنؤ میں مسلمانوں نے ایک احتجاجی جلسہ منعقد کیا جس کی صدارت محسن الملک نے کی۔ اس جلسے میں ایک قرار داد منظور کی گئی جس میں حکومت سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرے۔ اُردو کو اس کا صحیح مقام دلانے کی غرض سے "اُردو ڈیفنس ایسوسی ایشن" قائم ہوئی اور محسن الملک اس کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ ان کے اس تقرر سے گورنر بڑا زچ ہوا۔ اس نے ان سے کہا کہ اگر انہوں نے اُردو کی حمایت جاری رکھی اور "اُردو ڈیفنس ایسوسی ایشن" سے علیحدگی اختیار نہ کی تو وہ کالج کی سرکاری گرانٹ بند کر دے گا۔ اب محسن الملک کے لئے ایک ہی راستہ تھا یا تو وہ کالج کے سیکرٹری کے عہدے سے مستعفی ہو جائیں یا "اُردو ڈیفنس ایسوسی ایشن" سے علیحدگی اختیار کر لیں۔ انہوں نے اُردو کی حمایت جاری رکھنے کا فیصلہ کیا اور کالج کی سیکرٹری شپ سے مستعفی ہو گئے۔ اس پر مسلمانوں نے ان پر دباؤ ڈالنے کے لئے جگہ جگہ جلسے کئے اور ان سے یہ درخواست کی کہ وہ کالج کی سیکرٹری شپ سے اپنا استعفےٰ واپس لے لیں۔ مسلمانوں کے اس مطالبے پر انہوں نے اپنا استعفےٰ واپس لے لیا اور دوسری جانب اُردو کی حمایت میں بھی سینہ سپر رہے۔

محسن الملک نے کالج کے داخلی انتظام میں دشواریوں کے باوجود سرسید کے کام کو آگے بڑھایا۔ "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کچھ عرصے سے بند ہو چکا تھا، اسے دوبارہ جاری کیا۔ انہوں نے علی گڑھ تحریک کے اہم ستون محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کو ترقی دی اور مختلف شہروں میں کانفرنس کے جلسے منعقد کر کے مسلمانوں کی توجہ حصولِ تعلیم کی جانب مبذول کرائی۔ سرسید کے مذہبی رُجحانات کی وجہ سے جو لوگ علی گڑھ تحریک کی مخالفت کر رہے تھے محسن الملک کے زمانے میں ان کی مخالفت میں نمایاں کمی ہو گئی۔ علی گڑھ میں ابھی تک لڑکیوں کی تعلیم کے لئے کوئی ادارہ قائم نہیں ہوا تھا۔ محسن الملک کے دَور میں زنانہ سکول قائم ہوا۔ جو شیخ عبداللہ عرف پاپا میاں (م ۱۹۶۵ء) کی سعی و کاوش سے گرلز کالج بن گیا۔

سیاسی خدمات:

محسن الملک سیاست میں سرسید کے نقشِ قدم پر چلتے رہے۔ اپنے پیش رو

سرسید کی طرح انہوں نے بھی کانگرس کی مخالفت جاری رکھی اور مسلمانوں کو ہندو اکثریت کی اس جماعت میں شامل ہونے سے روکتے رہے۔ محسن الملک اس وفد کے محرک اور رُوحِ رواں تھے جو یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو شملہ میں وائسرائے ہند لارڈ منٹو سے ملا تھا۔ اسی وفد نے لارڈ منٹو کو جداگانہ انتخاب کا قائل کیا تھا۔

جب ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو ڈھاکہ میں پُورے ملک سے آئے ہوئے مسلمان نمائندوں نے مسلم لیگ کی بنیاد رکھی تو اس اجلاس میں محسن الملک اپنے رفقاء سمیت شریک تھے۔ اسی اجلاس میں انہیں مسلم لیگ کا جائنٹ سیکرٹری مقرر کیا گیا۔ مسلم لیگ کا قیام ان کا آخری بڑا کارنامہ تھا۔

مذہبی رُجحانات:

محسن الملک مذہبی عقائد میں سرسید کی عقل پسندی کے خلاف نہ تھے، مگر ان کے حد سے بڑھے ہوئے عقلی نقطۂ نظر کو پسند نہ کرتے تھے۔ ان کے اس معتدل مسلک کی وجہ سے مذہبی حلقوں میں علی گڑھ تحریک کی مخالفت کم ہو گئی۔ محسن الملک ایک شیعہ خاندان میں پیدا ہوئے تھے، لیکن بعد میں انہوں نے سُنّی مذہب اختیار کر لیا انہوں نے "آیاتِ بیّنات" کے عنوان سے ایک کتاب لکھ کر شیعوں کے عقائد کی تردید کی۔ یہ کتاب لکھ کر انہوں نے سُنّی علمائے کرام کے دلوں میں گھر کر لیا اور انہوں نے ان کی کالج کی سیکرٹری شپ کے دَور میں علی گڑھ تحریک کی مخالفت ختم کر دی۔

مُحسن المُلک کی تصانیف

۱۔ آیاتِ بیّنات:

سطور بالا میں اس کا ذکر آچکا ہے۔ جب محسن الملک نے یہ کتاب لکھی تو ان کے حقیقی بھائی نے "آیاتِ محکمات" کے عنوان سے اس کا رَد لکھا۔

۲۔ میلاد شریف:

جس طرح سرسید احمد خان نے میلاد شریف کی محفلوں میں بیان کی جانے والی ضعیف روایتوں کی مخالفت کی تھی اور واعظوں کو ایسی محافل میں صحیح راویتیں بیان کرنے کا مشورہ دیا تھا، اسی انداز پر محسن الملک نے بھی "میلاد شریف" کے عنوان سے ایک کتاب تصنیف کی۔

۳۔ رسالہ ہائے قوانین:

جس زمانے میں محسن الملک تحصیلدار کے منصب پر فائز تھے، انہوں نے محکمہ مال اور فوجداری سے متعلق چند رسائل تحریر کئے تھے۔

۴۔ کتابُ المحبت والشوق:

یہ امام غزالی کی مشہور تصنیف "احیاء العلوم" کے ایک باب "کتاب المحبت" کا خلاصہ ہے، جو انہوں نے سلیس اُردو زبان میں تیار کیا تھا۔

۵۔ تقلید و عمل بالحدیث:

گزشتہ صدی میں تقلید اور عدم تقلید کے موضوع پر مسلمانوں میں بڑی نزاع پائی جاتی تھی۔ محسن الملک نے اس مسئلے پر ایک مضمون تحریر کیا جو تہذیب الاخلاق میں شائع ہوا۔ بعد ازاں یہی مضمون کتابچہ کی صورت میں شائع ہوا۔

۶۔ مجموعہ لیکچرز و تقاریر:

محسن الملک نے مختلف جلسوں اور تقریبات میں جو تقریریں کی تھیں وہ کتابی صورت میں شائع ہوئیں۔

۷۔ مجموعہ مضامینِ تہذیب الاخلاق:

مجلّہ تہذیب الاخلاق میں انہوں نے جو مضامین شائع کرائے تھے وہ بعد میں کتاب کی صورت میں چھاپ دیئے گئے۔

۸۔ مکتوبات الخلان فی اصول التفسیر و علوم القرآن:

اس عنوان سے ان کی وہ خط و کتابت شائع ہوئی ہے جو انہوں نے سرسید

کے ساتھ ان کی تفسیرِ قرآن شائع ہونے کے بعد کی تھی۔

۹۔ مکاتیبِ محسن الملک:

اس عنوان کے تحت ان کے خطوط شائع ہوئے ہیں جن سے ان کے سیاسی اور مذہبی خیالات پر روشنی پڑتی ہے۔

محسن الملک ایک مصنف کی حیثیت سے ڈپٹی نذیر احمد، مولانا شبلی نعمانی اور مولانا الطاف حسین حالی کے ہم پلّہ نہ تھے تاہم ان کا طرزِ بیان بڑا زور دار، دلکش اور اطمینان بخش تھا۔ وہ اپنا مافی الضمیر بڑے احسن طریقے سے ادا کر لیتے تھے۔ ان کی تحریروں سے یقیناً علی گڑھ کے دبستانِ ادب کو فروغ ملا۔

وفات:

آخری عمر میں ان کے برادرِ بزرگ غلام عباس فوت ہو گئے جس کا انہیں بے حد صدمہ ہوا۔ ادھر کالج کے طلبہ نے سٹرائیک کر دی، جس کے صدمے سے ان کی صحت خراب رہنے لگی۔

محسن الملک اس وفد کے محرک اور رُوحِ رواں تھے جو یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو شملہ میں وائسرائے لارڈ منٹو سے ملا تھا۔ اس کے بعد وہ گاہے ماہے مسلمانوں کے مطالبات کو عملی شکل دلوانے کے لئے دہلی یا شملہ میں انگریز حکام سے ملتے رہتے تھے، وہ اسی سلسلے میں شملہ گئے ہوئے تھے کہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۷ء کو وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔

محسن الملک کی وفات کی خبر جنگل میں آگ کی طرح آناً فاناً پورے ملک میں پھیل گئی۔ علی گڑھ میں ان کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔ محسن الملک کا جسدِ خاکی تدفین کے لئے بذریعہ ریل ان کے آبائی وطن اٹاوہ لے جایا جا رہا تھا اور جب وہ ٹرین علی گڑھ میں رُکی تو کالج کے طلبہ نے ٹرین کا وہ ڈبّہ جس میں ان کا جسدِ خاکی تھا، ٹرین سے الگ کر لیا۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ علی گڑھ کی یہ امانت اٹاوہ چلی جائے۔ کالج کے اساتذہ اور طلبہ نے ان کے لواحقین کو رضامند کر کے ان کا جسدِ خاکی سرسید کے پہلو میں سپردِ خاک کر دیا۔ رحمۃ اللہ علیہ واسعاً کثیراً۔

وقار الملکؒ

ولادت اور تعلیم:

علی گڑھ تحریک کے تیسرے بڑے ستون اور مسلمانانِ پاک وہند اور بنگلہ دیش کے عظیم محسن وقار الملک مولوی مشتاق حسین ۲۴ مارچ ۱۸۴۱ء کو ضلع میرٹھ کے موضع سرادہ کے ایک کمبوہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ چھ ماہ کی عمر میں وہ سایۂ پدری سے محروم ہو گئے اور ان کی تعلیم و تربیت کا بوجھ ان کی والدۂ ماجدہ بتول النساء کے نازک کندھوں پر آپڑا۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق ان کی تعلیم کا آغاز قدیم طرز کے مکتب سے ہوا۔ لیکن جلد ہی ان کی سمجھدار والدہ نے انہیں مکتب سے اٹھا کر ورنیکلر سکول میں داخل کرا دیا۔ سکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے انجینیئرنگ کالج رُڑکی داخلہ لیا۔ لیکن اس فنی مضمون سے طبعی مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔

ملازمت:

انجینیئرنگ کالج رُڑکی چھوڑنے کے بعد ان کا تقرر اپنے سابقہ سکول میں بحیثیتِ نائب مدرس ہوا۔ چند ماہ بعد انہیں محکمہ انکم ٹیکس میں محرّر کی نوکری مل گئی تو انہوں نے سکول کی ملازمت چھوڑ دی۔

سرسید سے تعلق:

"حیاتِ وقار" کی روایت کے مطابق ۱۸۶۱ء میں یُو۔پی میں قحط رونما ہوا۔ ان دنوں سرسید احمد خان مراد آباد میں متعین تھے۔ حکومت نے انہیں ریلیف کا کام سونپا۔ سرسید کو اس کام کے لئے چند مددگاروں کی ضرورت تھی۔ چنانچہ انہوں نے مولوی مشتاق حسین کو امروہہ کے متاثرین کی خدمت پر مامور کیا۔ سرسید ان کی ذہانت، قابلیت، پابندیٔ شریعت، نیکی و تقویٰ اور بے ریا عبادت سے بے حد متاثر ہوئے اور جب

انہوں نے سائنٹیفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی تو مولوی مشتاق حسین کو اس کا رکن بنا لیا۔

اتفاق سے چند ماہ بعد مولوی مشتاق حسین کی اسامی تخفیف کی زد میں آ گئی اور وہ بیکار ہو گئے۔ ان چند مہینوں میں انہوں نے اپنے فرائض منصبی بڑی لگن اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیئے تھے۔ اس لئے ان کے افسران بالا اور خاص طور پر جان سٹریچی ان سے بہت خوش تھے۔ ان کی کوشش سے مولوی مشتاق حسین صدر الصدور کے محکمے میں سر رشتہ دار مقرر ہوئے اور ترقی پا کر صدرُ الصدور بن گئے۔ کچھ عرصے بعد ان کا تقرر علی گڑھ کی عدالت میں بطور منصرم ہو گیا۔ علی گڑھ میں قیام کے دوران میں مولوی صاحب کو سرسید کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور وہ ان کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ جب سرسید نے تہذیب الاخلاق جاری کیا تو مولوی مشتاق حسین باقاعدگی کے ساتھ اس مجلّے کے لئے مضمون لکھنے لگے۔

بدقسمتی سے ۱۸۷۲ء میں بنگال میں شدید قحط رونما ہوا، جس کا اثر یُو۔پی تک محسوس کیا گیا۔ حکومت نے قحط کے تدارک کے لئے سرسید احمد خان کو مامور کیا۔ انہوں نے ایک بار پھر مولوی مشتاق حسین کو اپنا مددگار مقرر کیا۔ انہوں نے جس دلسوزی اور خلوص کے ساتھ متاثرین کی خدمت کی اس نے سرسید احمد خان کو ان کا مداح بنا دیا۔

حیدر آباد کی ملازمت:

ریاست حیدر آباد کے مدارالمہام سر سالار جنگ ریاست کا نظم و نسق چلانے کے لئے قابل اور دیانت دار افراد کی تلاش میں رہتے تھے۔ انہوں نے محسن الملک مہدی علی اور مولوی مشتاق حسین کو حیدر آباد آنے کی دعوت دی۔ مولوی مشتاق حسین ۱۸۷۵ء میں حیدر آباد پہنچے تو ان کا تقرر بحیثیتِ ناظم دیوانی ہوا۔ ایک سال کے بعد موصوف ترقی پا کر صدرُ المہام عدالت مقرر ہوئے۔ یہ عہدہ انگریزی حکومت میں جوڈیشل منسٹر کے برابر تھا۔ انہوں نے اپنے محکمے میں کئی مفید اصلاحات کیں جو خود غرض افراد کو پسند نہ تھیں۔ چنانچہ وہ لوگ ان کے خلاف سازشوں میں شریک ہو گئے۔ سترہ سال حیدر آباد میں قیام کے بعد مولوی مشتاق حسین نے اپنے عہدے سے استعفیٰ

دے دیا اور ۱۸۹۲ء میں وہ علی گڑھ چلے گئے ان کی خدمات کے اعتراف میں نظام کی حکومت نے انہیں وقار الملک کا خطاب دیا۔ یہ خطاب اس قدر مقبول ہوا کہ لوگ ان کا اصل نام بھول گئے۔

حیدر آباد میں قیام کے زمانے میں مولوی صاحب نے وہاں کے اُونچے طبقے میں علی گڑھ تحریک کا تعارف کرایا اور سر آسمان جاہ (م ۱۸۹۸ء) کو کالج کی مدد پر آمادہ کیا۔ انہوں نے کالج میں متعدد کمرے تعمیر کرائے جو اب تک "آسمان جاہ منزل" کے نام سے موسوم ہیں۔ اسی طرح نظام میوزیم علی گڑھ کی تعمیر کے مصارف بھی ریاست حیدر آباد نے برداشت کئے۔

ذاتی صدمات:

۷ ستمبر ۱۸۹۶ء کو ان کے اکلوتے فرزند محمد احمد کا انتقال ہو گیا۔ وقار الملک ابھی اس صدمے سے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ ۲۰ ستمبر ۱۸۹۷ء کو ان کی اہلیہ بھی داغِ مفارقت دے گئیں۔ احباب کے مشورے سے انہوں نے عقدِ ثانی کر لیا۔ بد قسمتی سے ان کی زوجۂ ثانی ۱۹۰۶ء میں چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر راہیِ ملکِ بقا ہوئی اور ان بچوں کی تعلیم و تربیت کی تمام تر ذمہ داری وقار الملک پر آپڑی۔

قومی تحریکات میں حصہ:

وقار الملک نے دل و جان کے ساتھ سرسیّد احمد خان کا ساتھ دیا اور ایم اے اُو کالج اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بڑی خدمت کی۔ جب محسن الملک کالج کے سیکرٹری مقرر ہوئے تو وقار الملک ان کے دستِ راست بن گئے۔ ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء کو یُوپی کے گورنر سر انٹونی میکڈونل نے اُردو کی بجائے ہندی کو دفتری زبان قرار دیا تو وقار الملک بھی محسن الملک کی طرح اُردو کی حمایت میں سینہ سپر ہو گئے۔ یہیں سے ان کی شہرت کا آغاز ہوا۔

مولانا محمد علی کانپوری ثمّ مونگیری (م ۱۹۲۷ء) نے لکھنؤ میں ایک جدید طرز کے دینی مدرسے ندوۃ العلماء کی بنیاد رکھی تو وقار الملک نے ان کی اس خدمت کو سراہا۔ یہیں سے مولانا محمد علی مونگیریؒ کے ساتھ ان کے مخلصانہ تعلقات کا آغاز ہوا۔

یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو ۳۵ مسلم عمائدین کا جو وفد مسلمانوں کے مطالبات لے کر شملہ میں لارڈ منٹو سے ملا وقار الملک نے اس وفد کی تشکیل میں بڑا اہم کردار ادا کیا اور خود بھی اس وفد میں شامل ہوئے۔

۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو جب مسلمانانِ پاک و ہند اور بنگلہ دیش کے نمائندوں نے مسلم لیگ کی بنیاد رکھی تو وقار الملک نے اس کی تشکیل میں بھی بڑا اہم کردار ادا کیا۔ مسلم لیگ کے قیام کے ساتھ ہی وہ اس جماعت کے جوائنٹ سیکرٹری مقرر ہوئے۔

محسن الملک ایم اے اُو کالج کے آنریری سیکرٹری مقرر ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد نواب سر مزمل اللہ خاں (م ۱۹۳۸ء) نے عارضی طور پر اس عہدے کا چارج لیا تو متعدد شہروں میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اور اس جیسی مسلم تنظیموں کے تحت جلسے منعقد ہوئے جن میں وقار الملک کو محسن الملک کا جانشین مقرر کرنے پر زور دیا گیا۔ سر محمد شفیع (م ۱۹۳۲ء) اور مولانا الطاف حسین حالی (م ۱۹۱۴ء) نے برملا کہا کہ محسن الملک کی جانشینی کے لئے اس وقت پُورے ملک میں وقار الملک سے بہتر شخص موجود نہیں ہے۔ چنانچہ کالج کے ٹرسٹیوں نے انہیں ۱۵ ستمبر ۱۹۰۷ء کو کالج کا آنریری سیکرٹری مقرر کیا۔ انہوں نے ساڑھے چار سال تک اس ذمہ داری کو نبھایا۔

ان کے زمانے میں یُورپین سٹاف کی جگہ ہندوستانی اساتذہ نے لی اور کالج ترقی کی راہ پر گامزن ہوا۔ کالج میں پہلے دینیات کا ایک ہی شعبہ ہوا کرتا تھا وقار الملک نے سُنّی دینیات اور شیعہ دینیات کے ناموں سے دو الگ شعبے قائم کر دیئے جو ترقی کرتے کرتے فیکلٹی بن گئے۔

وقار الملک بڑے راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور نماز و رُوزے کے سختی کے ساتھ پابند تھے۔ اس لئے ان کے زمانے میں مذہبی طبقوں نے علی گڑھ تحریک کی مخالفت ختم کر دی۔

۲۲ اپریل ۱۹۰۸ء کو لارڈ منٹو نے وقار الملک کی ملی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں "نواب" کا خطاب عطا کیا۔ وقار الملک نے لڑکیوں کی تعلیم کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے مختلف شہروں میں زنانہ سکول قائم کرنے پر زور دیا۔

۱۹۰۹ء میں منٹو مارلے اصلاحات کے تحت مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا

حق ملا تو وقار الملک کو بے حد مسرت ہوئی کہ مسلمانوں کا ایک دیرینہ مطالبہ منظور کرتے ہوئے سرکاری سطح پر مسلمانوں کو ہندوؤں سے ایک الگ قوم تسلیم کر لیا ہے۔

۱۹۱۱ء میں ملکی اور غیر ملکی سطح پر دو ایسے واقعات پیش آئے جنہوں نے مسلم سیاست پر گہرا اثر چھوڑا۔ اولاً یہ کہ انگریز حکام نے ہندوؤں کے مطالبے اور جارحانہ تحریک کے نتیجے میں تقسیم بنگال منسوخ کر دی۔ اس طرح مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو ہندوؤں کی اقتصادی اور سیاسی گرفت سے جو رہائی ملی تھی وہ ختم ہو گئی اور انہیں ایک بار پھر بے رحم اکثریت کے زیر کر دیا گیا۔ اس سانحہ پر وقار الملک نے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

"گورنمنٹ کی یہ پالیسی بمنزلہ ایک توپخانے کی تھی جو مسلمانوں کی مُردہ لاشوں پر سے گزر گیا۔ بدون اس احساس کے کہ ان غریب لاشوں میں سے کسی میں جان بھی ہے اور اس سے ان کو کوئی تکلیف محسوس ہوئی ہوگی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کہاں کا ٹرپولی کہاں کا ایران۔ یہاں تو سرے سے اسلام کا ہی قلع قمع ہوا جاتا ہے۔"

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تقسیم کی منسوخی ایک بہت بڑا صدمہ تھا، جو بڑھاپے میں وقار الملک کو برداشت کرنا پڑا۔

ثانیاً ستمبر ۱۹۱۱ء کو سامراجی قوتوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اٹلی نے طرابلس (موجودہ لیبیا) پر حملہ کر کے قبضہ جما لیا۔ ان دنوں طرابلس میں سید احمد الشریف سنوسی حکمران تھا جو برائے نام ترکی کی اطاعت کا دم بھرتا تھا۔ ایک مسلم ملک پر یوں غیر مسلموں کے قبضے سے دنیا بھر کے مسلمانوں کو دکھ پہنچا اور اس کی شدت برِعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش میں بھی محسوس کی گئی۔ طرابلس میں تھوڑی سی ترک فوج اٹلی کے حملے کے وقت موجود تھی۔ طرابلس پر اٹلی کے قبضے کے بعد ترکوں نے اٹلی کے ساتھ ایک معاہدہ کر کے اپنی فوج واپس بُلا لی۔ یہ ترکی کی کمزوری کی ایک واضح مثال تھی۔ اس موقع پر وقار الملک نے ترکی کی حمایت میں کئی مضامین لکھ کر شائع کرائے۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون میں ارشاد فرمایا:

"جو مصیبت ترکوں پر نازل ہو رہی ہے وہ ترکوں پر نہیں، بلکہ اسلام پر ہے۔

اگر ترکی کی قوت کمزور ہو گئی اور اس قابل نہ رہی کہ اپنے اماکن مقدسہ مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ زادہم اللہ شرفاً و تعظیماً اور اسی طرح دیگر اماکن مقدسہ کی حفاظت کر سکے تو مسلمانوں کو وہ دن دیکھنے کے لئے تیار رہنا چاہئے کہ ایک دن بلاد عرب و شام پر کسی نہ کسی یورپین قوم کا جھنڈا لہراتا ہوگا"۔

وقار الملک کی یہ پیشگوئی حرف بحرف سچ نکلی اور پانچ سال بعد عراق، شام، فلسطین، لبنان اور موجودہ اُردن پر برطانیہ اور فرانس نے تسلط قائم کر لیا دوسری جانب شمالی افریقہ میں فرانس نے مراکش پر قبضہ کر لیا۔ طرابلس پر اٹلی کے حملے اور مراکش پر فرانس کے قبضے نے مسلمانانِ پاک و ہند اور بنگلہ دیش کے دلوں میں غم و غصے کی ایک لہر دوڑا دی اور وہ طرابلس اور مراکش کے مسلمانوں کے رنج و غم کو اپنا رنج و غم سمجھنے لگے۔ اس سال مولانا محمد علی جوہر نے "کامریڈ" اخبار جاری کیا، جس نے مسلمانوں میں بین الملی سیاسی شعور پیدا کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

۱۹۱۳ء میں پھر ملکی اور غیر ملکی سطح پر دو ایسے واقعات پیش آئے جنہوں نے خونِ مسلم کو گرما دیا۔ وقار الملک پر ان واقعات کا گہرا اثر ہوا اور ان پر فالج گرا اور وہ بستر پر دراز ہو گئے۔ اولاً مشرقی یورپ کی وہ ریاستیں جو ریاست ہائے بلقان کے نام سے مشہور تھیں اور وہ عرصۂ دراز تک ترکی کے ماتحت رہ چکی تھیں دُولِ یورپ کی شہ پر ترکی کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ ترکی داخلی طور پر پہلے ہی بہت کمزور ہو چکا تھا۔ اس لئے بلقانی ریاستوں کی یلغار نے اسے مزید کمزور کر دیا۔ اس موقع پر پورے عالم اسلام میں اضطراب کی ایک لہر دوڑ گئی اور مسلمانانِ پاک و ہند اور بنگلہ دیش نے ترکی کی مدد کے لئے چندہ جمع کرنا شروع کر دیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر مختار احمد انصاری (م ۱۹۳۶ء) کی قیادت میں ایک طبی وفد زخمی مجاہدین کے علاج معالجے کے لئے ترکی روانہ کیا گیا۔

ثانیاً مچھلی بازار کانپور میں ایک مسجد تھی اور اس مسجد کے عین سامنے سڑک کے درمیان ہندوؤں نے ایک مندر تعمیر کر لیا تھا جس کی وجہ سے آمد و رفت میں مشکلات پیدا ہو گئی تھیں۔ کانپور کی میونسپلٹی نے، جس میں ہندوؤں کی اکثریت تھی، یہ فیصلہ کیا کہ ٹریفک کی مشکلات دُور کرنے کے لئے سڑک چوڑی کی جائے اور مسجد کا کچھ حصہ مسمار کر دیا جائے۔ میونسپلٹی کے حکام نے برطانوی سنگینوں کی حفاظت میں

اس منصوبے پر عمل کیا۔ مسجد کی بے حرمتی اور اس کے کچھ حصے کے انہدام نے مسلمانوں کے دلوں میں جوش پیدا کر دیا اور ملک کے مختلف حصوں سے رضاکار مسجد کو دوبارہ تعمیر کرنے کی غرض سے کانپور پہنچنے لگے۔

حکومت کی بے تدبیری سے ہنگامہ برپا ہو گیا اور پولیس کی گولیوں سے درجنوں مسلمان شہید ہو گئے۔ مولانا شبلی نعمانی، کیفی چریا کوٹی اور دوسرے شعراء نے اس موقع پر بڑی جوشیلی نظمیں لکھیں، جن سے مسلمانوں کے جذبات کی صحیح عکاسی ہوتی ہے۔

ان واقعات کے زخم ابھی مندمل بھی نہ ہونے پائے تھے کہ ۱۹۱۴ء میں پہلی عالمی جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں ترکی نے برطانیہ کے خلاف جرمنی کا ساتھ دیا۔ مسلمانان پاک و ہند اور بنگلہ دیش کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ عملاً برطانیہ کی رعایا تھے لیکن ان کی تمام تر ہمدردیاں ترکوں کے ساتھ تھیں۔ وہ ترکی کے خلیفہ کو اپنا مذہبی اور روحانی قائد سمجھتے تھے اور بیشتر مساجد میں جمعہ کے خطبہ میں ترک خلیفہ کا نام پڑھا جاتا تھا۔ ۱۹۱۶ء میں انگریزوں کی شہ پر عربوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی اور ترکوں کے زیرِ اثر عرب علاقے، شام، فلسطین، لبنان اور عراق ان کے قبضے سے نکل گئے۔ وقار الملک کی پیشگوئی سچ ثابت ہوئی اور بسترِ مرگ پر انہوں نے یہ صدمہ بھی برداشت کیا۔

وقار الملک کے آخری ایامِ حیات میں جب وہ عملاً سیاست میں حصہ لینے سے معذور ہو چکے تھے، لکھنؤ میں کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان تعاون کا ایک معاہدہ طے پایا جو "میثاقِ لکھنؤ" کے نام سے مشہور ہوا۔

وفات:

وقار الملک پر ۱۹۱۳ء میں پہلی بار فالج کا حملہ ہوا تھا۔ اس کے بعد ان کی صحت جواب دینے لگی۔ ۱۹۱۴ء کے آخر میں ان کے اپنے رفقاء میں سے مولانا شبلی اور مولانا حالی ڈیڑھ ماہ کے وقفے سے فوت ہو گئے۔ وقار الملک کو ان کی وفات سے بڑا صدمہ ہوا۔ ۱۹۱۵ء میں ان کی حالت زیادہ خراب ہو گئی اور وہ کئی بیماریوں کا شکار ہو گئے۔ جنوری ۱۹۱۷ء میں ان کی زیست کی اُمید جاتی رہی۔ ۲۸ جنوری کا دن گزار کر ۲۹ جنوری کو رات ۲

بجے وہ اپنے وطن امروہہ ضلع مراد آباد میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ انہوں نے اپنی وفات سے قبل یہ وصیت کی تھی کہ ان کی وفات کی اطلاع ان کی تدفین کے بعد علی گڑھ دی جائے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نمود و نمائش سے کوسوں دور تھے۔ ان کی وصیت کے مطابق ان کا جسدِ خاکی امروہہ میں ان کے خاندانی احاطۂ قبور میں سپردِ خاک کیا گیا۔

رحمۃ اللہ علیہ واسعاً کثیراً

وقار الملک کی وفات پر پورے ملک میں سوگ منایا گیا۔ مسلم رہنماؤں نے اپنے بیانات میں انہیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ مولانا محمد علی جوہر نے اس موقع پر فرمایا:

"ہندوستان اپنے فرزندِ بزرگ اور ہم اپنے باپ سے محروم ہو گئے۔ خدا ہماری مدد کرے"۔

مولانا سید سلیمان ندوی (م ۱۹۵۳ء) نے ماہنامہ معارف اعظم گڑھ میں انہیں ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا:

"محسن الملک کی وفات پر ہم نے تدبّر و سیاست کا ماتم کیا۔ مولانا نذیر احمد کے مرنے پر سحر نگاری اور بزم آرائی کا مرثیہ پڑھا۔ مولانا شبلی کی وفات پر ہم نے علم کے فقدان کا نوحہ کیا۔ مولانا حالی کو رخصت کرتے وقت ہم نے سخن وری اور وقیقہ سنجی پر نالہ کیا لیکن نواب وقار الملک کی وفات پر ہم قوم کا ماتم کرتے ہیں اور اُولوالعزمانہ اخلاق کی گمشدگی پر فریاد"۔

باب (9)

تقسیم بنگال

پس منظر:

بیسویں صدی کے آغاز میں بنگال بہت بڑا صوبہ تھا۔ اس زمانے میں آسام، بہار اور اڑیسہ بھی صوبہ بنگال میں شامل تھے اور اس کا رقبہ ۱۸۹۰۰۰ مربع میل اور آبادی ۸۰۰۰۰۰۰۰ کے لگ بھگ تھی۔ اس کی وسعت کی وجہ سے اس کی انتظامی حالت درست نہ تھی اور دارالحکومت کلکتہ سے دور دراز علاقوں میں لاقانونیت کا دور دورہ تھا۔

مشرقی بنگال کے ساحلی علاقوں نواکھالی اور باریسال میں آئے دن سمندری طوفان آتے رہتے تھے اور متاثرین کو بروقت امداد پہنچانے میں دشواری پیدا ہوتی تھی۔ مشرقی بنگال یوں بھی ندیوں اور دریاؤں کی سرزمین ہے۔ میگھنا اور پدما جیسے دریاؤں کا پاٹ کئی کئی میل ہے۔ ان دریاؤں میں دُخانی جہاز چلتے تھے اور اب بھی چلتے ہیں۔ لمبے چوڑے اور گہرے دریاؤں کی موجودگی میں اس علاقے میں ریلیں چلانی یا سڑکیں بنانی آسان کام نہ تھا۔ ان دریاؤں پر پُل بنانے ممکن نہ تھے اس لئے مسافر تھوڑی دُور تک ریل میں سفر کرتے اور جہاں دریا آجاتا وہاں دُخانی جہاز میں سوار ہو جاتے اور دریا پار کرکے پھر ریل میں بیٹھ جاتے۔ اس طرح چند گھنٹوں کا فاصلہ دنوں میں طے ہوتا تھا۔

بنگال میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے شدید قحط رونما ہوتا تھا۔ ذرائع آمدو رفت کی کمی اور اس سے پیدا ہونے والی مشکلات کی وجہ سے بروقت متاثرین تک امدادی سامان پہنچانے میں بڑا وقت صرف ہوتا تھا اور ہزاروں افراد بھوکوں مرجاتے تھے۔

ذرائع آمد و رفت میں مشکلات کی وجہ سے حکومت کا کنٹرول بہت کمزور تھا، اس لئے دُور دراز کے علاقے جرائم پیشہ افراد کی آماجگاہ بن کر رہ گئے تھے۔

ہندو صنعت کاروں نے تمام تر صنعت مغربی بنگال میں ہندو اکثریت کے علاقے میں لگائی تھی، جہاں ہندو مزدور کام کرتے تھے۔ اس لئے مشرقی بنگال میں بے روزگاری عام تھی۔ مشرقی بنگال کی زیادہ تر اراضی ہندوؤں کی ملک تھی جسے غریب مسلمان کاشت کرتے تھے۔ زمینداروں کے کارندے زمیندار کا حصہ بڑی سختی کے ساتھ وصول کرتے اور اسے مغربی بنگال بھیج دیتے تھے۔ زمیندار کے بیٹوں اور بیٹیوں کی شادی کے موقعوں پر کاشت کاروں پر مزید بوجھ ڈال دیا جاتا اور شادی کے اخراجات ان سے وصول کئے جاتے تھے۔ بنگالی ہندوؤں میں ملک کے دوسرے علاقوں میں رہنے والے ہندوؤں کی نسبت زیادہ مذہبی تہوار منائے جاتے تھے۔ ان تہواروں پر خرچ ہونے والی رقم بھی مسلمان کاشتکاروں سے وصول کی جاتی تھی۔ ان تہواروں میں بُت پرستی ہوتی تھی اس لئے مسلمانوں کو رقوم فراہم کرتے وقت بڑی اُلجھن ہوتی تھی اور وہ اس ناجائز ٹیکس کی ادائیگی کو حرام سمجھتے تھے۔ بنگال کے مسلم رہنما، حاجی شریعت اللہ (م ۱۸۴۰ء) دادو میاں (م ۱۸۶۲ء) اور میر نثار علی المعروف بہ تیتومیر (م ۱۸۳۱ء) اس ٹیکس کے خلاف آواز بلند کرچکے تھے۔ لیکن ہندوؤں نے انگریزوں کی مدد سے ان کی آواز [illegible] تھا۔

مشرقی بنگال میں غربت کی وجہ سے لوگ حصول تعلیم سے محروم تھے۔ ان کے افلاس کی وجہ سے آئے دن کوئی نہ کوئی وبا پھوٹتی رہتی تھی جو پُورے علاقے کو اور بعض اوقات پُورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی تھی۔

مشرقی بنگال کے مقابلے میں مغربی بنگال میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ کلکتہ اس زمانے میں مغربی بنگال کے علاوہ پورے ملک کا دارالحکومت تھا۔ اس لئے کلکتہ کی تجارتی منڈی پر ہندوؤں کا مکمل کنٹرول تھا۔ ان میں تعلیم کی شرح بہت زیادہ تھی۔ اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک سال کلکتہ یونیورسٹی سے ۲۳۰ اُمیدواروں نے بی اے کا امتحان پاس کیا ان میں صرف ایک مسلمان تھا۔ ہندو وکلاء ہی عدالتوں میں مقدمات لڑتے تھے اور صحافت بھی انہی کے ہاتھوں میں تھی۔ کلکتے سے شائع ہونے والے اخبارات انگریزوں یا ہندوؤں کی ملک تھے، سرکاری دفاتر میں بھی ہندوؤں کا غلبہ تھا۔ بنگال کے علاوہ یو۔ پی اور پنجاب میں ریلوے کے محکمے میں ہندو بنگالی کلرک بکثرت موجود تھے۔

ملازمتوں میں ہندوؤں کی اجارہ داری کی وجہ سے رفاہ عامہ کے لئے مختص رقم مشرقی بنگال میں صرف ہونے کی بجائے مغربی بنگال میں صرف ہو رہی تھی ۔ ان حالات میں مشرقی بنگال کے مسلمانوں کا بُری طرح استحصال ہو رہا تھا ۔

صوبے کی وسعت اور ذرائع آمد و رفت میں دشواری کی بنا پر گورنر کے لئے اپنے پانچ سالہ دَور حکومت میں پورے صوبے کا دورہ کرنا ممکن نہ تھا ۔ وہ اس مدت میں بمشکل ایک بار چٹا گانگ اور ڈھاکہ کا دورہ کر پاتا تھا ۔ اس لئے پورے صوبے کا نظم و نسق خراب ہو رہا تھا ۔

انگریزوں کو صوبے کی وسعت کی بنا پر پیدا ہونے والی خرابیوں کا احساس ہو چکا تھا ۔ ۱۸۵۳ء میں سر چارلس گرانٹ نے بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی ۔ اس سے ایک سال بعد گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی نے برطانوی حکام سے اس بات کی شکایت کی کہ بنگال کے گورنر پر بہت زیادہ انتظامی بوجھ پڑا ہوا ہے اسے ذرا ہلکا کرنا چاہیے ۔

۱۸۶۶ء میں اُڑیسہ میں شدید قحط رونما ہوا ، جس کے نتیجے میں ہزاروں افراد لقمۂ اجل بنے اور لاکھوں افراد اپنے گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہو گئے ۔ حکومت نے قحط کے اسباب معلوم کرنے کے لئے ایک کمیشن تشکیل دیا ۔ اس کمیشن نے حکومت سے یہ سفارش کی کہ صوبہ بنگال بہت وسیع ہے اس لئے اسے تقسیم کر دیا جائے تاکہ آئندہ مقامی سطح پر ہی اس طرح کی صورت حال سے نمٹا جا سکے ۔

۱۸۷۲ء میں بنگال کے گورنر سر جارج کیمبل نے اپنی رپورٹ میں یہ لکھا کہ بنگال اتنا بڑا صوبہ ہے کہ اس کا انتظام چلانا ایک شخص کے بس کی بات نہیں ہے ۔ اس کے دو سال بعد ۱۸۷۴ء میں آسام اور اس کے ساتھ بنگالی بولنے والے لوگوں پر مشتمل تین اضلاع سلہٹ ، کچھار اور گوالپاڑہ کو ملا کر ایک کمشنری بنا دی گئی ۔ اس کے باوجود بنگال بڑا وسیع صوبہ تھا اور نظم و نسق کی خرابی اپنی جگہ موجود رہی ۔

وائسرائے ہند لارڈ کرزن کے زمانے میں اُڑیا زبان بولنے والوں نے یہ مطالبہ کیا کہ وہ اُڑیسہ کے علاوہ مدراس ، بنگال اور سی پی کے علاقوں میں بھی پھیلے ہوئے ہیں ، لہٰذا انہیں ایک انتظامیہ کے تحت کر دیا جائے ۔ لارڈ کرزن نے ان کے اس

معقول مطالبے کو مان لیا ۔ ۱۹۰۱ء میں سر اینڈریو فریزر نے وائسرائے کو یہ مشورہ دیا کہ سنبھل پور کو اُڑیسہ کے ساتھ ملا کر بنگال میں شامل کر دیا جائے یا اُڑیسہ کا علاقہ سی پی میں شامل کر دیا جائے ۔ اسی زمانے میں سی پی کے چیف کمشنر نے حکومت سے یہ استدعا کی کہ اسے سنبھل پور کی ذمہ داری سے فارغ کر دیا جائے کیونکہ اس کے پاس پہلے ہی بہت کام ہے ۔

انہی ایّام میں حکومت مدراس نے اپنے انتظامی معاملات کے بارے میں شکایت کی کہ اسے روز مرہ کا سرکاری کام چلانے کی غرض سے تین زبانیں تامل ، اُڑیا اور ملیالم استعمال کرنا پڑتی ہیں ۔ اس لئے اگر اُڑیا زبان بولنے والوں کے علاقوں کو مدراس پریذیڈنسی سے الگ کر دیا جائے تو کام کا بوجھ کم ہو جائے گا ۔ چنانچہ مرکزی حکومت نے اُڑیا زبان بولنے والوں کے علاقے کو بنگال کے ساتھ منسلک کرنے کا فیصلہ کر لیا ۔ اس سے حکومتِ بنگال کے لئے مزید مسائل پیدا ہونے کا امکان تھا ۔ اس کا حل تلاش کرنے کے لئے وائسرائے نے ڈھاکہ ، میمن سنگھ اور چٹا گانگ کو آسام کے ساتھ ملانے کا ارادہ ظاہر کیا ۔ ۱۹۰۳ء میں جب یہ منصوبہ منظرِ عام پر آیا تو ان علاقوں میں بسنے والے لوگوں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی کیونکہ آسام تو پہلے ہی ایک پس ماندہ علاقہ تھا اس لئے اس کے ساتھ الحاق کی صورت میں یہاں کے باشندوں کی معاشی حالت مزید خراب ہو جاتی اور ترقی کی تمام راہیں مسدود ہو کر رہ جاتیں ۔ ثانیاً آسام ایک کمشنری تھی اور اس کا درجہ ایک صوبے کے مقابلے میں بہت کم تھا ۔ جو سہولتیں ایک صوبے کے رہنے والوں کو میسّر آ سکتی تھیں وہ ایک کمشنری میں رہنے والوں کو کہاں حاصل تھیں ؟

فروری ۱۹۰۴ء میں وائسرائے لارڈ کرزن نے مشرقی بنگال کا دورہ کیا اور وہاں کے لوگوں کو یقین دلایا کہ حکومت ان کا علاقہ ایک کمشنری میں شامل کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی ، بلکہ وہ ایک نیا صوبہ بنانے کا جائزہ لے رہی ہے جس کی اپنی اسمبلی ہو گی اور ڈھاکہ اس کا صدر مقام ہو گا ۔ اس نئے صوبے کا انتظام ایک گورنر کے سپرد کیا جائے گا ۔ وائسرائے کے اس اعلان سے وہاں کے باشندوں کو ایک گونا خوشی ہوئی ۔

تقسیمِ بنگال کا اعلان:

برطانوی حکومت نے ۲۰ جولائی ۱۹۰۵ء کو نئے صوبے کی تشکیل کا اعلان کیا اور ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو مشرقی بنگال کا صوبہ معرضِ وجود میں آگیا۔ اس نئے صوبے کا رقبہ ۱۰۶۵۰۰ مربع میل اور آبادی تین کروڑ دس لاکھ نفوس پر مشتمل تھی جس میں دو کروڑ سے زائد مسلمان تھے اس لئے مسلمانوں نے مشرقی بنگال کی مغربی بنگال سے علیحدگی پر مُسرّت کا اظہار کیا۔

تقسیمِ بنگال کے فوائد:

اس موقع پر مسلمانوں نے ڈھاکہ میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا۔ اس جلسے میں مقررین نے اس اَمر پر خوشی کا اظہار کیا کہ اور کچھ نہیں تو اتنا ہی غنیمت ہے کہ بنگال کے ایک حصے میں مسلمان، ہندوؤں کے اقتصادی استحصال اور سیاسی غلبے سے محفوظ ہو گئے ہیں۔

مشرقی بنگال کے نئے صوبے کا دارالحکومت ڈھاکہ قرار پایا جو مشرقی ہندوستان میں اسلامی اقدار اور تہذیب و ثقافت کا ایک اہم مرکز تھا۔ مشرقی بنگال میں حاجی شریعت اللہ، دادو میاں اور تیتو میر اسلامی تحریکوں کے احیاء کے لئے بڑا کام کر چکے تھے، اس لئے نئے صوبے کے قیام کے بعد اسلامی اُخوّت اور اتحاد کے مظاہرے دیکھنے میں آئے۔

ہندوؤں کا ردِ عمل:

مشرقی بنگال کے صوبے کے قیام سے مسلمانوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے مواقع میسر آئے جو ہندوؤں کو ایک آنکھ نہ بھائے۔ پہلے وہاں کے باشندوں کو حصولِ انصاف کے لئے کلکتہ ہائی کورٹ کے چکر لگانے پڑتے تھے جہاں ہندو وکلاء ان سے بھاری فیس طلب کرتے تھے۔ اب ڈھاکہ میں ہائی کورٹ قائم ہوا تو مسلم وکلاء کو بھی پریکٹس کرنے کا موقع ملا۔ کلکتہ کے ہندو وکلاء اپنے کاروبار میں مندے کے رُجحان کو برداشت نہ کر سکے اور انہوں نے تقسیم کے خلاف واویلا شروع کر دیا۔

اس وقت تک کلکتہ صحافت کا مرکز تھا اور بیشتر اخبارات و جرائد وہیں سے شائع ہوتے تھے۔ اخبارات کی مشرقی بنگال میں بھی مانگ تھی۔ بدقسمتی سے یہ

اخبارات انگریزوں اور ہندوؤں کی ملک تھے اس لئے یہ انہی کے خیالات کی ترجمانی کرتے تھے۔ نئے صوبے کے قیام سے ڈھاکہ سے اخبارات شائع ہونے لگے جو مسلمانوں کی ملک تھے اور وہ انہی کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے تھے۔ ان اخبارات کی مشرقی بنگال میں مانگ بڑھی تو اس کا اثر کلکتہ سے شائع ہونے والے اخباروں پر پڑا۔ اس لئے ان اخبارات کے ہندو مالکوں نے تقسیمِ بنگال کے خلاف زہر اُگلنا شروع کر دیا۔ انہوں نے اپنے اخبارات کے اداریوں کے ذریعے برطانوی حکومت پر تقسیم کو منسوخ کرنے کے لئے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔

کلکتہ اور اس کے گرد و نواح میں ہندوؤں نے صنعتیں لگائی تھیں۔ ان کارخانوں میں تیار ہونے والے مال کی کھپت مشرقی بنگال میں تھی۔ نئے صوبے کے قیام کے بعد مسلمانوں نے ڈھاکہ اور اس کے نواح میں کارخانے لگانے کی طرف توجہ دی تو اس کی زد براہِ راست مغربی بنگال کے ہندو کارخانہ داروں پر پڑی اور انہوں نے بھی تقسیم کی مخالفت پر کمر باندھ لی۔

ڈھاکہ میں پہلے تعلیم کا اتنا رواج نہ تھا اور نہ ہی ایسے تعلیمی ادارے تھے، جہاں مسلمان طلبہ تعلیم حاصل کر سکتے۔ نئے صوبے کے قیام سے سکول اور کالج کھلے، (چند سال بعد یونیورسٹی بھی قائم ہو گئی) جہاں مسلمان طلبہ کو تعلیم حاصل کرنے کی سہولتیں میسر آئیں اور حصولِ تعلیم کے بعد ان پر ملازمتوں کے دروازے کھل گئے۔ اس سے قبل سرکاری ملازمتوں پر ہندوؤں کی مکمل اجارہ داری تھی۔ اس لئے جب مسلمانوں کو ملازمتیں ملنے لگیں تو ہندوؤں نے اس پر بڑا شور مچایا اور وہ تقسیمِ بنگال کو ہی اس کا ذمہ دار قرار دینے لگے۔

مشہور بنگالی ہندو رہنما سریندر ناتھ بینرجی (م ۱۹۲۵ء) نے کہا کہ بنگال کو تقسیم کر کے ہندوؤں کی تذلیل کی گئی ہے اور یہ تقسیم ان کے لئے بم کے گولے سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔ اس جیسے متعصب ہندو سیاست دانوں نے ہندوؤں کے جذبات بھڑکانے کی غرض سے ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو یومِ سیاہ منانے کا اعلان کیا۔ اس رُوز انہوں نے اپنے گھروں پر سیاہ پرچم لہرائے اور اپنے بازوؤں پر سیاہ پٹیاں باندھیں۔ اس رُوز ہندوؤں نے اپنی دکانیں بند رکھیں۔ جلسے منعقد کئے اور جلوس نکالے۔ اُدھر انڈین

نیشنل کانگرس نے بھی تقسیمِ بنگال کی مخالفت شروع کر دی ۔

۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگرس کے قیام کے بعد ہندوؤں میں سیاسی شعور پیدا ہوا تو کئی ہندو جماعتیں معرضِ وجود میں آئیں ۔ مشہور متعصب مرہٹہ راہنما گنگا دھر تلک (م ۱۹۲۰ء) نے گنیش کی پُوجا اَز سرِ نو شروع کرائی اور اورنگ زیب کے باغی مرہٹہ حکمران شیواجی (م ۱۶۸۰ء) کو قومی ہیرو کا درجہ دیا ۔ تلک نے مہاراشٹر میں اس کے بُت بنوا کر نصب کروائے ۔ اس نے گئو کشی کے انسداد کے لئے ایک انجمن قائم کی اور مساجد کے سامنے باجا بجانے کو ہندوؤں کا حق ظاہر کیا ۔ اس نے اپنے اخبار " کیسری " کے ذریعے مسلمانوں کے خلاف خوب زہر پھیلایا ۔

بنگال میں راجہ رام موہن رائے (م ۱۸۳۳ء) کے جانشینوں نے برہمو سماج کو فروغ دیا اور مدراس میں ہندوؤں نے تھیوسوفیکل سوسائٹی کے نام سے ایک مذہبی تنظیم قائم کی ۔ لالہ لاجپت رائے نے آگے چل کر سنگٹھن جیسی نیم فوجی تنظیم کی نیو رکھی ۔ پُونا کے ہندوؤں نے پرارتھنا سماج کی بنیاد رکھی ۔

کاٹھیاواڑ کے ایک برہمن سوامی دیانند (م ۱۸۸۳ء) نے آریہ سماج کی بنیاد رکھی ۔ وہ ہندوؤں کو ویدوں کے زمانے کی طرف واپس لے جانا چاہتا تھا ۔ اس نے "ستیارتھ پرکاش" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جس کے چودھویں باب میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف خوب زہر اُگلا ۔ اسے پنجاب میں شردھا نند (م ۱۹۲۶ء) ، مہاتما ہنسراج (م ۱۹۳۸ء) لالہ لاجپت رائے (م ۱۹۲۸ء) راج پال اور لیکھ رام جیسے سرگرم کارکن مل گئے جنہوں نے اس کے کام کو آگے بڑھایا ۔ اس کے بعد ہندو مہاسبھا قائم ہوئی جو ہندوستان میں ہندو راج قائم کرنے کی داعی تھی ۔

ہندو سیاست دانوں نے بڑی چالاکی اور ہوشیاری کے ساتھ ان تمام مذہبی جماعتوں کا رخ تقسیمِ بنگال منسوخ کرانے کی طرف موڑ دیا ، جس سے اس تحریک کو بڑی تقویت ملی ۔

برطانوی حکومت نے سر بمفیلڈ فلر (Sir Bamfylde Fuller) کو مشرقی بنگال کا گورنر مقرر کیا ۔ وہ بڑا انسان دوست تھا ۔ اپنے عہدے کا چارج سنبھالنے کے بعد اسے یہ معلوم ہوا کہ مسلمان کاشت کاروں کی حالت بڑی پتلی ہے ۔ ہندو زمیندار

بڑی سختی کے ساتھ ان سے لگان اور دوسرے واجبات وصول کرتے ہیں ۔ انہوں نے اپنی مذہبی رسومات ادا کرنے کے لئے بھی مسلمانوں پر ٹیکس لگائے ہوئے ہیں ۔ اسے یہ معلوم کر کے اور بھی تعجب ہوا کہ ہندو زمینداروں نے نجی قید خانے بنائے ہوئے ہیں ۔ جہاں ناجائز ٹیکس ادا نہ کرنے والے مسلمان کاشت کاروں کو قید رکھا جاتا ہے اور ان پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے جاتے ہیں ۔ اس نے مسلمان کاشتکاروں کی حالت بہتر بنانے کی کوشش کی تو ہندوؤں نے اس کے خلاف طوفان کھڑا کر دیا ۔

کانگرسی راہنماؤں نے انگریزوں پر دباؤ ڈالنے کی خاطر انگریزی مصنوعات کا بائیکاٹ کرنے کی کوشش کی ۔ ان کا مقصد انگریزوں کو اقتصادی نقصان پہنچانے کے علاوہ انگلستان میں مزدوروں سے ہڑتال کرانا بھی تھا ۔ کیونکہ جب انگریزی مال کی برِ عظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش میں مانگ نہ ہوئی تو انگلستان کے کارخانوں میں پیداوار کم کرنا پڑے گی اور اس کے لئے مزدوروں کی چھانٹی ضروری ہو جائے گی ۔ اس کے نتیجے میں مزدور حکومت کے خلاف مظاہرے کریں گے ۔

سر بمفیلڈ فلر (م ۱۹۳۵ء) نے اس تحریک کو روکنے کے لئے مختلف اقدام کئے ۔ اس نے طلبہ سے اپیل کی کہ وہ سیاست میں حصہ نہ لیں ۔ سراج گنج میں دو سکولوں کے طلبہ اور اساتذہ نے مظاہروں میں حصہ لیا تو گورنر نے باقاعدہ تحقیق کرانے کے بعد کلکتہ یونیورسٹی سے اپیل کی کہ وہ ان اداروں کا الحاق ختم کر دے ۔ برطانوی حکومت نے گورنر کے اس اقدام کو پسند نہ کیا تو وہ اپنے عہدہ سے استعفیٰ دینے پر تیار ہو گیا ۔ دوسری جانب ہندو اخبارات نے اس کے خلاف زہریلا پروپیگنڈہ شروع کر رکھا تھا ۔ ان حالات میں بمفیلڈ نے استعفیٰ داغ دیا ۔ اس واقعہ پر ہندوؤں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اور وہ اسے اپنی فتح قرار دینے لگے ۔ یہ عجب بات ہے کہ جس اختلاف رائے کی بنا پر سر بمفیلڈ فلر مستعفی ہوا تھا بعد میں حکومت نے ان کے اس اقدام کو صحیح قرار دیتے ہوئے ان سکولوں کے خلاف تادیبی کاروائی کی جن کے طلبہ اور سٹاف نے حکومت کے خلاف مظاہروں میں حصہ لیا تھا ۔

بمفیلڈ فلر کے مستعفی ہونے پر ڈھاکہ میں مسلمانوں نے ایک جلسہ منعقد کیا جس کی صدارت نواب سر سلیم اللہ خان نے کی ۔ اس جلسے میں مسلمانوں نے

اس کے مستعفی ہونے پر سخت رنج و غم کا اظہار کیا اور حکومت کے متلون مزاج ہونے پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ انہی ایام میں بنگال کے ایک مسلم رہنما سید نواب علی چوہدری نے نواب محسن الملک کے نام اپنے خط میں اس بات کا خدشہ ظاہر کیا کہ اب مسلمانوں کے لئے حصول تعلیم اور ملازمتوں کے دروازے بند ہوتے نظر آتے ہیں۔ اس لئے اب مسلمانوں کو بھی اپنے مفاد کی خاطر وہی راستہ اپنانا چاہیے جو ہندوؤں نے اپنایا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان خواب خرگوش سے بیدار ہوں۔

دوسری جانب یہ ہوا کہ مسلمانوں نے صوبہ مشرقی بنگال کے قیام کی سالگرہ منائی اور اس موقع پر مسلم رہنماؤں نے وزیر ہند کی خدمت میں ایک یادداشت روانہ کی۔ اس یادداشت میں اس سے یہ استدعا کی تھی کہ تقسیم بنگال کو "اٹل حقیقت" سمجھا جائے۔ مسلمان یہ چاہتے تھے کہ اس یادداشت کے ذریعے ان کے جذبات وزیر ہند کے ذریعے برطانوی حکومت تک پہنچ جائیں اور وہ ہندوؤں کے آگے نہ جھکے۔ برطانوی حکومت کے ہندوؤں کے آگے جھکنے سے مسلمان ان تمام فوائد سے محروم ہو جاتے جو انہیں نئے صوبے کے قیام سے حاصل ہوئے تھے۔ اسی طرح تقسیم کے دو سال بعد مسلم لیگ کے سالانہ جلسے میں ایک قرارداد کے ذریعے انگریزوں سے یہ توقع ظاہر کی گئی کہ وہ تقسیم بنگال کو "اٹل حقیقت" سمجھتے رہیں۔

ادھر ہندوؤں کی تحریک میں تشدد کا عنصر غالب آگیا۔ انہوں نے انگریزی مصنوعات کا بائیکاٹ کیا ہوا تھا۔ اب وہ توڑ پھوڑ کرنے لگے۔ انہوں نے کئی مقامات پر سرکاری املاک کو نقصان پہنچایا، ذرائع مواصلات کو منقطع کر دیا، اکیلے دُوکیلے انگریزوں پر حملے شروع کئے۔ کچھ مقامات پر بم بھی چلائے گئے اور چند انگریز افسر مارے گئے۔ ان حالات میں برطانوی حکومت تقسیم بنگال منسوخ کرنے پر غور کرنے لگی۔

مسلم لیگ نے ایک خصوصی اجلاس میں ایک قرارداد پاس کی جو ۷ نومبر ۱۹۰۸ء کو وزیر ہند کی خدمت میں روانہ کی گئی۔ مسلم لیگی رہنماؤں نے وزیر ہند پر واضح کر دیا کہ تنسیخ تقسیم مسلمانوں میں اضطراب اور بے اطمینانی کا سبب بنے گی۔ لہٰذا اس اقدام سے گریز کیا جائے۔ دوسری جانب ہندو دہشت گردوں کا زور بڑھتا جا رہا تھا۔ ۱۹۱۰ء میں چند اہم انتظامی تبدیلیاں ہوئیں۔ لارڈ مارلے کی جگہ لارڈ کریو (Lord Crewe)

(d.1945) وزیر ہند مقرر ہوا اور لارڈ منٹو (م ۱۹۱۴ء) کے عہدے کی میعاد ختم ہونے کے بعد لارڈ ہارڈنگ (م ۱۹۴۴ء) وائسرائے بن کر آیا۔ نئے وائسرائے کا دادا لارڈ ہارڈنگ جولائی ۱۸۴۴ء سے جنوری ۱۸۴۷ء تک برعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش میں گورنر جنرل کے منصب پر فائز رہ چکا تھا۔ اس لئے نیا وائسرائے اس ملک میں اجنبی نہ تھا، وہ اس ملک کے مسائل کے حل میں دلچسپی بھی رکھتا تھا۔ وہ ایک جلوس کی شکل میں دہلی میں داخل ہو رہا تھا کہ ایک بنگالی ہندو دہشت گرد نے اس پر بم پھینکا۔ حسن اتفاق سے اس کا نشانہ چوک گیا اور بم وائسرائے کی سواری کے عقب میں چلنے والے ہاتھی پر گرا۔ دھماکے سے فیلبان ہلاک ہو گیا اور وائسرائے کو زخم آئے۔

اسی سال شہنشاہ ہند ایڈورڈ ہفتم کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ جارج پنجم تخت نشین ہوا۔ وہ اپنی ملکہ سمیت ۱۹۱۱ء کے اواخر میں برعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش آیا۔ اس کی آمد پر ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء کو دہلی میں دربار تاجپوشی منعقد ہوا، جس میں تمام ریاستوں کے حکمرانوں اور ملک بھر کے عمائدین نے شرکت کی۔ اس موقع پر جارج پنجم نے دو اہم اعلان کئے۔ ایک اعلان کی رُو سے اس نے کلکتہ کی بجائے دہلی کو برعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کا دارالحکومت قرار دیا اور دوسرے اعلان میں تقسیم بنگال منسوخ کرکے مشرقی بنگال کو مغربی بنگال میں ضم کر دیا۔ جارج پنجم کا یہ دوسرا اعلان مسلمانوں پر بجلی بن کر گرا۔

اس واقعہ پر نواب وقار الملک نے ان الفاظ میں اظہار رائے فرمایا:

> "گورنمنٹ کی یہ پالیسی بمنزلہ ایک توپ خانے کی تھی، جو مسلمانوں کی مردہ لاشوں پر سے گزر گیا۔ بدون اس کے کہ ان غریبوں میں سے کسی میں جان بھی ہے اور اس سے ان کو کوئی تکلیف محسوس ہوئی ہو گی انا للہ و انا الیہ راجعون۔ کہاں کا ٹرپولی، کہاں کا ایران، یہاں تو سرے سے اسلام ہی کا قلع قمع ہوا جاتا ہے"۔

نواب سر سلیم اللہ خان اس صدمے کو برداشت نہ کر سکے اور جلد بعد ۱۹۱۵ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۴۴ برس تھی۔

تقسیم بنگال کی منسوخی سے مسلمانوں کو اس بات کا پختہ یقین ہو گیا کہ

ہندو انہیں کبھی بھی خوش حال اور فارغ البال نہیں دیکھ سکتے اور ان کی ہمیشہ یہی کوشش ہوگی کہ مسلمان اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے ان کے محکوم بن کر رہیں ۔

باب (10)

شملہ وفد

پس منظر:

انیسویں صدی کا آغاز یوپی کے گورنر سرانتونی میکڈانل کی مسلم دشمنی سے ہوا ۔ اس نے ہندوؤں کے مطالبے پر ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء کو اُردو کی بجائے ہندی کو دفتری زبان قرار دے دیا ۔ گورنر کے اس فیصلے سے مسلمانوں کو بڑا رنج ہوا کیونکہ اس کے اس یکطرفہ فیصلے سے مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت خطرے میں پڑ گئی اور ہندو مسلم اتحاد کی فضا مکدر ہو گئی ۔

۱ ۔ گورنر کے اس فیصلے کے خلاف لکھنؤ میں ایک احتجاجی جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت نواب محسنؒ الملک نے کی ۔ اس جلسے میں مسلمانوں نے اپنے جذبات کا کھل کر اظہار کیا اور حکومت کے حالیہ فیصلے کی مذمت کی ۔ نواب محسنؒ الملک نے "اُردو ڈیفنس ایسوسی ایشن" قائم کی جس سے گورنر بڑا زِچ ہوا اور وہ نواب صاحب کو ایم اے اوکالج علی گڑھ کے سیکرٹری کے عہدے سے الگ کرنے پر تل گیا ۔

۲ ۔ برطانوی حکومت نے انتظامی سہولت کی غرض سے ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ۔ مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی واضح اکثریت تھی ۔ اس لئے انہیں اس نئے صوبے کے قیام سے بہت خوشی ہوئی ۔ وہ قریباً نصف صدی کے بعد ہندوؤں کی بالا دستی سے آزاد ہوئے تھے اور اب تعلیم و تجارت ، صنعت و حرفت اور سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان پر وا ہو گئے تھے ۔ ہندو ان کی یہ آزادی کسی قیمت پر برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھے ۔ اس لئے انڈین نیشنل کانگرس نے تقسیم بنگال کی مخالفت شروع کر دی اور اسے منسوخ کرانے کی غرض سے باقاعدہ ایک جارحانہ تحریک شروع کی ۔

۳۔ ہندوؤں میں تعلیم کے فروغ کے بعد ہندو دھرم کے احیاء کا جذبہ پیدا ہوا اور وہ ویدوں کی تعلیم کے مطابق ہندو راج قائم کرنے کے خواب دیکھنے لگے۔ مہاراشٹر (بمبئی پریذیڈنسی) کے متعصب کانگرسی رہنما بال گنگا دھر تلک (م ۱۹۲۰ء) نے ہندو دھرم کے احیاء کے لئے اپنے ہم قوم مرہٹوں کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ اس نے سیواجی کو قومی ہیرو قرار دیا اور مہاراشٹر میں گنپتی پُوجا کا آغاز کیا۔ اس نے انسدادِ گاؤ کشی کے لئے ایک انجمن بھی قائم کی اور ذبیحۂ بقر کے بہانے ہندو مسلم فسادات کو ہوا دی۔ اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ مساجد کے سامنے باجا بجانا ہندوؤں کا پیدائشی حق ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو اس پر احتجاج کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔

۴۔ سوامی دیانند سرسوتی کاٹھیاواڑ کے ایک قصبے ٹنکارا کا برہمن تھا۔ اس نے ہندو دھرم کے احیاء اور ویدوں کی تعلیم کے فروغ کے لئے "آریہ سماج" کی بنیاد رکھی۔ اس نے ستیارتھ پرکاش کے نام سے ایک کتاب لکھی جس کے چودھویں باب میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف خوب زہر اُگلا۔ اس کتاب کی اشاعت سے مسلمانوں کو سخت رنج ہوا۔ پنجاب میں اس تحریک کو مہاتما ہنسراج، سوامی شردھانند، لالہ لاجپت رائے، مہانند، لیکھ رام، پنڈت کالی چرن اور راجپال جیسے سرگرم کارکن مل گئے۔ آریہ سماج نے اسلام دشمنی اور مسلم کشی کو اپنا شعار بنا لیا۔ ہندو اخبارات نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور ہندو مسلم اتحاد کو پاش پاش کر دیا۔

(آریہ سماج نے ہی آگے چل کر شُدھی اور سنگٹھن کے نام سے دو تنظیمیں قائم کیں)۔ آریہ سماج نے ہی ہندو مہا سبھا کے لئے زمین ہموار کی۔

۵۔ مدراس کے ہندوؤں نے تھیوسوفیکل سوسائٹی قائم کی اور بنگال میں راجہ رام موہن رائے (م ۱۸۳۳ء) کے جانشینوں نے "برہمو سماج" کو پھیلانے کی ہر ممکن سعی کی۔ بنکم چندر چیٹرجی (م ۱۸۹۴ء) کے ناول آنند مٹھ نے مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے جذبات بھڑکانے میں بڑا کام کیا۔ پُونا کے علاقے میں "پرارتھنا سماج" کے نام سے ایک ہندو تنظیم قائم ہوئی جس کا رُخ مسلم کشی کی جانب مُڑ گیا۔

۶۔ تقسیم بنگال کے بعد ہندو سیاسی رہنماؤں نے اپنی چالاکی سے ہندوؤں کی مذہبی جماعتوں کا رُخ تقسیم بنگال منسوخ کرانے کی طرف موڑ دیا۔ اس سے ان کی تحریک میں

تشدد کا رنگ غالب آگیا۔ ہندوؤں نے حکومت پر دباؤ بڑھانے کی خاطر بندوقوں اور بموں کا استعمال عام کر دیا۔ اس سے مسلمانوں میں عدمِ تحفظ کا احساس پیدا ہو گیا۔

۷۔ برطانوی حکومت نے ۱۸۹۲ء کے ایکٹ کے تحت میونسپل کمیٹیاں اور ضلعی بورڈ قائم کئے تھے جن کے ارکان کا انتخاب ووٹوں کے ذریعے ہوتا تھا۔ ملک میں ہندوؤں کی واضح اکثریت تھی اس لئے ان اداروں میں کسی مسلمان کا ہندوؤں کے ووٹوں سے منتخب ہونا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ ان اداروں میں مسلمانوں کی عدمِ موجودگی کا احساس مسلمانوں کے علاوہ حکومت کو بھی ہوا۔

۸۔ ۱۹۰۵ء میں برطانیہ میں لبرل پارٹی برسرِ اقتدار آئی تو اس کے رہنماؤں نے یہ اعلان کیا کہ وہ جلد ہی برِ عظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش میں آئینی اصلاحات نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ اس اعلان کے بعد مسلم رہنماؤں کو حکومت تک اپنے جذبات پہنچانے کا خیال آیا اور نواب محسن الملک نے اس کام کی ذمہ داری سنبھالی۔

وائسرائے سے رابطہ:

ایم، اے، او کالج علی گڑھ کا پرنسپل مسٹر ڈبلیو، اے، جے، آرچبولڈ (م ۱۹۲۹ء) شملہ میں موسم گرما کی تعطیلات گزار رہا تھا۔ ان دنوں وائسرائے ہند لارڈ منٹو بھی وہیں تھا۔ نواب محسن الملک نے ۱۰ اگست ۱۹۰۶ء کو بمبئی سے آرچبولڈ کو خط لکھا اور اسے بتایا کہ مسلمان مخلوط انتخاب کی وجہ سے میونسپل کمیٹیوں اور اضلاعی بورڈز کے رکن نہیں بن سکتے۔ اس لئے ان اداروں میں ان کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کے علاوہ بھی مسلمانوں کے بہت سے مسائل ہیں جو وہ وائسرائے کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک اچھی تجویز ہے اس لئے وہ وائسرائے کے سیکرٹری مسٹر ڈنلپ سمتھ (م ۱۹۲۱ء) سے رابطہ قائم کرے اور وائسرائے کے ساتھ مسلمان عمائدین کے وفد کی ملاقات کے لئے وقت لے دے۔ آرچبولڈ نے ۱۰ اگست کو نواب محسن الملک کو امید افزا جواب تحریر کیا اور دوسری جانب نواب صاحب کا خط مسٹر ڈنلپ سمتھ کے توسط سے وائسرائے کی خدمت میں پیش کر دیا۔

ان دنوں وائسرائے لارڈ منٹو (م ۱۹۱۴ء) بھی اصلاحات کے نفاذ پر غور کر

رہا تھا اور اسے اس بات کا بھی احساس ہو چکا تھا کہ ۱۸۹۲ء کے ایکٹ کے تحت قائم ہونے والے اداروں میں مخلوط انتخاب کی وجہ سے مسلمانوں کی نمائندگی صحیح طریقے سے نہیں ہو رہی۔ وہ کانگرس کے نقطۂ نظر سے آگاہ ہو چکا تھا لیکن مسلمانوں کے خیالات جاننا چاہتا تھا۔ جب اس نے نواب محسن الملک کا خط دیکھا تو اسے بڑی مسرت ہوئی اور اس نے وہ خط وزیرِ ہند لارڈ مارلے (م ۱۹۲۳ء) کو لندن بھجوا دیا۔ اس کے بعد اس مسئلے پر وزیرِ ہند اور وائسرائے کے درمیان کئی خطوں کا تبادلہ ہوا۔ مشہور مورخ ڈاکٹر سید رضی واسطی نے اپنی تصنیف

LORD MINTO AND THE INDIAN NATIONALIST MOVEMENT.

میں یہ خطوط شائع کر دیئے ہیں۔ ان خطوں کے مطالعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وائسرائے کو وزیرِ ہند کی مکمل تائید حاصل تھی۔

وزیرِ ہند کو اعتماد میں لینے کے بعد لارڈ منٹو نے یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو مسلم عمائدین سے ملاقات پر آمادگی ظاہر کی۔ دوسری جانب نواب محسن الملک سے مشورے کے بعد عماد الملک بلگرامی (م ۱۹۲۶ء) نے وائسرائے کی خدمت میں پیش کرنے والے ایڈریس کا ڈرافٹ تیار کیا جسے مسلمان زعماء نے ۱۶ ستمبر کو لکھنؤ میں منعقد ہونے والے ایک خصوصی اجلاس میں منظور کیا۔

وفد کی تشکیل:

وائسرائے کی خدمت میں باریاب ہونے والے وفد میں ۳۵ مسلم عمائدین شامل تھے۔ پنجاب کی نمائندگی ملک عمر حیات ٹوانہ (م ۱۹۴۳ء) میاں سر محمد شفیع (م ۱۹۳۲ء)، خلیفہ محمد حسین (م ۱۹۰۸ء) خان بہادر کرنل عبدالمجید خان، شیخ غلام صادق امرتسری اور خواجہ یوسف شاہ نے کی۔ علی گڑھ سے نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، حاجی محمد اسمٰعیل خان، نواب سر مزمل اللہ خان (م ۱۹۳۸ء) نواب حبیب الرحمٰن خان شروانی (م ۱۹۵۱ء) اور صاحبزادہ آفتاب احمد خان (م ۱۹۳۰ء) نے شرکت کی۔ کلکتہ سے عبدالرحیم سید، امیر حسن خان، مرزا شجاعت علی بیگ اور نواب سرفراز حسین خان اور نصیر حسین خان خیال اس تاریخی وفد میں شامل ہوئے۔ پٹنہ صوبہ بہار سے سید

علی امام (م ۱۹۳۲ء) اور مولوی شرف الدین بیرسٹر نے حصہ لیا۔ بمبئی کی نمائندگی سر آغا خان (م ۱۹۵۷ء) مولوی رفیع الدین احمد اور ابراہیم بھائی آدم جی نے کی۔ خیر پور سندھ سے سید اللہ داد شاہ، میمن سنگھ (سلہٹ) سے سید نواب علی چوہدری اور دہلی سے حکیم محمد اجمل خان (م ۱۹۲۷ء) وفد میں شامل ہوئے۔ میسور (جنوبی ہند) کی نمائندگی شاہزادہ بختیار شاہ نے کی۔ مدراس سے احمد محی الدین، الہ آباد سے نبی اللہ اور کرامت حسین، رام پور سے سید عبدالرؤف اور حیدر آباد دکن سے سید سردار علی خان وفد میں شامل ہوئے۔ لکھنؤ کے نواحی قصبے کاکوری کے منشی احتشام علی (م ۱۹۳۳ء) اس وفد میں شریک تھے۔ اس فہرست پر نظر ڈالنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پنجاب سے زیادہ حضرات اس وفد میں لئے گئے تھے۔

اتفاق رائے سے سر آغا خان (م ۱۹۵۷ء) اس وفد کے سربراہ چنے گئے اور انہوں نے ہی وائسرائے کی خدمت میں ایڈریس پیش کیا۔

ایڈریس کی نمایاں خصوصیات:

سر آغا خان نے اپنے ایڈریس میں وائسرائے کو بتایا کہ اس وقت ملک میں چھ کروڑ بیس لاکھ مسلمان موجود ہیں جو کل آبادی کا ایک چوتھائی حصہ ہیں۔ اگر ہندوؤں میں شامل اچھوتوں اور دوسری اقلیتوں کو الگ کر دیں تو مسلمانوں کا تناسب ہندوؤں کے مقابلے میں اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ روس میں آباد مسلمانوں کو مستثنیٰ کر دیں تو برِ عظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش میں مسلمانوں کی تعداد کسی بھی مسلم ملک سے زیادہ ہے۔ مسلمان یہاں ایک سیاسی حیثیت کے مالک ہیں اور وہ ملک کے دفاع میں قابلِ رشک کردار ادا کر رہے ہیں (اس لئے انہیں فراموش نہیں کیا جا سکتا) اور ملک میں یورپی طرز کے نمائندہ اداروں کا قیام یہاں کے مخصوص سماجی، مذہبی اور سیاسی حالات کو مدِ نظر رکھ کر عمل میں لانا چاہیے۔ اگر اس معاملے میں احتیاط نہ برتی گئی تو مسلمان ایک نامہربان اکثریت کے رحم و کرم پر ہوں گے۔

مطالبات:

مسلمانوں کی تعداد اور خدمات بیان کرنے کے بعد سر آغا خان نے مسلمان کی طرف سے یہ مطالبات وائسرائے کی خدمت میں پیش کئے ۔

۱۔ مجالس قانون ساز کے انتخاب میں مسلمانوں کے الگ انتخابی حلقے ہوں ۔
۲۔ میونسپل کمیٹیوں میں ہر فرقہ اپنے نمائندے منتخب کرکے بھیجے ۔
۳۔ مسلمان تعلیم میں بہت پیچھے ہیں اس لئے سرکاری ملازمتوں میں بھرتی کا مروجہ طریقہ ختم کرکے ان کے لئے نشستیں مخص کی جائیں ۔
۴۔ ہائی کورٹوں اور چیف کورٹ میں مسلمان جج مقرر کئے جائیں ۔
۵۔ یونیورسٹیوں کے سنڈیکیٹوں اور سینٹوں میں مسلمانوں کے لئے چند نشستیں مخص کی جائیں ۔
۶۔ حکومت مسلم یونیورسٹی کے قیام کے لئے امداد فراہم کرے ۔

وائسرائے کا جواب:

ایڈریس کا جواب دیتے ہوئے لارڈ منٹو نے مسلمانوں کی خدمات کو سراہا اور ان کے شاندار ماضی کا اعتراف کیا ۔ اس نے سرسید احمد خان کی خدمات گنواتے ہوئے علی گڑھ تحریک کی بھی تعریف کی ۔

وائسرائے نے اس بات کا اعتراف کیا کہ اگر یہاں " ایک فرد ایک ووٹ " کی بنیاد پر انتخاب ہو تو یہاں کے مخصوص حالات کی بنا پر مسلمانوں کو نمائندگی نہیں ملے گی ۔ اس لئے ایسے ادارے ناکام ہو جائیں گے ۔ وائسرائے نے وفد کو اس بات کا یقین دلایا کہ ان کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا اور ان کے مفادات کو نظر انداز نہیں کیا جائے گا ۔

اس موقع پر وائسرائے نے بعض مطالبات کا گول مول جواب دیا لیکن مسلمانوں کو یہ اُمید دلائی کہ حکومت ان کے مطالبات پر ہمدردی کے ساتھ غور کرے گی ۔

رَدِّ عمل:

وائسرائے لارڈ منٹو نے وزیر امور ہند لارڈ مارلے (م ۱۹۲۳ء) کو مسلمانوں کے ساتھ اپنی ملاقات کی تفصیل بتائی تو لارڈ مارلے نے مسلمانوں کی پیش کردہ تجاویز پسند کیں ۔ مسلمانوں نے ہائی کورٹوں میں مسلمان جج مقرر کرنے کا مطالبہ کیا تھا ۔ چنانچہ میاں شاہ دین (م ۱۹۱۸ء) مولوی شرف الدین اور کرامت علی کو علی الترتیب پنجاب ، کلکتہ اور الہ آباد ہائی کورٹ کا جج مقرر کیا گیا ۔ ۱۹۰۹ء میں جب منٹو مارلے اصلاحات کے نام سے ایکٹ نافذ ہوا تو اس میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب کا حق تسلیم کر لیا گیا ۔ یوں اس ایکٹ کی رُو سے برطانوی حکومت نے مسلمانوں کو ہندوؤں سے الگ " قوم " تسلیم کر لیا اور مسلمانوں نے جداگانہ انتخاب کا حق منوا کر پاکستان کی نیو رکھ دی ۔ مشہور قوم پرست مصنّف اور مؤرخ مولوی طفیل احمد منگلوری (م ۱۹۴۶ء) نے اس حقیقت کا برملا اظہار کیا ہے کہ عام مسلمان اس وفد کی کامیابی سے بڑے خوش تھے ۔ مولانا محمد علی جوہر نے بھی اس وفد کی کارکردگی کو COMMAND PERFORMANCE کہا ہے ۔ اس وفد کی کامیابی سے مسلمانوں کے حقوق محفوظ ہوگئے اور وہ ایک سیاسی جماعت قائم کرنے کے لئے سوچنے لگے ۔

ہندوؤں کا رَدِّ عمل:

مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق دینے سے ہندو بہت سی نشستوں سے محروم ہوگئے ۔ پہلے وہ تمام کی تمام نشستیں اپنی عددی برتری کی بنیاد پر جیت لیتے تھے ۔ اس پر انہوں نے بڑا واویلا مچایا اور شملہ وفد کو انگریزوں اور مسلمانوں کی ملی بھگت کا نام دیا ۔ عدالتوں میں مسلمان جج مقرر ہوئے ، ملازمتوں میں مسلمانوں کا کوٹہ مخص ہوا ، مسلم یونیورسٹی کے قیام کے لئے راہ ہموار ہوئی ، ادھر مشرقی بنگال کا مسلم اکثریت کا صوبہ معرضِ وجود میں آچکا تھا ، اس لئے ہندوؤں کے اخبارات نے آسمان سر پر اٹھا لیا ۔ اس موقع پر بعض " مسلمانان ہندو مزاج " بھی ہندوؤں کے ہمنوا ہو گئے اور اسے ہندو مسلم اتحاد کی راہ میں ایک عظیم رُکاوٹ سمجھنے لگے ۔ یہاں وہ یہ بھول گئے تھے کہ ہندی زبان کی سرکاری سطح پر ترویج کرا کے ہندوؤں نے خود افتراق کی پہل کی تھی اور مسلمانوں کو اپنی تہذیب و ثقافت کی حفاظت کرنے پر مجبور کر دیا تھا ۔

باب نمبر(۱۱)

مُسلم لیگ کا قیام

مسلم لیگ کا قیام ڈھاکہ میں ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو عمل میں آیا۔ اس سے قبل مسلمانوں کی اپنی کوئی سیاسی جماعت نہ تھی۔ مسلم عمائدین محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم کو ہی بسا اوقات سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کر لیتے تھے۔ اس سے کانفرنس کے اغراض و مقاصد کو نقصان پہنچنے کا احتمال تھا کیونکہ یہ ایک خالص علمی تنظیم تھی جو مسلمانوں میں فروغ علم کے لئے کوشاں تھی۔

جب ۱۸ مارچ ۱۹۰۰ء کو یوپی کے ہندو نواز گورنر سر انتونی میکڈانل نے اُردو کی بجائے ہندی کو سرکاری دفاتر میں پذیرائی بخشی تو مسلمانوں کو اپنے مفادات اور تہذیب و ثقافت کی حفاظت کی غرض سے ایک سیاسی جماعت قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

۲۱ اور ۲۲ اکتوبر ۱۹۰۱ء کو لکھنؤ میں حامد علی خان کی رہائش گاہ پر مسلم عمائدین کا ایک اجتماع ہوا جس کی صدارت سیّد محمد شرف الدین نے کی۔ اس اجتماع میں نواب وقار الملک نے مسلمانوں کی پس ماندگی، زبوں حالی اور ان کے حقوق کی پامالی کا ذکر کرتے ہوئے ایک سیاسی جماعت کے قیام پر زور دیا۔ حاضرینِ مجلس نے ان کی اس تجویز کو سراہتے ہوئے "پولٹیکل ایسوسی ایشن" کے نام سے ایک سیاسی جماعت قائم کی۔ نواب محسنُ الملک نے مختلف شہروں کے دَورے کئے اور وہاں کے مسلمانوں سے رابطے قائم کرکے انہیں سیاست میں حصہ لینے پر آمادہ کیا۔ مسلم عمائدین کی کوششوں کے باوجود "پولٹیکل ایسوسی ایشن" وہ کام نہ کر سکی جس کی اس سے توقع تھی۔

۱۹۰۵ء میں تقسیمِ بنگال ہوئی تو ہندوؤں کی مذہبی جماعتیں اور انڈین

نیشنل کانگرس اسے منسوخ کرانے پر تُل گئیں اور انہوں نے دہشت گردی کے مظاہرے شروع کر دیئے۔ ہندوؤں کی گندی اور مسلم آزار سیاست نے مسلمانوں کو اپنی الگ سیاسی جماعت قائم کرنے پر مجبور کر دیا تاکہ وہ سیاسی سطح پر ہندوؤں کے غلط پراپیگنڈے کا جواب دے اور مسلمانوں کے حقوق کی نگہداشت کر سکیں۔

۱۸۹۲ء کے ایکٹ کے تحت میونسپل کمیٹیاں، ضلعی بورڈ اور ڈسٹرکٹ کونسلیں قائم ہوئیں تو ہندو اپنی اکثریت کی بنا پر ان اداروں پر قابض ہوگئے۔ محرومی کے اسی احساس سے ایک جانب تو مسلمانوں کو اپنی سیاسی تنظیم قائم کرنے کا خیال آیا اور دوسری جانب انہوں نے شملہ وفد تشکیل دے کر وائسرائے ہند لارڈ منٹو سے ملاقات کی اور اس کے سامنے اپنے مسائل رکھے۔ شملہ وفد کی کامیابی نے مسلمانوں کو ایک نیا حوصلہ اور عزم دیا اور وہ یہ سمجھنے لگے کہ اگر وہ ایک سیاسی جماعت قائم کر لیں تو اپنے مطالبات بہتر طور پر حکومت کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ ان کی یہی سوچ مسلم لیگ کے قیام کا سبب بنی۔

اسی زمانے میں ڈھاکہ کے نواب سر سلیم اللہ خان نے "آل انڈیا مسلم کنفڈریسی" کے نام سے ایک سیاسی جماعت قائم کرنے کی غرض سے مضامین لکھنے اور شائع کرانے شروع کئے۔ اس سے مسلمانوں کی توجہ اپنی الگ سیاسی جماعت قائم کرنے کی جانب مبذول ہوئی۔ ۱۹۰۶ء میں برطانوی حکومت نے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ جلد ہی ملک میں آئینی اصلاحات نافذ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس لئے حکومت کے سامنے مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لئے بھی ایک سیاسی جماعت کے قیام کی ضرورت پیش آگئی تھی۔

دسمبر ۱۹۰۶ء کے آخر میں، شملہ وفد کی وائسرائے ہند کی خدمت میں باریابی کے ٹھیک ڈیڑھ ماہ بعد، ڈھاکہ میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نواب سر سلیم اللہ خان نے ملک کے طول و عرض سے تین ہزار مسلم عمائدین کو ڈھاکہ آنے کی دعوت دی۔ ۳۰ دسمبر کو ڈھاکہ میں مسلم عمائدین کا تاریخ ساز اجلاس منعقد ہوا، جس کی صدارت بزرگ راہنما نواب وقار الملک نے کی۔

نواب وقار الملک نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ جس مقصد کے لئے وہ یہاں جمع ہوئے ہیں وہ نیا نہیں ہے۔ اس کی ضرورت اسی روز پیش آگئی تھی جس روز انڈین نیشنل کانگرس قائم ہوئی تھی۔ سرسید احمد خاں نے اپنے تدبّر اور دور اندیشی سے کانگرس کے عزائم بھانپ لئے تھے اور انہوں نے مسلمانوں کو اس جماعت میں شامل ہونے سے روکنے کی کوشش کی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان کی رائے میں وزن پیدا ہوتا گیا۔ کانگرس کا داخلی اور خارجی اثر دیکھ کر اور بنگال کی تقسیم پر اس کے معاندانہ رویہ کے پیشِ نظر مسلمانوں کا وفد وائسرائے سے ملا اور ان کے ساتھ ہونے والی ناانصافیاں اس کے سامنے پیش کیں۔ اس وفد میں شامل ہونے والے مسلم عمائدین بڑے غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ وہ ڈھاکہ میں جمع ہو کر آئندہ کے لئے لائحہ عمل تیار کریں۔

نواب وقار الملک نے یہ بھی فرمایا کہ اس وقت ملک میں مسلمانوں کی آبادی دوسری اقوام کے مقابلے میں ایک خمس (۱/۵) کے قریب ہے۔ اس لئے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اگر کسی وقت انگریزوں کی حکومت یہاں قائم نہ رہے تو اس وقت وہ قوم اقتدار میں ہوگی جو مسلمانوں سے چار گنا زیادہ ہوگی۔ اس صورت میں مسلمان ان کے غلام بن کر رہ جائیں گے۔ اور ان کی جان، مال، آبرو اور دین خطرے میں پڑ جائیں گے اور وہ اورنگ زیب کا بدلہ صدہا سال گزر جانے کے بعد مسلمانوں سے لیں گے۔ اس لئے آج کا اجتماع ایک سیاسی جماعت قائم کرنے کے لئے ہوا ہے۔

نواب وقار الملک کی مدبرانہ تجویز کی تائید نواب سر سلیم اللہ خان، (م ۱۹۱۵ء) مولانا محمد علی جوہر (م ۱۹۳۱ء) اور مولانا ظفر علی خان (م ۱۹۵۶ء) نے کی اور سر محمد شفیع (م ۱۹۳۲ء) کی تجویز پر اس سیاسی تنظیم کا نام "آل انڈیا مسلم لیگ" تجویز ہوا۔ سر آغا خان کو مسلم لیگ کا صدر اور نواب وقار الملک کو جائنٹ سیکرٹری مقرر کیا گیا۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۰۷ء کو پنجاب مسلم لیگ کی شاخ کا قیام عمل میں آیا۔ میاں شاہ دین اس کے صدر اور سر محمد شفیع سیکرٹری مقرر ہوئے۔

مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا:

مسلم لیگ کے قیام کے وقت نواب سر سلیم اللہ خان نے ایک قرارداد منظوری کے لئے پیش کی، جو مسلمانوں کے ذہن کی عکاسی کرتی ہے۔ اس قرارداد کے خاص خاص نکات یہ تھے:

۱۔ آل انڈیا مسلم لیگ (سرسید احمد خان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے) مسلمانوں میں برطانوی حکومت کے ساتھ وفاداری کا جذبہ پیدا کرے گی۔

(اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ انڈین نیشنل کانگرس کے ہر سالانہ جلسے میں برطانوی حکومت کے ساتھ وفاداری کا اظہار کیا جاتا تھا اور ملکہ وکٹوریہ اور اس کی وفات کے بعد ایڈورڈ ہفتم کے جشن دن کے موقع پر مبارکباد کے تار ارسال کئے جاتے تھے۔ اسی طرح برطانیہ کے وزیراعظم کے جشن دن کے موقع پر بھی مبارکباد کا تار بھیجا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ برطانوی حکومت پر یہ واضح کرنا بھی ضروری تھا کہ مسلم لیگ باغی مسلمانوں کی جماعت نہیں ہے بلکہ وہ حکومت کے ساتھ تعاون کرکے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت چاہتی ہے)۔

۲۔ حکومت کے اقدامات سے پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جائے۔

۳۔ مسلمانوں کے حقوق و مفادات کا بہتر طریقے سے محفوظ کیا جا سکے اور ان کے مطالبات حکومت تک پہنچائے جا سکیں۔

۴۔ دوسرے فرقوں کے خلاف پیدا ہونے والے معاندانہ جذبات روکے جائیں۔

مسلم لیگ کے ابتدائی اجلاس:

مسلم لیگ کا پہلا سالانہ جلسہ ۲۹، ۳۰ دسمبر ۱۹۰۷ء کو کراچی میں ہوا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ مسلم لیگ کا آخری سالانہ اجلاس بھی دسمبر ۱۹۴۳ء میں کراچی میں ہوا جس میں راقم آثم نے اپنے والدِ محترم چودھری طفیل محمدؒ (م ۱۹۶۹ء) اور جدِّ امجد حاجی عمر الدینؒ (م ۱۹۷۷ء) کے ساتھ شرکت کی سعادت حاصل کی تھی)۔ مسلم لیگ کے پہلے اجلاس کے انعقاد سے صرف ڈیڑھ ماہ قبل نواب محسنُ الملک کا انتقال ہوا تھا۔ اس لئے اجلاس کی فضا پر افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ اس وقت نواب وقار الملک مسلمانوں کے مسلّمہ رہنما تھے۔ ان کی دعوت پر بمبئی کے مشہور تاجر اور شملہ وفد کے رکن سر ابراہیم

بھائی آدم جی پیر بھائی نے اجلاس کی صدارت کی۔ اس اجلاس میں مسلم لیگ کے منشور کی منظوری دی گئی۔ صدر جلسہ سر ابراہیم بھائی کے خطبۂ صدارت کو حاضرین نے بے حد سراہا۔

مسلم لیگ کا دوسرا اہم اجلاس ۱۸ مارچ ۱۹۰۸ء کو علی گڑھ میں میاں شاہ دین (م ۱۹۱۸ء) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں ملک کے تمام صوبوں میں مسلم لیگ کی شاخیں قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اسی فیصلے کے تحت سیّد امیر علی (م ۱۹۲۸ء) نے لندن میں مسلم لیگ کی شاخ قائم کی اور پنجاب مسلم لیگ کا الحاق مرکزی مسلم لیگ سے ہوا۔ اسی اجلاس میں حکومت سے عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ کرنے کی بھی سفارش کی۔

مسلم لیگ کا دوسرا سالانہ اجلاس دسمبر ۱۹۰۸ء کے آخری ہفتے میں امر تسر میں سر علی امام (م ۱۹۳۲ء) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کے شرکاء نے حکومت سے تین مطالبات کئے:

۱۔ لوکل بورڈوں کی تشکیل فرقہ وارانہ نمائندگی کی بنیاد پر کی جائے۔
۲۔ پریوی کونسل میں ایک مسلمان اور ایک ہندو جج کا تقرر کیا جائے۔
۳۔ تمام سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو ان کا حق دیا جائے۔

اسی اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے انڈین نیشنل کانگرس کے مطالبے تنسیخِ تقسیمِ بنگال کی مخالفت کی گئی۔

اس اجلاس کے ایک ماہ بعد مسلم لیگی راہنماؤں کا ایک وفد سر علی امام کی قیادت میں ۲۷ جنوری ۱۹۰۹ء کو وزیرِ امورِ ہند لارڈ مارلے سے ملا۔ اس ملاقات میں مسلمانوں نے اس کی توجہ چار امور کی جانب مبذول کرائی۔

۱۔ مسلمانوں کے ساتھ اگر ناانصافی کی گئی تو اس کا ردِ عمل ترکی میں ظاہر ہوگا۔
۲۔ مردم شماری کرتے وقت اچھوتوں اور نیچ ذاتوں کو ہندوؤں سے الگ شمار کیا جائے۔
۳۔ اصلاحات کے نفاذ میں خواہ کتنی ہی تاخیر ہو جائے لیکن دونوں بڑے فرقوں کے مفادات کا فیصلہ الگ الگ ہونا چاہیے۔
۴۔ صوبائی کونسلوں کے انتخاب میں مسلمانوں کے لئے الگ حلقے بنائے جائیں۔

وزیر امورِ ہند لارڈ مارلے نے مسلم لیگی راہنماؤں کی ان تجاویز سے اتفاق کیا اور ۱۹۰۹ء کی منٹو مارلے اصلاحات میں مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق مل گیا۔ یہ بات ہندوؤں کو ناگوار گزری۔ کیونکہ اس سے قبل وہ اپنی اکثریت کے بل بوتے پر میونسپل کمیٹیوں، ضلعی بورڈوں اور ڈسٹرکٹ کونسلوں پر بلا شرکتِ غیرے قابض تھے۔ ان حالات میں مسلمانوں اور ہندوؤں میں کشیدگی پیدا ہو گئی۔ اور ہندوؤں کے اخبارات نے اسے خوب اُچھالا۔

مسلم لیگ اور کانگرس کے تعلقات:

اس موقع پر چند عاقبت اندیش سیاست دانوں نے یہ کوشش کی کہ ہندو اور مسلم راہنما مل کر بیٹھیں اور اپنے اختلافات رفع کر لیں۔ کانگرس کے ۱۹۱۰ء کے سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد کے صدر سر ویڈر برن نے الہ آباد میں ہندو اور مسلم راہنماؤں کا اجلاس طلب کیا۔ قائداعظم محمد علی جناح اس زمانے میں کانگرس کے رکن تھے، ان کی بھی یہی خواہش تھی کہ دونوں قوموں کے اختلافات ختم ہو جائیں اور وہ حصولِ آزادی کے لئے مل کر کوشش کریں۔ سر ولیم ویڈر برن (م ۱۹۱۸ء) (SIR WILLIAM WEDDERBURN) کی دعوت پر دونوں قوموں کے نمائندے الہ آباد میں جمع ہوئے۔ ان دنوں ہندو تقسیمِ بنگال ختم کرانے کے لئے ہر جائز اور ناجائز حربہ استعمال کر رہے تھے اس لئے مفاہمت کی بات آگے نہ بڑھ سکی۔

۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء کو جارج پنجم نے دہلی میں منعقد ہونے والے دربارِ تاجپوشی میں ایک اعلان کے ذریعے تقسیمِ بنگال ختم کر کے مسلمانوں کو دوبارہ ہندوؤں کے زیر دست کر دیا۔ اس پر جہاں کانگرس نے خوشی کا اظہار کیا وہاں مسلمانوں کو سخت رنج ہوا اور وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے کہ ہندو انہیں کسی طرح بھی خوشحال دیکھنا پسند نہیں کرتے۔

قائداعظم محمد علی جناح اس وقت صرف کانگرس کے رکن تھے لیکن ان کی ہمدردیاں مسلمانوں کے ساتھ تھیں۔ جب ۱۹۰۹ء میں منٹو مارلے اصلاحات کے تحت مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق ملا تو وہ مسلمانانِ بمبئی کے نمائندے کی حیثیت سے

سپریم لیجسلیٹو کونسل کے رکن منتخب ہوئے ۔ انہوں نے کونسل کے جلسوں میں بڑی جرات اور قابلیت کے ساتھ مختلف بلوں پر پُر زور تقریریں کیں جس سے ان کی قانون دانی کا شہرہ ملک کے طول و عرض میں پھیل گیا ۔

مسلم لیگ کا باقاعدہ رکن نہ ہونے کے باوجود مسلم لیگ نے انہیں اپنے جلسوں میں تقریریں کرنے کی دعوت دی ، جسے انہوں نے قبول کر لیا ۔ مسلم لیگ نے ۱۹۱۳ء میں لکھنؤ میں منعقد ہونے والے اپنے سالانہ اجلاس میں ان کی تقریر کی روشنی میں اپنی آئندہ پالیسی مرتب کی ۔ یہی وہ تاریخی سال ہے جس میں قائداعظم محمد علی جناح نے مسلم لیگ کی رکنیت حاصل کی ۔ اس زمانے میں کانگرس اور مسلم لیگ کے دستور میں اس کی گنجائش تھی کہ ایک شخص بیک وقت ان دونوں سیاسی جماعتوں کا رکن ہو سکتا تھا ۔

۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں متفقہ طور پر یہ طے پایا کہ تاج برطانیہ کے زیر سایہ رہتے ہوئے آئینی ذرائع سے ایسا طرز حکومت حاصل کیا جائے جو اس ملک کے لئے موزوں ہو اور اس سے لوگوں میں عوامی خدمت کا جذبہ پیدا ہو ۔ اس کے علاوہ مختلف گروہوں کے درمیان تعاون کی فضاء پیدا کر کے انتظام حکومت کو مضبوط بنایا جائے اور ملک میں بہتری کے لئے مسلسل کوشش جاری رکھی جائے ۔

مسلم لیگ اس مدبرانہ حکمت عملی پر گامزن ہو کر کانگرس سے آگے نکل گئی ۔ اس وقت کانگرسی راہنماؤں کو یہ محسوس ہونے لگا کہ انکی حکمتِ عملی مسلم لیگ کی حکمت عملی سے ہم آہنگ ہو چکی ہے اور دونوں جماعتوں کا مطمح نظر ایک جیسا ہی ہے ۔ اس سے سیاست میں ہندو مسلم اتحاد کے امکانات روشن ہو گئے اور قائداعظم جیسے مخلص سیاست دان ہندو مسلم اتحاد کے لئے کوشاں ہو گئے ۔

۱۹۰۷ء اور ۱۹۱۲ء کے درمیان مسلمانانِ برعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش داخلی اور خارجی سیاست میں اُلجھے رہے ۔ ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس (موجودہ لیبیا) پر حملہ کر کے مسلمانوں کو بڑا صدمہ پہنچایا ۔ وہ ابھی اس صدمے سے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ جارج پنجم نے ہندو دہشت گردوں کے دباؤ میں آکر تقسیمِ بنگال ختم کر دی اور نواب

وقار الملک نیم جان مسلمانوں پر بلڈوزر چلا دیا ۔ ۱۹۱۲ء میں فرانس نے مراکش پر قبضہ کر لیا اور ریاستہائے بلقان نے دول یورپ کی شہ پر ترکی کے ساتھ جنگ چھیڑ دی ۔ ان واقعات کا اثر مسلمانوں کی سیاست پر ہوا ۔ مولانا محمد علی جوہر کے قلم نے اس موقع پر تلوار کا کام کیا اور خونِ مسلم کو گرما دیا ۔ ۱۹۱۳ء میں مچھلی بازار کانپور کی مسجد کے انہدام کا سانحہ پیش آیا ۔ اس موقع پر مولانا محمد علی جوہر ، مولانا شبلی نعمانی اور مولوی محمد ظفر علی خان کیفی چریا کوٹی (م ۱۹۵۶ء) جیسے شاعروں نے پُردرد نظمیں لکھیں اور مسلمانوں کو ہلا کر رکھ دیا ۔

۱۹۱۴ء میں پہلی عالمی جنگ کا آغاز ہوا ۔ اس جنگ میں ترکی نے برطانیہ کے خلاف جرمنی کا ساتھ دیا ۔ اس وقت حجازِ مقدس ترکی کے قبضے میں تھا اور شریف مکہ حسین حکومت ترکی کے نمائندے کی حیثیت سے حرمین شریفین کا انتظام چلا رہا تھا ۔ اس جنگ کے آغاز پر مسلمانانِ برعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کو اس بات کا خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں انگریز حجازِ مقدس پر قبضہ کر کے مقاماتِ مقدسہ کی بے حرمتی نہ کریں ۔ انہیں برطانوی فوج کے کمانڈر لارڈ کچنر (م ۱۹۱۶ء) کے ایک بیان سے انگریزوں کے مذموم عزائم کا پتہ چل گیا تھا ۔ ان حالات میں مسلمانوں کی تمام تر ہمدردیاں حکومت ترکی کے ساتھ تھیں ۔

دوسری جانب رُسوائے زمانہ برطانوی شاطر کرنل لارنس (م ۱۹۲۹ء) نے عربوں سے ترکی کے خلاف بغاوت کروا دی اور ترکوں کو مقاماتِ مقدسہ سے نکلنے پر مجبور کر دیا ۔ ان تمام واقعات نے سیاسی میدان میں مسلمانوں اور ہندوؤں میں تعاون کی راہ ہموار کر دی اور قائداعظم جیسے "ہندو مسلم اتحاد کے پیامبر" کی کوشش سے ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں مسلم لیگ اور کانگرس کے مابین ایک سمجھوتہ ہو گیا ۔

باب (12)

جنگِ بلقان اَور مسلمانانِ برِ عظیم

بلقان:

مشرقی یورپ کی وہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں جن کے شمال میں دریائے ساوا اور دریائے ڈینیوب بہتے ہیں اور مشرق میں بحیرۂ اسود اور بحیرۂ ایجئین موجزن ہیں، جن کو جنوب کی طرف سے بحیرۂ رُوم اور جنوب مغرب کی طرف بحیرۂ ایونین گھیرے ہوئے ہیں، جن کے جانب مغرب بحیرۂ ایڈریاٹک واقع ہے، "بلقان" کے نام سے معروف ہیں۔ بلقان کے لفظی معنی پہاڑی علاقے کے ہیں۔

بلقان میں سربیا، کوریشیا، بوسنیا، ہرزوگووینا، مقدونیہ، مونٹی نیگرو، البانیہ، بلغاریہ، رُومانیہ، یُونان اور ترکی کا یورپی علاقہ شامل ہیں۔ البانیہ اور بوسنیا کے علاوہ باقی ریاستوں میں عیسائیوں کی واضح اکثریت ہے۔ ان عیسائیوں کا تعلق عیسائیت کے ایک فرقے گریک آرتھوڈوکس چرچ سے ہے۔ اتفاق سے رُوسیوں کی اکثریت بھی اسی فرقے سے تعلق رکھتی ہے۔ رُوس اس زمانے میں بھی بڑا طاقتور ملک تھا اور وہ بلقان میں بسنے والے اپنے ہم مذہبوں کو ہر قیمت پر تُرکوں کے تسلّط سے آزاد دیکھنے کا متمنی تھا۔ اس معاملے میں دولِ یورپ کی تمام تر ہمدردیاں بلقان کے عیسائیوں کے ساتھ تھیں اور وہ انہیں تُرکوں کے خلاف بغاوت پر اُکساتے رہتے تھے۔

یورپ کے دانشوروں اور شاعروں نے پہلے یونان میں بیداری کی لہر پیدا کی۔ شیلے اور کیٹس جیسے انگریز شاعروں نے یونانیوں کو ان کے ماضی کی یاد دلا کر انہیں تُرکوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا۔ یہیں سے "شرقی مسئلہ" پیدا ہوا اور دولِ یورپ کی مداخلت سے یونان آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یونان کے بعد دوسری

بلقانی ریاستیں بھی حصولِ آزادی کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگیں۔

بلغاریہ ایک زمانے میں بڑی طاقتور ریاست تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی ماتحت ریاستیں آزاد ہوتی گئیں اور وہ ایک چھوٹی سی ریاست رہ گئی جو تُرکوں کے ماتحت تھی۔ دولِ یورپ کی شہ پر بلغاریہ کے عوام اپنی قدیم ریاست کا احیاء کرنا چاہتے تھے اور وہ "بلغاریہ عظمیٰ" کے قیام کا خواب دیکھ رہے تھے۔

بلغاریہ کی طرح سربیا بھی اپنی قدیم ریاست کا احیاء چاہتا تھا۔ اس کی یہ خواہش تھی کہ شاہ اسٹیفن ڈوشن کے زمانے میں جو علاقے اس کی سلطنت میں شامل تھے ان پر دوبارہ اس کا قبضہ ہو جائے اور اس کی ریاست کی حدود بحیرۂ ایجئین اور بحیرۂ ایڈریاٹک تک وسیع ہو جائیں تاکہ اس کے قبضے میں کوئی بندرگاہ آ جائے جس کے ذریعے وہ باقی دنیا سے تعلق قائم کرے۔

مونٹی نیگرو کا حکمران شاہ نکولس ترکی کا باجگزار تھا۔ وہ البانیہ کے مسلم اکثریت کے علاقے پر اپنی نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ اس کی بھی یہی خواہش تھی کہ اسے بحیرۂ ایڈریاٹک کے ساحل پر ایک بندرگاہ مل جائے۔ البانیہ پر قبضے کی صُورت میں اس کی تکمیل ہو سکتی تھی۔ اس لئے سب سے پہلے اسی نے ترکی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔

ترکی کی داخلی حالت:

دوسری جانب عثمانی سلطنت کا زوال بہت عرصہ پہلے شروع ہو چکا تھا۔ دولِ یورپ اسے کئی محاذوں پر شکستیں دے چکی تھیں۔ مصر ایک زمانے میں عثمانی سلطنت کا ایک صوبہ تھا۔ وہاں کے گورنر محمد علی پاشا (م ۱۸۴۹ء) نے سلطان ترکی کے خلاف بغاوت کر دی اور ترکی فوج کو پے در پے شکستیں دے کر اپنی خود مختاری تسلیم کروا لی۔ محمد علی پاشا کے نا اہل جانشین اپنے ملک کا دفاع نہ کر سکے تو برطانیہ نے ۱۸۸۲ء میں مصر پر قبضہ کر لیا۔ اِدھر دولِ یورپ کی کھلم کھلا مداخلت کے سبب یونان نے آزادی حاصل کر لی۔ شمالی افریقہ کے ممالک پر فرانس اور اٹلی نظریں لگائے بیٹھے تھے۔ اٹلی نے ۱۹۱۱ء میں طرابلس (موجودہ لیبیا) پر قبضہ کر لیا اور فرانس نے تیونس، الجزائر اور مراکش پر تسلّط جما لیا۔ یوں عثمانی حکومت بہت کمزور ہو گئی اور مغربی مؤرخین اسے

"مردِ بیمار" کہنے لگے۔

اس زمانے میں عثمانی سلطنت کی اندرونی حالت بڑی نازک ہو رہی تھی۔ قدامت پسند اور ترقی پسند سیاست دان ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو رہے تھے۔ ۱۹۰۹ء میں ترقی پسند گروہ نے عثمانی خلیفہ عبدالحمید ثانی کو معزول کرکے اس کی جگہ سلطان محمد خامس کو تختِ خلافت پر بٹھا دیا۔ اس کی پوزیشن شاہ شطرنج سے زیادہ نہ تھی۔ ان حالات میں دولِ یورپ ہاتھ دھوکر "مردِ بیمار" کے پیچھے پڑ گئیں اور اسے اس کے یورپی مقبوضات سے بیدخل کرنے کے لئے ریاستہائے بلقان کی کھلم کھلا حمایت کرنے لگیں۔

آغازِ جنگ:

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے سب سے پہلے مونٹی نیگرو کے حکمران شاہ نکولس نے ۸ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو ترکی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ یونان اور بلقان کی دوسری ریاستیں بھی جنگ میں کود پڑیں۔ ان اتحادیوں نے قرق کلیسہ اور کولولوبرگاس کے معرکوں میں ترک فوج کو بھاری جانی نقصان پہنچایا۔ وسطِ نومبر تک ادرنہ شہر کے علاوہ ترکی کے یورپی حصے پر بلقانی افواج کا قبضہ ہو گیا۔

دوسری جانب سربیا کی فوج پوری تیاری کے ساتھ ترکوں کے مقابلہ کے لئے نکلی اور اس نے کمانوفو کے میدان میں ترک فوج کو شکست دی۔ ادھر مونٹی نیگرو کی فوج سقوطری تک پیشقدمی کر آئی۔ ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یونان نے سالونیکا پر قبضہ کر لیا۔ یونان کی بحریہ نے ہمت سے کام لیتے ہوئے بحیرۂ ایجین میں واقع تمام جزائر پر تسلط قائم کر لیا۔

اسی زمانے میں برطانیہ کے وزیرِاعظم مسٹر ایسکوئتھ نے یہ اعلان کیا کہ موجودہ حالات میں یورپ کا سیاسی نقشہ ازسرِ نو مرتب کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ اس نے اس موقع پر یہ بھی کہا کہ فاتحین کو ان ثمرات سے محروم کرنا نامناسب ہوگا، جو انہوں نے اتنی گراں قیمت پر حاصل کئے ہیں۔

دولِ یورپ کی مداخلت پر ۳ دسمبر ۱۹۱۲ء کو طرفین میں جنگ بند ہو گئی

اور ۱۶ دسمبر کو لندن میں صلح کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس موقع پر بلغاریہ نے مستقل صلح کے لئے ادرنہ کے بلغاریہ کے ساتھ الحاق کی شرط لگائی جو عثمانی حکومت کے لئے قابلِ قبول نہ تھی۔ اس طرح بلغاریہ کی حرص اور ہٹ دھرمی کے باعث صلح کانفرنس ناکام ہو گئی۔

اسی زمانے میں ترکی کی داخلی سیاست میں انقلاب رُونما ہوا۔ ریاستہائے بلقان کے ہاتھوں ترک قوم کی جو تذلیل ہوئی تھی ترکوں نے اس کا ذمہ دار صدرِاعظم کامل پاشا کو ٹھہرایا۔ اس نے شدید دباؤ کے تحت اپنے عہدے سے استعفیٰ دیدیا اور اس کی جگہ محمود شوکت پاشا نے لی۔

ادھر ۳ فروری ۱۹۱۳ء کو بلغاریہ نے ادرنہ پر حملہ کرکے عارضی صلح توڑ دی۔ بلغاریہ نے بولیر کے مقام پر ترک فوج کو شکست دی۔ اسی زمانے میں یونان نے بھی عارضی صلح توڑ کر ترکی کے خلاف جنگ شروع کر دی۔ ترکی ان دو محاذوں پر غنیم کا مقابلہ نہ کر سکا اور ۲۶ مارچ کو ادرنہ ترکوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔

دولِ یورپ کے ایماء پر لندن میں ایک بار پھر صلح کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس موقع پر صلح کی کوشش کامیاب ہوئی اور ۳۰ مئی ۱۹۱۳ء کو طرفین میں صلح ہو گئی۔ اس صلح نامہ کی رُو سے عثمانی حکومت کئی علاقوں اور بہت سے جزیروں کی ملکیت سے دستبردار ہو گئی۔

جنگِ بلقان کا برِ عظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش پر اثر:

جس زمانے میں ترکی ریاستہائے بلقان سے نبرد آزما تھا ان دنوں برِ عظیم کے مسلمانوں میں بڑا جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ ان کی تمام تر ہمدردیاں ترکوں کے ساتھ تھیں۔ برِ عظیم کے مسلمان برطانوی ہند میں رہتے ہوئے عثمانی خلیفہ کی اطاعت کو مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔ عیدین اور جمعہ کے خطبات میں عثمانی خلیفہ کا نام لیا جاتا تھا اور اس کے لئے دُعا کی جاتی تھی۔ اس لئے ان کے دلوں میں خلیفہ کا بے حد احترام تھا اور وہ کسی قیمت پر بھی اس کی سبکی ہوتے نہ دیکھ سکتے تھے۔

مولانا محمد علی جوہر اس وقت مسلمانوں کے مسلمہ قائد تھے۔ انہوں نے

اپنے قلم اور زبان کے ذریعے ملک بھر کے مسلمانوں میں ایثار اور قربانی کا جذبہ بھر دیا اور وہ ترکوں کی خاطر تن من اور دھن کی بازی لگانے پر تیار ہوگئے۔ جب ترکوں کو مختلف محاذوں پر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، اور اخبارات میں زخمی ترک فوجیوں کی تصویریں شائع ہوئیں تو زخمیوں کی مرہم پٹی اور علاج معالجے کے لئے ایک طبی وفد ترکی بھیجنے کا فیصلہ ہوا۔ مسلم قائدین نے عوام سے چندے کی اپیل کی جس پر عوام نے لبیک کہا۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری (م ۱۹۳۶ء) جب ڈاکٹروں کی ایک ٹیم لے کر ترکی روانہ ہونے لگے تو مولانا محمد علی جوہر نے جوش اور فرطِ عقیدت سے ان کے قدم چُومے۔ اسی بات سے مسلمانوں کے جوش و جذبے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مسلمانوں نے ملک کے طول و عرض میں جلسے منعقد کئے جن میں دولِ یورپ اور خاص طور پر جنگِ بلقان میں انگریزوں کے کردار پر سخت تنقید کی۔ کہنے کو تو جنگ برِعظیم سے ہزاروں میل کے فاصلے پر لڑی گئی تھی لیکن اس نے برِعظیم کے مسلمانوں میں جذبہ ایثار و قربانی کے ساتھ سیاسی شعور پیدا کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ مسلمانوں نے یہ ثابت کر دکھایا کہ ان کے دل دنیا بھر میں بسنے والے مسلمانوں کے ساتھ دھڑکتے ہیں۔ جنگ طرابلس اور جنگِ بلقان نے برِعظیم کے مسلمانوں کے دلوں میں عالم اسلام کے ساتھ ہمدردی پیدا کر دی اور انہوں نے یہ شعر صحیح ثابت کر دکھایا:

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

باب (13)

سانحہ مسجدِ کانپور

یوپی میں دریائے گنگا کے کنارے کانپور ایک بڑا تجارتی، مذہبی اور ثقافتی مرکز ہے۔ ہندو چمڑے کے کام اور کاروبار کو معیوب سمجھتے ہیں اس لئے مسلمانوں نے اس شہر میں چمڑا رنگنے کے متعدد کارخانے قائم کئے تھے۔ اس کے علاوہ جوتے اور چمڑے کا سامان بنانے کی صنعت بھی ان کے ہاتھوں میں تھی جس کی وجہ سے کانپور کے مسلمان بڑے خوشحال تھے اور وہ شہر میں کئی تعلیمی، دینی اور رفاہی ادارے چلا رہے تھے۔

کانپور اُردو ادب اور صحافت کا بھی مرکز تھا۔ منشی دیا نرائن نگم (م ۱۹۴۲ء) کا مجلہ "زمانہ" اور مولانا حسرت موہانی (م ۱۹۵۱ء) کا رسالہ "اُردوئے معلّی" وہیں سے شائع ہوتے تھے۔ کانپور میں درجنوں شاعر پیدا ہوئے جنہوں نے اُردو شاعری میں نکھار پیدا کیا۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نوّر اللہ مرقدہٗ (م ۱۹۴۳ء) کانپور کے ایک محلے پٹکہ پور میں جامع العلوم نامی ایک مدرسے میں کئی سال تک درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ کانپور کے قرب و جوار میں جاجمئو، موہان، اناؤ، بانگر مئو، گنج مراد آباد، صفی پور، انبیا پور، ملاواں اور بلہور جیسے مسلم آبادی کے بہت سے تاریخی قصبے ہیں جن کا اپنا الگ سے اسلامی تشخص برقرار ہے۔

یوپی کی صوبائی حکومت نے ۱۹۰۸ء میں کانپور کی سڑکوں کی توسیع کے لئے دو لاکھ پچاس ہزار روپے کی رقم مختص کی۔ اس منصوبے میں اے۔ بی۔ روڈ کی توسیع بھی شامل تھی۔ اس اے۔ بی۔ روڈ پر مچھلی بازار میں سڑک کے عین درمیان میں ایک چھوٹا سا مندر تھا جو ناجائز تجاوز کرکے بنایا گیا تھا اور اس وقت کسی نے اس کا نوٹس نہیں لیا۔ اس مندر کے صحن میں پیپل کا ایک پیڑ تھا۔ پیپل ہندوؤں کے نزدیک ایک

مقدس درخت ہے، جسے کاٹنا مہا پاپ (گناہ کبیرہ) ہے۔ قرائن بتاتے ہیں کہ پہلے یہاں پیپل کا درخت تھا جس کے گرد ہندوؤں نے مندر تعمیر کر لیا۔ اس مندر کی وجہ سے سڑک تنگ ہو گئی اور ٹریفک بند رہنے لگی۔ سڑک کو کھلا کرنے کے لئے مندر کو اپنی جگہ سے ہٹانا ضروری تھا۔ کانپور کی میونسپل کمیٹی میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ اس لئے انہوں نے حکومت پر واضح کر دیا کہ مندر اپنی جگہ پر رہے گا اور اگر اسے کسی بھی قسم کا نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی تو وہ احتجاجی تحریک چلائیں گے۔ انگریز حکام تقسیمِ بنگال کی تنسیخ کے لئے چلائی جانے والی احتجاجی تحریک کا تجربہ کر چکے تھے اس لئے انہوں نے مندر کو تو نہیں چھیڑا لیکن اس کے بالمقابل مچھلی بازار کی مسجد کے مشرقی حصے کو گرانے کے بارے میں سوچنے لگے۔ مسلمانوں کے کانوں میں بھی اس منصوبے کی بھنک پڑ گئی اور وہ مسجد کے بارے میں متفکر رہنے لگے۔

۱۹۱۳ء میں یوپی کے گورنر نے کانپور کا دورہ کیا اور موقع پر جا کر مسجد اور مندر کا جائزہ لیا۔ اس موقع پر مسلمانوں نے گورنر کی خدمت میں درخواست پیش کی جس میں ان کے مذہبی جذبات کا خیال رکھنے کی التماس کی گئی تھی۔ گورنر نے مسلمانوں اور ہندوؤں کو اس بات کی یقین دہانی کرائی کہ ان کے معابد محفوظ رہیں گے۔ گورنر کا یہ بیان ۲۲ نومبر کو ایک مقامی اخبار "ہیرلڈ آف انڈیا" میں چھپا جس سے مسلمان مطمئن ہو گئے۔

گورنر کی اس یقین دہانی کے باوجود میونسپل کمیٹی، جس میں ہندوؤں کی واضح اکثریت تھی، مسجد کا کچھ حصہ منہدم کرنے پر آمادہ نظر آتی تھی۔ ایک روز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر ٹائلر مسجد کے معائنے کے لئے آیا اور وہ جوتوں سمیت مسجد کے مشرقی حصے میں چلا گیا۔ جب وہ مسجد سے باہر نکلا تو اس نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ وہ جوتوں سمیت مسجد کے مشرقی حصے میں داخل ہوا تھا اس لئے یہ مسجد کا حصہ نہیں ہے۔ مسلمان سمجھ گئے کہ حکومت مسجد کو منہدم کرنے کا ارادہ کر رہی ہے۔ ۱۲ اپریل ۱۹۱۳ء کو مسلمانانِ کانپور کی طرف سے بیرسٹر شاہد حسین نے گورنر مسٹر مسٹن (م ۱۹۴۳ء) سے اس معاملے میں مداخلت کرنے کی اپیل کی، دوسری جانب مسلم اخبارات نے بھی گورنر کی توجہ اس جانب مبذول کرائی۔ حکومت چونکہ مسجد پر دست اندازی کا ارادہ کر چکی

تھی اس لئے مسلمانوں کی درخواستوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ "اعمال نامہ" کے مصنف سر رضا علی (م ۱۹۴۹ء) کے خیال میں سانحہ کانپور انگریزی تدبر کی بدترین مثال ہے۔

یکم جولائی ۱۹۱۳ء کو صبح منہ اندھیرے مسلح پولیس کے دستوں نے مسجد کو گھیرے میں لے کر اس طرف جانے والے تمام راستے بند کر دیئے۔ پولیس کی نگرانی میں مزدوروں نے مسجد کا مشرقی حصہ جو سڑک کی جانب تھا گرا دیا۔ حکومت کا یہ کہنا تھا کہ یہ حصہ بطور وضو خانہ اور طہارت خانہ استعمال ہوتا ہے، اس لئے یہ مسجد کا مقدس حصہ نہیں ہے۔

مسلمانوں کو مسجد کی بے حرمتی کا سخت ملال ہوا۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ اگر سڑک ہی چوڑی کرنا مقصود تھا تو مندر کو سڑک کے درمیان سے ہٹایا جاتا جو بلا اجازت اور شرارتاً مسجد کے بالمقابل تعمیر کیا گیا تھا۔ ۳ جولائی کو مسلمانوں نے عیدگاہ کے میدان میں احتجاجی جلسہ منعقد کیا۔ جس میں مولانا آزاد سبحانی (م ۱۹۵۷ء) نے مسجد کی بے حرمتی اور مذہب میں مداخلت کرنے پر حکومت کی پالیسی پر کڑی تنقید کی۔ جلسے کے اختتام پر پانصد کے قریب جوشیلے مسلمان مچھلی بازار پہنچ اور مسجد کے منہدم شدہ حصے کی اینٹیں زمین سے اکٹھی کر کے بغیر مسالے کے اس کی اصلی جگہ پر رکھنے لگے۔ اس پر پولیس نے مداخلت کی اور مجمع کو منتشر کرنے کی غرض سے چند ہوائی فائر کئے۔ مجمع میں سے کسی جوشیلے مسلمان نے پولیس پر پتھراؤ کیا جس پر ڈیوٹی پر مامور مجسٹریٹ نے گولی چلانے کا حکم دیا۔ پندرہ منٹ تک نہتے مسلمانوں پر گولیاں چلتی رہیں۔ سر رضا علی کے قول کے مطابق حکومت نے اس موقع پر صبر و تحمل اور فہم و فراست سے کام لینے کی بجائے تشدد کا راستہ اختیار کیا۔

پولیس کی اندھا دھند فائرنگ سے سرکاری اطلاع کے مطابق ۱۹ مسلمان جاں بحق اور ۳۰ زخمی ہوئے جبکہ غیر سرکاری ذرائع کے مطابق ۲۰ تا ۳۰ مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا جن میں نو عمر لڑکے بھی شامل تھے۔ زخمیوں کی تعداد درجنوں تک پہنچ گئی۔ فائرنگ کے بعد پولیس نے ۱۷۵ مسلمان گرفتار کرلئے جن میں ۵۰ لڑکے بھی تھے۔ ان لڑکوں کو پولیس نے چوبیس گھنٹے نورسٹل جیل میں رکھ کر رہا کر دیا اور بالغ مردوں کے خلاف مقدمات درج کروا دیئے۔

اس سانحہ پر ملک کے طول و عرض میں مسلمانوں نے غم و غصے کا اظہار کیا۔ میرٹھ کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے خواجہ حسن نظامی نے کہا کہ حکومت نے مسجد سے محبت کرنے والے مسلمانوں پر گولی چلا کر انہیں خاک و خون میں نہلا دیا اور مسجد کے سامنے ہمارے بوڑھے بزرگوں کی لاشیں تڑپ تڑپ کر گریں اور ان کی سفید داڑھیاں لال ہو گئیں۔

مولانا شبلی نعمانی نے ان الفاظ میں اپنے جذبات کا اظہار فرمایا:

مساجد کی حفاظت کے لئے پولیس کی حاجت ہے
خدا کو آپ نے مشکور فرمایا، عنایت ہے
پہنائی جا رہی ہیں عالمانِ دین کو زنجیریں
یہ زیور سیدِ سجاد عالی کی وراثت ہے
یہی دس بیس اگر ہیں کشتگانِ خنجر اندازی
تو مجھ کو سستیِ بازوئے قاتل کی شکایت ہے
شہیدانِ وفا کے قطرۂ خوں کام آئیں گے
عروسِ مسجد زیبا کو افشاں کی ضرورت ہے
عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
کہ یہ بچے ہیں ان کو جلد سو جانے کی عادت ہے

نو عمر بچوں کی شہادت اور پچاس لڑکوں کی گرفتاری سے مولانا شبلی نعمانی بڑے مضطرب ہوئے۔ اس پر انہوں نے یہ اشعار رقم فرمائے:

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جان نظر پڑے
دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفلِ خورد سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر
بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
آئے تھے اس لئے کہ بنائیں خدا کا گھر
نیند آ گئی ہے منتظرِ نفخ صُور ہیں

کچھ نوجواں ہیں بے خبرِ نشۂ شباب
ظاہر میں گرچہ صاحبِ عقل و شعور ہیں
اٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ
مجرم کوئی نہیں ہے مگر ہم ضرور ہیں
سینے پہ ہم نے روک لئے برچھیوں کے وار
ازبسکہ مست بادۂ ناز و غرور ہیں
ہم آپ اپنا کاٹ کے رکھ دیتے ہیں جو سر
لذت شناس ذوقِ دلِ ناصبور ہیں
کچھ پیر کہنہ سال ہیں دلدادۂ فنا
جو خاک و خوں میں ہمہ تن غرقِ نور ہیں
پوچھا جو میں نے۔ کون ہو تم۔ آئی یہ صدا
ہم کشتگانِ معرکۂ کانپور ہیں

شبلی نعمانی اور ان جیسے دوسرے شعرا نے خونِ مسلم کو گرمانے کے لئے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ مسلمان ابھی دولِ یورپ کے ہاتھوں طرابلس، مراکش اور بلقان میں مسلمانوں کے قتلِ ناحق پر نوحہ کناں تھے کہ حادثۂ کانپور پیش آ گیا۔ ملکہ وکٹوریہ نے ۱۸۵۸ء کے اعلان میں برِّعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کے عوام کو مذہبی آزادی دی تھی۔ ۱۹۱۳ء میں اس کے پوتے جارج پنجم کے عہدِ حکومت میں مذہبی معاملات میں مداخلت ہو رہی تھی اور اللہ کے گھر ڈھائے جا رہے تھے۔ سانحۂ کانپور نے ملک کے طول و عرض میں بسنے والے مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

مسلمانوں کا ایک وفد محمد علی خان راجہ صاحب محمود آباد (م ۱۹۳۱ء) کی قیادت میں گورنر کو مسلمانوں کے جذبات سے آگاہ کرنے کے لئے ۱۹ اگست کو لکھنؤ گیا۔ اس وفد میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی (م ۱۹۲۶ء) نواب محمد اسحٰق خان (م ۱۹۱۸ء) نواب مزمل اللہ خان (م ۱۹۳۸ء) سر رضا علی (م ۱۹۲۹ء) اور شیخ شاہد حسین شامل تھے۔ وفد نے

گورنر سے کہا کہ وہ مسلمانوں کے جذبات و اضطراب کے پیشِ نظر مسجد کے مسمار شدہ حصے کی دوبارہ تعمیر کی اجازت دے دے تاکہ مسلمانوں کا جوش ٹھنڈا ہو جائے۔ دوسری جانب حکومت اس مسئلے کو اپنے وقار کا مسئلہ بنا چکی تھی، اس لئے بات آگے نہ بڑھی۔

سر علی امام (م ۱۹۳۲ء) ان دنوں وائسرائے کی کونسل کے رکن تھے۔ انہوں نے مولانا محمد علی جوہر کے ذریعے ان کے شیخِ طریقت مولانا عبدالباری فرنگی محلی کو مصالحت کا پیغام بھجوایا اور حکومت کی طرف سے یہ وعدہ کیا:

۱۔ حکومت نے جن افراد کو گرفتار کیا ہے انہیں بلاتاخیر رہا کر دیا جائے گا۔

۲۔ ملزموں کے خلاف درج شدہ مقدمات واپس لے لئے جائیں گے۔

۳۔ سانحۂ کانپور کے متاثرین کی مالی امداد کی جائے گی۔

سر علی امام نے مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے یہ درخواست کی کہ کانپور کے مسلمان ان مراعات کے بدلے مسجد کے مسمار شدہ حصے کی دوبارہ تعمیر پر اصرار نہ کریں اور یہ معاملہ یہیں ختم کر دیں۔

مسلمانوں نے مقدمات کی پیروی کے لئے ایک انجمن قائم کی۔ محمد علی خان راجہ صاحب محمود آباد، بیرسٹر محمد نسیم، منشی احتشام علی، اظہر علی اور مظہر الحق اس انجمن کے رُوحِ رواں تھے۔ مسلم وکلاء نے بلا فیس مقدمات کی پیروی کی۔ اس موقع پر مولانا محمد علی جوہر اور سر وزیر حسن (م ۱۹۴۷ء) سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ ایک وفد لے کر انگلستان گئے۔ وہاں کی حکومت سانحۂ مسجد کانپور کے مسئلے پر مسلمانوں کے جذبات سے کما حقہٗ آگاہ نہ تھی، اس لئے وفد کو برطانوی حکومت تک اپنے خیالات پہنچانے میں بڑی دشواری پیش آئی۔

ادھر چند مسلمانوں نے وائسرائے ہند لارڈ ہارڈنگ (م ۱۹۵۴ء) کو کانپور جا کر جائے وقوعہ کا معائنہ کرنے پر آمادہ کر لیا۔ اس نے کانپور آکر مقامی حکام اور مسلمانوں میں مصالحت کرا دی۔ مسجد کے مسمار شدہ حصے کے بارے میں یہ تصفیہ ہوا کہ زمین سے آٹھ فٹ اونچا چھتہ تعمیر کیا جائے اور اس پر وضو خانہ اور طہارت خانہ بنائے جائیں۔ اس چھتے کے نیچے ایک محراب دار راستہ بنا دیا جائے۔

کہنے کو تو سانحۂ مسجد کانپور ایک مقامی مسئلہ تھا لیکن اس نے پُورے ملک کے مسلمانوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس واقعہ کے بعد مولانا آزاد سبحانی ملکی سطح پر متعارف ہوئے اور وہ سیاست میں بھرپُور حصہ لینے لگے۔ (راقم الحروف کو ۲۸ اگست ۱۹۸۳ء کو اس تاریخی مسجد میں نماز ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ الحمد للہ)

باب (14)

جنگِ عظیم اوّل کا آغاز اور تحریکِ ریشمی رُومال

اگست ۱۹۱۴ء میں برطانیہ اور جرمنی کے مابین جنگ چھڑ گئی جس نے جلد ہی عالمی جنگ کی شکل اختیار کر لی۔ ان دنوں ترکی میں عنانِ اقتدار ترقی پسند نوجوانوں کے ہاتھوں میں تھی اور ان کے قائد غازی انور پاشا (م ۱۹۲۲ء) کا جھکاؤ جرمنی کی طرف تھا۔ اس بنا پر حکومتِ ترکی کی تمام تر ہمدردیاں جرمنی کے ساتھ تھیں۔ اس موقع پر ترکی کے حکمران سلطان محمد خامس نے ایک جلسۂ عام میں خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے جہاد کا فتویٰ صادر کیا جس میں دنیا بھر کے مسلمانوں کو برطانیہ اور اس کے حلیفوں کے خلاف جہاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کا "حکم" دیا۔

برطانیہ کی سازش:

جنگ کے آغاز پر شام، عراق، لبنان، موجودہ سعودی عرب اور فلسطین (جس میں اسرائیل اور اُردن شامل تھے) ترکی کے ماتحت تھے۔ اس زمانے میں یہ ممالک ترکی سلطنت کے صوبوں کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے اور ان کا نظم و نسق چلانے کے لئے ترکی سے گورنر بھیجے جاتے تھے۔ اس لئے ان ملکوں پر برطانیہ اور اس حلیف نظریں لگائے بیٹھے تھے۔ جنگ شروع ہوتے ہی مشہور انگریز شاطر کرنل لارنس سعودی عرب پہنچ گیا۔ وہ شریفِ مکہ حسین اور اس کے بیٹوں فیصل (م ۱۹۳۳ء) اور عبداللہ (م ۱۹۵۱ء) کو ترکوں کے خلاف بغاوت پر اکسانے لگا۔ برطانوی حکومت نے حسین سے یہ وعدہ کیا کہ وہ ترکی میں خلافت کے خاتمے کے بعد اسے خلیفہ تسلیم کر لے گی اور اس کے فرزند فیصل کو شام کا بادشاہ بنا دے گی اور عبداللہ کو فلسطین کے تخت پر بٹھا دے گی۔

مسلمانانِ برعظیم اور خلیفہ:

برعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کی اکثر و بیشتر مساجد میں نمازِ جمعہ اور عیدین کے موقعوں پر خلیفۃ المسلمین کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ یہاں بسنے والے مسلمانوں کی عجیب حالت تھی۔ ایک جانب تو وہ شاہِ برطانیہ کی رعایا تھے اور دوسری جانب وہ خلیفۃ المسلمین کو اپنا دینی پیشوا مانتے اور اسے احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ جانشینِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت سے وہ خلیفۃ المسلمین کے فرمان پر عمل کرنا "فرضِ عین" سمجھتے تھے۔ جنگ کے آغاز پر مسلمانوں کو اس بات کی فکر ہوئی کہ کہیں انگریز ترکوں کی دشمنی میں حجازِ مقدس پر قبضہ کر کے حرمین شریفین کی بے حرمتی نہ کریں۔ برطانوی فوج کے سربراہ لارڈ کچنر کے ایک بیان سے مسلمانوں کے اس خدشے کو مزید تقویت ملی۔ اسی زمانے میں حرمین شریفین کے تقدس کو برقرار رکھنے کی غرض سے "انجمن خدامِ کعبہ" کے نام سے ایک تنظیم قائم کی گئی جس کے اراکین نے حرمین شریفین کی حرمت پر کٹ مرنے کا حلف اٹھایا۔ برطانیہ کی فوج میں پنجاب کے لاکھوں مسلمان سپاہی شامل تھے جو مختلف محاذوں پر دادِ شجاعت وصول کر رہے تھے۔ ان کی وفاداری کو متزلزل ہونے سے روکنے اور عوام کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لئے برطانوی حکومت نے یہ اعلان کیا کہ وہ ہر حالت میں حرمین شریفین کا تقدس برقرار رکھے گی۔

شیخ الہندؒ کا منصوبہ:

جنگ چھڑتے ہی برعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش سے انگریز سپاہی مختلف محاذوں پر روانہ ہو گئے اور یہاں مقیم انگریز فوجیوں کی تعداد بہت کم رہ گئی۔ ان حالات میں مسلمانوں کے بہی خواہ مجاہدِ اعظم اور دارالعلوم دیو بند کے صدر مدرس شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے دل میں یہ بات آئی کہ اگر اس وقت مسلمان حصولِ آزادی کی خاطر کوئی مثبت قدم اٹھائیں تو وہ اس مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ شیخ الہند یہ بخوبی جانتے تھے کہ انگریزوں جیسی عظیم قوت کو آئینی طریقے یا بغیر تشدد کے اس ملک سے نکالنا ممکن نہیں ہے اس کے لئے محفوظ مراکز، اسلحہ اور مجاہدین کی ضرورت ہوگی۔

شیخ الہند کے تلامذہ میں صوبہ سرحد، آزاد قبائل اور افغانستان سے تعلق

رکھنے والوں کی بڑی تعداد شامل تھی ۔ یہ لوگ صحت مند، قوی ہیکل اور فوجی مزاج کے حامل تھے اور ان میں جہاد کی رُوح پھونکنا ضروری تھی ۔ اس غرض سے "جنودِ ربّانیہ" کے نام سے مجاہدین کی فوج تیار کی گئی ۔ شیخ الہند نے اپنے شاگردِ رشید مولانا فضلِ رَبّی اور حاجی فضلِ واحد المعروف بہ حاجی صاحب ترنگ زئی (م ۱۹۳۷ء) کو قبائلی علاقے میں فوج تیار کرنے پر مامور کیا ۔ شیخ الہند کے خادمِ خاص مولانا عُزیر گُل (م ۱۹۸۹ء) نے راقم الحروف کو بتایا کہ وہ حضرت شیخ الہند اور حاجی صاحب ترنگ زئی کے درمیان رابطہ قائم رکھے ہوئے تھے ۔ شیخ الہند ایک چھڑی کے خفیہ خانے میں پیغام لکھ کر رکھ دیتے اور عُزیر گُل وہ چھڑی حاجی صاحب کے حوالے کر دیتے ۔ اسی طرح حاجی صاحب شیخ الہند کو اپنی کارکردگی کی رپورٹ بھیج دیتے ۔

مولانا سندھی کی کابل روانگی:

دوسری جانب شیخ الہند نے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو کابل جانے کا حکم دیا۔ مولانا سندھیؒ دہلی سے کراچی جاتے ہوئے دین پُور میں رُکے ۔ انہوں نے اپنی بیٹی کو وہاں مولانا غلام محمد دینپوری کے پاس چھوڑا اور خود کراچی پہنچے ۔ سیٹھ عبداللہ ہارون (م ۱۹۴۲ء) نے انہیں سفرِ خرچ دیا اور تیرہ رُوز کے سفر کے بعد مولانا سندھی ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو کابل پہنچے ۔ شیخ الہند نے مفتیٔ اعظم کابل کو ان کی روانگی سے مطلع کر دیا تھا اور ان کے ذریعے انہیں خفیہ پیغام بھی بھجوایا تھا ۔

لاہور کے کالجوں کے طلبہ:

اسی زمانے میں لاہور کے کالجوں سے متعدد مسلمان طلبہ ترک فوج میں شامل ہو کر انگریزوں سے لڑنے کے شوق میں کابل پہنچ چکے تھے ۔ ان طلبہ میں ظفر حسن ایبک اور عبدالباری (جو بعد میں میاں عبدالباری کے نام سے پنجاب مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے)، شجاع اللہ، رحمت علی اور خوشی محمد خاص طور پر مشہور ہیں ۔ بعد میں اقبال شیدائی اور مولانا سندھیؒ کے بھتیجے عزیز احمد بھی کابل پہنچ گئے ۔ انہیں مولانا سندھی کے ورودِ کابل سے تقویت ملی اور مولانا سندھی کو اپنے ہم وطن خدمت گار مل گئے ۔ مولانا سندھی نے ان کی دینی اور سیاسی تربیت بھی کی ۔ (ظفر حسن ایبک کے ساتھ راقم

کی خط و کتابت رہی ہے اور اقبال شیدائی مرحوم کے ساتھ قریبی تعلقات رہے ہیں) ۔ راقم کو ان بزرگوں نے بہت سی ایسی باتوں سے آگاہ کیا ہے جو عام لوگوں کے علم میں نہیں ہیں ۔

شیخ الہند کی آمد حجاز:

شیخ الہند نے مولانا سندھی کو اس غرض سے کابل بھیجا تھا کہ وہ امیرِ کابل حبیب اللہ خان کو انگریزوں کے خلاف جہاد پر آمادہ کریں ۔ جرمنی اور ترکی امیرِ کابل کی فوجی مدد کریں اور وہ برطانوی ہند پر حملہ کر دے ۔

دوسری جانب سے حاجی صاحب ترنگ زئی اور مولانا فضلِ رَبّی قبائلیوں کا لشکر لے کر دہلی کی طرف پیشقدمی کریں اور برِّعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کے مسلمان اپنے اپنے علاقوں میں انگریزوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیں ۔ ترکی کو افغانستان کی مدد پر آمادہ کرنے کی غرض سے شیخ الہند حج کے بہانے مکّہ مکرمہ پہنچے اور وہاں انہوں نے ترک گورنر غالب پاشا سے متعدد ملاقاتیں کیں اور اپنی آمد کا مقصد بیان کیا ۔ اتفاق سے انہیں دنوں ترکی کے وزیرِ جنگ غازی انور پاشا اور مشرقِ وسطیٰ میں ترک فوج کے کمانڈر جمال پاشا مدینہ منورہ پہنچے ۔ شیخ الہند نے انہیں اپنے منصوبے سے آگاہ کیا اور مدد کی درخواست کی ۔

کابل میں جلا وطن حکومت کا قیام:

مولانا عبیداللہ سندھی کی کابل میں آمد سے تیرہ روز قبل ۲ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو ہندوستانی، ترکی اور جرمن مشن کابل پہنچا تھا ۔ اس مشن میں ہندوستان کے راجہ مہندر پرتاپ اور مولوی برکت اللہ بھوپالی، ترکی کے ڑاندار مری، جرمنی کے فون ہنٹنگ اور آسٹریا کے نیڈرمائر شامل تھے ۔ اس لئے جب مولانا سندھی کابل پہنچے تو وہاں سیاسی سرگرمیاں زوروں پر تھیں ۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے ان کے ساتھ مل کر "ہندوستان کی آزاد جلا وطن حکومت" کی بنیاد رکھی ۔ راجہ مہندر پرتاپ (م ۱۹۷۹ء) صدر، مولوی برکت اللہ بھوپالی (م ۱۹۲۷ء) وزیرِ اعظم اور مولانا عبیداللہ سندھی (م ۱۹۴۴ء) وزیرِ داخلہ مقرر ہوئے ۔ جب اقبال شیدائی (م ۱۹۷۴ء) کابل پہنچے تو انہیں وزارتِ مواصلات اور وزارت

جنگ کا نائب وزیر مقرر کیا گیا ۔ اس جلا وطن حکومت نے جاپان اور روس کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے کے لئے وفد روانہ کئے ۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے اپنی تمام کار گزاری اور مستقبل کا پروگرام ریشم کے تین ٹکڑوں پر لکھ کر ایک واسکٹ کے اندر سلوا دیا ۔ یہ واسکٹ انہوں نے عبدالحق نامی ایک قاصد کے ذریعے شیخ عبدالرحیم سندھی (م ۱۹۴۹ء) کو حیدر آباد بھجوائی اور شیخ موصوف کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ کسی قابلِ اعتماد حاجی کے ذریعے اسے شیخ الہند تک پہنچا دیں اور اگر کوئی قابلِ اعتماد حاجی نہ ملے تو وہ خود حج کے بہانے مکۂ مکرمہ جا کر یہ امانت شیخ الہند کے حوالے کر دیں ۔

قاصد کی گرفتاری:

عبدالحق یہ واسکٹ پہن کر کابل سے حیدر آباد روانہ ہوا ۔ ظفر حسن ایبک نے اسے اپنی "آپ بیتی" میں "ایک اَن پڑھ سا نَو مُسلم" لکھا ہے وہ کابل جانے قبل ملتان میں رَب نواز خان کے ہاں ملازم رہ چکا تھا ۔ حیدر آباد جاتے ہوئے جب وہ ملتان پہنچا تو اس نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا اور رَب نواز خان کو ملنے چلا گیا ۔ رَب نواز خان نے باتوں باتوں میں اس سے تمام راز اُگلوا لیا اور انگریزوں کی خوشنودی کے حصول کی خاطر اسے ملتان ڈویژن کے انگریز کمشنر کے پاس لے گیا ۔ کمشنر کے سامنے جب واسکٹ چاک کی گئی تو اس میں سے ریشمی کپڑے پر لکھے ہوئے تین خط برآمد ہوئے جن پر شیخ الہند کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے تمام تفاصیل درج تھیں ۔ انگریز حکام مدت سے جس راز کو جاننے کی کھوج میں لگے ہوئے تھے وہ انہیں رَب نواز خان کی خیر خواہی سے مل گیا ۔ رَب نواز خان کو اس کی "بیش بہا خدمت" کے صلے میں خان بہادر کا خطاب اور بارہ مربعے اراضی عطاء ہوئی ۔

ان خطوط کی برآمدگی کے بعد برطانوی پولیس چوکنّی ہو گئی اور شیخ الہند سے وابستہ سیکڑوں افراد کو مختلف شہروں اور قصبوں سے گرفتار کر لیا ۔ کابل میں مقیم لاہور کے کالجوں کے طلبہ کے بارے میں یہ حکم صادر ہوا کہ ان میں سے اگر کوئی پکڑا جائے تو اسے برطانوی ہند اور افغانستان کی سرحد پر انگریزی علاقے میں اُگے ہوئے پہلے درخت کے ساتھ پھانسی پر لٹکا دیا جائے ۔

شیخ الہند کی نظر بندی:

دوسری جانب انگریزوں نے مشہور انگریز شاطر کرنل لارنس کے ذریعے شریفِ مکہ حسین سے تُرکوں کے خلاف بغاوت کروا دی ۔ حسین اور اس کے رفقاء نے تُرک فوجیوں کو بڑی بیدردی کے ساتھ قتل کیا اور اپنے بیٹوں فیصل اور عبداللہ کو عرب فوجیوں کے ساتھ شام اور فلسطین کی تسخیر میں انگریزوں کی مدد کے لئے بھیجا ۔ حرمین شریفین پر حسین کا قبضہ ہوتے ہی انگریزوں نے اسے شیخ الہند کو گرفتار کرکے جدہ پہنچانے کے لئے کہا ۔ حسین نے شیخ الہند مولانا محمود حسن (م ۱۹۲۰ء) ، مولانا حسین احمد مدنی (م ۱۹۵۷ء) حکیم نصرت حسین (م ۱۹۱۹ء) اور عزیر گل (م ۱۹۸۹ء) کو ۲۰ ستمبر ۱۹۱۶ء کو مکہ مکرمہ سے گرفتار کر کے جدہ میں مقیم برطانوی سفیر کے حوالے کر دیا ۔ قریباً ۳ ماہ کی پُوچھ گچھ کے بعد انہیں ۱۲ جنوری ۱۹۱۷ء کو قاہرہ روانہ کیا گیا جہاں انگریز حکام نے بغاوت کے جرم میں ان پر مقدمہ چلایا اور انہیں مالٹا کے جزیرے میں نظر بند کر دیا ۔ حکیم نصرت حسین کا نظر بندی کے عالم میں انتقال ہو گیا اور بقیہ تین حضرات تین سال اور سات ماہ کی نظر بندی کے بعد ۸ جون ۱۹۲۰ء کو رہا ہوئے ۔ رہائی کے وقت شیخ الہند شدید بیمار تھے اور ان پر ضعف غالب آ رہا تھا ۔ تحریکِ آزادی کے مشہور رہنما ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے ان کے علاج معالجے میں کوئی کسر باقی اٹھا نہ رکھی لیکن ان کا وقت موعود آ چکا تھا ۔ رہائی کے صرف پَونے چھ ماہ بعد ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو دہلی میں ڈاکٹر انصاری کے مکان پر ہی شیخ الہند نے وفات پائی ۔ ان کا جسدِ خاکی دیو بند لے جا کر خطۂ صالحین میں سپردِ خاک کیا گیا ۔ ایسے ہی بزرگوں کے لئے حضرت مرزا مظہر جانجاناںؒ (م ۱۷۸۶ء) نے فرمایا تھا ۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

باب (15)

دار العلوم دیوبند اور علماء دیوبند کی دینی و سیاسی خدمات

دریائے جمنا کے مشرقی کنارے پر مسلمانوں کی بہت سی مردم خیز بستیاں ہیں جن میں سے سہارنپور، انبیٹھہ، گنگوہ، لکھنوتی، جلال آباد، تھانہ بھون، کاندھلہ، کیرانہ، نہاری جھنجھانہ، تھگرہ، بڈھانہ، پھلت، دیوبند، منگلور، کلیر شریف، رائپور، مظفر نگر، سردھنہ اور نانوتہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہاں گزشتہ صدی کے دوران صدہا علماء و صلحاء پیدا ہوئے جنہوں نے مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

معرکۂ شاملی:

۱۸۵۷ء میں انہی بستیوں کے غیور مسلمانوں نے شاملی کے میدان میں انگریزوں سے ٹکر لی۔ اس کی تفصیل مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم (م ۱۹۸۵ء) کی زبان سے سنئے:

"بالا کوٹ میں ہزیمت کے بعد ۱۸۵۷ء میں پھر ایک موقع آیا اور اس جماعت کے افراد سر ہتھیلیوں پر رکھ کر انگریزوں کے مقابلہ میں نکل پڑے۔ انہیں لوگوں میں مولانا محمد قاسم نانوتوی (م ۱۸۸۰ء) اور آپ کے رفقاء بھی تھے جنہوں نے شاملی کے محاذ پر بڑی دلیری اور بہادری کے ساتھ جنگ کی تھی۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ باقی افواج کا مرکزِ اطاعت بہادر شاہ ظفر تھے لیکن مولانا نانوتوی اور ان کی جماعت کو یقین تھا کہ مغلیہ سلطنت کی آخری یادگار میں اب کوئی دم باقی نہیں رہا ہے۔ اس لئے آپ نے اپنا نظم و نسق بالکل الگ رکھا جس کے ماتحت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی (م ۱۸۹۹ء) امام یعنی بیعتِ جہاد کے مرکز قرار پائے۔ حافظ محمد ضامن شہیدؒ کو علمبردارِ لشکر مقرر کیا گیا۔ مولانا رشید احمد گنگوہی (م ۱۹۰۵ء) کو تقریر و خطابت کے ذریعے مجاہدین میں جوش اور ہمت و استقلال پیدا کرنے کی خدمت سپرد ہوئی اور خود مولانا

نانوتوی امیرِ لشکر بنے۔"

قصبہ شاملی سے باہر ایک باغ سے قریب مجاہدین کا مقابلہ انگریزوں کے ساتھ ہوا جس میں مجاہدین جان ہتھیلی پر رکھ کر لڑے۔ انگریزوں کے پاس جدید ترین اسلحہ تھا۔ اس لئے جنگ میں ان کا پلہ بھاری رہا۔ علم بردار محمد ضامن کے زیرِ ناف گولی لگی تو ان کے ساتھی انہیں اٹھا کر ایک قریبی مسجد میں لے گئے جہاں انہوں نے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ مولانا رشید احمد گنگوہی ان کا جسدِ خاکی اٹھا کر تھانہ بھون لے گئے جہاں اسے سپردِ خاک کیا گیا۔

حاجی امداد اللہ کی ہجرت:

معرکۂ شاملی میں ہزیمت کے بعد مجاہدین کی گرفتاری کا حکم صادر ہوا۔ اس موقع پر بعض مجاہدین زیرِ زمین ہوگئے اور چند ایک پکڑے بھی گئے جنہیں انگریزوں نے نظر بند کر دیا۔ امامِ مجاہدین حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نے دریائے جمنا پار کر کے پنجلاسہ کے رئیس راؤ عبداللہ خان کے ہاں پناہ لی۔ انگریز ان کی تلاش میں راؤ صاحب کی قیام گاہ پر پہنچے لیکن حاجی صاحب معجزانہ طور پر وہاں سے بچ کر نکل گئے۔ ان کی زندگی کے بقیہ چالیس سال مکہ مکرمہ میں گزرے جہاں ۱۸۹۹ء میں انہوں نے انتقال کیا اور مکہ مکرمہ کے قبرستان جنتِ معلیٰ میں ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے مزار مبارک کے پائنتی دفن ہوئے۔

قیامِ دار العلوم دیوبند:

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حریت پسندوں کی ناکامی کے بعد برِ عظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش پر انگریزوں کی گرفت پہلے کی نسبت زیادہ مضبوط ہو گئی۔ برِ عظیم، ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط سے نکل کر براہِ راست تاجِ برطانیہ کے ماتحت ہو گیا۔ ان بدلے ہوئے حالات میں علماء کرام نے دین کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا۔ اس کام میں معرکۂ شاملی کے بقیۃ السیف مجاہد علماء پیش پیش تھے۔

سب سے پہلے دیوبند کے ایک نیک دل بزرگ حاجی محمد عابد حسین (م ۱۹۱۲ء) کے دل میں ایک معیاری مدرسہ قائم کرنے کا خیال آیا اور انہوں نے شیخ الہند

محمود حسن کے تایا شیخ مہتاب علی سے اس کا ذکر کیا - انہوں نے ان کی رائے سے اتفاق کیا - اس کے بعد حاجی محمد عابد حسین نے مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، شاہ فضل الرحمٰن عثمانی اور شیخ ذوالفقار علی کے ساتھ مشورہ کیا - ان سب نے حاجی صاحب کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے اپنے تعاون کا یقین دلایا - شاہ عبدالرحیم دہلوی (م ۱۷۱۸ء) کا قائم کردہ مدرسۂ رحیمیہ جس میں شاہ عبدالرحیم، شاہ ولی اللہ (م ۱۷۶۲ء) شاہ عبدالعزیز (م ۱۸۲۳ء) شاہ رفیع الدین (م ۱۸۱۸ء) شاہ عبدالقادر (م ۱۸۱۵ء) شاہ مخصوص اللہ (م ۱۸۵۵ء) اور شاہ محمد اسحٰق (م ۱۸۴۵ء) جیسے نابغہ روزگار پڑھاتے رہے تھے، ۱۸۳۰ء میں بند ہو گیا تھا اور ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے وہ عمارت ایک ہندو کے ہاتھ فروخت کر دی تھی - اس لئے ایک ایسے معیاری مدرسے کی ضرورت محسوس کی گئی جو مدرسۂ رحیمیہ کا صحیح معنوں میں جانشین ثابت ہو سکے -

حاجی محمد عابد حسین نے توکل علی اللہ ۳ مئی ۱۸۶۷ء کو دیو بند کی چھتہ مسجد میں مدرسے کی بنیاد رکھی - مولانا محمد قاسم نانوتوی نے مولوی محمود صاحب کو پانچ روپے ماہانہ پر اُستاد مقرر کیا (راقم نے یہ تقرر نامہ دیو بند کے ریکارڈ آفس میں سیّد محبوب رضوی مرحوم کی عنایت سے دیکھا ہے) اور شیخ ذوالفقار علی کے فرزند ارجمند محمود حسن (جو بعد میں شیخ الہند کے لقب سے مشہور ہوئے) کو اس مدرسے کا پہلا طالب علم ہونے کا شرف حاصل ہوا - اُستاد بھی محمود اور شاگرد بھی محمود - اُستاد نے مسجد کے صحن میں ایک انار کے پیڑ کے سایہ میں اپنے تلمیذ رشید کو پڑھانا شروع کیا -

دیو بند میں مدرسے کے قیام کی نوید سنتے ہی چاروں اطراف سے طلبہ ٹوٹ پڑے اور ان کے قیام کے لئے چھتہ مسجد اور دیو بند کی جامع مسجد ناکافی ہو گئیں تو منتظمین نے ۱۸۷۶ء میں ایک وسیع خطہ زمین مدرسے کی عمارات تعمیر کرنے کی غرض سے خریدا - ایک روایت یہ بھی ہے کہ ایک بزرگ نے خواب میں دیکھا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عصاء مبارک سے زمین پر نشان لگا کر بتا رہے ہیں کہ یہاں بنیادیں کھودی جائیں - اگلی صبح جب اس جگہ کا معائنہ کیا گیا تو زمین پر نشان موجود تھا - منتظمین نے ۱۸۷۶ء میں موجودہ عمارت کا سنگ بنیاد اس عہد کے ایک نامور عالم دین مولانا احمد علی محدث سہار نپوری کے ہاتھوں رکھوایا - مولانا محمد قاسم

نانوتوی اور سرسیّد احمد خان کے اُستاد مولانا مملوک العلی (م ۱۸۵۰ء) کے صاحبزادے مولانا محمد یعقوب دارالعلوم دیو بند کے پہلے صدر مدرّس اور مولانا رفیع الدین مہتمم مقرر ہوئے - یہ وہ زمانہ تھا جب مہتمم اور صدر مدرّس سے لے کر گھنٹہ بجانے والا چپراسی بھی صاحبِ نسبت ہوتا تھا - مولانا محمد قاسم بھی اپنے احباب کے اصرار پر مدرّسین میں شامل ہو گئے -

مسلکِ دیو بند:

دارالعلوم دیو بند کے بانیوں نے بڑی سوچ بچار کے بعد اپنا راستہ متعین کیا - تحریکِ مجاہدین کی ناکامی اور شاہ اسماعیل شہید کے اپنے جدِ امجد شاہ ولی اللہ کے مسلکِ اعتدال سے انحراف کے بعد اس جماعت کے بارے میں عوام الناس میں بڑی غلط فہمیاں پائی جاتی تھیں - اس لئے دارالعلوم کے بانیوں نے حنفیت پر بڑا زور دیا تاکہ ان غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکے - دارالعلوم کے سابق مہتمم قاری محمد طیب مرحوم (م ۱۹۸۳ء) کے بقول دارالعلوم دیو بند محض ایک مدرسہ نہیں بلکہ یہ ایک مستقل تحریک اور ایک مکتبِ فکر ہے - علماء دیو بند تکفیر بین المسلمین کے بارے میں بڑے محتاط ہیں اور انہوں نے کبھی اپنے مخالفین کی تکفیر نہیں کی - وہ مسلکِ اعتدال پر چلتے اور بدعت سے احتراز برتتے ہیں - وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دین محض رسم و رواج کا نام نہیں بلکہ یہ مکمل ضابطۂ حیات ہے - غیر مقلدین کے برعکس وہ تصوف سے دلچسپی رکھتے ہیں اور اصلاحِ نفس کے لئے کسی شیخِ طریقت کے ہاتھ پر بیعت کو ضروری سمجھتے ہیں -

دارالعلوم کا نظم و نسق:

دارالعلوم دیو بند کا نظم و نسق مجلسِ شوریٰ چلاتی ہے - وہی گورننگ باڈی ہے - مجلسِ شوریٰ ہی دارالعلوم کا بجٹ پاس کرتی ہے - عزل و نصب کے تمام اختیارات مجلسِ شوریٰ کے ہاتھ میں ہیں - مجلسِ شوریٰ مہتمم مقرر کرتی ہے جو ادارے کا نظم و نسق چلاتا ہے - تعلیمی امور صدر مدرّس کے ہاتھ میں ہیں -

دارالعلوم کے بانیوں نے چند اصول مقرر کئے تھے جن پر اب تک عمل ہو رہا ہے - ان طے شدہ اصولوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ امراء سے مستقل گرانٹ

دی جائے اور مدرسے کو توکل علی اللہ چلایا جائے ۔ صرف ایسے لوگوں سے چندہ لیا جائے جو چندہ دے کر نام پیدا نہ کرنا چاہیں ۔ مدرسے کے اسباب ظاہری میں ایک طرح کی بے سرو سامانی ملحوظ رہے ۔ مدرسے کے مدرسین متقی اور پرہیزگار ہوں ۔ ہمیشہ طلبہ کی تعداد بڑھانے کی فکر کی جائے ۔

دارالعلوم دیوبند کا نظم و نسق ۱۹۲۸ء تک بڑے احسن طریقے سے چلتا رہا۔ اسی سال چند نامور اساتذہ اور مہتمم دارالعلوم مولانا حبیب الرحمن عثمانی (م ۱۹۲۹ء) کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہو گئے جس کے نتیجے میں مولانا انور شاہ کشمیری (م ۱۹۳۳ء) مولانا شبیر احمد عثمانی (م ۱۹۴۹ء) مفتی عتیق الرحمن عثمانی (م ۱۹۸۴ء) مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی (م ۱۹۶۲ء) اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی (م ۱۹۸۵ء) دیوبند سے ڈابھیل چلے گئے ۔ ان کے وہاں جانے سے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں رونق پیدا ہو گئی ۔

دیوبند کی طرز کے مدارس:

دارالعلوم دیوبند کے فضلاء نے بنارس ، کرنول ، سلہٹ ، ملتان ، سکھر ، جہلم ، چکوال ، فیصل آباد ، اکوڑہ خٹک ، فقیروالی ، کبیر والا ، جالندھر ، ویلور ، حیدر آباد ، دہلی ، امروہہ ، آنولہ ، مرادآباد ، ساہی وال ، رائے پور گوجراں ، کانپور ، مبارکپور ، عمر آباد ، لدھیانہ ، ڈابھیل ، راندیر ، کوئٹہ ، پشاور ، کراچی ، جونپور ، گوجرانوالہ ، ٹنڈوالہ یار ، بہرائچ ، مئو ، تھانہ بھون ، گنگوہ ، امرتسر ، مونگیر ، نگینہ اور لاہور جیسے شہروں میں صدہا کی تعداد میں مدارس قائم کئے ۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دیوبند ایک مدرسے کا نام نہیں بلکہ ایک علمی اور فکری تحریک کا نام ہے ۔

دیوبند کے نامور فضلاء:

دارالعلوم دیوبند کے فضلاء میں سے شیخ الہند مولانا محمود حسن (م ۱۹۲۰ء) ، مولانا مناظر احسن گیلانی (م ۱۹۵۶ء) مولانا احمد حسن امروہوی (م ۱۹۱۱ء) مولانا نور گل (م ۱۹۸۹ء) ، مولانا حبیب الرحمن عثمانی (م ۱۹۲۹ء) ، مولانا شبیر احمد عثمانی (م ۱۹۴۹ء) ، مولانا اشرف علی تھانوی (م ۱۹۴۳ء) ، سید فخر الحسن (م ۱۹۸۰ء) ، مولانا عبیداللہ سندھی (م ۱۹۴۴ء) مولانا خیر محمد جالندھری (م ۱۹۷۰ء) ، مولانا حامد میاں دیوبندی (م ۱۹۸۸ء) ، مولانا محمد

ادریس کاندھلوی (م ۱۹۷۴ء) ، مولانا عبیداللہ انور (م ۱۹۸۵ء) ، مولانا مظہر الدین ، مفتی عتیق الرحمن عثمانی (م ۱۹۸۴ء) ، قاری محمد طیب (م ۱۹۸۳ء) ، مولانا عبدالحق بانی دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک (م ۱۹۸۸ء) ، مولانا احتشام الحق تھانوی (م ۱۹۸۰ء) ، مولانا حسین احمد مدنی (م ۱۹۵۷ء) ، مولانا محمد منظور نعمانی ، علامہ ابراہیم بلیاوی (م ۱۹۶۷ء) ، مولانا اعزاز علی دیوبندی (م ۱۹۵۵ء) ، مولانا سعید احمد اکبر آبادی (م ۱۹۸۵ء) ، مفتی کفایت اللہ (م ۱۹۵۲ء) ، مولانا مرغوب الرحمن بجنوری ، مولانا ثناء اللہ امرتسری (م ۱۹۴۸ء) ، مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی (م ۱۹۶۲ء) ، مولانا بدر عالم میرٹھی (م ۱۹۶۵ء)، مولانا حبیب الرحمن اعظمی (م ۱۹۹۲ء) ، قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی (م ۱۹۹۱ء) ، علامہ احسان اللہ خاں تاجور نجیب آبادی (م ۱۹۵۱ء) ، مولانا رسول خان (م ۱۹۷۱ء) ڈاکٹر سید عبدالعلی لکھنوی (م ۱۹۶۱ء) ، ڈاکٹر مصطفیٰ حسن کاکوروی (م ۱۹۸۱ء) ، مولانا معراج الحق (م ۱۹۹۱ء) ، مولانا میرک شاہ اندرابی (م ۱۹۷۴ء) ، مولانا محمد چراغ (م ۱۹۸۹ء) ، اور مولانا شمس الحق افغانی (م ۱۹۸۳ء) قابل ذکر ہیں ۔ قیامِ دارالعلوم سے لے کر اب تک ہزاروں کی تعداد میں جید عالم اس درسگاہ سے فارغ ہو کر نکلے ہیں ۔

دارالعلوم کے اساتذہ اور طلبہ نے تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حضرت شیخ الہند فرمایا کرتے تھے کہ ان کے اساتذہ نے یہ مدرسہ محض مولویوں کی کھیپ تیار کرنے کے لئے قائم نہیں کیا تھا بلکہ ان کے تدِ نظر مجاہدین کی ایک جماعت تیار کرنا تھی جو انگریزوں کے خلاف صف آرا ہوتی ۔ ایسے ہی مجاہدین میں مولانا اشرف علی تھانوی (م ۱۹۴۳ء) ، مولانا شبیر احمد عثمانی (م ۱۹۴۹ء) ، مولانا ظفر احمد عثمانی (م ۱۹۷۴ء) مفتی محمد شفیع (م ۱۹۷۶ء) اور احتشام الحق تھانوی (م ۱۹۸۰ء) شامل تھے جنہوں نے رائے عامہ کو مسلم لیگ کے حق میں ہموار کیا اور قیامِ پاکستان کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کر دکھایا۔

باب (16)

امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ

مولانا عبیداللہ سندھیؒ ۱۰ مارچ ۱۸۷۲ء کو چیانوالی ضلع سیالکوٹ کے ایک سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے ۔ ان کا پیدائشی نام بُوٹا سنگھ تھا ۔ ان کا والد رام سنگھ ان کی ولادت سے چار ماہ قبل فوت ہو گیا تھا اس لئے ان کی کفالت ان کے دادا جسپت رائے نے اپنے ذمے لی ۔ شومئ قسمت سے دو سال بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا ۔ جسپت رائے کی وفات کے بعد اس کی بیوہ بہو اپنے یتیم بیٹے کو ساتھ لے کر جام پُور (ضلع ڈیرہ غازیخاں) چلی گئی ۔ جہاں اس کے دو بھائی بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے ۔ انہوں نے اپنے یتیم بھانجے کی سرپرستی قبول کی اور جب وہ سکول جانے کے قابل ہوگئے تو انہیں اُردو مڈل سکول جام پُور میں داخل کروا دیا ۔

قبولِ اسلام:

۱۸۸۴ء میں ان کے ایک آریہ سماجی ہم جماعت نے ایک نَو مُسلم عالم مولانا عبیداللہ مالیر کوٹلوی کی مایہ ناز تصنیف " تحفۃ الہند " انہیں مطالعہ کے لئے دی جس کے مطالعے سے اسلام کی حقانیت ان کے دل پر نقش ہو گئی اور انہوں نے اسلام قبول کر لیا ۔ تحفۃ الہند کے مصنف کے نام کی رعایت سے انہوں نے اپنا نام عبیداللہ تجویز کیا اور گھر والوں سے چھپ کر نمازیں ادا کرنے لگے ، لیکن یہ صورتِ حال خود ان کے لئے قابلِ قبول نہ تھی ۔ اس لئے وہ ۱۵ اگست ۱۸۸۷ء کو اپنے گھر سے فرار ہوگئے اور مختلف مدرسوں اور خانقاہوں کے چکر کاٹتے ہوئے بھرچونڈی شریف (نزد گھوٹکی) میں حضرت حافظ محمد صدیق کی خدمت میں پہنچ گئے ۔ حافظ صاحب نے ان سے کہا کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی خاطر گھر چھوڑا ہے اس لئے وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی خوشنودی کے لئے انہیں اپنا بیٹا بناتے ہیں ۔ انہوں نے ان کے حق میں دُعا کی " خدا

کرے عبیداللہ کا کسی راسخ عالم سے پالا پڑے " ۔

تعلیم و تربیت:

بھرچونڈی شریف میں کچھ عرصہ قیام کے بعد مولانا سندھی دین پور شریف (نزد خانپور) چلے آئے اور یہاں انہوں نے مولانا غلام محمد دین پوریؒ کی خدمت میں رہ کر ابتدائی کتابیں پڑھیں ۔ اکتوبر ۱۸۸۸ء میں انہیں دارالعلوم دیو بند میں داخلہ مل گیا اور حافظ محمد صدیق کی دُعا سے انہیں وہاں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ جیسے بزرگوں کی صحبت ملی جس نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ۔

انیسویں صدی کے اواخر میں برِعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کے طول و عرض میں میاں نذیر حسین سورج گڑھیؒ (م ۱۹۰۲ء) کے درسِ حدیث کا بڑا شہرہ تھا ۔ میاں صاحب براہ راست شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے شاگرد تھے اور دہلی میں مقیم تھے ۔ مولانا سندھی نے دہلی جا کر ان سے صحیح بخاری اور جامع ترمذی کی سماعت کی ۔ اسی طرح کچھ عرصہ کانپور میں رہ کر مولانا احمد حسن کانپوری سے حکمت و فلسفہ کی بڑا ؤ کتابیں پڑھیں اور رام پُور جا کر مولوی ناظر الدین سے منطق کا درس لیا ۔ مولانا سندھی نے آخری چند ماہ دیو بند میں اپنے محبوب اُستاد شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی خدمت میں گذارے اور ۱۸۹۱ء میں ان کی دُعائیں لے کر امروٹ شریف (نزد شکار پُور سندھ) روانہ ہوئے ۔ امروٹ شریف کے سجادہ نشین مولانا تاج محمود امروٹی (م ۱۹۲۹ء) کی خواہش پر مولانا سندھی نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور ان کی تحریک پر اسلامیہ سکول سکھر کے ماسٹر مولوی محمد عظیم خان کی بیٹی سے ان کا عقد ہو گیا ۔

۱۹۰۱ء میں مولانا سندھیؒ سندھ کے ایک بڑے رُوحانی مرکز گوٹھ پیر جھنڈا منتقل ہوگئے ۔ جہاں پیر صاحب جھنڈا کی سرپرستی میں انہوں نے مدرسہ " دار الرشاد " کی بنیاد رکھی ۔

سیاسی زندگی کا آغاز:

مولانا سندھی کی زندگی میں ۱۹۰۸ء بڑا اہم سال ہے اور یہیں سے ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے ۔ اسی سال شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے انہیں دیو بند طلب

فرما کر جمعیت الانصار کی تاسیس کا کام سپرد کیا۔ مولانا سندھی کے مخصوص نظریات کی بنا پر دیو بند کے ارباب اہتمام ان کے مخالف ہوگئے اور مدرسین دارالعلوم میں سے مولانا انور شاہ کشمیری (م ۱۹۳۳ء) اور مولانا شبیر احمد عثمانی (م ۱۹۴۹ء) نے ان کی مخالفت شروع کر دی جو ان کی تکفیر پر منتج ہوئی۔ ان حالات میں حضرت شیخ الہند کے مشورہ پر مولانا سندھی دیو بند سے دہلی منتقل ہوگئے جہاں انہوں نے ۱۹۱۲ء میں "نظارۃ المعارف" کی بنیاد رکھی۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن، حکیم محمد اجمل خان (م ۱۹۲۷ء)، نواب وقار الملک (م ۱۹۱۷ء) اور بیگم صاحبہ بھوپال سلطان جہاں بیگم (م ۱۹۳۰ء) اس ادارے کے سرپرست بن گئے۔

شیخ الہند کا منصوبہ:

۱۹۱۴ء میں پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی تو برِعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش سے بیشتر انگریزی فوج مشرقِ وسطیٰ اور یورپ کے محاذوں پر روانہ ہو گئی۔ شیخ الہند اور ان کے رفقاء نے اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے برِعظیم کو برطانیہ کے تسلط سے آزاد کرانے کا عزم کیا اور اس مقصد کے لئے آزاد قبائل کو انگریزوں کے خلاف جہاد پر آمادہ کرنے کا کام حاجی صاحب ترنگ زئی حضرت فضل واحد اور مولانا فضل ربی کے سپرد کیا۔ حضرت شیخ الہند نے مولانا سندھی کو اپنے مشن کی تکمیل کے لئے کابل روانہ کیا۔ حضرت شیخ الہند یہ چاہتے تھے کہ امیرِ افغانستان حبیب اللہ خان (م ۱۹۱۹ء) برِعظیم پر حملہ کر دے اور ادھر سے حاجی صاحب ترنگ زئی اور مولانا فضل ربی قبائلی لشکر کے ساتھ انگریزی علاقے پر چڑھائی کر دیں۔ ادھر برِعظیم کے مسلمان انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ انگریز ان دنوں یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کے محاذوں پر جرمنی اور ترکی کے خلاف نبرد آزما تھے۔ اس لئے وہ برِعظیم کا دفاع نہیں کر سکیں گے اور بالآخر برِعظیم آزاد ہو جائے گا۔

ہجرتِ کابل:

مولانا عبیداللہ سندھی ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو کوئٹہ اور قندھار ہوتے ہوئے کابل پہنچ گئے۔ ان کی آمد سے تیرہ روز قبل ہندوستانی، ترکی، جرمن مشن کابل پہنچ چکا تھا۔ اس مشن کی یہ خواہش تھی کہ افغانستان فوراً برِعظیم پر حملہ کر دے۔ اس لئے جب

مولانا سندھی کابل پہنچے تو ان دنوں وہاں سیاسی سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔

جلاوطن حکومت کا قیام:

انہی ایام میں مولانا عبیداللہ سندھی، راجہ مہندر پرتاپ (م ۱۹۷۹ء) اور مولوی محمد برکت اللہ بھوپالی (م ۱۹۲۷ء) نے کابل میں "حکومت موقتۂ ہند" کی بنیاد رکھی اور جاپان اور روس سمیت متعدد ممالک کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ بعض نا سمجھ لوگ مولانا سندھی کو اس بنا پر معتوب کرتے ہیں کہ انہوں نے "حکومت موقتۂ ہند" کا سربراہ ایک ہندو (راجہ مہندر پرتاپ) کو کیوں بنایا۔ ماہنامہ کنز الایمان لاہور کے "تحریک پاکستان نمبر" میں بھی مولانا سندھی پر یہی الزام دہرایا گیا ہے کہ انہوں نے ایک ہندو کو حکومت موقتۂ ہند کا سربراہ کیوں بنایا۔ مولانا سندھی اور ان کے بعض رفقاء کی تحریروں سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ امیرِ افغانستان حبیب اللہ خان (م ۱۹۱۹ء) نے انہیں یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ جو کام بھی کریں اس میں برِعظیم کی اکثریت (ہندوؤں) کو نظر انداز نہ کریں اس لئے انہیں مجبوراً یا مصلحتاً ایک ہندو کو اس حکومت کا سربراہ بنانا پڑا۔

شیخ الہند کی گرفتاری:

مولانا سندھی کی کابل روانگی کے بعد حضرت شیخ الہند اپنے مشن کی تکمیل کے سلسلہ میں حجازِ مقدس تشریف لے گئے تاکہ وہاں کے ترک گورنر غالب پاشا کے توسط سے حکومتِ ترکی سے رابطہ قائم کریں اور اسے اس پر آمادہ کریں کہ وہ روس یا ایران کے راستے افغانستان کی فوجی مدد کرے، تاکہ افغانستان برِعظیم پر حملہ کر دے۔ کابل میں قیام کے دوران میں مولانا سندھی نے اپنی پوری سکیم ریشمی رومال پر لکھ کر عبدالحق نامی ایک قاصد کے ذریعے شیخ عبدالرحیم سندھی (م ۱۹۷۹ء) کے پاس حیدر آباد سندھ روانہ کی اور انہیں یہ پیغام بھیجا کہ وہ کسی معتبر حاجی کے ذریعے یا خود مکہ مکرمہ جا کر یہ خط حضرت شیخ الہند کی خدمت میں پہنچا دے۔ جب وہ قاصد ملتان پہنچا تو اپنے ایک قدیم مربی رب نواز خان سے ملنے چلا گیا۔ رب نواز خان نے باتوں باتوں میں اس سے تمام راز اگلوا لیا اور انگریزوں کی خوشنودی کے حصول کی خاطر اسے ملتان ڈویژن کے

انگریز کمشنر کے حوالے کر دیا ۔ راز کے افشاء ہوتے ہی برطانوی حکومت چوکنی ہو گئی اور سیکڑوں افراد کو اس سازش میں شریک ہونے کے الزام میں گرفتار کر لیا ۔ ادھر انگریزوں نے حسین شریف مکّہ کی وساطت سے حضرت شیخ الہند کو گرفتار کرکے مالٹا میں نظر بند کر دیا ۔ تحریک ریشمی رومال کی ناکامی کے بعد مولانا سندھی نے ۱۹۱۶ء میں تقسیم ہند کا نظریہ پیش کیا ۔ اس کا ذکر ان کے " سیاسی مکتوبات " میں موجود ہے جس سے ماہنامہ کنزالایمان کے بہت سے دعووں کی تردید ہو جاتی ہے ۔

مولانا سندھی کے منصوبے کی ناکامی:

مولانا عبیداللہ سندھی نے شہزادہ نصراللہ خان کو جو انگریز دشمنی کے لئے افغانستان کے سیاسی حلقوں میں مشہور تھا ، برِّعظیم پر حملہ کرنے کی ترغیب دی اور وہ اس بات پر رضا مند بھی ہو گیا ۔ اتفاق سے انگریزوں کے کان میں اس کی بھنک پڑ گئی اور انہوں نے چہار باغ کے ایک پیر ضیائے معصوم کو ، جو شہزادہ نصراللہ خان کے مُرشد تھے ، اس پر آمادہ کیا کہ وہ شہزادے کو اس اقدام سے باز رکھیں ۔ پیر صاحب فوراً کابل پہنچے اور جب شہزادہ ان کی زیارت کے لئے حاضر ہوا تو پیر صاحب نے فرمایا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے انہیں خواب میں فرمایا ہے کہ شہزادے کو برِّعظیم پر حملہ کرنے سے باز رکھیں ، ورنہ بڑا نقصان ہوگا ۔ مولانا محمد علی قصوری اپنی مشہور تصنیف " مشاہدات کابل و یاغستان " میں لکھتے ہیں کہ انگریزوں نے اس خدمت کے عوض پیر صاحب کو ایک بڑی رقم بطور " نذرانہ " پیش کی تھی ۔ تحریک کی ناکامی کے بعد یہ انکشاف ہوا کہ امیر حبیب اللہ خان پہلی عالمی جنگ میں غیر جانبدار رہنے کا انگریزوں سے بھاری معاوضہ وصول کیا کرتا تھا ۔ اس لئے اُس نے افغانستان میں ہندوستانی مہاجروں کو کام کرنے کا موقع نہ دیا ۔

مولانا سندھی کی روس روانگی:

۲۰ فروری ۱۹۱۹ء کی رات کو چند سازشیوں نے امیر حبیب اللہ خان کو قتل کر دیا اور اس کی جگہ امان اللہ خان تخت پر بیٹھا ۔ اس کے عہد میں انگریزوں اور افغانوں کے مابین ایک جنگ ہوئی جو افغانستان کی تاریخ میں " جنگِ استقلال " کے نام سے یاد

کی جاتی ہے ۔ اس جنگ کے نتیجے میں انگریزوں نے امان اللہ خان سے کہا کہ ان کے خلاف کابل میں جو کام ہو رہا ہے ، اسے فوراً بند کر دیا جائے ۔

لہٰذا حکومتِ افغانستان نے مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے رفقاء کو سیاسی سرگرمیاں بند کرنے کا حکم دیا ۔ سیاسی سرگرمیاں بند کرنے کے بعد مولانا سندھی کا کابل میں رہنا محض تضیعِ اوقات تھا ۔ اس لئے مولانا سندھی کابل سے ماسکو روانہ ہوئے اور ۱۳ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو افغان سرحد پار کرکے رُوس میں داخل ہوگئے ۔

قیام روس:

ماسکو میں ان کا قیام آٹھ ماہ رہا ۔ اس دوران میں انہوں نے کمیونزم کا بہت قریب سے مطالعہ کیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اسلام کے معاشرتی اور معاشی نظام کا کوئی جواب نہیں ۔ نیز شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے جس انداز سے مزدوروں ، کاشتکاروں اور اہلِ صنعت و حرفت کے مسائل حل کئے ہیں ویسا حل کمیونسٹ بھی پیش نہیں کر سکے ۔ ماسکو میں قیام کے دوران میں مولانا سندھی کی رُوس کے وزیر خارجہ چیچرن سے چند ملاقاتیں ہوئیں ۔ جس کی تفصیل ظفر حسن ایبک کی " آپ بیتی " میں موجود ہے ۔ (یہ غلط ہے کہ مولانا وہاں لینن یا سٹالن سے ملتے رہے اور لینن کی اہلیہ ان کے وضو کے لئے پانی گرم کرتی رہی) ۔

تُرکی میں قیام:

جولائی ۱۹۲۳ء میں مولانا عبیداللہ سندھی رُوس سے تُرکی تشریف لے گئے ۔ ان کی آمد سے ایک سال قبل اتاترک عثمانی سلطان کے سیاسی اختیارات سلب کر چکا تھا اور ۱۹۲۴ء میں اُسے برائے نام خلافت سے بھی محروم کر دیا ۔ مولانا سندھی نے قریباً تین سال تُرکی میں گزارے اور وہاں انہوں نے بڑے قریب سے اتا ترک کو تُرکی میں اصلاحات نافذ کرتے دیکھا ۔

تُرکی میں قیام کے دوران میں مولانا سندھی نے اپنا سیاسی پروگرام شائع کیا ۔ اس وقت ان کے پیشِ نظر چند مقاصد تھے ۔

مولانا سندھی کا سیاسی فارمولا:

۱: برِعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کے لئے کامل آزادی حاصل کرنا اور آزاد وطن میں وفاقی نظامِ حکومت قائم کرنا۔
۲: آزاد وطن میں مسلمانوں، اقلیتوں اور اسلام کو محفوظ کرنا۔
۳: آزادی کے بعد محنت کش طبقہ کی اکثریت رکھنے والی حکومت قائم کرنا۔
۴: امپیریل ازم کا توڑ کرنے کے لئے ایشیاٹک فیڈریشن بنانا۔

اس پروگرام کو بروئے کار لانے کے لئے مولانا سندھی نے "سرو راجیہ پارٹی" کے نام سے ایک سیاسی جماعت تشکیل کی۔ یہ پارٹی رنگ و مذہب اور مال و دولت کے فرق کو مٹا کر آزاد وطن میں حکومت قائم کرنا چاہتی تھی۔

مولانا عبیداللہ سندھی یہ تسلیم کرتے تھے کہ برِعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کے تین قدرتی حصے ہیں۔ شمال مغربی، مشرقی اور جنوبی۔ (۱۹۴۷ء میں برِعظیم کی تقسیم اسی انداز سے ہوئی) ۔ وہ ان حصوں کو لسانی اور تمدنی بنیادوں پر تقسیم کرکے وہاں جمہوری حکومتیں قائم کرنا چاہتے تھے۔ یہ جمہوریتیں داخلی معاملات میں بالکل آزاد ہوں گی اور وفاقی حکومت کے پاس صرف امورِ خارجہ، دفاع اور درآمدات و برآمدات کے محکمے ہوں گے۔

مولانا سندھی کی روشن دماغی:

مولانا سندھی یہ چاہتے تھے کہ ان جمہوریتوں کی مجالس قانون ساز میں کسان، مزدور، دماغی کام کرنے والے کلرک، تاجر اور کارخانہ دار اپنی آبادی کے تناسب سے، اپنے ہی طبقے سے نمائندے چنیں۔ اسی طرح ان مجالس قانون ساز میں محنت کشوں کی اکثریت ہوگی اور یہ لوگ اپنے مفاد کی کما حقہٗ حفاظت کر سکیں گے۔

مولانا سندھی فوائدِ عامہ کے تمام ذرائع قومیانے کے حق میں تھے۔ اسی طرح وہ منقولہ جائیداد کی حد متعین کرنے کے بھی حامی تھے۔ زرعی زمینوں کے بارے میں ان کی یہ رائے تھی کہ ایک کاشت کار کے پاس صرف اتنی زمین ہونی چاہیئے جس پر وہ خود کاشت کر سکے۔ وہ سُودی نظام ختم کرنا چاہتے تھے اور قومی ملکیت میں لئے گئے کارخانوں کو مزدوروں کی انجمنوں کے ذریعے چلانے کے حامی تھے تاکہ مزدور اپنے فائدے

کے لئے زیادہ سے زیادہ محنت کریں۔ داخلی تجارت کے بارے میں ان کا یہ خیال تھا کہ اسے کواپریٹو سوسائیٹیوں کے ہاتھ میں دے دیا جائے اور اگر کاروباری لوگ چاہیں تو وہ ان سوسائیٹیوں کے رُکن بن سکتے ہیں۔ جہاں تک برآمدات کا تعلق ہے یہ حکومت کے ہاتھ میں رہے گی۔

مولانا سندھی مڈل تک مفت اور لازمی تعلیم کے حامی تھے۔ وہ محنت کشوں کو مفت طبی امداد اور صاف ستھرے گھر دلانا چاہتے تھے۔ مولانا کا یہ خیال تھا کہ جمہوریت کا سرکاری مذہب وہاں کی اکثریت کا مذہب ہونا چاہیئے لیکن وفاقی حکومت سیکولرازم پر کاربند ہو اور وہ کسی جمہوریت کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہ کرے۔

جہاں تک وفاقی حکومت میں ریاستوں کی نمائندگی کا تعلق ہے مولانا سندھی کی یہ رائے تھی کہ مختلف ریاستیں اپنے تناسب آبادی، اقتصادی، تمدنی اور فوجی اہمیت کی بنا پر حقِ نمائندگی حاصل کریں گی۔

اس پروگرام کو ان کی قائم کردہ سرو راجیہ پارٹی عمل میں لائے گی۔ اس پارٹی کے ہر رُکن کے لئے یہ لازمی ہوگا کہ اس کا معیارِ زندگی ملک کے ایک عام کسان کے معیارِ زندگی سے بلند نہ ہو۔ وہ اپنی فاضل آمدنی یا جائداد پارٹی کے نام وقف کر دے۔

مولانا سندھی نے ترکی حکومت کی اجازت سے یہ پروگرام طبع کروا کے اپنے دُوست و احباب کو بھیجا۔ برطانوی حکومت نے ۱۵ مئی ۱۹۲۵ء کو ایک سرکلر کی رُو سے برِعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش میں اس پروگرام کے داخلے پر پابندی لگا دی۔

مولانا سندھی حجازِ مقدّس میں:

۱۹۲۶ء میں سلطان عبدالعزیز ابنِ سعود (م ۱۹۵۳ء) نے مکّہ معظمہ میں دُنیا بھر کے مسلمانوں کے نمائندوں کو جمع کیا اور انہیں بتایا کہ حرمین شریفین پر اب اس کا قبضہ ہو چکا ہے۔ اس لئے اب اس کی مخالفت کرنے کی بجائے افہام و تفہیم کا راستہ تلاش کرنا چاہیئے۔ مکّہ کانفرنس میں شرکت کی غرض سے برِعظیم سے مُسلم زعماء کا ایک وفد حجازِ مقدّس گیا تھا۔ مولانا سندھی ان سے ملنے کی غرض سے اگست ۱۹۲۶ء میں ایک

اطالوی جہاز میں سوار ہو کر جدہ پہنچے تو اس وقت کانفرنس ختم ہو چکی تھی اور وہ زعما واپس جا چکے تھے۔

مولانا سندھی نے اگلے تیرہ سال حرم شریف میں گزارے۔ مکہ مکرمہ آنے کے بعد وہ عملی سیاست سے کنارہ کش ہوگئے۔ ان کا زیادہ تر وقت شاہ ولی اللہ دہلوی کی تصانیف کے مطالعہ اور غور و فکر کرنے میں گزرتا تھا۔ وہ اس بات کے قائل ہوگئے تھے کہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ صرف شاہ صاحب کی تعلیمات کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

مولانا سندھی کی وطن واپسی:

۱۹۳۷ء میں جب برِعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کے متعدد صوبوں میں کانگرس برسرِ اقتدار آئی تو کانگرسی رہنماؤں نے مولانا سندھی کی وطن واپسی کے لئے برطانوی حکومت پر دباؤ ڈالا۔ اُدھر برطانوی حکومت کو بھی اپنے محکمہ جاسوسوں کے ذریعے اس بات کا کامل یقین ہو گیا تھا کہ مولانا سندھی سیاست سے بالکل کنارہ کش ہو چکے ہیں۔ چنانچہ انہیں واپس وطن آنے کی اجازت مل گئی اور موصوف ۱۹۳۹ء میں کراچی پہنچ گئے۔

مراجعتِ وطن کے بعد مولانا سندھی کا قیام جامعہ ملیہ دہلی میں رہا۔ رُبع صدی تک غیر ممالک میں رہ کر ان میں وسعتِ قلب پیدا ہو گئی تھی اور وہ فرقہ پرستی اور گروہ بندی سے بہت بلند ہو چکے تھے۔ دوسری جانب انہوں نے افغانستان میں ۱۹۱۹ء میں امیر حبیب اللہ خان کا قتل اور امان اللہ خان کی تخت نشینی دیکھی اور پھر افغانستان میں انقلاب آتے ہوئے دیکھا۔ امان اللہ خان انقلابیوں سے جان بچا کر اٹلی میں پناہ گزین ہوا۔ جب وہ رُوس پہنچے تو وہاں انہوں نے انقلابِ روس کا مشاہدہ کیا۔ ترکی گئے تو ان کے سامنے اتاترک نے خلافت ختم کر کے خلیفہ کو ترکی سے چلتا کیا۔ انہوں نے اتاترک کی انقلابی اصلاحات کا قریب سے مشاہدہ کیا۔ جب وہ ترکی سے حجاز پہنچے تو وہاں سلطان ابن سعود انقلاب برپا کر چکا تھا۔ ان انقلابوں کا ان کے ذہن پر بڑا اثر ہوا۔ جب وہ برِعظیم واپس لوٹے تو یہاں ابھی تک لوگ پرانی ڈگر پر گامزن تھے۔

ہمعصر علماء سے اختلاف

ان بدلے ہوئے حالات میں دیوبند کے اکابرین کے ساتھ ان کا نبھاہ مشکل ہو گیا۔ وہ مولانا سندھی کے مخصوص نظریات کی بنا پر ان کی ڈٹ کر مخالفت کرنے لگے۔ ادھر مولانا مسعود عالم ندوی جیسے غیر مقلد عالم دین نے ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ میں ان کے خلاف قسط وار مضامین لکھنے شروع کئے جن کا دنداں شکن جواب مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ نے ماہنامہ "برہان" دہلی میں دیا۔ مولانا اکبر آبادی کے یہی مضامین بعد میں "مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے ناقد" کے عنوان سے کتابی صورت میں ہمارے سامنے آئے۔

مولانا سندھی نے دہلی میں قیام کے زمانے میں جامع مسجد سے قریب مولانا ادریس میرٹھی کے ادارۂ شرقیہ میں جمعہ کی نماز کے بعد علمی مجلس آراستہ کرنا شروع کر دی۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ زمانہ قیامت کی چال چل گیا ہے اور برِعظیم کے مسلمان اور خصوصاً مذہبی طبقہ بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ اس لئے انہیں پرانی ڈگر سے ہٹ کر آگے بڑھنا چاہیئے۔

ایک اچھوتا منصوبہ:

کرنل خواجہ عبدالرشید (م ۱۹۸۳ء) مولانا عبیداللہ سندھی کے کہنے پر فوج میں بھرتی ہوئے تھے۔ انہوں نے راقم الحروف کو بتایا کہ مولانا سندھی یہ کہتے تھے کہ دوسری عالمی جنگ ہو رہی ہے اور وہ یہ دیکھ رہے ہیں کہ اس جنگ کے خاتمے پر انگریزوں کے لئے برِعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش پر تسلط برقرار رکھنا مشکل ہو جائے گا آزادی کے بعد مسلمانوں پر آزاد وطن کے دفاع کی ذمہ داری پڑے گی۔ اس لئے مسلمانوں کو بڑی تعداد میں فوج میں شامل ہو کر انگریزوں سے تربیت حاصل کرنی چاہیئے۔ مثال کے طور پر اگر دس لاکھ مسلمان فوج میں شامل ہو جائیں اور ان میں سے نصف یا اس سے زائد جنگ میں کام آجائیں تو جو باقی زندہ بچیں گے وہ انگریزوں کے تربیت یافتہ سپاہی ہوں گے اور وہ دفاعِ وطن کا فریضہ بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیں گے۔ اگر مولانا سندھی کی اس تجویز پر عمل ہوتا تو تقسیمِ ہند کے موقع پر ایک بھی مسلمان کی نکسیر نہ پھوٹتی۔

دہلی میں قیام کے دوران میں انہوں نے اپنے مخصوص نظریات متعدد اصحاب کو اِملاء کروائے اور قرآنِ حکیم کی متعدد سُورتوں کی شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تعلیمات کی رُوشنی میں تفسیر لکھی جن میں مزدوروں، کاشت کاروں اور محنت کشوں کے مسائل پر دَورِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق روشنی ڈالی۔ مولانا سندھی کے شاگردِ رشید اور برِّعظیم کے نامور عالم دین، مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ (م ۱۹۸۵ء) فرمایا کرتے تھے کہ شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۷۶۲ء) کے بعد مولانا سندھی سے زیادہ روشن دماغ عالم برِّعظیم میں پیدا نہیں ہوا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس طرح علامہ اقبال کی وجہ سے موجودہ صدی میں مولانا جلال الدین رُومی کو دوبارہ شہرت ملی۔ اسی طرح مولانا سندھی کی وجہ سے شاہ ولی اللہ دہلوی کا چرچا عام ہوا۔

مولانا سندھی کی وفات:

وسط ۱۹۴۴ء میں مولانا سندھی، سندھ کا دَورہ کر رہے تھے کہ ان کی طبیعت خراب ہوگئی اور موصوف اپنی بیٹی کے پاس دین پُور تشریف لے گئے۔ وہیں ۲۲ اگست ۱۹۴۴ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے معتقدین نے ان کے جسدِ خاکی کو ان کے مُرشد مولانا غلام محمد دین پوریؒ کے مزار کے پائنتی دفن کیا۔ رحمۃُ اللہ علیہ واسعاً و کثیراً۔

مولانا سندھی کی اُولاد:

مولانا عبیداللہ سندھی کی کوئی اُولادِ نرینہ نہ تھی۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ ان میں سے ایک مولانا احمد علی لاہوریؒ کے عقد میں آئی لیکن اس کا شادی کے جلد بعد انتقال ہوگیا۔ دوسری بیٹی کا عقد مولانا غلام محمد دین پُوری سے ہوا۔ ان کے بطن سے صاحبزادہ ظہیرالحق پیدا ہوئے جو مولانا سندھی کی طرح بڑے روشن دماغ عالم ہیں۔ ان کا قیام خانپور میں ہے جہاں وہ اپنے عظیم نانا کے سیاسی اور دینی افکار کی نشر و اشاعت میں مصروف ہیں۔

باب (17)

ندوۃُ العلماء، لکھنؤ

گزشتہ صدی کے رُبعِ آخر میں مشرقی اقدار اور مغربی تہذیب کی کشمکش زوروں پر تھی۔ ہمارے دینی مدارس مشرقی اقدار کے علمبردار تھے جبکہ ایم اے او کالج علی گڑھ اور اس جیسے مغربی طرز کے علمی ادارے جدید مغربی علوم کی تدریس پر زور دے رہے تھے۔ ان دونوں کے مابین دن بدن اختلافات کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی تھی۔

ہمارے دینی مدارس کا نصابِ تعلیم سیکڑوں سال پرانا تھا اور وہ زمانے کی ضرورتوں سے ہم آہنگ نہ تھا۔ ان مدارس میں قرآن و سُنّت اور تفسیر و حدیث کی بجائے فلسفہ، منطق، فلکیات اور صرف و نحو پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی اور علماء کرام کی اکثریت فلسفیانہ موشگافیاں حل کرنے میں ہی مصروف رہتی تھی۔ وہ یورپ کی ثقافتی یلغار کا مقابلہ کرنے کی بجائے اپنے مدارس کو دینی قلعے سمجھتے ہوئے ان میں "قلعہ بند" ہو کر بیٹھ گئے۔

دوسری جانب ایم اے او کالج علی گڑھ اور جدید طرز کے تعلیمی اداروں میں مشرقی اقدار و علوم کو یکسر نظر انداز کرکے تمام تر توجہ یورپی علوم پڑھانے پر دی جارہی تھی اور ان اداروں کے منتظمین یورپ کی نقالی کو ہی "حاصلِ عمرِ خویش" سمجھ رہے تھے۔ اس زمانے میں عوام میں یہ مشہور تھا کہ جو دیو بند چلا گیا اس کی دنیا گئی اور جو علی گڑھ چلا گیا اس کا دین گیا (جب جامعہ ملیہ دہلی قائم ہوئی تو اس مقولے میں یہ اضافہ ہوا کہ جو جامعہ ملیہ چلا گیا وہ دین و دنیا دونوں سے محروم ہوگیا)۔

ان حالات میں اس بات کی اشد ضرورت محسوس کی گئی کہ ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے جو مشرقی علوم و اقدار اور مغربی نظریاتِ تعلیم کا حسین سنگم ہو۔ اس

بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے چند درد مند مسلمان آگے بڑھے جن میں مولانا محمد علی کانپوری ثم مونگیری پیش پیش تھے۔ انہوں نے اپریل ۱۸۹۲ء میں مدرسہ فیضِ عام کانپور کے سالانہ جلسہ میں ایک ایسے ادارے کا تخیل پیش کیا اور باہمی صلاح و مشورہ سے اس کا نام ندوۃ العلماء تجویز ہوا۔

ندوۃ العلماء کے موجودہ ناظم اور عالمِ اسلام کے مایہ ناز عالم دین مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کے الفاظ میں ندوۃ العلماء کے قیام کے دو بنیادی مقاصد تھے:

۱: علماء کی باہمی نزاع کا خاتمہ

۲: اصلاحِ طریقۂ تعلیم

ان مقاصد کی تشریح کرتے ہوئے مولانا سیّد ابُوالحسن علی ندوی تحریر فرماتے ہیں کہ اس تحریک کی اساس علی گڑھ کی جدید اور تہذیب مغربی کی دعوت اور ملک کی دوسری تحریکوں کے بر خلاف خالص دینی تھی۔ اس تحریک کے داعیوں نے (حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی طرح) مسلمانوں کے تنزل کا اصل سبب دین سے انحراف اور صحیح دینی تعلیم سے محرومی قرار دیا اور اسی کو ملّت کے درد کا مداوا اور اصلاح و ترقی کا واحد راستہ تسلیم کیا گیا۔

اس تحریک میں طبقۂ علماء کو جو شریعت اسلامی کا حامل و امین کتاب و سُنّت کا شارح و ترجمان اور اسلام کا اصل نبض شناس ہے، مرکزی مقام دیا گیا اور اسی کو اُمّت کی تعمیر و تخریب، ترقی و تنزل اور اصلاح و فساد کا ذمہ دار قرار دے کر اپنی دعوت و جدوجہد کا محور بنایا گیا۔

ندوۃ العلماء کے بانیوں کی یہ رائے کتنی وقیع ہے کہ اُمّت میں اصلاح احوال کی کوئی کوشش اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک علماء اس کے داعی اور علم بردار نہ بنیں اور ان میں اُمّت کی رہنمائی و قیادت کی صلاحیت پیدا نہ ہو۔ اس کے لئے ایک طرف دینی علوم پر حاوی اور کتاب و سُنّت کا رمز شناس ہونے کی ضرورت ہے، دوسری جانب حالاتِ زمانہ اور جدید ضرورتوں سے واقفیت کی۔

اس تحریک کا اوّلین بنیادی مقصد رفع نزاع باہمی تھا۔ جس کا تعلق سب سے پہلے علماء کے مذہبی و فقہی نزاعات و اختلافات سے تھا جس نے علمی تحقیق و مباحثہ

سے آگے بڑھ کر مجادلے کی صورت اختیار کرلی اور پھر مجادلے سے بڑھ کر مقاتلے، عدالتی چارہ جوئیوں فوجداری مقامات اور باہمی تذلیل و تفسیل بلکہ تکفیر و تفسیق کی شکل اختیار کرلی تھی اور سارا ہندوستان اس کی وجہ سے ایک مذہبی دنگل بنا ہوا تھا۔

مولانا محمد علی کانپوری ثم مونگیری کے خیالات کی سرسیّد احمد خان، نواب محسن الملک (م ۱۹۰۷ء)، شاہ سلیمان پھلواروی (م ۱۹۳۵ء) اور نواب حبیب الرحمٰن خان شروانی (م ۱۹۵۰ء) نے تائید کی اور اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ سرسیّد احمد خان اور ان کے رفقاء نے ندوۃ العلماء کے بانیوں کو آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا پلیٹ فارم استعمال کرنے کی اجازت دے دی اور مسلمانوں کو اس کی ہر ممکن مدد کرنے کا مشورہ دیا۔

منشی احتشام علی کاکوروی (م ۱۹۲۳ء)، جو بقول سیّد سلیمان ندوی اودھ میں قدیم شریفانہ جوہر، وضعداری، دین داری، مروّت، غربا نوازی اور مسکین پروری کا آخری نمونہ تھے، مولانا محمد علی کانپوری ثم مونگیری کے برادرِ طریقت اور حضرت شاہ فضلِ رحمٰن گنج مراد آبادی (م ۱۸۹۵ء) کے مرید تھے، ندوۃ العلماء کے قیام میں مولانا محمد علی کے دستِ راست تھے۔ منشی صاحب اور ان کے ایک بزرگ عزیز منشی اطہر علی کے اصرار اور تحریک پر ندوۃ العلماء کا قیام ۱۸۹۳ء میں لکھنؤ میں عمل میں آیا اور ان دونوں بزرگوں نے گولہ گنج لکھنؤ میں نو ہزار روپے صرف کرکے ایک وسیع عمارت خرید کر مدرسے کے لئے وقف کر دی۔ یہ عمارت ان دنوں "خاتون منزل" کے نام سے موسوم ہے۔

۱۸۹۵ء میں لکھنؤ میں ندوۃ العلماء کا پہلا اجلاس منعقد ہوا جس میں مدرسے کے قیام کی غرض و غایت بیان کی گئی اور عوام کو اس کارِ خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی ترغیب دی گئی۔ ۲۶ ستمبر ۱۸۹۸ء کو مدرسہ کا افتتاح ہوا۔ مولانا شبلی نعمانی ایم اے او کالج علی گڑھ کی ملازمت ترک کر چکے تھے۔ انہوں نے اپنی خدمات ندوۃ العلماء کے لئے وقف کر دیں۔ شبلی نعمانی کے اس ادارے کے ساتھ تعلق نے اسے جلد ہی پُورے ملک میں مشہور کر دیا اور طلبہ دینی علوم کی بجائے شعر و ادب میں زیادہ دلچسپی لینے لگے۔ جس کا احساس ندوۃ العلماء کے بانیوں کو بھی ہونے لگا۔ چند سال بعد شبلی نعمانی اس ادارے

سے الگ ہوگئے اور انہوں نے اعظم گڑھ میں دارالمصنفین کی بنیاد رکھی۔

ندوۃ العلماء میں طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کی بنا پر خاتون منزل کی عمارت چھوٹی پڑ گئی تو ندوۃ العلماء کے بانیوں نے حکومت سے بات چیت کر کے لکھنؤ یونیورسٹی سے ملحق گومتی ندی کے کنارے ایک وسیع خطہ اراضی حاصل کر لیا۔ اور یہاں گورنر کے ہاتھوں نئی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھوایا۔

غلام محمد شملوی (م ۱۹۳۳ء) کی سعی و کاوش سے نواب بہاولپور نے پچاس ہزار روپے کی خطیر رقم نئی عمارے کی تعمیر کے لئے عطا کی۔ مولوی نظام الدین جھجھری کی خدمات بھی اس سلسلے میں ناقابلِ فراموش ہیں۔ ۱۹۱۴ء میں ندوۃ العلماء نئی عمارت میں منتقل ہوگیا۔ مولوی مسعود علی ندوی (م ۱۹۷۴ء) کی کوشش سے نئے کیمپس میں بڑی شاندار مسجد تعمیر ہوئی جو اس ادارے کے اساتذہ اور طلبہ کی دینداری کا مظہر ہے۔

۱۹۱۵ء میں سید عبدالحئی رائے بریلوی (م ۱۹۲۳ء) صاحب نزہۃ الخواطر ندوۃ العلماء کے ناظم مقرر ہوئے۔ موصوف اپنی وفات ۱۹۲۳ء تک اس ذمہ داری کو نبھاتے رہے۔ ان کے بعد نواب صدیق حسن خان بھوپالی (م ۱۸۹۰ء) کے فرزندِ ارجمند نواب علی حسن خان (م ۱۹۳۶ء) ناظم مقرر ہوئے۔ وہ بھی شاہ فضل رحمن گنج مراد آبادی کے دامنِ ارادت سے وابستہ تھے۔ انہوں نے اپنے اثر و رسوخ سے سید عبدالحئی رائے بریلوی کے فرزندِ ارجمند ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی کو نائب ناظم مقرر کروایا۔ نواب علی حسن خان ضعف اور پیری کی بنا پر ۱۹۳۱ء میں نظامت سے الگ ہوگئے تو ان کی جگہ حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی ناظم مقرر ہوئے جو اپنی وفات ۱۹۶۱ء تک اس عہدے پر مامور رہے۔ ان کا دورِ نظامت طویل ترین دَور تھا۔ ان کے دورِ نظامت میں ندوۃ العلماء نے ہر اعتبار سے ترقی کی۔ ان دنوں ان کے برادرِ اصغر سید ابوالحسن علی ندوی ناظم کے فرائض انجام دے رہے ہیں ان کی وجہ سے ندوۃ العلماء عالمِ اسلام میں متعارف ہوا اور کئی نئی عمارات تعمیر ہوئیں۔ ندوۃ العلماء کا کتب خانہ بڑا قیمتی ہے اور وہاں بہت سی نادر و نایاب کتابیں موجود ہیں۔ (راقم کو وہاں مطالعہ کرنے کی سعادت حاصل ہے اور مولانا ابوالحسن علی ندوی سے شرفِ ملاقات بھی کی)۔

ندوۃ العلماء کے ناظمین اور بانیوں کا تعلق اہل اللہ کے ساتھ رہا ہے۔

سید عبدالحئی رائے بریلوی کا تعلق حضرت سید احمد بریلوی کے خاندان سے ہے۔ ان کا رُوحانی تعلق حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (م ۱۸۹۹ء) اور شاہ فضل رحمن گنج مراد آبادی (م ۱۸۹۵ء) سے تھا۔ ان کے جانشین نواب علی حسن خان بھی شاہ فضل رحمن گنج مراد آبادی کے مرید تھے۔ حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی حضرت مولانا حسین احمد مدنی سے بیعت ہوئے اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ابتداء میں حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری (م ۱۹۶۲ء) کا دامن تھاما۔ حضرت شاہ عبدالقادر رائپوری کے وصال کے بعد مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنا رُوحانی تعلق شاہ محمد یعقوب بھوپالی سے قائم کیا۔ ان کی وفات ۱۹۷۰ء میں ہوئی تو مولانا صاحب نے اپنا تعلق شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا (م ۱۹۸۲ء) سے جوڑا۔ ناظمین کے اسی رُوحانی تعلقات نے ان میں للّٰہیت، ایثار و قربانی، دین کی بے لوث خدمت اور قومی ہمدردی کے جذبات کو جنم دیا۔

ندوۃ العلماء کے اساتذہ نے نصابِ تعلیم سے منطق اور فلسفہ کے طومار کو خارج کر کے اس کی جگہ قرآنِ مجید کے ترجمے اور تفسیر پر زور دیا۔ اسی طرح صرف و نحو میں جولانی دکھانے کی بجائے جدید عربی پڑھانے پر توجہ دی۔ اس ادارے میں عربی زبان کو ایک زندہ زبان کے طور پر پڑھایا جاتا ہے۔ ندوۃ العلماء سے فارغ ہونے والے طلبہ کو تاریخ و جغرافیہ بھی پڑھائے جاتے ہیں اور انہیں عالمِ اسلام میں ہونے والے واقعات سے واقف رکھا جاتا ہے۔ طلبہ کے لئے انٹرمیڈیٹ کے نصاب میں شامل انگریزی زبان سے واقفیت بھی لازمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ادارے کے فارغین عہدِ حاضر کے تقاضوں پر پُورے اترتے ہیں۔

ندوۃ العلماء سے ایک پندرہ روزہ عربی مجلہ "الرائد" شائع ہوتا ہے اور "البعث الاسلامی" کے عنوان سے ایک ماہنامہ بھی جاری ہے۔ یہ بھی عربی زبان میں چھپتا ہے۔ ان جرائد کی وجہ سے ندوۃ العلماء کی علمی سرگرمیوں سے عالمِ اسلام واقف رہتا ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنی عربی اور اُردو تصانیف کے ذریعے برِّعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کے علاوہ عرب ممالک کو بھی متاثر کیا ہے اور وہاں ان کا نام بڑے احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

ندوۃ العلماء کے اساتذہ میں سے مولانا شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی،

مولانا محمد فاروق چڑیا کوٹی (م ۱۹۰۹ء) مولانا علی زینبی، مولانا حیدر حسن ٹونکی (م ۱۹۳۲ء) مولانا حفیظ اللہ (م ۱۹۳۳ء) ابوالعرفان ندوی، سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد اویس نگرامی، مولانا عبداللہ ٹونکی اور علامہ تقی الدین الہلالی مراکشی قابلِ ذکر ہیں۔

ندوۃ العلماء سے فارغ ہونے والے طلبہ میں سید سلیمان ندوی (م ۱۹۵۳ء)، سید ابوالحسن علی ندوی، ریاست علی ندوی (م ۱۹۷۹ء) عبدالسلام ندوی (م ۱۹۵۶ء) اکرام اللہ خان ندوی (م ۱۹۵۲ء) حاجی معین الدین ندوی (م ۱۹۳۱ء)، مولانا محمد حنیف ندوی (م ۱۹۸۷ء) رشید اختر ندوی (م ۱۹۹۲ء) رئیس احمد جعفری (م ۱۹۶۸ء) شاہ محمد جعفر پھلواروی (م ۱۹۸۲ء)، ابوالحسنات ندوی (م ۱۹۲۳ء) شاہ معین الدین احمد ندوی (م ۱۹۷۴ء) شیخ خلیل عرب، مسعود علی ندوی (م ۱۹۶۷ء)، عبدالرحمٰن نگرامی (م ۱۹۲۶ء) ابوظفر ندوی (م ۱۹۵۸ء) اور مجیب اشرف ندوی (م ۱۹۶۸ء) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

سید سلیمان ندوی کی رہنمائی میں ندوۃ العلماء کے اخلاق و معاشرت میں دین داری اور دینی شعائر کے مزید احترام کا رنگ نمایاں ہوا۔ ان کے زمانے میں تبلیغی جماعت کے بانی مولانا محمد الیاس (م ۱۹۴۴ء) نے ندوۃ العلماء میں قیام فرمایا اور اساتذہ اور طلبہ کو اپنے رنگ میں رنگ دیا۔ ندوۃ العلماء کے اساتذہ اور طلبہ نے شدھی تحریک کے زمانے میں مسلمانوں کو مرتد ہونے سے بچانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی اور ان کی سعی و کاوش سے ہزارہا مسلمان مرتد ہونے سے بچ گئے۔

مولانا شبلی نعمانی آخری عمر میں ندوۃ العلماء سے قطع تعلق کر کے اعظم گڑھ چلے گئے جہاں انہوں نے اپنے خاندانی باغ میں دارالمصنفین کے نام سے ایک تحقیقی اور اشاعتی ادارے کی بنیاد رکھی۔ اس کے جلد بعد شبلی نعمانی کا انتقال ہو گیا تو سید سلیمان ندوی نے اس ادارے کی سربراہی قبول کی اور مولوی مسعود علی ندوی کے تعاون سے اسے ایک عظیم علمی ادارہ بنا دیا۔

ندوۃ العلماء سے فارغ ہونے والے اہلِ ذوق کو سید سلیمان ندوی دارالمصنفین میں کھینچ لائے۔ انہوں نے ماہنامہ "معارف" جاری کیا جو گزشتہ ۸۰ برسوں سے بڑی باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ دار المصنفین نے اسلامی تاریخ اور دوسرے اسلامی علوم پر صدہا کی تعداد میں کتابیں شائع کی ہیں۔ ایک عرصے تک یہ ادارہ

ندوۃ العلماء کے اشاعتی ادارے کے طور پر کام کرتا رہا۔ اب چند سالوں سے مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کوششوں سے ندوۃ العلماء نے "مجلسِ نشریاتِ اسلام" کے نام سے اپنا اشاعتی ادارہ کھول لیا ہے۔

مختصراً یہ کہ ندوۃ العلماء نے مسلمانانِ برِعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کی سیاسی مذہبی، سماجی اور معاشرتی زندگی میں ایک ناقابلِ فراموش کردار ادا کیا ہے۔

باب (18)

میثاقِ لکھنؤ

برطانوی حکومت نے مسلمانوں کو ہندوؤں سے الگ قوم تسلیم کرتے ہوئے ۱۹۰۹ء کے آئین کی رو سے جداگانہ انتخاب کا حق دیا تو ہندوؤں کے مفاد کو سخت نقصان پہنچا اور وہ سرکاری اداروں میں بہت سی نشستوں سے محروم ہوگئے۔ اس پر ہندوؤں نے بڑا واویلا مچایا اور اسے ہندو مسلم اتحاد کے لئے نقصان دہ قرار دیا۔

ہندو مسلم اتحاد کیلئے کوشش:

۱۹۱۰ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس وسطی ہند کے مشہور شہر ناگپور میں منعقد ہوا۔ ناگپور اس زمانے میں صوبہ سی پی کا دارالحکومت تھا۔

(آج کل سی پی کو مدھیہ پردیش کہتے ہیں اور ان دنوں اس کا دارالحکومت بھوپال ہے)۔ اس اجلاس کے صدارتی خطبے میں مسلم لیگ کے رہنما سر نبی اللہ نے ہندوؤں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم محض لفظی یا کاغذی اتحاد کے قائل نہیں ہیں اگر ہندو اس سلسلے میں مخلص ہیں تو ہم ان کے ساتھ قلبی اتحاد چاہتے ہیں۔

سر نبی اللہ کی اس پیش کش کے بعد کانگریس کے سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد ۱۹۱۰ء کے صدر سر ولیم ویڈن برگ نے یکم جنوری ۱۹۱۱ء کو الہ آباد میں ایک "اتحاد کانفرنس" بلائی جس میں ساٹھ ہندو سیاستدانوں اور چالیس مسلم رہنماؤں نے شرکت کی۔ ہندوؤں کی نمائندگی کرنے والوں میں پنڈت موتی لعل نہرو (م ۱۹۳۱ء) سر سریندر ناتھ بینرجی (م ۱۹۲۵ء) مدن موہن مالویہ (م ۱۹۴۶ء) مہاراجہ صاحب دربھنگہ (بہار) اور گوپال کرشنا گوکھلے (م ۱۹۱۵ء) قابلِ ذکر ہیں۔ مؤخر الذکر مسٹر گوکھلے کو سب سے زیادہ سمجھدار ہندو رہنما تسلیم کیا جاتا ہے۔ مسلم رہنماؤں میں نواب وقارالملک، سر آغا خان، ابراہیم رحمت اللہ اور سید محمد شامل تھے۔ ہندوؤں کی بڑھتی ہوئی حرص کی بنا پر یہ اتحاد کانفرنس

ناکام ہو گئی۔

دسمبر ۱۹۱۱ء میں دربارِ تاجپوشی دہلی کے موقع پر شاہِ برطانیہ جارج نے تقسیمِ بنگال منسوخ کر دی تو مسلمانوں کو اس کا بے حد صدمہ ہوا اور وہ ہندوؤں کو اس کا ذمہ دار ٹھہرانے لگے کیونکہ انہوں نے تقسیمِ بنگال منسوخ کرانے کی غرض سے باقاعدہ ایک تحریک چلائی تھی جس نے تشدد کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ تنسیخِ تقسیمِ بنگال کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں میں تناؤ بڑھ گیا۔

۱۹۱۱ء، ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۳ء میں مسلمان جنگِ طرابلس، تنسیخِ تقسیمِ بنگال کے منفی اثرات، جنگِ بلقان اور حادثہ مسجد کانپور کی جانب متوجہ رہے۔ ۱۹۱۳ء میں مولانا محمد علی جوہر اور مسلم لیگ کے سیکرٹری سید وزیر حسن کی تحریک اور ترغیب پر قائداعظم محمد علی جناح مسلم لیگ کے رُکن بن گئے۔ قائداعظم کانگرس کے سیاسی حلقے میں بے حد مقبول تھے اور کانگرسی ان کی رائے کو بڑا وزنی سمجھتے تھے۔ انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت کے بعد ہندو مسلم اتحاد کے لئے کوششیں تیز تر کر دیں۔

۱۹۱۴ء میں پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی تو مسلمانانِ برِعظیم کی تمام تر توجہ ترکی کی جانب مبذول ہو کر رہ گئی۔ ۱۹۱۵ء میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن نے برِعظیم کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد کرانے کے لئے تحریک شروع کی تو مولانا عبیداللہ سندھی کو کابل روانہ کیا اور خود مکّہ مکرمہ چلے گئے۔ مولانا سندھی نے کابل میں آزاد ہندوستان کی جلا وطن حکومت قائم کی تو امیرِ افغانستان حبیب اللہ خان کے مشورے سے اس کا صدر راجہ مہندر پرتاپ نامی ایک ہندو کو بنایا۔ یہ ہندو مسلم اتحاد کی ایک اچھی کاوش اور مخلصانہ کوشش تھی۔

۱۹۱۵ء سے پہلے مسلم لیگ اور کانگریس کے سالانہ اجلاس دسمبر کے آخری ایام میں مختلف شہروں میں منعقد ہوا کرتے تھے۔ اس لئے ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم اجمل خان، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور قائداعظم جیسے مسلم رہنماؤں کے لئے مشکل پیدا ہو جاتی تھی کہ وہ کس جماعت کے اجلاس میں شرکت کریں۔ ان دنوں یہ حضرات دونوں سیاسی جماعتوں میں یکساں مقبول تھے۔

باب (18)

میثاقِ لکھنؤ

برطانوی حکومت نے مسلمانوں کو ہندوؤں سے الگ قوم تسلیم کرتے ہوئے ۱۹۰۹ء کے آئین کی رو سے جداگانہ انتخاب کا حق دیا تو ہندوؤں کے مفاد کو سخت نقصان پہنچا اور وہ سرکاری اداروں میں بہت سی نشستوں سے محروم ہوگئے۔ اس پر ہندوؤں نے بڑا واویلا مچایا اور اسے ہندو مسلم اتحاد کے لئے نقصان دہ قرار دیا۔

ہندو مسلم اتحاد کیلئے کوشش:

۱۹۱۰ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس وسطی ہند کے مشہور شہر ناگپور میں منعقد ہوا۔ ناگپور اس زمانے میں صوبہ سی پی کا دارالحکومت تھا۔

(آج کل سی پی کو مدھیہ پردیش کہتے ہیں اور ان دنوں اس کا دارالحکومت بھوپال ہے)۔ اس اجلاس کے صدارتی خطبے میں مسلم لیگ کے رہنما سر نبی اللہ نے ہندوؤں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم محض لفظی یا کاغذی اتحاد کے قائل نہیں ہیں اگر ہندو اس سلسلے میں مخلص ہیں تو ہم ان کے ساتھ قلبی اتحاد چاہتے ہیں۔

سر نبی اللہ کی اس پیش کش کے بعد کانگریس کے سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد ۱۹۱۰ء کے صدر سر ولیم ویڈربرگ نے یکم جنوری ۱۹۱۱ء کو الہ آباد میں ایک "اتحاد کانفرنس" بلائی جس میں ساٹھ ہندو سیاستدانوں اور چالیس مسلم رہنماؤں نے شرکت کی۔ ہندوؤں کی نمائندگی کرنے والوں میں پنڈت موتی لعل نہرو (م ۱۹۳۱ء) سر سریندر ناتھ بینرجی (م ۱۹۲۵ء) مدن موہن مالویہ (م ۱۹۴۶ء) مہاراجہ صاحب دربھنگہ (بہار) اور گوپال کرشنا گوکھلے (م ۱۹۱۵ء) قابلِ ذکر ہیں۔ موخرالذکر مسٹر گوکھلے کو سب سے زیادہ سمجھدار ہندو رہنما تسلیم کیا جاتا ہے۔ مسلم رہنماؤں میں نواب وقارالملک، سر آغا خان، ابراہیم رحمت اللہ اور سید محمد شامل تھے۔ ہندوؤں کی بڑھتی ہوئی حرص کی بنا پر یہ اتحاد کانفرنس

ناکام ہوگئی۔

دسمبر ۱۹۱۱ء میں دربارِ تاجپوشی دہلی کے موقع پر شاہ برطانیہ جارج پنجم نے تقسیم بنگال منسوخ کر دی تو مسلمانوں کو اس کا بے حد صدمہ ہوا اور وہ ہندوؤں کو اس کا ذمہ دار ٹھہرانے لگے کیونکہ انہوں نے تقسیم بنگال منسوخ کرانے کی غرض سے باقاعدہ ایک تحریک چلائی تھی جس نے تشدد کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ تنسیخِ تقسیم بنگال کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں میں تناؤ بڑھ گیا۔

۱۹۱۱ء، ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۳ء میں مسلمان جنگِ طرابلس، تنسیخِ تقسیم بنگال کے منفی اثرات، جنگِ بلقان اور حادثۂ مسجدِ کانپور کی جانب متوجہ رہے۔ ۱۹۱۳ء میں مولانا محمد علی جوہر اور مسلم لیگ کے سیکرٹری سید وزیر حسن کی تحریک اور ترغیب پر قائداعظم محمد علی جناح مسلم لیگ کے رُکن بن گئے۔ قائداعظم کانگرس کے سیاسی حلقے میں بے حد مقبول تھے اور کانگرسی ان کی رائے کو بڑا وزنی سمجھتے تھے۔ انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت کے بعد ہندو مسلم اتحاد کے لئے کوششیں تیز تر کر دیں۔

۱۹۱۴ء میں پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی تو مسلمانانِ برعظیم کی تمام تر توجہ ترکی کی جانب مبذول ہو کر رہ گئی۔ ۱۹۱۵ء میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن نے برعظیم کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد کرانے کے لئے تحریک شروع کی تو مولانا عبیداللہ سندھی کو کابل روانہ کیا اور خود مکہ مکرمہ چلے گئے۔ مولانا سندھی نے کابل میں آزاد ہندوستان کی جلا وطن حکومت قائم کی تو امیرِ افغانستان حبیب اللہ خان کے مشورے سے اس کا صدر راجہ مہندر پرتاپ نامی ایک ہندو کو بنایا۔ یہ ہندو مسلم اتحاد کی ایک اچھی کاوش اور مخلصانہ کوشش تھی۔

۱۹۱۵ء سے پہلے مسلم لیگ اور کانگریس کے سالانہ اجلاس دسمبر کے آخری ایام میں مختلف شہروں میں منعقد ہوا کرتے تھے۔ اس لئے ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم اجمل خان، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور قائداعظم جیسے مسلم رہنماؤں کے لئے مشکل پیدا ہو جاتی تھی کہ وہ کس جماعت کے اجلاس میں شرکت کریں۔ ان دنوں یہ حضرات دونوں سیاسی جماعتوں میں یکساں مقبول تھے۔

مسلم لیگ اور کانگرس کے اجلاس منعقدہ ۱۹۱۵ء:

قائداعظم نے مسلم لیگ میں شمولیت کے بعد ہندو مسلم اتحاد کے لئے کوشش تیز تر کر دی۔ عالمی جنگ نے دونوں قوموں کو قریب تر کر دیا تھا۔ ۱۹۱۵ء میں قائداعظم کی سعی و کاوش سے دونوں سیاسی جماعتوں کے اجلاس ایک ہی ایام میں بمبئی میں منعقد ہوئے۔ مسلم لیگ کے اجلاس میں مدن موہن مالویہ (م ۱۹۴۶ء)، موہن داس کرم چند گاندھی (م ۱۹۴۸ء) ستیندر پرسانا سنہا (جو بعد میں لارڈ سنہا کے لقب سے مفتخر ہوئے (م ۱۹۲۸ء)، سروجنی نیڈو (م ۱۹۴۹ء) اور مسز اینی بیسنٹ (م ۱۹۳۳ء) نے شرکت کی۔ ان رہنماؤں نے ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا اور آزادی وطن کی خاطر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کو ضروری قرار دیا۔ اسی طرح کئی مسلم رہنماؤں نے خیر سگالی کے طور پر کانگرس کے اجلاس میں شرکت کی۔ اجلاس کے خاتمے پر لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ مسلم لیگ کے صدر مظہر الحق کا خطبہ صدارت جرأت اور صاف گوئی کا مظہر تھا اور اس کے برعکس کانگرس کے صدر سنہا کا خطبہ صدارت بڑی بے احتیاطی اور بے اعتدالی کے عالم میں لکھا گیا تھا۔

بمبئی کے جلسوں میں دونوں سیاسی جماعتوں نے ریفارم کمیٹیاں قائم کرنے کی سفارش کی۔ ان کمیٹیوں کا اجلاس نومبر ۱۹۱۶ء میں کلکتہ میں منعقد ہوا اور چار روز کے بحث و مباحثے اور غور و فکر کے بعد ایک سکیم تیار کی گئی۔ جب لکھنؤ میں مسلم لیگ اور کانگرس کے سالانہ اجلاس منعقد ہوئے تو اس سکیم کی منظوری دی گئی۔

مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ:

دسمبر ۱۹۱۶ء کے آخری ایام میں مسلم لیگ اور کانگرس کے سالانہ اجلاس لکھنؤ میں منعقدہ ہوئے۔ مسلم لیگ کے جلسے میں شیرِ بنگال ابوالقاسم فضل الحق (م ۱۹۶۲ء)، مشہور بنگالی صحافی مولانا اکرم خان، نواب سر ذوالفقار علی خان آف مالیر کوٹلہ (م ۱۹۳۳ء)، سر فضل حسین (م ۱۹۳۶ء) مولانا ظفر علی خان (م ۱۹۵۶ء) مدیر روز نامہ زمیندار، اعمال نامہ کے مصنف سر رضا علی (۱۹۴۹ء) صاحبزادہ آفتاب احمد خان (م ۱۹۳۰ء) جناب حسن امام اور مظہر الحق (م ۱۹۳۰ء) جیسے سلجھے ہوئے سیاستدانوں نے شرکت کی۔

۱۹۱۶ء کے اجلاس لکھنؤ کے صدر قائداعظم تھے۔ انہوں نے اپنے صدارتی خطبے میں واضح الفاظ میں فرمایا کہ برِعظیم میں حکومت خود اختیاری کا آغاز کیا جائے اور جنگ کے خاتمے پر ہندوستان کے مسئلے کو دلیری اور فیاضی کے ساتھ حل کیا جائے۔ انگریزوں کو چاہیئے کہ وہ ہندوستان کو برطانیہ کے آزاد، ذمہ دار اور ہمسر رکن کی حیثیت سے اس کا جائز حق عطا کرے۔

اس موقع پر ریفارم کمیٹیوں کی سفارشات کو عملی جامہ پہناتے ہوئے کانگرس اور مسلم لیگ کے مابین ایک سمجھوتے پر دستخط ہوئے جو ہماری تاریخ آزادی میں "یثاقِ لکھنؤ" کے نام سے مشہور ہے۔

یثاقِ لکھنو کی شقیں:

یثاقِ لکھنؤ کی اہم شقیں درج ذیل ہیں۔

۱: کانگرس نے مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کو تسلیم کر لیا۔ یہ ایک طرح سے مسلم لیگ کی بڑی کامیابی تھی۔ مسلم لیگ نے خود کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت منوا لیا اور ۱۹۰۹ء کے آئین کی رو سے انہیں جداگانہ انتخاب کا جو حق ملا تھا کانگرس نے اس پر صاد کر دیا۔

۲: کانگرس نے مسلمانوں کا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا کہ مرکزی مجلس قانون ساز میں انہیں ایک تہائی نشستیں ملیں گی۔

۳: اس معاہدے کی رو سے ویٹیج فارمولا طے پایا۔ اس کی رو سے ان صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہوگی، انہیں اسمبلی میں اپنی آبادی کے تناسب سے کم نشستیں ملیں گی اور وہاں کے غیر مسلموں کو اپنی آبادی کے تناسب سے قدرے زیادہ نشستیں ملیں گی۔

اسی طرح جن صوبوں میں ہندوؤں کی اکثریت ہے وہاں اسمبلیوں میں ہندوؤں کو اپنی آبادی کے تناسب سے کم نشستیں ملیں گی اور مسلمانوں کو اپنی آبادی کے تناسب سے زیادہ نشستیں حاصل ہوں گی۔ اس طرح مسلم اکثریت کے صوبوں کی اسمبلیوں میں ہندوؤں کا وزن بڑھ جائے گا اور ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کا۔

۴: اس فارمولے کے تحت صوبائی اسمبلیوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کا یہ اصول طے پایا۔

پنجاب ۵۰ فیصد	مدارس ۱۵ فیصد
یوپی ۳۰ فیصد	بمبئی ۳۳ فیصد
بنگال ۴۰ فیصد	سی پی ۱۵ فیصد
بہار ۲۵ فیصد	

۵۔ اس اصول پر دونوں سیاسی جماعتوں میں سمجھوتہ طے پایا کہ اگر کسی فرقے کے تین چوتھائی ارکان مخالفت کریں تو کوئی غیر سرکاری رکن، مرکزی مجلس قانون ساز، صوبائی اسمبلی یا کسی انتخابی ادارے میں اس فرقے کے بارے میں کوئی قرار داد یا بل پیش کرنے کا مجاز نہیں ہو گا۔

۶۔ اس سمجھوتے کی رُو سے یہ بھی قرار پایا کہ امپریل لجسلیٹو کونسل کے ارکان کی تعداد ۱۵۰ ہونی چاہیئے اور اس ادارے کے ۸۰ فیصد ارکان براہِ راست عوام کے منتخب کردہ ہوں بقیہ بیس فیصد ارکان حکومت نامزد کرے۔ اس ادارے کے صدر کا تقرر گورنر جنرل کی بجائے ادارے کے ارکان اپنے ووٹوں سے کریں۔

اسی طرح بڑے صوبوں کی اسمبلیوں کے ارکان کی تعداد ۱۲۵ ہو اور چھوٹے صوبوں کی اسمبلیوں کے ارکان کی تعداد ۵۰ سے ۷۵ تک ہونی چاہیے۔

۷۔ دونوں سیاسی جماعتوں نے حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں اراکین کو تحریک التواء کا حق تفویض کیا جائے۔

۸۔ صوبائی حکومتوں پر سے وزیر امورِ ہند اور حکومت ہند کے اختیارات کم کر کے انہیں زیادہ سے زیادہ آزادی دی جائے۔ نیز انڈین سول سروس کے ملازمین میں سے کسی کو صوبائی حکومت کا سربراہ یا گورنر مقرر نہ کیا جائے۔

۹۔ اس وقت تک سوال کرنے والے رکن کو ہی ضمنی سوال پوچھنے کا حق تھا۔ دونوں سیاسی جماعتوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ کونسل کے تمام اراکین کو یہ حق ملنا چاہیے۔

۱۰۔ حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ کسٹم، ڈاک اور تار، نمک، افیون اور ریلوے کے

محکموں کی آمدنی مرکزی حکومت لے اور دوسرے تمام ذرائع سے ہونے والی آمدنی صوبوں کو ملے۔

۱۱۔ وزیر امورِ ہند کی کونسل ختم کر کے اس کی جگہ دو نائب سیکرٹری مقرر کئے جائیں۔ جن میں سے ایک کا تعلق ہندوستان سے ہو۔ اس کے علاوہ وزیر امورِ ہند کی تنخواہ ہندوستان کے خزانے کی بجائے برطانیہ کے خزانے سے ادا کی جائے۔

۱۲۔ گورنر کی انتظامی کونسل کے نصف ارکان لازمی طور پر ہندوستان کے باشندے ہوں اور انہیں امپیریل لجسلیٹو کونسل کے اراکین منتخب کیا کریں اور اسی اصول پر گورنروں کی کونسلوں میں بھی عمل کیا جائے۔

۱۳۔ عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ کیا جائے اور انتظامیہ سے متعلق کسی افسر سے عدالتی کام نہ لیا جائے۔

میثاقِ لکھنؤ کا ردِ عمل:

مسلمانوں اور ہندوؤں کے مختلف طبقوں میں میثاق لکھنؤ کا مختلف ردِ عمل ہوا۔ پنجاب اور یوپی کے ہندوؤں نے اس سمجھوتے کی شدید مخالفت کی کیونکہ کانگرس نے مسلمانوں کا جداگانہ انتخاب کا حق تسلیم کر لیا تھا۔ اس سے مسلمانوں کی انتخابی نشستیں محفوظ ہو گئی تھیں ورنہ ہندو بزورِ زر ان میں سے بیشتر نشستیں حاصل کر لیتے۔

ہندوؤں کی فرقہ پرست اور متعصب مذہبی جماعت ہندو مہا سبھا نے اس سمجھوتے کی ڈٹ کر مخالفت کی۔ کیونکہ وہ برِصغیر میں ہندوؤں کے علاوہ دوسری اقوام کو غیر ملکی سمجھتی تھی اور ہندی، ہندو اور ہندوستان کا نعرہ بلند کر رہی تھی۔

مسلمانوں میں سے علی گڑھ والوں نے اس سمجھوتے کی اس بنا پر مخالفت کی کہ سرسیّد احمد خان مرحوم کانگرس کے ساتھ کسی بھی قسم کا تعاون کرنے کے حق میں نہ تھے۔ علی گڑھ میں گرلز کالج کے بانی شیخ محمد عبداللہ (سابق نام ٹھاکر داس) اس سمجھوتے کی مخالفت میں سب سے آگے تھے۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے اس سمجھوتے کے خلاف بڑے سخت مضامین شائع کئے۔ کیونکہ کئی صوبوں میں مسلمان اکثریت اقلیت

میں تبدیل ہو کر رہ گئی تھی ۔ بدایوں کے ہفت روزہ مجلّے " ذوالقرنین " اور اٹاوہ کے اخبار " البشیر " نے بھی میثاقِ لکھنؤ کو ناپسند کیا اور اس کے نقصانات پر مضامین چھاپنے شروع کر دیئے ۔ اسی طرح اس زمانے کے دو موقر جرائد " مشرق " اور " المیزان " نے بھی میثاقِ لکھنؤ کی مخالفت کرتے ہوئے لکھا کہ اس سمجھوتے نے مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے ہندوؤں کے زیر کر دیا ہے ۔ چوہدری خلیق الزمان (م ۱۹۷۳ء) کی یہ رائے ہے کہ اگر پنجاب اور بنگال میں مسلم اکثریت کو اقلیت میں تبدیل نہ کیا جاتا تو ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے موقع پر ان صوبوں کی تقسیم عمل میں نہ آتی ۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے اس موقع پر تقسیم ہند کا خاکہ پیش کر دیا ۔

بنگال میں مسلمانوں کی واضح اکثریت تھی اس کے باوجود وہ چالیس فیصد نشستیں لینے پر مجبور کر دیئے گئے ۔ " دی انڈین مسلم ایسوسی ایشن " کے رہنماؤں نے ، جن میں نواب علی چودھری اور سراج الاسلام پیش پیش تھے ، اس سمجھوتے کی مخالفت کی ۔ انہوں نے وزیر امورِ ہند ایڈون مانٹیگو کو ایک درخواست بھیجی جس میں اس سے یہ اپیل کی کہ وہ فراخدلی سے کام لیتے ہوئے مسلمانوں کو پچاس فیصد نشستیں ضرور دلوائے ۔

سر محمد شفیع اس سمجھوتے سے اس قدر بد دل ہوئے کہ انہوں نے پنجاب مسلم لیگ کا الحاق آل انڈیا مسلم لیگ سے ختم کر دیا ۔ اس سمجھوتے کے بعد قائداعظم کو برطانوی حکومت سے آئینی اصلاحات نافذ کرانے کے لئے بڑی جدوجہد کرنا پڑی ۔

بعض نقادوں کی یہ رائے ہے کہ مسلمانوں کو مرکزی مجلسِ قانون ساز میں ایک تہائی نشستیں حاصل کرنے کے لئے صوبوں میں بڑی قربانی دینا پڑی اور پنجاب اور بنگال میں مسلمان اکثریت میں ہونے کے باوجود اقلیت بن کر رہ گئے ۔

اس کے برعکس ہندوؤں نے اپنی اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو ان کی آبادی کے حساب سے چند فیصد زائد نشستیں دے دیں ۔ اس کے باوجود ہندو ان صوبوں میں اکثریت میں رہے بلکہ کئی صوبوں میں ان کی نشستیں تین چوتھائی سے بھی زائد تھیں ۔ ان پر مسلمانوں کو زائد نشستیں دے کر بھی کوئی فرق نہ پڑا ۔

مسلمانوں کو اس سمجھوتے سے صرف چار فائدے پہنچے ۔

۱ ۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کو خود سے الگ قوم تسلیم کر لیا ۔

۲ ۔ کانگرس نے مسلمانوں کا جداگانہ انتخاب کا حق تسلیم کر لیا ۔ اس سے اس کا یہ دعویٰ باطل ہو گیا کہ وہ ہندوستان کے تمام باشندوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے ۔

۳ ۔ مسلمانوں کو اس بات کا اطمینان ہو گیا کہ اگر وہ اسمبلی میں مسلمانوں کے بارے میں کسی بل کی مخالفت کریں گے تو وہ بل پاس نہیں ہو سکے گا ۔

۴ ۔ مسلمانوں کی مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں نشستیں مخص ہو گئیں اور انہیں یہ معلوم ہو گیا کہ ان کے پاس فلاں اسمبلی میں اتنی نشستیں ضرور ہوں گی ۔

تاہم اس سمجھوتے کی " دوستانہ فضا " زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکی اور تنگ دل ہندوؤں نے شدھی ، سنگھٹن اور ہندو مہاسبھا کی سرگرمیوں کے ذریعے اس دوستانہ فضا کو مسموم کر دیا اور رہی سہی کسر پنڈت موتی لعل نہرو نے ۱۹۲۸ء میں اپنی رسوائے زمانہ رپورٹ کے ذریعے نکال دی ۔

باب (19)

پہلی عالمی جنگ کے بعد کی سیاست

پہلی عالمی جنگ کے دوران برطانیہ نے اپنے حریفوں جرمنی اور ترکی کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ۔ جرمنی کو افریقہ میں اپنے مقبوضات ٹانگا نیکا (موجودہ تنزانیہ) کیمرون اور جنوب مغربی افریقہ جیسے ملکوں کے علاوہ متعدد جزائر سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔ ترکی کے قبضے سے شام ، لبنان ، عراق ، فلسطین ، بشمول موجودہ اُردن ، موجودہ سعودی عرب ، کویت اور متحدہ عرب امارات نکل کر انگریزوں اور فرانسیسیوں کے زیر تسلط آ گئے۔ مصر پہلے ہی انگریزوں کے قبضے میں تھا ۔ اس لئے جنگ کے بعد برطانیہ فاتح کی حیثیت سے ایک عظیم عالمی قوت بن کر اُبھرا اور اپنے مقبوضات پر اس کی گرفت مزید سخت ہو گئی ۔

دوسری جانب میثاقِ لکھنؤ کے بعد وقتی طور پر ہندو مسلم اتحاد کی راہ ہموار ہو گئی اور دونوں قوموں نے مل کر آزادی کے لئے جدو جہد شروع کر دی ۔ حکومت برطانیہ حریت پسندوں کی خفیہ سرگرمیوں اور ریشمی رومال جیسی تحریکوں سے خائف تھی۔

غدر پارٹی:

اُنیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز پر ہندوستان کے بہت سے باشندے امریکہ کے مغربی ساحل پر آباد ہو گئے ۔ سان فرانسسکو اور سکرے منٹو میں ان کی خاصی تعداد تھی ۔ ان لوگوں نے وہاں ایک تنظیم قائم کر لی ۔ اس تنظیم کے بیشتر افراد برِّعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کی سیاست میں دلچسپی لیتے تھے ۔ یکم نومبر ۱۹۱۳ء کو بابا سوہن سنگھ بھکنا نے سان فرانسسکو میں "غدر پارٹی" کی بنیاد رکھی ۔ مولوی برکت اللہ بھوپالی (م ۱۹۲۷ء) اور ہر دیال (م ۱۹۳۹ء) جیسے انگریز دشمن حضرات اس پارٹی

میں شامل ہو گئے ۔ غدر پارٹی برِّعظیم سے انگریزوں کو ہر جائز اور نا جائز طریقے سے نکالنے کی حامی تھی اور اس مقصد کے لئے وہ تشدد اور دہشت گردی کی حوصلہ افزائی کرتی تھی ۔ اس پارٹی نے "غدر" کے نام سے انگریزی اُردو اور گورمکھی زبانوں میں ایک اخبار جاری کیا جس میں انگریزوں کو ہر قیمت اور ہر طریقے سے برِّعظیم سے نکالنے کا پروپیگنڈا کیا جاتا تھا ۔ انگریزوں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر برِّعظیم میں اس اخبار کے داخلے پر پابندی عائد کر دی اور غدر پارٹی کے حامیوں کی کڑی نگرانی شروع کر دی ۔

رولٹ ایکٹ:

جنگِ عظیم کے خاتمے پر برطانیہ نے برِّعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کے باشندوں کی باغیانہ سرگرمیوں اور زیرِ زمین تحریکوں کا پتہ چلانے اور ان کا سدِّ باب کرنے کی غرض سے سڈنی رولٹ (م ۱۹۴۵ء) نامی ایک انگریز کی سربراہی میں ایک کمیشن قائم کیا ۔ برِّعظیم کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد سڈنی رولٹ نے یہ تجویز پیش کی کہ مرکزی قانون ساز اسمبلی سے ایسا قانون پاس کروایا جائے کہ جن لوگوں پر دہشت انگیز سرگرمیوں میں حصہ لینے کا شبہ ہو ان کو بغیر کسی عدالتی کاروائی یا صفائی کا موقع دیئے قید کر دیا جائے ۔ جب سڈنی رولٹ کی تجاویز منظرِ عام پر آئیں تو ملک کے طول و عرض میں اس کے خلاف غم و غصے کا اظہار کیا گیا ۔ پشاور سے لے کر راس کماری تک اور کوئٹہ سے لے کر رنگون تک عوام سراپا احتجاج بن گئے ۔ انہوں نے ان تجاویز کو اپنی عزتِ نفس اور غیرت پر زبردست حملہ قرار دیا ۔

بل کی منظوری:

اس زمانے میں مرکزی قانون ساز اسمبلی کے ۵۷ اراکین میں ۳۴ انگریز اور ۲۳ ہندوستانی تھے ۔ جب سڈنی رولٹ کی سفارشات اسمبلی میں پیش ہوئیں تو تمام ہندوستانی اراکین نے ، جن میں حکومت کے منظورِ نظر انگریز پرست اور فرزندِ دلبند دولتِ انگلشیہ اور فرزندِ جگر بندِ خاص دولتِ انگلیشیہ جیسے اراکین بھی شامل تھے ، بل کے خلاف ووٹ دیا ۔ ان کی مخالفت کے باوجود یہ بل اسمبلی میں پاس ہو گیا اور وائسرائے ہند لارڈ چیمسفورڈ (م ۱۹۳۳ء) نے فوراً اس بل کی منظوری دے دی ۔ اس موقع پر

قائداعظم اور مولوی مظہر الحق نے ڈٹ کر اس بل کی مخالفت کی اور جرأت و بیباکی کے ساتھ اس پر احتجاج کیا۔ قائداعظم نے اس موقع پر فرمایا کہ کوئی مہذب حکومت اس طرح کا قانون تیار نہیں کر سکتی اور نہ ہی لوگ اس قسم کے قانون کے نفاذ کا تصوّر کر سکتے ہیں۔ اس بل کی منظوری کے بعد قائداعظم نے وائسرائے کے نام ایک خط میں اس بل کی منظوری پر احتجاج کرتے ہوئے اسمبلی کی رُکنیت سے استعفےٰ دے دیا۔ انہوں نے وائسرائے کے نام خط میں یہ لکھا کہ حکومت نے یہ بل پاس کر کے عوام کے ساتھ شدید ناانصافی کی ہے اور عدل و انصاف کے تمام بنیادی تقاضوں کو پامال کر دیا ہے۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ اپنی پالیسی بدلے تاکہ سازشیں خود بخود ختم ہو جائیں۔

عوام کا ردِ عمل:

رولٹ ایکٹ پاس ہوتے ہی ملک کے طول و عرض میں ہنگامے شروع ہو گئے اور عوام سراپا احتجاج بن گئے۔ گاندھی جی نے اس بل کے خلاف عدم تشدد کی تحریک کا آغاز کیا۔ انہوں نے ۳۰ مارچ ۱۹۱۹ء کو ملک گیر ہڑتال کی اپیل کی اور اس روز عوام کو روزہ رکھنے کا مشورہ دیا۔ چند روز بعد گاندھی جی نے کسی مصلحت کے تحت ۳۰ مارچ کی بجائے ۶ اپریل کو ہڑتال کرنے کی اپیل کی۔ اس تبدیلی تاریخ کے باوجود دہلی میں ۳۰ مارچ کو مکمل ہڑتال ہوئی اور عوام نے زبردست احتجاج کیا۔ پولیس نے ایک احتجاجی جلوس پر گولی چلا دی اور بہت سے مظاہرین ہلاک ہو گئے۔

گورنر پنجاب کا رویہ:

گاندھی جی کی اپیل پر ۶ اپریل کو ستیہ گرہ کیا گیا۔ مختلف شہروں میں ہڑتال رہی۔ لوگوں نے جلسے منعقد کئے اور احتجاجی جلوس نکالے۔ اس روز لاہور، کلکتہ، بمبئی، احمد آباد اور ندیا (بنگال) میں خوب ہنگامہ آرائی ہوئی۔ پنجاب اس تحریک کا بڑا مرکز تھا۔ بدقسمتی سے ان دونوں سرمائیکل ایڈوائر پنجاب کا گورنر تھا۔ وہ بڑا رعونت پسند انگریز اور انگریزی اقتدار کا زبردست حامی تھا۔ وہ اپنی رعونت کی وجہ سے وکلاء اور پڑھے لکھے افراد کو ناپسند کرتا تھا۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ انگریزوں نے یہ ملک بزورِ شمشیر اور بڑی جانی قربانیاں دے کر فتح کیا ہے۔ اس لئے انہیں اس پر قبضہ برقرار رکھنا چاہیے۔ وہ یہ

بھی کہا کرتا تھا کہ نرم دل لوگ حکومت کا کاروبار نہیں چلا سکتے۔ اس کام کے لئے سخت دل لوگوں کی ضرورت ہے۔ وہ برِّعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش میں اصلاحات نافذ کرنے کے بھی خلاف تھا۔ وہ چونکہ ہندوستانیوں سے ملنا اپنی ہتک سمجھتا تھا اس لئے جب وزیر امورِ ہند اڈون مانٹیگو نے اصلاحات کے نفاذ سے قبل برِّعظیم کا دورہ کرنے اور یہاں کے سیاستدانوں سے ملنے کا ارادہ ظاہر کیا تو سرمائیکل ایڈوائر نے اس کی زبردست مخالفت کی۔ اس کا یہ خیال تھا کہ انگریز افسروں کا ہندوستانی لیڈروں سے ملنا ان کی ہتک ہے۔ وہ ہر ہندوستانی کو جھوٹا اور بے ایمان سمجھتا تھا۔ وہ یہ کہا کرتا تھا کہ جو لوگ ایک اسکول، اخبار یا میونسپلٹی کا انتظام نہیں چلا سکتے وہ ایک ملک کی حکومت کیونکر چلا سکتے ہیں۔

سرمائیکل ایڈوائر (م ۱۹۴۰ء) پنجاب کی صورتِ حال پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھا۔ جب مسز اینی بیسنٹ نے ہوم رول لیگ کا ڈول ڈالا تو اس نے پنجاب میں اس کی شاخ قائم نہ ہونے دی۔ جب رولٹ ایکٹ کی منظوری پر ہنگامے شروع ہوئے تو اس نے پنجاب میں جلسے اور جلوسوں پر مکمل پابندی لگا دی۔ گاندھی جی ۱۰ اپریل ۱۹۱۹ء کو پنجاب کا دورہ کرنے والے تھے۔ جب ان کی ٹرین پلول کے ریلوے اسٹیشن پر رُکی تو پولیس نے انہیں گورنر صاحب کا حکمنامہ دکھایا کہ وہ پنجاب میں داخل نہیں ہو سکتے۔ گاندھی نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا تو پولیس انہیں گرفتار کر کے بمبئی لے گئی۔

جب پنجاب کے عوام کو یہ معلوم ہوا کہ حکومت پنجاب نے گورنر کے ایماء پر گاندھی جی کے پنجاب میں داخلے پر پابندی عائد کر دی ہے تو پورے صوبے میں اشتعال پھیل گیا۔ امرتسر کے عوام دوسرے شہروں میں بسنے والوں کی نسبت زیادہ مشتعل ہوئے۔ اس زمانے میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال امرتسریوں کے مسلمہ رہنما تھا۔ حکومت ان کی کڑی نگرانی کر رہی تھی۔ ۳ اپریل کو حکومت نے ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی زبان بندی کر دی تاکہ وہ لوگوں کو حکومت کے خلاف بھڑکا نہ سکیں اس کے چار پانچ روز بعد حکومت نے ان دونوں رہنماؤں کو گرفتار کرنے کا ارادہ کیا لیکن عوام میں ان کی مقبولیت کے پیشِ نظر انہیں سرِ عام گرفتار کرنا آسان کام نہ تھا۔ اس لئے ڈپٹی کمشنر نے انہیں ملاقات کے بہانے اپنے گھر مدعو کیا۔ جب وہ وہاں پہنچے تو انہیں عقبی دروازے سے کار میں بٹھا کر دھرم سالہ (ضلع کانگڑہ) روانہ کر دیا۔

امرتسر کا ہنگامہ:

جب عوام کو ان دونوں رہنماؤں کی گرفتاری کا علم ہوا تو وہ سراپا احتجاج بن گئے ۔ عوام نے احتجاجی جلوس نکالا ، جس میں تشدد کا رنگ پیدا ہو گیا ۔ لوگوں نے نیشنل بنک پر حملہ کر کے کچھ رقم لوٹ لی اور بنک کے انگریز منیجر اور ڈپٹی منیجر کو قتل کر ڈالا ۔ اس ہنگامے میں تین اور انگریز بھی مارے گئے ۔ پانچ انگریزوں کے مارے جانے کے بعد گورنر نے امرتسر کو فوج کے حوالے کر دیا اور جالندھر چھاؤنی سے جنرل ڈائر ۱۱ اپریل کو ۴۷۵ گوروں اور ۷۱۰ ہندوستانی فوجیوں کے ہمراہ امرتسر پہنچ گیا ۔ اس نے امرتسر پہنچتے ہی ہر قسم کے جلوسوں اور جلسوں پر پابندی لگا دی ۔

سانحہ جلیانوالہ باغ:

جنرل ڈائر (م ۱۹۲۷ء) کے امرتسر پہنچنے کے تین دن بعد ۱۳ اپریل کو بیساکھی کا تہوار آ گیا ۔ امرتسر میں یہ تہوار ہمیشہ سے بڑی دھوم دھام کے ساتھ منایا جاتا ہے ۔ اس موقع پر دُور دُور سے سکھ یاتری ہر مندر کے تالاب میں اشنان کے لئے آتے ہیں اور ہندو بھی رسم دُرگیانہ کے مندر سے ملحقہ تالاب میں ادا کرتے ہیں ۔ امرتسر کے اہالیان نے بیساکھی کے رُوز احتجاجی جلسہ کرنے کا پروگرام بنایا اور اس مقصد کے لئے ہر مندر سے قریب جلیانوالہ باغ کا انتخاب کیا ۔ یہ باغ چاروں اطراف سے مکانوں میں گھرا ہوا ہے اور داخلے کے لئے صرف ایک ہی دروازہ ہے جس میں سے کار بھی نہیں گزر سکتی ۔

جنرل ڈائر کی بربریت:

پروگرام کے مطابق جب امرتسر کے باشندے جلسہ منعقد کرنے کے لئے باغ میں جمع ہوئے تو جنرل ڈائر ۹۰ سپاہیوں کو ساتھ لے کر وہاں پہنچ گیا ۔ اسے یہ چاہیے تھا کہ وہ جلسے کو منتشر کرنے کے لئے آنسو گیس پھینکتا یا لاٹھی چارج کراتا ، مگر اس نے وارننگ دیئے بغیر عوام پر گولی چلا دی ۔ سپاہیوں نے نہتے عوام پر ۱۶۵۰ راؤنڈ چلائے ۔ سرکاری اطلاع کے مطابق گولیاں لگنے سے ۳۷۹ افراد جاں بحق تسلیم ہوئے اور ۱۲۰۰ شدید زخمی ہوئے ۔ جبکہ غیر سرکاری اطلاع کے مطابق مرنے والوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی ۔

جلیانوالہ باغ کا سانحہ سامراجی قوت کے ظلم و بربریت کی بدترین مثال ہے ۔ نہتے عوام پر گولی چلانا دنیا کے کسی بھی آئین کے خلاف ہے ۔ جنرل ڈائر نے ہنٹر کمیٹی کے رُو برو اپنے بیان میں یہ کہا کہ اگر باغ کا دروازہ چوڑا ہوتا تو وہ بکتر بند گاڑیاں اندر لے جا کر عوام کو کچل ڈالتا ۔ اس بہیمانہ عمل سے جنرل ڈائر کا مقصد عوام کو دہشت زدہ کرنا اور ان کے دلوں پر انگریزی حکومت کا رعب بٹھانا تھا ۔

اس سانحہ پر پُورے ملک میں سوگ منایا گیا ۔ عوام کے جذبات دیکھتے ہوئے حکومت نے ۱۵ اپریل کو پنجاب میں مارشل لاء نافذ کر دیا ۔ سکولوں اور کالجوں میں تعلیم پانے والے طلبہ پر تشدد کیا گیا ۔ معززین کو رُسوا کرنے کی غرض سے انہیں مارا پیٹا گیا ۔ لاہور کے عوام کو تنگ کرنے کی غرض سے پانی کی سپلائی رُوک دی گئی ۔ عوام کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ اپنی کاریں ، موٹر سائیکلیں ، سائیکلیں ، لیمپ اور پنکھے قریبی تھانوں میں جمع کرا دیں ۔ پنجاب کے چیف جج سرشادی لعل کو بھی اس قانون سے مستثنیٰ نہ کیا گیا اور اسے بھی اپنی کار حکومت کے حوالے کرنا پڑی ۔ حکومت نے سربر آوردہ لوگوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا کہ دیواروں پر کوئی شخص حکومت کے خلاف اشتہار نہ لگائے اور وہ سرکاری اشتہارات کی حفاظت کریں ۔ دیال سنگھ کالج لاہور کی دیوار پر کسی نے حکومت کے خلاف اشتہار لگا دیا تو حکومت نے پرنسپل کو جیل میں ڈال دیا ۔ معمولی معمولی خطاؤں پر حکومت عمر قید کی سزائیں دینے لگی ۔ امرتسر میں ایک انگریز عورت مس شروڈ عوام کے ہتھے چڑھ گئی ۔ عوام تو غصے سے بھرے بیٹھے تھے ۔ انہوں نے اس کی پٹائی کر دی ۔ وہ بھاگ کر ایک گلی میں گھس گئی ۔ اس گلی کے باشندوں نے بھی اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا ۔ اس کی جان تو بچ گئی لیکن حکومت نے اس گلی کے باشندوں پر یہ پابندی لگا دی کہ وہ اپنے پاؤں پر چلنے کی بجائے اس گلی میں رینگ کر گزریں ۔ مجبوراً عوام کو یہ تکلیف کئی ماہ تک برداشت کرنا پڑی ۔ اسی بنا پر اس گلی کا نام " رینگنے والی گلی " پڑ گیا ۔

سانحہ جلیانوالہ باغ نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور عوام کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف شدید نفرت پیدا کر دی ۔ انگریزوں کے اس ظلم و بربریت نے وقتی طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات ختم کر دیئے اور دونوں قومیں انگریزوں

کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑی ہو گئیں ۔ اس سانحہ نے آزادی کی منزل کو قریب تر کر دیا ۔ اس سال کانگرس اور مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقد ہونے والے تھے ۔ دونوں جماعتوں نے یہ اجلاس امرتسر میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ۔

سانحہ جلیانوالہ باغ نے بہت سے حریت پسند نوجوانوں کے ذہنوں کو متاثر کیا اور انہوں نے انگریزوں سے اس ظلم و بربریت کا بدلہ لینے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی ۔ ایک سکھ جانباز اُودھم سنگھ لندن میں جا آباد ہوا ۔ اس نے ۱۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو اپنے ہموطنوں کے قتلِ عام کا بدلہ لینے کی خاطر لندن میں پنجاب کے سابق گورنر سرمائیکل ایڈوائر کو ایک بھرے جلسے میں گولی مار کر ہلاک کر دیا ۔ گولی چلنے سے جلسے میں بھگدڑ مچ گئی ۔ اُودھم سنگھ اگر چاہتا تو وہ ہجوم میں غائب ہو جاتا لیکن اس نے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا ۔ اس پر عدالت میں سرمائیکل ایڈوائر کے قتل کے جرم میں مقدمہ چلایا گیا ۔ اُودھم سنگھ نے اعتراف جرم کرتے ہوئے کہا کہ اسے مرنے کا کوئی غم نہیں ہے ۔ عدالت نے قانونی کاروائی پوری کرنے کے بعد اسے موت کی سزا سنائی اور ۳۱ جولائی ۱۹۴۰ء کو اسے پنٹون ول جیل میں تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا ۔ آزادیٔ وطن کے بعد اس کی ہڈیاں بھارت لائی گئیں اور اسے "شہیدِ آزادی" کا درجہ دیا گیا ۔

باب (20)

تحریکِ خلافت

پہلی عالمی جنگ نے مسلمانانِ پاک و ہند اور بنگلہ دیش میں ذہنی اور فکری انقلاب پیدا کر کے خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کر دیا ۔ برطانیہ کا حکمران طبقہ حرمین شریفین (مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ) کا تقدس برقرار رکھنے اور خلیفۃ المسلمین اور ترکی کے ساتھ انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے اعلانات کے باوجود مسلمانوں کے خدشات دُور نہ کر سکا ۔

۱۹۱۹ء کا آئین:

انگریزوں نے ۱۹۱۹ء میں مانٹیگو چیمسفورڈ کی سفارشات پر مبنی آئین نافذ کر کے برِعظیم کے باشندوں کو مزید مراعات دیں لیکن یہ حربہ بھی کارگر ثابت نہ ہوا ۔ اس آئین کے نفاذ سے مرکز اور صوبوں میں دو عملی پیدا ہو گئی ۔ اس لئے آئین کے مطابق رُوز مرہ کا کام چلانا حکومت کے لئے مشکل ہو گیا ، جس سے عوام کے لئے مشکلات پیدا ہو گئیں ۔

جنگ کے اثرات ما بعد:

جنگ کے زمانے میں فوجی ضروریات پوری کرنے کے لئے کارخانوں میں دن رات شفٹوں میں کام ہوتا تھا ۔ لاکھوں افراد فوج میں بھرتی ہو کر مختلف محاذوں پر لڑنے کے لئے گئے ہوئے تھے ۔ اس زمانے میں رُوزگار کے مواقع فراہم تھے ۔ اس لئے غریب طبقہ مالی لحاظ سے مطمئن تھا ۔

جنگ کے خاتمے پر کارخانوں میں پیداوار کم ہو گئی جس کی وجہ سے مزدوروں کی چھانٹی کرنا پڑی ۔ اس پر مزدوروں نے ہنگامے شروع کر دیئے ۔ ۱۹۱۹ء کے

آغاز میں بمبئی کے کارخانوں میں ہڑتال ہو گئی اور مالکان نے سوا لاکھ مزدور ملازمت سے الگ کر دیئے۔ اس کے بعد ہڑتالوں اور ہنگاموں کا ملک گیر سلسلہ شروع ہو گیا اور جون ۱۹۲۰ء تک دو صد کارخانوں کے مزدوروں نے ہڑتالوں میں حصہ لیا اور پندرہ لاکھ مزدور ملازمت سے برخاست کر دیئے گئے۔ اس سے کروڑوں افراد فاقہ کشی پر مجبور ہو گئے۔

دوسری جانب جنگ کے خاتمے پر فوجیوں کو گھر بھیج دیا گیا۔ اس طرح لاکھوں افراد جو برسرِ روزگار تھے، بے روزگار ہو گئے۔

اسی دوران میں ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں جلیانوالہ باغ کا سانحہ پیش آیا جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ انگریزوں کے اس ظلم و تشدد کے خلاف مختلف شہروں میں ہنگامے شروع ہو گئے۔ گوجرانوالہ میں انگریزوں کے ظلم و تشدد کے خلاف بڑا زبردست مظاہرہ ہوا۔ انگریزوں نے جہاز کے ذریعے نہتے عوام پر بمباری کی اور حکومت کے خلاف مظاہرے کرانے کے جرم میں بہت سے افراد کو تختۂ دار پر لٹکا دیا۔

انگریزوں کی چال:

جن دنوں انگریز اور ان کے حلیف سلطنتِ عثمانیہ کے حصے بخرے کرنے پر غور کر رہے تھے، انہیں اس بات کی فکر لاحق تھی کہ کہیں برِ عظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کے مسلمان ترکوں کی حمایت میں نہ اُٹھ کھڑے ہوں۔ دوسری جانب سلطنتِ عثمانیہ کا دارالخلافہ استانبول انگریزوں کے قبضے میں تھا اور خلیفۃ المسلمین ان کی پناہ میں تھا۔ انگریز اور ان کے حلیف یہ چاہتے تھے کہ استانبول سے ترکوں کو نکال کر اسے ویٹیکن (Vitican) کی حیثیت دے دیں تاکہ یہ دوبارہ سیاسی مرکز نہ بن جائے۔ استانبول کو ویٹیکن کی حیثیت دینے سے ترک مجبوراً اپنا دارالحکومت ایشیائی حصے میں لے جائیں گے اس طرح یورپ سے ترک بیدخل ہو جائیں گے۔

مسلمانوں کی تشویش:

۲۶ جنوری ۱۹۱۹ء کو لکھنؤ میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کے شیخِ طریقت مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی صدارت میں ایک احتجاجی جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں مقررین نے خلیفۃ المسلمین محمد سادس کو اپنی اطاعت کا یقین دلایا اور یورپی اقوام

کو امورِ خلافت میں مداخلت نہ کرنے کا مشورہ دیا۔ مقررین نے برطانیہ اور اس کے حلیفوں پر یہ واضح کر دیا کہ استانبول اور حرمین شریفین خلیفۃ المسلمین کے زیرِ نگرانی رہنے چاہیں۔ اگر اتحادیوں نے ایسا کوئی معاہدہ ترکی پر تھوپنا چاہا جس میں یہ شرائط نہ ہوں گی تو مسلمانانِ برِ عظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش ایسے معاہدے کو تسلیم نہیں کریں گے۔

دوسری جانب برطانیہ میں مقیم مسلمانوں نے ۱۷ جولائی ۱۹۱۹ء کو ایک عرضداشت برطانوی حکام کی خدمت میں پیش کی جس میں امن کانفرنس میں ترکی کے احساسات کا خیال رکھنے کی التماس کی گئی تھی۔

لوگوں کو جب اس بات کا کامل یقین ہو گیا کہ ان کے بیانات اور مطالبات کا برطانوی حکام پر مطلقاً کوئی اثر نہیں ہو رہا اور وہ فتح کے نشے میں سرشار ہو کر اپنی پسند کی شرائط ترکی پر تھوپنا چاہتے ہیں تو انہوں نے خلافت کے تحفظ کی غرض سے ایک جماعت قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس جماعت کے قیام کی ضرورت اس لئے بھی محسوس کی گئی کہ مسلم لیگ خالصتاً ایک سیاسی جماعت تھی جو مذہبی معاملات میں مداخلت سے احتراز برتتی تھی۔ اس لئے ۲۰ مئی ۱۹۱۹ء کو بمبئی میں پندرہ ہزار مسلمانوں کے نمائندہ اجتماع میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے "خلافت کمیٹی" کی بنیاد رکھی۔ انہی ایام میں ہی جمعیت العلماء ہند کا قیام عمل میں آیا۔

گاندھی جی کی تحریکِ خلافت میں شمولیت:

کانگرس کے رہنما موہن داس کرم چند گاندھی بھی اپنے مفاد کی خاطر مسلمانوں کے ساتھ اشتراکِ عمل پر آمادہ ہو گئے اور غیر مسلم ہونے کے باوجود گاندھی جی نے تحریکِ خلافت میں مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ ان کے ایسے ہی اقدامات کی بنا پر ترکی کے ایک اسکالر ڈاکٹر م کمال اوکے نے ان کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ گاندھی ایک ایسا معمّہ ہے جسے آج تک حل نہیں کیا گیا حالانکہ اس پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں اور متعدد فلمیں تیار ہوئی ہیں جن کو آسکر ایوارڈ بھی مل چکے ہیں۔

مسلم لیگ کی قرارداد:

۲۲ ستمبر ۱۹۱۹ء کو لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک ہنگامی اجلاس

منعقد ہوا جس میں ملک بھر سے پانچ ہزار مندوبین نے شرکت کی ۔ اس اجلاس کے مقررین نے انگریزوں پر یہ واضح کیا کہ خلیفہ کی روحانی اور اخلاقی حیثیت اور مادی و جسمانی طاقت اور سیاسی اقتدار کے بغیر خلافت کا تصور بے معنی ہے ۔ اسی جلسے میں چند قرار دادیں بھی منظور کی گئیں جو انگریز حکام کو بھجوائی گئیں ۔

۱: مسلمانوں کے مقدس مقامات کا تقدس برقرار رکھا جائے ۔

۲: اناطولیہ (وسطی ترکی) اور ترکی کا یورپی حصہ ترکوں کے قبضے میں رہنے دیا جائے ۔

۳: یونانی فوج فی الفور سمرنا (موجودہ ازمیر) خالی کر دے ۔

۴: ترکوں کے ساتھ صلح سے متعلق مسلمانوں کے خدشات برطانوی حکومت تک پہنچائے جائیں ۔

۵: ۱۷ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو خلیفہ کی عزت و وقار کا دن منایا جائے ۔

۶: بمبئی میں واقع خلافت کمیٹی کو مرکزی حیثیت دی جائے اور پورے ملک میں اس کی شاخیں قائم کی جائیں ۔

۷: اجلاس میں کی جانے والی تقریروں اور فیصلوں کی رپورٹ مرتب کر کے حکومت کو بھجوائی جائے ۔

اجلاس کے اختتام پر خلافت کمیٹی کی طرف سے خلیفہ محمد سادس کو ایک خصوصی پیغام بھجوایا گیا جس میں اسے مسلمانانِ برعظیم کی طرف سے بھرپور حمایت اور مکمل وفاداری کا یقین دلایا گیا ۔

برطانوی حکومت سے اپیل:

۱۲ دسمبر ۱۹۱۹ء کو خلافت کمیٹی نے وزیراعظم برطانیہ کو ایک مراسلہ بھیجی جس میں ان سے یہ التماس کی کہ ملکِ معظم کی حکومت ترکی کے بارے میں زیادہ مفاہمانہ رویہ اختیار کرے ۔

۳۱ دسمبر ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں خلافت کمیٹی کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا جس میں پنجاب کے مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔ اس اجلاس کی صدارت مولانا شوکت علی نے کی ۔ اس جلسے میں گاندھی جی، قائداعظم اور حکیم محمد اجمل

خاں بھی شریک ہوئے ۔ اجلاس کے خاتمے پر ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں برطانیہ اور امریکہ میں ایسے وفود بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا جو وہاں کے حکام اور صحافیوں کو مسئلہ خلافت کی اہمیت سے آگاہ کریں ۔ اسی جلسے میں ترکی کی مکمل حمایت کا بھی اعلان کیا گیا

۵ جنوری ۱۹۲۰ء کو برطانیہ میں مقیم مسلمانوں نے "اسلامی جماعت" کے زیر اہتمام برطانیہ کے وزیراعظم لائڈ جارج کو الٹی میٹم دیا کہ ترکی کو جنگ سے پہلے کی حالت پر بحال کیا جائے اور خلافت کا منصب عثمانیوں کے ہاتھوں میں ہی رہنے دیا جائے۔ انہوں نے حرمین شریفین حسین شریفِ مکہ کی تحویل میں رکھنے کی بھی شدید مذمت کی ۔

خلافت وفد:

امرتسر میں منعقد ہونے والی کانفرنس کے فیصلے کے مطابق برطانیہ بھیجنے کے لئے مولانا سید سلیمان ندوی (م ۱۹۵۳ء) مشہور صحافی سید حسین (م ۱۹۴۹ء) حسن محمد حیات (م ۱۹۵۵ء) اور مولانا محمد علی (م ۱۹۳۱ء) پر مشتمل ایک وفد تشکیل دیا گیا ۔ اس وفد نے ۱۹ جنوری ۱۹۲۰ء کو لندن میں برطانوی حکام سے مل کر انہیں مسئلہ خلافت کے مختلف پہلوؤں سے آگاہ کیا ۔ وفد نے برطانوی حکام کو بتایا کہ انہیں مسلمانوں کے جذبات کا صحیح علم نہیں ہے ۔ اس لئے خلیفہ اور خلافت پر ہاتھ نہ ڈالا جائے اور سلطنتِ عثمانیہ کی حیثیت تبدیل نہ کی جائے ۔

۲ مارچ ۱۹۲۰ء کو خلافت وفد نے وزیر امورِ ہند مانٹیگو (م ۱۹۲۴ء) کے نمائندے فشر سے ملاقات کی ۔ اس موقع پر مولانا محمد علی نے فشر سے کہا کہ وہ برطانوی حکام تک ان کی بات پہنچا دے اور ان سے کہے کہ وہ خارجہ پالیسی مرتب کرتے وقت مسلمانانِ پاک و ہند اور بنگلہ دیش کے جذبات کا خیال رکھیں اور یونانیوں اور آرمینیوں کے ترکوں کے خلاف زہریلے پراپیگنڈے سے متاثر نہ ہوں ۔ مولانا محمد علی نے یہ بات بھی فشر کے گوش گزار کی کہ خلیفہ کو برقرار رکھنے کے لئے یہ بھی اشد ضروری ہے کہ اس کے پاس اختیارات ہوں ۔ ہمیں برطانوی حکومت سے اس بات کا گلہ ہے کہ اس معاملے میں ہمیں اعتماد میں لینے کی کوشش نہیں کی گئی ۔ اس موقع پر سید حسین نے خلافت کانفرنس کے فیصلوں سے فشر کو آگاہ کیا ۔

فشر نے وفد سے ملاقات کے دوران برطانوی حکومت کے استحکام اور جنگِ عظیم اول میں مسلمانوں کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے جذبات کا احترام کرنے کی یقین دہانی کرائی۔ اس نے وفد کو بتایا کہ ان دنوں وزیراعظم بے حد مصروف ہے اس لئے اس کے ساتھ ملاقات ممکن نہیں۔ وفد کے ارکان نے فشر سے کہا کہ وزیراعظم یونانی اور ارمنی راہنماؤں کے ساتھ کئی بار ملاقات کر چکا ہے کیا وہ ہمارے لئے وقت نہیں نکال سکتا؟ اس پر فشر نے وزیراعظم کے ساتھ ان کی ملاقات کا انتظام کیا لیکن عندالملاقات اس نے بڑی سرد مہری کا مظاہرہ کیا۔ وزیر امورِ ہند مانٹیگو مسلمانوں کے جذبات سے بخوبی آگاہ تھا۔ اس نے مسئلہ خلافت میں مسلمانوں کا موقف تسلیم کر لیا۔ یہ بات برِعظیم کے سابق وائسرائے لارڈ کرزن (م ۱۹۲۵ء) کو پسند نہ آئی اور اس نے وزیراعظم لائڈ جارج (م ۱۹۴۵ء) کو اپنا ہمنوا بنا کر مانٹیگو کے خلاف کر دیا۔ لائڈ جارج نے مانٹیگو کو اپنے دفتر میں طلب کر کے اس سے استعفیٰ لکھوا لیا۔ اس کے بعد مانٹیگو نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور دو سال بعد صرف ۴۵ سال کی عمر میں اس کا انتقال ہو گیا۔

برطانیہ کا دورہ مکمل کرنے کے بعد وفد نے پیرس میں فرانس کے وزیراعظم سے ملاقات کی۔ اس نے وفد کو اپنے جذبات پر قابو پانے کا مشورہ دیا۔ فرانس سے چل کر وفد روم پہنچا اور وہاں اٹلی کے وزیراعظم سے ملاقات کر کے اپنا موقف دہرایا۔ اٹلی سے یہ حضرات سوئٹزر لینڈ گئے۔ اس تمام سفر میں برطانوی جاسوس سائے کی طرح ان کے ساتھ ساتھ رہے۔ یہ وفد ترکی بھی جانا چاہتا تھا لیکن برطانوی حکومت نے انہیں وہاں جانے کی اجازت نہ دی۔ اسی طرح کی ایک کوشش سر آغا خاں اور سر امیر علی نے بھی کی لیکن ترکی کی حکومت نے انہیں انگریزوں کے ایجنٹ سمجھ کر منہ نہ لگایا۔

ملک گیر ہڑتال:

اسی دوران میں کلکتہ میں ۲۸ فروری ۱۹۲۰ء کو خلافت کانفرنس کا ایک جلسہ مولانا ابو الکلام آزاد کی صدارت میں منعقد ہوا۔ انہی ایام میں کنٹربری کے لاٹ پادری نے خلیفہ اور خلافت کے بارے میں حقارت آمیز بیان جاری کیا تھا اس جلسے میں اس کے

معاندانہ رویے کی سخت مذمت کی گئی اور مسلمانوں نے خلیفہ کے ساتھ وفاداری کا عہد کیا۔ اب تک خلافت کے تحفظ کے لئے آئینی جدوجہد ناکام رہی تھی۔ اس لئے ۱۹ مارچ ۱۹۲۰ء کو ملک گیر ہڑتال کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کے بعد انگریزوں کے خلاف سرگرمیاں تیز تر ہو گئیں اور لوگوں نے خلافت کو بچانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔

معاہدہ سیورے:

مسلمانوں کے خدشات بے جا نہ تھے۔ جب برطانیہ اور اس کے اتحادیوں نے ۱۰ اگست ۱۹۲۰ء کو سیورے کے مقام پر ترکوں کو صلح کے معاہدے پر دستخط کرنے پر مجبور کیا تو پورے عالمِ اسلام میں اس پر غم و غصے کا اظہار کیا گیا۔

اس معاہدے کا متن درج ذیل ہے۔

جرمنی اور ترکی کی شکست کے بعد اتحادیوں نے ان کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لئے سیورے کے مقام پر نام نہاد امن کانفرنس منعقد کی۔ اس کانفرنس میں سامراجی قوتوں نے ترکی کو اپنے من پسند فیصلے قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس "امن" کانفرنس میں مندرجہ ذیل فیصلے ہوئے۔

۱۔ ترکی کو تمام عرب ممالک سے محروم کر دیا گیا۔

الف: حجاز کو خود مختار ملک تسلیم کر لیا گیا۔

ب: ترکی نے شام، فلسطین اور عراق سے اپنی سیادت ختم کرنے کا اعلان کیا۔ اس وقت یہ بھی طے پایا کہ ان تینوں ملکوں کے مستقبل کا فیصلہ اتحادی کریں گے۔

۲۔ یورپ میں ترکی کا علاقہ مشرقی تھریس یونان میں ضم کر دیا گیا۔ اس طرح یونان کی سرحد سے ترکی کا دارالحکومت استنبول صرف بیس میل رہ گیا۔ (جو ہر وقت خطرے کی زد میں تھا۔)

بحیرۂ ایجئین میں واقع متعدد جزیرے یونان کے حوالے کر دیئے گئے۔ جزیرہ روڈس اٹلی کے سپرد کر دیا گیا (اس سے قبل یہ جزائر عثمانی سلطنت میں شامل تھے)۔

۳۔ ترکی کو مجبور کیا گیا کہ وہ آرمینیا کو ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے تسلیم کر لے اس موقع پر یہ بھی طے پایا کہ امریکہ کا صدر ولسن ترکی اور آرمینیا کی سرحد متعین کرنے

میں ثالث کے فرائض انجام دے گا۔

۵: دریائے فرات کے مشرق میں بسنے والے کردوں کو ترکی داخلی خود مختاری دے گا۔ اس ضمن میں برطانیہ، فرانس اور اٹلی کے نمائندوں پر مشتمل ایک کمیشن جو سفارشات مرتب کرے گا، ترکی اس پر عمل پیرا ہوگا۔

۶: استانبول ترکی کے قبضے میں رہے گا۔ البتہ بحیرۂ اسود کو بحیرۂ روم سے ملانے والے سمندر، بحیرۂ مارمورا، باسفورس اور درۂ دانیال بین الاقوامی کنٹرول میں رہیں گے اور اسے غیر فوجی علاقہ قرار دیا جائے گا۔

۷: اتحادیوں نے ترکی پر مندرجہ ذیل پابندیاں بھی عائد کیں۔

الف: ترکی پچاس ہزار سے زائد فوج نہیں رکھ سکے گا۔

ب: آئندہ ترکوں سے لازمی فوجی خدمت نہیں لی جائے گی۔

ج: ترکی کی بحریہ میں ایک مقررہ تعداد سے زائد جہاز شامل نہیں کئے جائیں گے۔

د: ترکی کے فوجی حکام فوجی امور میں اتحادیوں کے مشورے پر عمل کیا کریں گے۔

ہ: اتحادیوں کا ایک کمیشن ان امور کی نگرانی کیا کرے گا۔

و: برطانیہ، فرانس اور اٹلی مل کر ترکی کے مالی امور کی نگرانی کریں گے۔ یہی ممالک ترکی کا بجٹ تیار کریں گے۔ قرضوں کی واپسی ان کی نگرانی میں رہے گی۔ عوامی قرضے یہی تینوں ملک جاری کریں گے۔ کسٹم اور ٹیکسوں کی وصولی کا انتظام بھی اتحادیوں کے ہاتھوں میں ہوگا۔

ز: غیر ملکیوں کی مراعات برقرار رہیں گی۔

ح: ترکی میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔ آرمینیوں، کردوں، کلدانیوں، یونانیوں اور عیسائیوں کے مختلف فرقوں کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جائے گا۔

ان ذلت آمیز شرائط کو منوانے کے بعد برطانیہ، فرانس اور اٹلی نے ترکی کو تین منطقوں میں تقسیم کرکے اپنے اپنے زیر اثر علاقے میں تسلط قائم کر لیا۔ مشرقِ وسطیٰ کے سیاسی امور کے ماہر LENCZOWSKI کے خیال کے مطابق ترکی ایک طرح سے اتحادیوں کے زیر انتداب آگیا۔

یونان کی جارحیت:

ادھر سیورے میں ترکی کو یہ معاہدہ قبول کرنے پر مجبور کیا جارہا تھا ادھر اتحادیوں کی شہ پر یونان نے ترکی کے مغربی ساحل پر اپنی فوج اتار دی اور سمرنا (موجودہ ازمیر) پر قبضہ کر لیا۔ برِعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش میں یونان کے اس اقدام پر غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ شاعروں نے اشعار کے ذریعے خون مسلم کو گرما دیا۔ سمرنا کے معصوم ترک بچوں پر یونانیوں کے ظلم کو پنجابی شاعروں نے اپنی شاعری کا موضوع بنا کر پنجاب کے طول و عرض میں اتحادیوں اور یونانیوں کے خلاف آگ بھڑکا دی۔

معاہدۂ سیورے پر برِعظیم میں ردِعمل:

معاہدہ سیورے میں اتحادیوں کا انتقامی جذبہ کار فرما تھا۔ اس لئے جب اس معاہدے کی تفصیلات برِعظیم کے اخبارات میں شائع ہوئیں تو مسلمانوں کو بڑی مایوسی ہوئی۔ انگریزوں نے فتح کے نشے میں سرشار ہو کر ان تمام وعدوں کو بالائے طاق رکھ دیا جو وہ جنگ کے دوران میں مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لئے کرتے رہے تھے۔ اس موقع پر مسلم لیگ کے رہنماؤں نے برطانیہ کے وزیراعظم لائڈ جارج کے نام ایک احتجاجی تار ارسال کیا۔ جس میں اس معاہدے کی شدید مذمت کی۔ مولانا شوکت علی نے وائسرائے ہند کے نام ایک درخواست ارسال کی جس میں اسے بتایا کہ اگر معاہدہ سیورے پر نظرثانی نہ کی گئی تو برطانوی حکومت کے خلاف عدمِ تعاون کی تحریک کو تیز تر کر دیا جائے گا۔ قائداعظم نے ۷ ستمبر ۱۹۲۰ء کو کلکتے میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمارا دہلی اور لندن کے برطانوی حکام پر سے اعتماد اٹھ گیا ہے۔

سول نافرمانی کا فیصلہ:

خلافت کمیٹی نے سول نافرمانی کا فیصلہ کیا۔ مولانا محمد علی نے الہ آباد میں خلافت کمیٹی کے اجلاس میں مسلمانوں سے یہ اپیل کی کہ وہ انگریزوں کی فوج میں بھرتی نہ ہوں اور جو مسلمان اپنے نام ریکروٹنگ افسروں کو دے چکے ہیں وہ اپنے نام واپس لے لیں۔ کیونکہ یہ ہو سکتا ہے کہ ان مسلمان سپاہیوں کو آئندہ برادر ملک ترکی کے خلاف لڑنے کے لئے بھیجا جائے۔ برطانوی حکومت نے محمد علی کے اس اقدام کو

ملکِ معظم جارج ہشتم کی حکومت کے خلاف بغاوت پر محمول کیا۔

عدمِ تعاون کا فیصلہ:

خلافت کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ ملک کے طول و عرض میں ہڑتالیں کی جائیں اور جلسوں اور جلوسوں کے ذریعے حکومت پر دباؤ ڈالا جائے۔ طلبہ سے یہ کہا گیا کہ وہ سرکاری سکول اور کالجوں میں جانا بند کر دیں۔ مزدوروں سے یہ اپیل کی گئی کہ وہ کارخانوں میں کام کرنا بند کر دیں۔ کلرکوں نے سرکاری دفاتر میں قلم چھوڑ ہڑتال کر دی اور زمینداروں نے غلہ اُگانا بند کر دیا۔ خلافت کمیٹی اور کانگرس کی اپیل پر لوگوں نے سرکاری اعزازات اور خطابات واپس کر دیئے۔ وکلاء نے عدالتوں میں مقدمات کی پیروی ترک کر دی۔ عوام نے انگریزی مال کا بائیکاٹ کر دیا اور انگریزی لباس سرِ عام نذرِ آتش کرکے آئندہ کھدر کا لباس پہننے کا وعدہ کیا۔ نجی تعلیمی اداروں نے سرکاری گرانٹ لینا بند کر دی۔ گاندھی جی نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بند کرانے کی بڑی کوشش کی لیکن وہ اس مقصد میں ناکام رہا۔ مولانا محمد علی نے علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی۔ حکیم محمد اجمل خان اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے جامعہ کی سرپرستی قبول کی۔ کچھ عرصے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ سے دہلی منتقل ہو گئی۔

نومبر ۱۹۲۰ء میں کونسلوں کے الیکشن ہوئے تو ان میں دو تہائی ووٹروں نے اپنا حق رائے دہی استعمال نہیں کیا۔ ان حالات میں برطانیہ نے پرنس آف ویلز کو برِعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کے دورے پر بھیجا تاکہ لوگ برطانیہ کے شاہی خانوادے سے اطاعت کا اظہار کریں۔ جس دن پرنس آف ویلز بمبئی کے ساحل پر اُترا اس روز کانگرس اور خلافت کمیٹی کی اپیل پر شہر میں مکمل ہڑتال کی گئی۔

۱۹۲۱ء میں کانگرس کے اجلاس منعقدہ احمد آباد میں سول نافرمانی کا فیصلہ کیا گیا۔ جمعیت العلماء ہند کے راہنماؤں نے اس موقع پر یہ اعلان کیا کہ جو شخص انگریزوں کی مادی امداد کرے گا وہ گنہگار اور عذاب کا مستحق ہو گا۔ ان حالات میں ملک کے طول و عرض میں انگریزوں کے خلاف نفرت عام ہو گئی۔ انگریزوں نے تیس ہزار افراد کو جیلوں میں بند کر دیا۔ تحریکِ خلافت کے زمانے میں قید و بند کا خوف لوگوں

کے دلوں سے نکل گیا اور وہ گرفتاری کو اپنے لئے باعثِ افتخار سمجھنے لگے۔

مقدمہ کراچی:

۱۹۲۱ء میں کراچی میں خلافت کانفرنس کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا جس میں سندھی مسلمانوں نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیا۔ مولانا محمد علی نے اس موقع پر مسلمانوں سے کہا کہ ان کے لئے فوج اور پولیس کی نوکری حرام ہے۔ وہ اس طرح کے خیالات کا اظہار پہلے بھی کر چکے تھے۔ حاضرینِ جلسہ نے ان کے خیالات کی پُرزور تائید کی۔

برطانوی حکومت نے اسے ملک معظم کے خلاف لوگوں کو بغاوت پر اکسانے پر محمول کرتے ہوئے اس اجلاس کے قائدین کو گرفتار کرکے خالق دینا ہال کراچی میں ایک خصوصی عدالت میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا حسین احمد مدنی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو (م ۱۹۶۳ء)، پیر غلام مجدد سرہندی، نثار احمد اور سوامی شنکر اچاریہ پر مقدمہ چلایا۔ ان دنوں تحریک عدمِ تعاون زوروں پر تھی اس لئے ان حضرات نے مقدمہ کی پیروی کرنے، وکیلوں سے مدد لینے یا اپنی صفائی پیش کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ مولانا محمد علی نے عدالت کے رُوبرو صرف اتنا کہا کہ وہ مسلمان ہیں اور ان کا دین ایک مسلمان کے ہاتھوں دوسرے مسلمان کے قتل کو جائز نہیں سمجھتا۔ اس لئے وہ یہ کہتے ہیں کہ مسلمان فوج اور پولیس میں بھرتی ہو کر اپنے ہم مذہبوں کا خون نہ بہائیں۔ یہ ان کے دین کا مسئلہ ہے اس کے لئے وہ تختۂ دار پر چڑھنے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔ عدالت نے اس مقدمہ کا فیصلہ سناتے ہوئے شنکر اچاریہ کو رہا کر دیا اور باقی "ملزمان" کو دو سال قید سخت کی سزا سنائی۔ اس موقع پر ایک شعر کا پہلا مصرع بہت مقبول ہوا۔

ہم تو جاتے ہیں دُو دُو برس کو

موپلا بغاوت:

جن دنوں ہندو مسلم اتحاد نقطۂ عروج پر پہنچ چکا تھا اور آزادی کی منزل سامنے نظر آرہی تھی تو بمبئی اور اس کے گرد و نواح کے علاقے میں موپلا مسلمانوں نے

حکومت کے خلاف بغاوت کر دی ۔ موپلا مخلوط نسل کے باشندے تھے ۔ ان کے والد عموماً عرب سے ساحل مالا بار پر آکر آباد ہوئے اور انہوں نے یہاں مقامی عورتوں سے شادی کر لی ۔ اس سے ایک نئی نسل پیدا ہوئی جو "موپلا" کہلائی ۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مقامی زبان میں موپلا کے معنی "دولہا بھائی" ہیں ۔ موپلے بڑے راسخ العقیدہ مسلمان تھے ۔ بمبئی کے قرب و جوار میں ان کی کافی آبادی تھی ۔ برطانوی حکومت نے موپلوں کو تحریکِ خلافت میں شامل ہونے سے رُوکنے کے لئے ان پر جلسوں اور جلوسوں میں شرکت کرنے پر پابندی لگا دی ۔ جب ان کے رہنماؤں نے جنوبی ہند کی طرف جانے کا قصد کیا تو حکومت نے انہیں گرفتار کر لیا ۔ موپلوں نے ایک جلسہ منعقد کر کے اپنے رہنماؤں کی رہائی کا مطالبہ کیا تو برطانوی حکومت نے جلیانوالہ باغ میں پیش آنے والے واقعہ کو دہرا دیا ۔ سپاہیوں کی اندھا دھند فائرنگ سے چار صد موپلے جان بحق تسلیم ہوئے ۔ اس وحشیانہ ظلم کے خلاف موپلوں نے برطانوی حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا ۔ انہوں نے مہاراشٹر کے علاقے میں ریلوے لائنیں اُکھاڑ دیں اور دہلی کا بمبئی کے ساتھ رابطہ ختم کر دیا ۔ بمبئی کے ذریعے ہی برطانوی ہند کے انگریز حکام کا لندن کے ساتھ رابطہ قائم رہتا تھا ۔ موپلوں نے ٹیلی گراف کے تار کاٹ دیے اور سرکاری تنصیبات کو بڑا نقصان پہنچایا ۔ مہاراشٹر ایک طرح سے میدان جنگ بن گیا ۔ انگریزوں نے ان کے خلاف سخت کاروائی کی ۔ ان کی فصلیں جلا ڈالیں ۔ انہیں مال گاڑیوں کے ڈبوں میں بند کر کے سانحہ بلیک ہول کا بدلہ لیا ۔ ان پر بم بھی برسائے گئے ۔ چار ماہ کی طویل جدوجہد کے بعد حکومت موپلوں کو زیر کرنے میں کامیاب ہوئی ۔

تحریکِ ہجرت:

جب تحریکِ خلافت عروج پر تھی تو چند عاقبت نا اندیش مفتیوں نے بشمول مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ داغ دیا ۔ ان مفتیوں نے کہا کہ ہندوستان اب دارالحرب بن گیا ہے ۔ لہٰذا مسلمانوں پر یہاں سے ہجرت فرض ہو گئی ہے ۔ ان مفتیوں نے مسلمانوں کو قریبی مسلم ملک افغانستان جانے کا مشورہ دیا ۔

ہندوؤں کی مذہبی جماعتیں ، ہندو مہا سبھا اور آریہ سماج تو پہلے ہی "ہندو ہندی اور ہندوستان" کا نعرہ لگا رہی تھیں ۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ مسلمان باہر سے آکر یہاں آباد ہوئے ہیں ۔ انہوں نے اگر یہاں رہنا ہے تو وہ ہندو بن کر رہیں یا ہندوستان چھوڑ دیں ۔ ہمارے عاقبت نا اندیش مفتیوں نے جوش میں آکر فتویٰ داغ دیا ۔ جس سے مسلمانوں کی بجائے ہندوؤں کو فائدہ پہنچا ۔

ہجرت کا فتویٰ صادر ہوتے ہی مسلمانوں نے اپنی جائیدادیں اَونے پَونے داموں ہندوؤں کے ہاتھ فروخت کر کے افغانستان کی راہ لی ۔ افغانستان ایک پس ماندہ اور غریب ملک تھا ۔ وہ اتنی بڑی تعداد میں مہاجرین کی کفالت نہیں کر سکتا تھا ۔ علاوہ ازیں ان مہاجرین کی بڑی تعداد نا خواندہ تھی جو افغانستان جا کر اس ملک کی ترقی میں ممد و معاون نہیں بن سکتی تھی ۔ ان حالات میں افغانستان نے اپنی سرحد بند کر دی ۔ غریب مہاجرین جو اپنی جائیدادیں کوڑیوں کے مول ہندوؤں کے ہاتھ فروخت کر کے گئے تھے ان کی پونجی جانے آنے میں صرف ہو گئی اور جب وہ واپس اپنے اوطان کو لوٹے تو وہ نانِ شبینہ کے لئے محتاج ہو چکے تھے ۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اٹھارہ ہزار مسلمانوں نے ہجرت کی تھی ۔

حکیم محمد موسیٰ امرتسری کا مشاہدہ:

میرے ایک علم دوست بزرگ حکیم محمد موسیٰ امرتسری مدظلہ العالی فرماتے ہیں کہ امرتسر میں دو تین ایسے بازار بھی تھے جہاں صرف ہندوؤں اور سکھوں کی ہی دکانیں تھیں ۔ ان بازاروں میں مسجدیں بھی تھیں جن پر قفل پڑے ہوئے تھے ۔ ایک رُوز حکیم صاحب نے اپنے والد محترم حکیم فقیر محمد چشتی مرحوم (م ۱۹۵۲ء) کی خدمت میں عرض کیا کہ ہندوؤں اور سکھوں کے بازاروں میں مسجدیں بنانے میں کیا حکمت تھی جبکہ وہاں نماز نہیں ہوتی اور مسجدیں مقفل پڑی ہیں ۔ اس پر چشتی صاحب نے فرمایا کہ پہلے ان بازاروں میں مسلمانوں کی دکانیں تھیں اور یہ مساجد آباد تھیں ۔ تحریکِ ہجرت کے دوران وہ مسلمان دکاندار اپنی دکانیں ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں فروخت کر کے افغانستان کی طرف ہجرت کر گئے ۔ تب سے یہ مسجدیں بے چراغ پڑی ہیں ۔

ہجرت کا فتویٰ سوچے سمجھے بغیر بڑی عجلت میں دیا گیا جس سے مسلمانوں کو بڑا نقصان پہنچا۔ یہ عجیب بات ہے کہ فتوے صادر کرنے والے مفتیوں کے سرخیل مولانا عبدالباری فرنگی محلی (م ۱۹۲۶ء) اور مولانا ابو الکلام آزاد (م ۱۹۵۸ء) نے خود ہجرت نہیں کی۔ جب لوگوں نے ان سے اس بارے میں استفسار کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ اگر وہ بھی ہجرت کر جاتے تو یہاں کے لوگوں کو ہجرت پر اور کون آمادہ کرتا۔ اس لئے ان کا یہاں رہنا ناگزیر تھا۔ سبحان اللہ کیا منطق ہے۔

آزادیٔ کامل کی قرارداد:

۱۹۲۱ء کے کانگرس کے اجلاس منعقدہ احمد آباد میں سول نافرمانی کا فیصلہ کیا گیا۔ اس موقع پر مولانا حسرت موہانی (م ۱۹۵۱ء) نے آزادیٔ کامل کی قرارداد پیش کرنا چاہی تو گاندھی جی اس پر رضا مند نہ ہوئے۔ وہ آزادیٔ کامل کی بجائے ڈومینین سٹیٹس کے حق میں تھے۔ گاندھی جی نے مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے کہا کہ وہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کرکے مولانا حسرت موہانی کو یہ قرارداد پیش کرنے سے باز رکھیں۔ مولانا حسرت موہانی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے والدِ بزرگوار مولانا عبدالوہاب فرنگی محلی (م ۱۹۰۳ء) سے بیعت تھے۔ اس لئے گاندھی جی خوب سمجھتے تھے کہ ان کے مرشد زادے کے ذریعے ان پر دباؤ ڈالنا چاہیئے۔ لیکن مولانا حسرت موہانی آزادیٔ کامل سے کم کوئی چیز قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ اس لئے گاندھی جی کے ساتھ ان کا اختلاف ہو گیا اور گاندھی جی نے کانگرس کے اجلاس میں ان کی تجویز مسترد کروا دی۔ یہیں سے ہندو مسلم اتحاد میں رخنہ پیدا ہوا ورنہ تحریکِ خلافت میں ہندو مسلم اس قدر قریب آگئے تھے کہ مسلمان رُسوائے عالم آریہ سماجی رہنما سوامی شردھانند کو جامع مسجد دہلی میں لے گئے اور اس نے مسجد کے تالاب سے قریب ایک چبوترے پر کھڑے ہو کر مسلمانوں سے خطاب کیا۔ یہ بالکل غلط ہے کہ اسے منبر پر بٹھایا گیا۔ منبر مسجد کے دالان کے اندر ہے اور سنگِ مرمر کا یہ چبوترہ آج بھی صحن مسجد میں وضو کے تالاب سے قریب موجود ہے۔ اسی زمانے میں بعض قوم پرست اور کانگرسی مسلمانوں کی زبان سے یہ بھی سننے میں آیا کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم نہ ہو گئی ہوتی تو (خاکم بدہن) گاندھی جی

بن کر آتا۔

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست

چوری چورا کا سانحہ:

جس زمانے میں تحریک سول نافرمانی، عدم تعاون اور ترکِ موالات عین عروج پر تھیں اور انگریزی سامراج جھکنے کو تیار تھا تو گاندھی جی اپنے رفقاء سمیت تحریکِ خلافت سے الگ ہوگئے۔ انہی ایام میں ایک سانحہ پیش آیا جسے گاندھی جی نے بہانہ بنا کر تحریک سے علیحدگی اختیار کر لی۔

گورکھپور کے نواح میں چوری چورا نامی ایک قصبہ ہے۔ وہاں مشتعل ہجوم نے تھانے کو آگ لگا دی اور ۲۲ سپاہی جل کر مر گئے۔ گاندھی جی نے کہا کہ وہ عدم تشدد اور اہنسا کے علمبردار ہیں۔ اب تحریک میں تشدد کا عنصر غالب آنے لگا ہے لہذا وہ تحریک سے علیحدگی اختیار کرتے ہیں۔ گاندھی جی کے اس فیصلے پر عوام کا ردِ عمل اچھا نہ تھا۔ اس کے باوجود کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے ۱۲ فروری ۱۹۲۲ء کو ان کے فیصلے کی توثیق کر دی۔ ہندوؤں کے اس طرح تحریکِ خلافت سے الگ ہونے سے ہندو مسلم اتحاد پارہ پارہ ہو گیا اور تحریکِ خلافت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔

ترکی میں خلافت کا خاتمہ:

اُدھر ترکی میں خلیفہ وحید الدین المعروف بہ سلطان محمد سادس نے مصطفیٰ کمال اور ان کے ترقی پسند ساتھیوں کا ساتھ نہ دیا۔ ترقی پسندوں نے وسطی ترکی کے مشہور شہر انقرہ (سابقہ نام انگورہ) کو ترکی کا نیا دارالحکومت قرار دیا۔ خلیفہ کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ انگریزوں کا پٹھو ہے اور انہی کے سہارے وہ استانبول میں اپنا اثر و رسوخ برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ اس کے معاندانہ رویے کے پیش نظر انقرہ کی گرینڈ نیشنل اسمبلی نے ۲۰ جنوری ۱۹۲۱ء کو ایک بل پاس کیا جس کی رُو سے خلیفہ کی بجائے ترک قوم کو حاکمِ اعلیٰ تسلیم کیا گیا۔

یکم نومبر ۱۹۲۲ء کو اسی اسمبلی نے ایک اور بل پاس کیا۔ اس بل میں یہ کہا گیا کہ ۱۶ مارچ ۱۹۲۰ء سے شخصی حکومت ختم ہو چکی ہے یعنی خلیفہ کی حکومت قصۂ

پارینہ بن کر رہ گئی ہے) اور اب خلافت گرینڈ نیشنل اسمبلی کے پاس ہے۔ اسی بل کی منظوری سے خلیفہ کی سیاسی حیثیت ختم ہو گئی اور وہ پوپ کی طرح ایک مذہبی راہنما بن گیا۔ اس بل کی منظوری کے بعد خلیفہ محمد سادس چپکے سے ایک برطانوی جہاز میں سوار ہو کر ۱۷ نومبر ۱۹۲۲ء کو مالٹا روانہ ہو گیا۔ اس کے ترکی سے یوں فرار ہونے کے بعد ۱۸ نومبر ۱۹۲۲ء کو اسمبلی نے اسے خلافت سے معزول کر کے اس کے چچا زاد عبدالمجید خان کو خلیفہ مقرر کر دیا۔ وہ صرف نام کا خلیفہ تھا اور اس کے پاس مطلق کوئی اختیار نہ تھا۔

۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو گرینڈ نیشنل اسمبلی نے ایک بل پاس کر کے خلافت ختم کر دی اور خلیفہ کو اس کے منصب سے معزول کر کے اگلے روز اس کے اہلِ خانہ سمیت ٹرین میں سوار کر کے یورپ روانہ کر دیا۔

تحریکِ خلافت کا خاتمہ:

جب ترکی میں ہی خلافت ختم ہو گئی تو برِ عظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش میں تحریکِ خلافت جاری رکھنے کا جواز ہی ختم ہو گیا۔ تحریکِ خلافت کے راہنماؤں نے اتاترک کو تار بھیجے کہ وہ خود ہی منصبِ خلافت سنبھال لے۔ اس طرح سے یہ منصب موجود رہے گا اور مسلمانوں کو اتاترک کے خلیفہ بننے سے خوشی ہو گی۔

مولانا محمد علی جوہر نے تحریک چلانے کے لئے جو چندہ جمع کیا تھا وہ ترکی پارلیمنٹ کے ایک با اثر رکن رائج بے کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ وہ اتاترک سے کہیں کہ ان کی درخواست قبول کر لے۔ رائج بے نے ترکی جا کر ان کا پیغام اتاترک کو پہنچایا تو وہ سخت ناراض ہوا۔ اس نے رائج بے سے کہا کہ خلیفہ محمد سادس کا رویہ دیکھنے کے بعد اسے خلافت کے ذکر سے ہی کوفت ہوتی ہے۔

۱۹۲۶ء میں ۱۳ مئی سے لے کر ۱۹ مئی تک جامعہ آزہر مصر میں احیائے خلافت کے موضوع پر ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں مسلم ممالک سے آئے ہوئے مندوبین نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں احیاء خلافت کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس نے منفی رپورٹ پیش کی۔ اس طرح احیائے خلافت کی ایک اور کوشش ناکام ہو گئی۔

تحریکِ خلافت کے اثرات:

برِعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش میں تحریکِ خلافت چلانے سے خلافت تو نہ بچ سکی لیکن یہ تحریک مسلمانوں میں ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا کر گئی۔ وہ بھولے بھالے عوام جو باوردی سپاہی کو دیکھ کر گرفتاری کے خوف سے چھپ جایا کرتے تھے اب وہ بڑے عزم و استقلال کے ساتھ خود کو گرفتاری کے لئے پیش کرنے لگے۔

برِعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ علماء اپنے حجروں اور مدرسوں سے نکل کر میدان سیاست میں آئے۔ اسی طرح مولانا محمد علی جوہر طلبہ کو سیاست میں کھینچ لائے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے اس دن کو بڑا ہی منحوس قرار دیا ہے جس دن طلبہ نے سیاست میں دخل دینا شروع کیا۔

تحریکِ خلافت سے مسلمان کوئی سیاسی فائدہ حاصل نہ کر سکے البتہ گاندھی جی مسلمانوں کے ساتھ مل کر پورے ملک میں مشہور ہو گئے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر مولانا علی اور مولانا شوکت علی گاندھی جی کے ساتھ لے کر دوروں پر نہ نکلتے تو انہیں اس ملک میں کوئی نہ جانتا۔

مولانا احمد رضا خان کی دانشمندی:

تحریکِ ہجرت کے دوران میں ہجرت کا فتویٰ بڑا نامعقول تھا۔ ہندو تو یہی چاہتے تھے کہ مسلمان اس ملک کو ہندوؤں کے حوالے کر کے عرب چلے جائیں۔ میں نجا پکا دیو بندی ہونے کے باوجود کھلے دل کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ اس موقع پر مولانا احمد رضا خان نے بڑی سمجھ بوجھ کا مظاہرہ کیا اور مسلمانوں کو ہجرت اور عدم تعاون سے باز رکھا۔ انہوں نے حاکم علی پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور کے استفسار پر بڑے واشگاف الفاظ میں ان کے خط کے جواب میں تحریر فرمایا تھا کہ ترکِ موالات اور عدم تعاون کے باوجود انگریزوں سے مدارس کے لئے سرکاری گرانٹ لینے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ انگریز یہ رقم انگلستان سے لا کر ہمارے سکولوں اور کالجوں کو نہیں دیتے بلکہ ہم سے ہی وصول کردہ ٹیکسوں میں سے گرانٹ دیتے ہیں لہذا یہ ہماری ہی رقم ہے، جو ہمیں دی جا رہی ہے۔ یہ ان کا ہم پر کوئی احسان نہیں ہے۔ یہ ہمارا حق ہے جو ہمیں مل رہا ہے۔

تحریکِ خلافت کے خاتمے کے بعد اس تحرک سے وابستہ رہنما، مجلس احرار اسلام، جمعیت العلماء ہند اور مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ جس سے ان جماعتوں کو تقویت پہنچی۔

باب (21)

ہندوؤں کی جارحانہ تحریکیں

گزشتہ صفحات میں ہم یہ بتا چکے ہیں کہ جب تحریکِ خلافت انتہائی عروج پر تھی اور ہندو مسلم اتحاد کی وجہ سے برِعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش میں برطانیہ کا اقتدار خطرے میں پڑ چکا تھا تو ۴ فروری ۱۹۲۲ء کو "چوری چورا" کے مقام پر مظاہرین نے ایک تھانے کو آگ لگا دی جس کے نتیجے میں ۲۲ سپاہی جل مرے۔ اس موقع پر گاندھی جی نے یہ اعلان کیا کہ تحریک میں تشدد کا عنصر شامل ہو گیا ہے اور وہ عدمِ تشدد اور اہنسا کے حامی ہیں اس لئے وہ تحریک سے علیحدہ ہو رہے ہیں۔ ۲ فروری ۱۹۲۲ء کو کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے گاندھی جی کے فیصلے کی توثیق کر دی اور کانگرس تحریکِ خلافت سے الگ ہو گئی۔ یہیں سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے راستے الگ ہو گئے۔

یہ عجیب منطق ہے کہ کانگرس اور گاندھی جی عدمِ تشدد کی حمایت میں تحریکِ خلافت سے الگ ہوئے تھے حالانکہ "چوری چورا" کے سانحہ سے گیارہ سال پہلے تک کانگرس نے تقسیمِ بنگال منسوخ کرانے کی غرض سے تشدد ہی کا راستہ اختیار کیا تھا اس مقصد کے لئے کانگرس تشدد اور لاقانونیت کو جائز سمجھتی تھی کیونکہ کانگرس کی ایسی کارروائیوں سے ہندوؤں کو فائدہ پہنچتا تھا۔ تحریکِ خلافت سے چونکہ مسلمانوں کو فائدہ پہنچ رہا تھا اس لئے گاندھی اور کانگرس تشدد کو ناپسند کرتے تھے۔ مشہور ترک اسکالر سیم کمال اُوکے نے کیا خوب کہا ہے کہ گاندھی ایک ایسا معمّہ ہے جو ہنوز حل نہیں ہوا۔ قائداعظم نے کیا خوب کہا: گاندھی کا مقصد وہ نہیں ہوتا جو وہ زبان سے کہتے ہیں۔

مسلم کش فسادات:

تحریکِ خلافت سے علیحدگی کے بعد ہندوؤں نے مسلم کش فسادات شروع کر دیئے۔ ۱۹۲۲ء میں انہوں نے عاشورۂ محرم کے موقع پر ملتان میں فساد برپا کر کے

بہت سے بے گناہ افراد قتل کر دیئے۔ اس کے بعد فسادات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا اور ہندوؤں نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت دہلی، الہ آباد، ناگپور، لکھنؤ، جبل پور گلبرگہ، شاہجہان پور اور کوہاٹ میں فتنہ و فساد کو ہوا دی۔ پھر ان فسادات کی صدائے بازگشت بنگال اور بہار میں سُنی گئی۔ وائسرائے ہند لارڈ اروِن (م ۱۹۵۹ء) نے ایک بیان میں یہ تسلیم کیا کہ ان فسادات میں ۲۵۰ افراد جاں بحق اور ۲۵۰۰ زخمی ہوئے۔ مشہور اچھوت رہنما ڈاکٹر بھیم راؤ رام جی امبیدکر (م ۱۹۵۶ء) نے ان فسادات کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین خانہ جنگی قرار دیا۔

فسادات کی وجوہات:

بیشتر مقامات پر ہندوؤں نے شرارتاً مسجدوں سے قریب مندر تعمیر کر لئے تھے۔ مساجد میں نماز باجماعت کے اوقات مقرر ہیں۔ جبکہ ہندوؤں کے ہاں ایسا کوئی تصور نہیں ہے۔ جونہی نماز باجماعت شروع ہوتی تو ہندو مندروں میں گھنٹیاں اور سنکھ بجا کر اپنے خوابیدہ معبودوں کو "بیدار" کرنا شروع کر دیتے۔ اس سے مسلمانوں کی نماز میں خلل پڑتا اور ان کی توجہ ہٹ جاتی۔ اسی طرح جب ہندو بارات لے کر نکلتے تو راستے میں مساجد کے سامنے کھڑے ہو کر پٹاخے چھوڑتے اور باجے بجاتے۔ جب مسلمان ان کی اس نازیبا حرکت پر انہیں ٹوکتے تو ہندو فساد شروع کر دیتے۔

ہندو شوراتری، دسہرا، دیوالی، رکھشا بندھن، ہولی، لوہڑی، جنم اشٹمی، درگا پُوجا اور رام نومی جیسے تہوار بڑی دُھوم دھام سے مناتے اور دیوالی کے موقع پر مسلمانوں کے مکانات پر بھی دیپ مالا کرتے۔ ہولی کے تہوار کے موقع پر مسلمانوں پر رنگ کے علاوہ کیچڑ اور گوبر پھینکتے جس سے مسلمانوں میں اشتعال پیدا ہوتا۔ بال گنگا دھر تلک نے گنیش پُوجا کا تہوار بڑی دُھوم سے شروع کرایا جس میں مسلمانوں کے خلاف سوقیانہ نعرے لگائے جاتے۔ شیواجی اور رانا پرتاپ جیسے مغل حکومت کے باغیوں کو قومی ہیرو کا درجہ دے کر ان کے مجسمے اہم شاہراہوں پر نصب کئے گئے۔ ہندو جب رام لیلا کا جلوس لے کر نکلتے تو راستے میں اگر کسی مسجد سے اذان کی آواز سنائی دیتی تو وہیں جلوس رُوک کر مسلمانوں کی املاک نذرِ آتش کرنے لگتے بقرعید کے موقع پر ذبیحۂ گاؤ کا

بہانہ بنا کر فساد برپا کر دیتے۔ اگر کسی مسلمان کے ہاتھ سے کوئی بندر مر جاتا تو ہندو غنڈے مسلمانوں پر ہلّہ بول دیتے۔ محرّم کے موقع پر ہندو مسلم فساد ہونا ضروری تھا۔ اگر تعزیہ گذرانے کے لئے راستے میں کسی پیپل کو تراشنا پڑتا تو ہندو مشتعل ہو جاتے۔ ڈاکٹر حسن ریاض (م ۱۹۷۲ء) نے کیا خوب لکھا ہے:

جب لڑنا ہی ہو تو اس کے لئے ہزار بہانے

اس وقت ہندو غنڈوں نے مختلف شہروں میں جتنے فسادات برپا کئے تھے ان میں کوہاٹ کا فساد بڑا خونریز تھا۔ گاندھی جی نے حسبِ عادت مسلمانوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ مولانا شوکت علی نے یہ الزام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس موقع پر ہندوؤں کے اخبارات نے مسلمانوں اور خاص طور پر مولانا شوکت علی کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا جس سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں کشیدگی بڑھ گئی۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور مسلم لیگ کے رہنماؤں کا زُور توڑنے کے لئے کانگرس نے ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر سید محمود (م ۱۹۷۱ء) آصف علی بیرسٹر (م ۱۹۵۳ء) رفیع احمد قدوائی (م ۱۹۵۴ء) اور عبدالغفار خاں (م ۱۹۸۸ء) جیسے "قوم پرستوں" کو آگے بڑھایا۔ یہ حضرات کانگرس میں مسلمانوں کی "نمائندگی" کرتے تھے اور مسلم لیگ کے مطالبات کا مذاق اُڑاتے تھے۔

تحریکِ خلافت کے دَوران مسلمانوں کا جذبہ ایثار و قربانی اور آزادی کے لئے ان کی تڑپ دیکھ کر ہندو بوکھلا اٹھے، اس لئے انہوں نے ہندوؤں کو مسلمانوں کے مقابلے میں لانے کے لئے ایسی جارحانہ تحریکیں شروع کیں، جن کی بنیاد اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت پر رکھی۔ آئندہ صفحات میں ہم ان تحریکوں کا اجمالی جائزہ لیں۔

آریہ سماج:

آریہ سماج کا بانی سوامی دیانند سرسوتی، جس کا اصلی نام مُول جی تھا، ۱۸۲۴ء میں کاٹھیاواڑ کی ایک ہندو ریاست "موروی" کے ایک گاؤں ٹنکارا کے ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوا۔ اس کا بچپن سخت قسم کے ہندووانہ ماحول میں گزرا۔

نے اس کی کردار سازی میں اہم کردار ادا کیا۔

سوامی دیا نند نے ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کا بغور مطالعہ کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ہندو اپنی اصلی تعلیمات بھلا کر رسم و رواج اور بت پرستی میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ اس نے اپنے گورو سوامی ورجانند کے کہنے پر ہندوؤں کی مقدس کتابیں پوران اور اپنشد وغیرہ دریا میں بہا دیں اور آئندہ کے لئے ویدوں کو اپنی تعلیم اور توجہ کا مرکز بنایا۔ اس نے آریہ سماج کے نام سے ایک تحریک چلائی اور ہندوؤں سے کہا کہ وہ تمام رسم و رواج، میلے ٹھیلے، مورتوں کی پرستش اور رام لیلا جیسے ناٹک چھوڑ کر ویدوں کے زمانے کی طرف لوٹیں۔ یہاں تک ہمیں اس کے مشن پر کوئی اعتراض نہیں۔

سوامی دیانند کو پنڈت گورودت، پنڈت لیکھرام، سوامی شردھانند، شری نارائن سوامی، سوامی سیتا نند، مہاتما ہنسراج، لالہ راجپت رائے، سوامی ورشانند اور پنڈت گنپتی شرما جیسے مخلص چیلے مل گئے جنہوں نے اس کے مشن کو آگے بڑھایا۔

پنجاب میں آریہ سماج تحریک زیادہ مقبول ہوئی شاید اس کی ایک وجہ پنجابی ہندوؤں کی ہندوؤں کے مقدس مقامات ہردوار، رشی کیش، پریاگ، ایودھیا، بنارس اور متھرا سے دوری ہو، آریہ سماجیوں نے اپنے گورو سوامی دیا نند کے مشن کو پروان چڑھانے کی غرض سے صوبے کے طول و عرض میں ڈی اے وی کالج (دیا نند اینگلو ویدک کالج) کا جال بچھا دیا۔ لاہور سے آریہ گزٹ کے نام سے اس فرقے کا ایک ترجمان بھی شائع ہوتا تھا۔

آریہ سماجیوں نے اپنے مذہبی نظریات کے پرچار اور مسلمانوں کے عقاید کی تردید کے لئے ہردوار سے قریب گوروکل کے مقام پر ایک یونیورسٹی قائم کی جس نے مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

سوامی دیانند (م ۱۸۸۳ء) نے "ستیارتھ پرکاش" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی، جس میں ہندومت کے علاوہ ہر دین اور مذہب کا ابطال کیا۔ اس کتاب کے چودھویں باب میں مصنف نے قرآنِ حکیم پر سخت نکتہ چینی کی، جس سے مسلمانوں میں اشتعال پیدا ہوا۔ آریہ سماجیوں نے غلام حیدر نامی ایک نام نہاد مسلمان کو شدھ کرکے اس سے "دوسرا قرآن" مرتب کرنے کا اعلان کروایا۔ اسی طرح عبدالغفور

لدھیانوی کو شدھ کرنے کے بعد اس کا نام دھرم پال رکھا۔ آریوں نے اسے ہندوؤں کے علوم سے متعارف کروانے کے بعد مسلمانوں کے مقابلے پر لا کھڑا کیا۔ دھرم پال نے اسلام کے خلاف متعدد کتابیں اور رسائل تحریر کئے۔ بالآخر مولانا ثناء اللہ امرتسری نے اسے دوبارہ مسلمان کرکے اس کا نام غازی محمود رکھا۔ اس کے بعد غازی محمود (م ۱۹۶۰ء) نے اپنی بقیہ زندگی آریوں کی تردید میں صرف کی (راقم کو غازی صاحب سے ملنے کا شرف حاصل ہے) آریہ سماجیوں کے اعتراضات کا جواب دینے کے لئے مولانا ثناء اللہ امرتسری (م ۱۹۴۸ء) کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ انہوں نے اسلام کے دفاع میں متعدد کتابیں تحریر کیں۔

سوامی دیانند اور اس کے چیلے یہ کہتے تھے کہ ہندوستان، ہندوؤں کا ملک ہے اور مسلمان یہاں غیر ملکی ہیں۔ اس لئے انہیں چاہیے کہ وہ ہندو دھرم میں شامل ہو جائیں۔ ان کے ایسے ہی نظریات نے ہندو مسلم تعلقات میں کشیدگی پیدا کر دی اور فرقہ وارانہ فسادات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔

سوامی دیانند نے اپنے فرقے (آریہ سماج) کے علاوہ ہندوؤں کے دوسرے تمام فرقوں کی بھی پرزور مذمت کی اور خاص طور پر متھرا کے "گوکلیے گوسائیوں" کو اپنی تنقید کا زبردست نشانہ بنایا۔ ان کے خیال میں پنڈتوں اور پروہتوں نے اپنی پیٹ پوجا کے لئے دھرم کے نام پر بہت سے غلط طور طریقے اپنائے تھے۔ اسی فرقے کے افراد نے سوامی جی کے رسوئیے (باورچی) کو رشوت دے کر ان کے کھانے میں زہر ملا دیا۔ اسی زہر کے اثر سے انہوں نے ۳۰ اکتوبر ۱۸۸۳ء کا دن گزار کر رات کے پہلے حصے میں اجمیر میں انتقال کیا۔

آریہ سماجیوں نے مسلم آزار صحافت کو فروغ دیا۔ ان کے اخبارات پرتاپ، ملاپ، ارجن اور تیج نے مسلمانوں کے خلاف ایک محاذ کھول دیا۔ ان اخبارات میں اسلام اور بانیٔ اسلام پر رکیک حملے ہونے لگے۔ لاہور کے راج پال نامی ایک بدبخت ہندو نے "رنگیلا رسول" کے عنوان سے ایک رسوائے زمانہ کتاب شائع کی۔ اس کتاب کی اشاعت سے مسلمانوں میں بڑا اشتعال پیدا ہوا اور غازی علم الدین (م ۱۹۲۹ء) نامی ایک جوشیلے مسلمان نے اس دریدہ دہن کو جہنم واصل کر دیا۔ ادھر عبدالرشید (م

۱۹۲۷ء) نامی ایک غیرت مند نوجوان نے دسمبر ۱۹۲۶ء میں دہلی میں سوامی شردھانند کو قتل کر دیا۔ کراچی میں عبدالقیوم نامی ایک باغیرت مسلمان نے بھی ایک گستاخ ناتھورام کو ٹھکانے لگا دیا۔ ان حالات میں برطانوی حکومت ایک قانون بنانے پر مجبور ہو گئی جس میں کسی مذہب کے بزرگوں کے خلاف لٹریچر شائع کرنے پر پابندی لگا دی۔

مختصر یہ کہ آریہ سماجیوں نے پنجاب میں ہندو مسلم کشیدگی پیدا کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا جس کے نتیجے میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے۔

شُدھی تحریک:

جن دنوں تحریکِ خلافت چل رہی تھی ان دنوں سوامی شردھانند جیل میں تھا۔ انگریز حکام نے اسے قبل از وقت رہا کر دیا تاکہ ہندو مسلم اتحاد کمزور ہو جائے شردھانند نے جیل سے رہا ہوتے ہی شُدھی تحریک کا ڈول ڈالا۔ اپنے گرو سوامی دیانند سرسوتی کی طرح وہ بھی مسلمانوں کو غیر ملکی سمجھتا تھا اور جو ہندو صدیوں پہلے مسلمان ہو چکے تھے انہیں دوبارہ ہندو دھرم میں شامل کرنا چاہتا تھا۔ یہی اس کا مشن تھا اور اسے ہی شُدھی تحریک کہتے ہیں۔

شردھانند نے جیل سے رہا ہوتے ہی مغربی یو۔ پی اور مشرقی راجستھان کا رُخ کیا۔ وہاں ملکھانہ راجپوت آباد تھے جو چند پشتوں سے مسلمان تھے لیکن ان کی تربیت صحیح انداز پر نہیں ہوئی تھی۔ شردھانند نے انہیں دوبارہ ہندو دھرم میں داخل کر لیا۔ اس کی اس حرکت پر مسلمانوں میں ہیجان برپا ہو گیا۔

اس کا دوسرا ہدف ضلع گوڑگانوہ، ریاست ہائے بھرت پور اور اَلور میں بسنے والے پچاس لاکھ میواتی مسلمانوں کو شُدھ کرنا تھا۔ ان کے بڑے بزرگوں کو سلطان محمود غزنوی کے بھانجے غازی مسعود سالار نے مشرف با سلام کیا تھا۔ وہ مجاہد ولی (Warrior Saint) تھے۔ وہ میواتیوں کو کلمہ پڑھا کر بہرائچ چلے گئے اور ان کی اسلامی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ مسلمان ہونے کے باوجود ان کے نام بھاگ مل، ارجن، مان سنگھ اور گنپت تھے اور اسی طرح ان کی عورتیں رادھا، سیتا اور کوشلیا جیسے ناموں سے موسوم تھیں۔

جونہی شردھانند میواتیوں کو شُدھ کرنے کی غرض سے میوات پہنچا تو مسلمانوں میں اشتعال پیدا ہو گیا۔ خواجہ حسن نظامی دہلوی (م ۱۹۵۵ء) غلام بھیک نیرنگ انبالوی (م ۱۹۵۲ء) اور مولانا محمد الیاس کاندھلوی (م ۱۹۴۴ء) شردھانند کے مقابلے کو نکلے۔ غلام بھیک نیرنگ نے انبالہ میں "جمعیتہ مرکزی، تبلیغ، اسلام" قائم کرکے ایک مجلہ ماہنامہ تبلیغ جاری کیا اور میوات میں مبلغ بھیجنے شروع کئے۔ وہاں کی پرانی مسجدیں آباد کیں اور جہاں مساجد نہ تھیں وہاں مساجد تعمیر کرکے میواتیوں کو نماز پڑھنے کی ترغیب دی اور ان کے بچوں کو ناظرہ قرآن حکیم پڑھانے لگے۔

اس ضمن میں سب سے زیادہ کام مولانا محمد الیاس کاندھلوی نے کیا۔ انہوں نے "تبلیغی جماعت" کی بنیاد رکھی اور بستی حضرت نظام الدین اولیاء میں بنگلے والی مسجد کو مرکز قرار دیا۔ انہوں نے مبلغوں کی جماعتیں بنا کر میوات کے دورے کئے اور لاکھوں افراد کی تعلیم و تربیت کی۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مولانا محمد الیاسؒ کی کاوشوں سے پچاس لاکھ میواتی مُرتد ہونے سے بچ گئے۔

آزادی کے بعد اس جماعت نے بھارت کے لاکھوں مسلمانوں کو مُرتد ہونے سے بچایا اور مختلف مقامات پر تبلیغی اجتماعات کرکے اسلام کی حقانیت ثابت کی۔ پاکستان میں رائیونڈ میں تبلیغی جماعت کا مرکز ہے۔ اس جماعت کے بانیوں کے خلوص نیت سے یہ جماعت اب بین الاقوامی جماعت بن گئی ہے۔

مولانا محمد الیاس ۱۳ جولائی ۱۹۴۴ء کو فوت ہوئے اور بنگلے والی مسجد کے ایک کونے میں دفن ہوئے۔ ان کے فرزند مولانا محمد یوسف المعروف بہ حضرت جی نے اپنے والد بزرگوار کے کام کو آگے بڑھایا۔ ان کا انتقال ایک تبلیغی دورے کے دوران ۲ اپریل ۱۹۶۵ء کو لاہور میں ہوا اور ان کی میت دہلی لے جا کر بنگلے والی مسجد میں سپردِ خاک کی گئی۔ ان کی وفات کے بعد ان کے چچا زاد بھائی مولانا محمد زکریا نے تبلیغی جماعت کی سرپرستی فرمائی۔ ان کا انتقال ۲۴ مئی ۱۹۸۲ء کو مدینہ منورہ میں ہوا۔ ان کے وصال کے بعد مولانا انعام الحسن تبلیغی جماعت کے سرپرست قرار پائے۔ انہوں نے ۳۰ سال جماعت کا نظم و نسق چلایا اور اسے عالمی جماعت بنا دیا۔ ان کا انتقال ۱۰ جون ۱۹۹۵ء کو ہوا۔ اس جماعت نے سوامی شردھانند کی شُدھی تحریک کو ناکام بنا دیا اور لاکھوں

میواتیوں کو اسلام پر ثابت قدم رکھا۔

سنگھٹن:

شُدھی تحریک ، ہندو مہا سبھا ، آریہ سماج اور سنگھٹن آپس میں اس قدر خلط ملط ہیں کہ بسا اوقات انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ان سب کا مقصد ایک ہی تھا اور ان کے رہنما بیک وقت ایک سے زائد تحریکوں میں شامل تھے۔ ان رہنماؤں کا یہ خیال تھا کہ ہندوستان کا مستقبل ان چار ستونوں پر قائم ہے:

۱۔ ہندو سنگھٹن

۲۔ ہندو راج

۳۔ مسلمانوں کی شدھی

۴۔ افغانستان ، صوبہ سرحد اور قبائلی علاقوں کی فتح اور وہاں بسنے والے مسلمانوں کی شُدھی۔

ہندو یہ کہتے تھے کہ ایک زمانے میں افغانستان ، موجودہ سرحد اور قبائلی علاقے ان کی عملداری میں شامل تھے۔ اس کی دلیل ، جو انتہائی بودی تھی ، وہ یہ دیتے تھے کہ ہندوؤں میں قندھاری مل ، کابلی مل اور پشاوری رام جیسے نام پائے جاتے ہیں جو اس بات کی دلیل ہیں کہ کبھی ان شہروں پر ان کی حکومت تھی۔

ہندو یہ بھی کہتے تھے کہ ہندوستان میں ان کا مستقبل صرف اور صرف اسی صورت میں محفوظ رہ سکتا ہے کہ بزورِ قوت افغانستان ، صوبہ سرحد اور قبائلی علاقے میں بسنے والے مسلمانوں کو شُدھ کر لیا جائے۔ بصورت دیگر اگر ہندوستان نے انگریزوں سے آزادی حاصل بھی کر لی تو اس علاقے سے پھر کوئی محمود غزنوی ، محمد غوری ، نادر شاہ یا احمد شاہ ابدالی آکر ان کے لئے خطرہ بن سکتا ہے۔

سنگھٹن تحریک کا اصل قائد ایک مرہٹہ مسمّی بال کرشن شیو رائے مونجے (م ۱۹۴۸ء) تھا۔ اس نے ہندوؤں کو بزدلی ترک کرکے فوجی تربیت حاصل کرنے کا مشورہ دیا۔ مشہور انقلابی راہنما ہر دیال (م ۱۹۳۹ء) نے ، جو ایک طویل عرصے سے غدر پارٹی

میں شامل ہو کر جلا وطنی کی زندگی گزار رہا تھا ، مسلمانوں کو یہ "مشورہ" دیا کہ وہ ہندوؤں جیسے نام رکھ لیں ، نیز وہ اپنے مخصوص تہواروں کو ترک کرکے اکثریتی فرقے کے تہواروں کو اپنا لیں۔ اگر مسلمان پسند کریں تو ان کے ساتھ اتنی رعایت برتی جا سکتی ہے کہ وہ ہندو مت کا ایک فرقہ بن جائیں اور اس فرقے کا نام "محمدی ہندو" رکھ لیں۔

ہندوؤں نے جا بجا تربیتی مرکز قائم کرلئے جہاں وہ فوجی طرز کی پریڈ کرتے اور مختلف قسم کے ہتھیار چلانے کی مشق کرتے تاکہ وقت آنے پر وہ مسلمانوں کو بزورِ قوت شُدھ کر لیں یا ہندوستان سے باہر نکال دیں۔ اس تحریک کے ردّ عمل کے طور پر علّامہ عنایت اللہ خان المشرقی (م ۱۹۶۳ء) نے خاکسار تحریک کی بنیاد رکھی اور مسلمانوں کو فوجی تربیت دینا شروع کی تاکہ وہ اپنا دفاع کر سکیں۔

ہندو مہا سبھا:

ہندو مہا سبھا ۱۹۰۰ء میں قائم ہوئی۔ یہ تمام ہندوؤں کی نمائندہ جماعت ہونے کی دعویدار تھی۔ قیام کے بعد کچھ عرصے تک یہ غیر فعّال جماعت بنی رہی ، لیکن جب شُدھی ، سنگھٹن اور آریہ سماج میدان عمل میں اُتریں تو ہندو مہا سبھا بھی ایک فعّال جماعت بن گئی۔ مشہور مرہٹہ لیڈر مونجے اور ونائیک دمودر ساورکر (م ۱۹۶۶ء) اس جماعت کے کرتا دھرتا تھے۔ مونجے سنگھٹن تحریک کا بھی قائد تھا۔ چونکہ ان تمام تحریکوں کا مقصد ہندوستان سے مسلمانوں کا اخراج یا ان کو ہندو دھرم میں ضم کرنا تھا ، اس لئے بیک وقت ایک قائد ، ایک سے زائد جماعتوں کا رکن تھا۔

ہندو مہا سبھا کا یہ دعویٰ تھا ہندوستان میں ہندوؤں کی واضح اکثریت ہے اس لئے اس ملک میں رہنے اور اس پر حکومت کرنے کا حق صرف ہندوؤں کو حاصل ہے ، ان کے علاوہ دوسری اقوام اجنبی اور غیر ملکی ہیں۔ مناسب یہی ہے کہ وہ اپنا تشخص ختم کرکے ہندوؤں میں ضم ہو جائیں۔

اس جماعت کا نعرہ ہندو ، ہندی اور ہندوستان تھا۔ یہ ہندوستان میں "رام راج" قائم کرنے کی زبردست حامی تھی۔ اس مقصد کے حصول اور ہندوؤں کے علوم و فنون کی نشریات کے لئے پنڈت مدن موہن مالوی (م ۱۹۴۶ء) نے بنارس میں ہندو

یونیورسٹی کی بنیاد رکھی ۔ آریہ سماجیوں نے ہردوار سے قریب گوڑوکل میں ہندوؤں کے مذہبی علوم کی تدریس کے لئے ایک یونیورسٹی قائم کی تھی جہاں ہندو مت کے پرچارک (مبلغ) تیار کئے جاتے تھے ۔

ہندو مہا سبھا سے تعلق رکھنے والے بہت سے افراد کانگرس میں شامل ہو گئے اور انہوں نے اپنے مذہبی تعصب کی بنا پر کانگرس کی پالیسی کو تبدیل کر دیا ۔ پنڈت مدن موہن مالوی اور سردار ولبھ بھائی پٹیل (م ۱۹۵۰ء) جیسے مہا سبھائی ذہنیت رکھنے والے سیاستدانوں نے کانگرس کے اندر اپنا الگ پریشر گروپ قائم کر لیا ۔ ساورکر اور مونجے جیسے متعصب ہندو رہنماؤں کی اشیر باد بھی انہیں حاصل تھی ۔

ہندو مہا سبھا نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان منافرت پیدا کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا اور مسلمان یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ وہ اس ملک میں ہندوؤں کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے ۔

آریہ سماج ، سنگھٹن ، شدھی اور ہندو مہا سبھا نے ملکی سیاست میں جو کردار ادا کیا اس کی ایک ہلکی سی جھلک رُسوائے زمانہ نہرو رپورٹ میں دکھائی دیتی ہے ۔

باب (22)

دہلی تجاویز

پس منظر:

تحریک خلافت ختم ہوئی تو مسلمان ایک عجیب صورت حال سے دو چار تھے ۔ ان کی چار پانچ سال کی محنت رائیگاں گئی تھی اور وہ ذہنی پریشانی اور انتشار کا شکار تھے ۔ دوسری جانب ہندو رہنما لالہ لاجپت رائے (م ۱۹۲۸ء) سوامی شردھا نند (م ۱۹۲۶ء) پنڈت مدن موہن مالوی (م ۱۹۴۶ء) اور ڈاکٹر مونجے (م ۱۹۴۸ء) آریہ سماج ، شدھی ، سنگھٹن اور ہندو مہاسبھا کو مضبوط تر بنانے کے لئے دن رات کوشاں تھے ۔ انہوں نے ہندوؤں کو اُکسا کر ملک کے طول و عرض میں مسلم کش فسادات شروع کروا دیئے تھے اور تحریک خلافت کے زمانے میں ہندو مسلم اتحاد کا جو مظاہرہ دیکھنے میں آیا تھا اس کی دھجیاں اُڑا دی تھیں ۔

مسلم لیگ ، تحریک خلافت کے دوران عملاً معطل ہو کر رہ گئی تھی ، اور جب تحریکِ خلافت ختم ہو رہی تھی تو مسلم لیگ میں افتراق پیدا ہو گیا ۔ سر محمد شفیع (م ۱۹۳۲ء) نے پنجاب مسلم لیگ کا اتحاد آل انڈیا مسلم لیگ سے ختم کر دیا اور پنجاب مسلم لیگ کو ہی آل انڈیا مسلم لیگ ظاہر کر کے اس کے صدر بن گئے (ان کا یہ دھڑا شفیع لیگ کے نام سے مشہور ہو گیا ۔)

دوسری جانب وہ مسلم سیاست دان جو تحریکِ خلافت کے خاتمے کے بعد سیاسی سرگرمیاں جاری رکھنا چاہتے تھے لیکن مسلم لیگ کے ساتھ انہیں خدا واسطے کا تھا ، وہ مجلسِ احرار ، جمعیتُ العلماء ہند اور خاکسار تحریک میں شامل ہو گئے ۔ اس وقت چند مسلم سیاست دان باقاعدہ کانگرس کے رُکن بن گئے اور پھر ہندوؤں نے انہیں مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا ۔ جب کبھی مسلمانوں کے مطالبات کی بات ہوتی کانگرس انہی

مہروں کو آگے بڑھا کر کہتی کہ مسلم لیگ تمام مسلمانوں کی نمائندہ جماعت نہیں ہے کیونکہ مسلمان کانگرس اور اس کی حلیف جماعتوں میں بھی شامل ہیں۔

مسلم لیگ کا اجلاس لاہور:

ترکی میں خلافت کے خاتمے کے بعد برِّعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش میں خلافت کو برقرار رکھنے کی تحریک عملاً ختم ہو گئی۔ اگرچہ خلافت کانفرنس کے بورڈ بعض دفاتر پر کئی سال بعد تک آویزاں رہے۔ مئی ۱۹۲۴ء میں لاہور میں مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس موقع پر قائداعظم نے ہندوؤں کی جارحانہ تحریکوں کے عروج کے زمانے میں ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا۔ انہوں نے اس موقع پر برملا فرمایا کہ انگریز اس ملک پر اسی لئے حکمرانی کر رہے ہیں کہ یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں میں افتراق ہے اور یہ دونوں قومیں ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کرتیں۔ میں عوام کو یقین دلاتا ہوں کہ جس روز ان قوموں میں اتحاد ہو گیا اسی روز ہندوستان کو نو آبادی کا درجہ مل جائے گا۔ جس کا نظم و نسق یہ دونوں قومیں مل کر چلائیں گی۔ اس اجلاس میں برطانوی حکومت سے یہ التماس کی گئی کہ برِّعظیم کے لئے دستور بناتے وقت مندرجہ ذیل باتوں کا خاص خیال رکھا جائے:

۱۔ ملک میں وفاقی طرزِ حکومت رائج کیا جائے۔

۲۔ تمام صوبوں کو مکمل خود مختاری ہو اور وفاقی حکومت کے پاس صرف وہی امور ہوں جو مشترکہ مفاد سے تعلق رکھتے ہیں۔

۳۔ اگر آئندہ کبھی صوبوں کی نئی حد بندی کی جائے تو اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ ایسا کرنے سے بنگال، پنجاب اور صوبہ سرحد میں مسلمانوں کی اکثریت کسی طرح بھی متاثر نہ ہو۔

۴۔ مختلف اداروں میں نمائندگی آبادی کے تناسب سے ہونی چاہیے۔

۵۔ جداگانہ انتخاب کا طریقہ جاری رکھا جائے۔

۶۔ تمام اقوام کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہو۔

۷۔ اگر مرکزی یا صوبائی اسمبلی میں کسی بل کی متاثرہ قوم کے تین چوتھائی

ارکان مخالفت کریں، تو وہ بل اسمبلی میں پیش کرنے کی اجازت ہی نہ دی جائے۔

۸۔ ۱۹۱۹ء میں نافذ ہونے والی مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات موجودہ حالات میں ناکام اور غیر تسلی بخش ہیں۔

ہندو مسلم اتحاد کے لئے قائداعظم کی کوششیں:

اجلاس لاہور کے بعد قائداعظم نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے اپنی کوششیں تیز تر کر دیں اور ہندوؤں کی جارحانہ تحاریک کی موجودگی میں بھی دونوں قوموں میں مفاہمت کرانے کے لئے تگ و دو کرتے رہے۔ ہندوؤں کے خیال میں ہندو مسلم اتحاد کے راستے میں جداگانہ انتخابات سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ ہندو اگرچہ جداگانہ انتخابات کو ۱۹۱۶ء میں میثاقِ لکھنؤ میں تسلیم کر چکے تھے لیکن اس کے بعد جلد بعد وہ اس کی مخالفت میں سرگرم ہو گئے۔

قائداعظم نے ہندو مسلم اتحاد کی خاطر مسلمانوں کی جانب سے زبردست ایثار و قربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہندو سیاست دانوں پر واضح کیا کہ مسلمان جداگانہ انتخاب کے حق سے دست بردار ہونے کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ ۱۹۲۴ء کے مسلم لیگ کے اجلاس لاہور میں جو تجاویز پیش کی تھیں انہیں مان لیا جائے۔ قائداعظم کے اس بیان کی کئی سمجھ دار ہندو رہنماؤں نے تعریف کی۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا اگلا اجلاس دسمبر ۱۹۲۶ء میں دہلی میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں بڑے غور و خوض کے بعد ہندوؤں کی سیاسی جماعتوں اور خاص طور پر کانگرس کے ساتھ بات چیت کے لئے ایک کمیٹی قائم کی گئی (اسی سال سوامی شردھانند ایک مسلمان نوجوان کے ہاتھوں قتل ہو چکا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد آریہ سماجی حلقوں میں جو خلاء پیدا ہوا، اسے کوئی دوسرا آریہ سماجی رہنما پُر نہ کر سکا۔ اس لئے کچھ عرصے کے لئے اس متشدد جماعت کی سرگرمیاں مدھم پڑ گئیں)۔ کمیٹی کے قیام پر قائداعظم نے فرمایا:

• ہمیں اُمید کرنی چاہیے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے سمجھ دار

طبقے یہ بات بخوبی سمجھ لیں گے کہ ہندوستان کے سیاسی مسائل کا حل دونوں قوموں کے اتحاد و تعاون کے ذریعے ہی ممکن ہو سکتا ہے اور ہم اس اتحاد کی کامیابی کے لئے دعا گو ہیں"۔

اس کے باوجود کانگرس کی طرف سے قائداعظم کی اس تجویز کا کوئی مثبت جواب نہ آیا۔

ہندوؤں کی اس سرد مہری کے باوجود قائداعظم مایوس نہیں ہوئے۔ وہ ۱۹۲۷ء میں مرکزی اسمبلی کے بجٹ اجلاس کے موقع پر دہلی میں قیام فرما تھے۔ ان دنوں پنڈت موتی لعل نہرو اور کانگرس کے ایک سرکردہ رہنما سری نواس آئنگر دہلی میں موجود تھے۔ سری نواس آئنگر کے ساتھ قائداعظم کے دوستانہ تعلقات تھے اور یہ دونوں حضرات مرکزی اسمبلی میں ایک دوسرے کے ساتھ تبادلہ خیالات کرتے رہتے تھے جس سے دونوں کے خیالات میں بڑی حد تک ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ قائداعظم نے ان کی دہلی میں موجودگی سے فائدہ اٹھایا۔ دوسری جانب پنڈت موتی لعل نہرو نے قائداعظم کو یقین دلایا کہ اگر وہ جداگانہ انتخاب کے حق سے دستبردار ہو جائیں تو وہ ان کی بقیہ تجاویز کانگرس سے منوا لیں گے۔ پنڈت جی کی یہ رائے تھی کہ ہندو مسلم اتحاد کی راہ میں جداگانہ انتخاب ہی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

قائداعظم نے ویسٹرن ہوٹل دہلی میں تیس سرکردہ ہندو اور مسلم رہنماؤں کو مدعو کیا۔ مسلم رہنماؤں میں سے راجہ صاحب محمود آباد، مولوی محمد شفیع داؤدی، نواب اسمٰعیل خان (م ۱۹۵۸ء)، میاں شاہنواز (م ۱۹۳۸ء)، عبدالمتین چودھری (م ۱۹۳۸ء)، سر عبدالرحیم (م ۱۹۵۲ء)، سر محمد شفیع، عبداللہ المامون سہروردی (م ۱۹۳۵ء) اور نواب سر ذوالفقار علی خاں والئی مالیر کوٹلہ (م ۱۹۳۳ء) اس موقع پر موجود تھے۔ یہ حضرات اس موقع پر متفق ہو گئے کہ اگر ہندوؤں کے نمائندے ان کی درج ذیل شرائط تسلیم کرلیں تو وہ جداگانہ انتخاب کے حق سے دستبردار ہونے کے لئے تیار ہیں:

مسلمانوں کی شرائط:

۱۔ سندھ کو بمبئی پریذیڈنسی سے الگ کر کے نیا صوبہ بنا دیا جائے۔

۲۔ بلوچستان اور سرحد میں بھی دوسرے صوبوں کی طرح آئینی اصلاحات نافذ کی جائیں۔

۳۔ ہندو اپنی اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو جتنی رعائتیں دیں گے مسلمان اپنی اکثریت کے صوبوں میں ہندوؤں کو ویسی ہی رعائتیں دیں گے۔

۴۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی نمائندگی کسی طرح بھی 1/3 سے کم نہیں ہونی چاہیے۔

۵۔ پنجاب اور بنگال کی اسمبلیوں میں نمائندگی آبادی کے تناسب سے ہونی چاہیے۔

اس موقع پر مسلم نمائندوں نے یہ شرط لگا دی کہ ہندو یا تو ان کی ان تجاویز کو کُلّی طور پر منظور کریں یا بالکل مسترد کر دیں۔ یہ نہیں ہو گا کہ وہ ان میں سے چند تجاویز مان لیں اور چند مسترد کر دیں۔

مسلمانوں کی پیش کردہ ان تجاویز کا سری نواس آئنگر، سروجنی نائیڈو (م ۱۹۴۹ء) اور پنڈت موتی لعل نہرو (م ۱۹۳۱ء) نے خیر مقدم کیا۔ انہوں نے ان تجاویز کو پائیدار امن اور فرقہ وارانہ فساد ختم کرنے کی بنیاد قرار دیا۔

اس کے باوجود ہندو اخبارات نے ان تجاویز کا مضحکہ اُڑایا اور مسلم رہنماؤں سے پوچھا کہ وہ مخلوط انتخاب کو بمبئی کی سندھ سے علیحدگی اور سرحد اور بلوچستان میں اصلاحات کے نفاذ کے ساتھ کیوں مشروط کر رہے ہیں؟ ہندو اخبارات میں اس طرح کے مضامین چھپ رہے تھے کہ مسلمان جداگانہ انتخاب سے دستبردار ہونے کی قیمت سندھ کی بمبئی پریذیڈنسی سے علیحدگی، بلوچستان اور سرحد میں آئینی اصلاحات کی صورت میں وصول کرنا چاہتے ہیں۔ وہ تھوڑی چیز کے بدلے زیادہ منافع حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

ہندوؤں کو اس سے یہ تکلیف پہنچ رہی تھی کہ سندھ میں مسلمانوں کی واضح اکثریت ہے۔ سندھ کے صوبہ بن جانے سے وہاں مسلمانوں کی حکومت بن جائے گی، عدالتوں میں مسلمان ججوں کا تقرر ہو جائے گا اور انہیں اپنی آبادی کے تناسب سے ملازمتوں میں کوٹہ ملنے لگے گا۔ دوسری جانب بلوچستان اور سرحد مسلم اکثریت کے علاقے ہیں، اگر وہاں آئینی اصلاحات نافذ ہو جائیں تو انہیں دوسرے صوبوں کے مساوی درجہ مل جائے گا۔ اس کا فائدہ بھی مسلمانوں کو ہو گا۔ بدیں وجہ وہ سندھ کی بمبئی سے

علیحدگی، بلوچستان اور سرحد میں اصلاحات کے نفاذ کی مخالفت کر رہے تھے۔ اگر ان علاقوں میں ہندوؤں کی اکثریت ہوتی، تو وہ سب سے پہلے یہی مطالبات پیش کرتے جو مسلمانوں نے کئے تھے۔

دہلی تجاویز کا ردِ عمل:

کانگرس نے ابتداء میں ان تجاویز کا خیر مقدم کیا، جیسا کہ پنڈت موتی لعل نہرو، سری نواس آئینگر اور سروجنی نائیڈو کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن چھ ماہ گزرنے کے بعد کانگرس نے ان تجاویز کو مسترد کر دیا۔

دوسری جانب سر محمد شفیع نے، جو ویسٹرن ہوٹل دہلی میں ہونے والی میٹنگ میں موجود تھے، اور تجاویز کی تیاری میں برابر کے شریک تھے، لاہور آنے کے بعد ان تجاویز کے خلاف بیان بازی شروع کر دی۔ انہوں نے دو ٹوک الفاظ میں یہ کہا کہ مسلمان جداگانہ انتخاب کے حق سے ہرگز دستبردار نہ ہوں گے۔

سر محمد شفیع نے علامہ اقبال کو بھی اپنا ہمنوا بنا لیا اور انہوں نے بھی بڑا سخت بیان دیا۔ انہوں نے کہا کہ جب تک اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کا انتظام کماحقہٗ نہیں ہو جاتا، اس وقت تک جداگانہ انتخاب کو دستور ہند کی اساس سمجھنا چاہیے۔

سر فضلِ حسین (م ۱۹۳۶ء) نے چودھری ظفر اللہ خان (م ۱۹۸۵ء) اور ڈاکٹر سر ضیاء الدین (م ۱۹۴۸ء) کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ انگلستان کے موقر اخباروں میں مضامین لکھ کر برطانوی حکومت پر واضح کریں کہ دہلی تجاویز کے حامیوں کی تعداد بہت ہی کم ہے۔

کانگرس کے فیصلے اور سر محمد شفیع اور سر فضلِ حسین کی مخالفت کی وجہ سے دہلی تجاویز سرد خانے میں پڑ گئیں۔

سر جان سائمن کی آمد

۱۹۱۹ء میں مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کے نفاذ کے وقت برطانوی حکومت نے برِ عظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کے عوام کو اس بات کا یقین دلایا کہ دس سال گزرنے کے بعد حکومت اس بات کا جائزہ لے گی کہ یہ اصلاحات کس حد تک مفید ثابت ہوئی ہیں۔ اگر حکومت کو مثبت رپورٹ ملی تو وہ نئی اصلاحات کے نفاذ کے لئے قدم اٹھائے گی۔ اس وعدے کے مطابق ۱۹۲۹ء میں مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کی کارکردگی کا جائزہ لینا ضروری تھا۔

ادھر ۱۹۲۹ء میں برطانیہ کی پارلیمنٹ کے انتخاب ہونے والے تھے۔ ادھر برِ عظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش میں بڑی بے چینی پائی جاتی تھی۔ فرقہ وارانہ فسادات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو چکا تھا جس سے امن و امان کا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ برطانیہ میں برسرِ اقتدار کنزرویٹو پارٹی کو جو عوام میں اپنے پرانے نام "ٹوری پارٹی" کے نام سے جانی پہچانی جاتی تھی، یہ خدشہ لاحق ہوا کہ آئندہ انتخابات کے موقع پر حزبِ اختلاف لیبر پارٹی برِ عظیم کے مسئلے کو ضرور اٹھائے گی اور حزبِ اقتدار کو برِ عظیم کے موجودہ حالات کا ذمہ دار ٹھہرائے گی۔ اس لئے برِ عظیم کے مسائل کو جلد از جلد حل کرنا چاہئے تاکہ لیبر پارٹی کو یہ مسئلہ اچھالنے کا موقع ہی نہ ملے۔ ان حالات میں برطانوی حکومت نے وعدے سے دو سال قبل ہی ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لئے ایک کمیشن بھیجنے کا فیصلہ کیا۔

برطانوی حکومت نے سر جان سائمن (م ۱۹۵۴ء) کی سربراہی میں ایک کمیشن تشکیل دیا، جس میں برطانوی پارلیمنٹ کے سات ارکان شامل تھے۔ یہ کمیشن ۱۹ جنوری ۱۹۲۸ء کو لندن سے بحری جہاز کے ذریعے بمبئی روانہ ہوا۔ کمیشن میں صرف انگریزوں کو ہی شامل کیا گیا اور برِ عظیم کے باشندوں میں سے دونوں بڑی قوموں کا کوئی نمائندہ شامل نہ کیا۔ اس کا ہندوؤں اور مسلمانوں کو بجا طور پر رنج ہوا کیونکہ غیر ملکی

باشندے عوام کی خواہشات اور مطالبات سے واقف نہ تھے جس طرح کی واقفیت مقامی باشندوں کو تھی۔

اس موقع پر ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے وائسرائے لارڈ اِروِن سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ برطانوی حکومت سے کہیں کہ اس وفد میں مقامی باشندوں کو بھی شامل کریں، بصورتِ دیگر ہندو اور مسلمان اس کمیشن کا بائیکاٹ کریں گے، اور اس سے کسی قسم کا تعاون نہیں کریں گے۔

سرتج بہادر سپرُو (م ۱۹۴۹ء) مشہور قانون دان تھے اور وہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے ہاں قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ علّامہ اقبال کے ساتھ ان کے بڑے خوشگوار مراسم تھے۔ علّامہ اقبال بھی سپرُو گوت کے فرد تھے، اس لئے وہ حضرت علّامہ سے ملتے رہتے تھے۔ سرتج بہادر سپرُو نے سائمن کمیشن کی تشکیل پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اس کمیشن کا قیام ہندوستان کی قومی غیرت کے خلاف ہے۔

ادھر کلکتہ میں مسلم لیگ کا اجلاس سر محمد یعقوب (م ۱۹۴۲ء) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس میں جداگانہ انتخاب سے دستبرداری کے عوض سندھ کی بمبئی سے علیحدگی، بلوچستان اور سرحد میں اصلاحات کے نفاذ پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا۔ قائداعظم نے سائمن کمیشن کی تشکیل پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہوئے فرمایا کہ میرے لئے ایسے سفید فام کمیشن کا تصور ہی شاق ہے جو ۳۵ کروڑ عوام کی قسمت کا فیصلہ کرے۔ ان حالات میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا اور ۳ فروری کو پورے ملک میں ہڑتال کرنے کا اعلان کیا۔

بدقسمتی سے مسلم لیگ ان دنوں دو دھڑوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ سر محمد شفیع نے اپنے دھڑے کی جانب سے سائمن کمیشن کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کرنے کا اعلان کیا اور اپنے دھڑے کا نام "آل انڈیا مسلم لیگ" رکھ کر لاہور میں مسلم لیگ کا اجلاس طلب کر لیا۔ سر محمد شفیع کے حامیوں نے ان کے فیصلے کی تائید کی۔

پنجاب کے علاوہ دوسرے تمام صوبوں میں سائمن کمیشن کی پُر زور مخالفت کی گئی۔ وہ جہاں کہیں بھی گیا، عوام نے کالی جھنڈیوں کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور (Simon Go Back) کے فلک شگاف نعرے لگائے۔ لکھنؤ میں

ایک وسیع پارک میں اسے حکومتِ ہند کی طرف سے استقبالیہ دیا گیا عوام کو اس پارک سے اتنی دُور رکھا گیا کہ ان کے نعروں کی آواز بھی سائمن تک نہ پہنچے۔ اس موقع پر مظاہرین کو بڑی دُور کی سوجھی اور انہوں نے پتنگوں پر (Simon Go Back) لکھ کر پتنگ اُڑائے اور اس پارک میں گرا دیئے۔

جب سائمن لاہور پہنچا تو سر محمد شفیع اور ان کے حواریوں نے اس کا استقبال کیا، جس پر بپھرے ہوئے عوام نے انہیں مغلظات سنائیں۔ دوسری جانب ہندوؤں اور مسلمانوں نے سائمن کی آمد پر بڑا زبردست مظاہرہ کیا۔ اس موقع پر پولیس نے مظاہرین پر لاٹھی چارج کیا۔ لالہ لاجپت رائے جو مظاہرین کی قیادت کر رہے تھے، وہ حال ہی میں ایک طویل بیماری سے صحت یاب ہوئے تھے، وہ بھی پولیس کی زد میں آ گئے۔ پولیس نے ان پر وحشیانہ انداز میں لاٹھی چارج کیا اور وہ ضربات کی تاب نہ لاتے ہوئے ۱۷ نومبر ۱۹۲۸ء کو انتقال کر گئے۔ ان کی موت سے ہندو مہاسبھا، سنگھٹن اور آریہ سماج ایک سرگرم رہنما سے محروم ہو گئیں۔

○

نہرو رپورٹ

برِعظیم پاک و ہند کے سیاست دانوں نے سرجان سائمن کے ساتھ مکمل عدم تعاون کیا اور اس سے ملنا بھی گوارا نہ کیا تو اس نے اپنی طرف سے درج ذیل سفارشات پیش کیں:

۱۔ مرکز اور صوبوں میں دو عملی ختم کی جائے۔
۲۔ ہر محکمہ ایک وزیر کے سپرد کیا جائے۔
۳۔ مرکزی حکومت اور گورنروں کے اختیارات کم کئے جائیں۔
۴۔ ملک میں وفاقی طرز کا نظام رائج کیا جائے۔
۵۔ صوبہ سرحد میں اصلاحات نافذ کی جائیں۔
۶۔ سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کا جائزہ لینے کے لئے ایک کمیٹی بنائی جائے۔

ہندو اور مسلمان دونوں سرجان سائمن کا بائیکاٹ کر چکے تھے، اس لئے انہوں نے ان تجاویز کو مسترد کر دیا۔ اس زمانے میں لارڈ برکن ہیڈ وزیر امورِ ہند تھا۔ وہ بڑا تیز طباع اور شاطر سیاست دان تھا۔ ایک بار اس نے یہ کہا تھا کہ اگر انگریز موجودہ حالات میں برِعظیم کو آزاد کر دیں تو ہندو اور مسلمان آپس میں کٹ مریں گے، اس لئے ان کا برِعظیم پر تسلط قائم رکھنا اشد ضروری ہے۔ جب برِعظیم کے سیاست دانوں نے بلا امتیاز مذہب و ملت سائمن کمیشن کی سفارشات رد کر دیں تو لارڈ برکن ہیڈ (م ۱۹۳۰ء) نے برِعظیم کے سیاست دانوں کو یہ دعوت دی کہ وہ برطانیہ کی نافذ کردہ اصلاحات پر ہمیشہ منفی انداز میں نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں۔ انہیں چاہیے کہ وہ خود کوئی دستور بنا کر پیش کریں۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس نے ایک محفل میں یہ کہا تھا، کہ اگر ہندوستانیوں میں اتنی لیاقت پیدا ہو گئی ہے تو وہ دستور کا خاکہ تیار کر کے دکھائیں۔

ہندو اور مسلم رہنماؤں نے لارڈ برکن ہیڈ کے اس چیلنج کو قبول کر لیا اور فروری ۱۹۲۸ء میں دہلی میں آل پارٹیز کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ اس کانفرنس کے آغاز ہی میں

ہندو مسلم اختلافات اُبھر کر سامنے آ گئے۔ کانفرنس کے مندوبین کے پیش نظر چند اہم نکات تھے، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ بات چیت کرتے وقت کامل ذمہ دار حکومت کے قیام کو مدِ نظر رکھا جائے اور فرقہ وارانہ نمائندگی اور تعلقات کا تعین کیا جائے۔ دو ماہ کے اندر آل پارٹیز کانفرنس کے ۲۵ اجلاس منعقد ہوئے، لیکن مندوبین کسی نتیجے پر نہ پہنچ پائے اور کانفرنس ملتوی کر دی گئی۔

۱۹ مئی ۱۹۲۸ء کو بمبئی میں کانفرنس کا ملتوی شدہ اجلاس دوبارہ طلب کیا گیا لیکن پہلے اجلاسوں میں ہندو مندوبین کی کج فہمی اور کج بحثی کی وجہ سے بہت سی جماعتوں کے مندوبین نے بمبئی کے اجلاس میں شرکت کرنا گوارا نہ کی۔ بمبئی کے اس اجلاس میں گاندھی جی، پنڈت موتی لعل نہرو، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مسز اینی بیسنٹ کے علاوہ اور کسی نے شرکت نہ کی۔ مندوبین کی کانفرنس میں عدم دلچسپی کی بنا پر گاندھی جی نے کانفرنس ملتوی کرنے کا مشورہ دیا۔ بعض حضرات نے یہ بھی کہا کہ اجلاس ملتوی کرنے کی بجائے کانفرنس کو ہی توڑ دیا جائے۔ اس پر چند سمجھ دار سیاست دانوں نے یہ کہا کہ کانفرنس توڑنے سے عوام میں مایوسی پھیلے گی اور لارڈ برکن ہیڈ کو یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ برِعظیم کے باشندے دستور بنانے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ اس پر گاندھی جی نے یہ کہا کہ پھر ایک کمیٹی بنا دی جائے جو دستور مرتب کرے۔ اس موقع پر مولانا شوکت علی نے گاندھی جی کی تجویز کی حمایت کی اور درج ذیل حضرات پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی:

۱۔ پنڈت موتی لعل نہرو (صدر)
۲۔ محمد شعیب قریشی (م ۱۹۶۲ء)
۳۔ مسٹر مکند رام راؤ جیکار (م ۱۹۵۹ء)
۴۔ سبھاش چندر بوس (اقبال حسن ریاض)
۵۔ سردار منگل سنگھ
۶۔ مسٹر ایم ایس۔ اینے

اس کمیٹی کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ حسب ضرورت ارکان کا اضافہ کر سکتی ہے اور اس شق کا فائدہ بھی ہندوؤں کو پہنچا اور کمیٹی کے صدر پنڈت موتی لعل نہرو نے

سرتیج بہادر سپرو، جی آر پردھان، ایم، این جوشی اور سر علی امام کو اس کمیٹی میں شامل کر لیا۔ پنڈت جواہر لعل نہرو اس کمیٹی کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔

جب اس کمیٹی کے اجلاس منعقد ہونے لگے تو تین ارکان نے اپنی ذمہ داری کا مُطلق خیال نہ کیا۔ مسٹر ایم آر جیکار نے کسی بھی میٹنگ میں شرکت نہ کی۔ سر علی امام (م ۱۹۳۲ء) اپنی دیگر معروفیات کی بنا پر صرف ایک ہی میٹنگ میں شرکت کر پائے۔ مسٹر این ایم جوشی نے کہا کہ وہ صرف اسی صورت میں میٹنگ میں شرکت کرے گا جب اسے مزدوروں کے حقوق پر غور کرنے کی یقین دہانی کرائی جائے گی۔

کمیٹی کے اجلاس الہ آباد میں ہونے لگے اور تین ماہ میں کمیٹی نے اپنا کام مکمل کر لیا۔ کمیٹی پر چونکہ ہندو چھائے ہوئے تھے، اس لئے کمیٹی نے تمام کام ہندوؤں کے مفاد کے لئے کیا اور مسلمانوں کے مطالبات اور حقوق یکسر نظر انداز کر دیئے۔ کمیٹی کے صدر پنڈت مُوتی لعل نے اپنی مرتب کردہ رپورٹ منظور کرانے کی غرض سے ۲۸ تا ۳۰ اگست لکھنؤ میں آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاس طلب کیا۔ مولانا محمد علی جوہر اور قائداعظم محمد علی جناح ان دنوں لندن میں تھے اس لئے وہ اجلاس میں شریک نہ ہو سکے۔

پنڈت مُوتی لعل نہرو نے جو رپورٹ تیار کی اس پر محمد شعیب قریشی نے اختلافی نوٹ لکھا۔ جس رپورٹ کی تیاری کے دوران میں اتنا زیادہ پراپیگنڈا کیا گیا تھا، جب وہ سامنے آئی تو مسلمانوں کو سخت مایوسی ہوئی۔ یہ رپورٹ ہندوؤں کی روایتی تنگ نظری کی مظہر تھی۔ اس کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

۱۔ ہندوستان کو ڈومینین سٹیٹس (نو آبادیاتی درجہ) دیا جائے۔
۲۔ مرکز میں وحدانی طرزِ حکومت رائج کیا جائے۔
۳۔ جداگانہ انتخاب کی جگہ مخلوط انتخاب کا طریقہ رائج کیا جائے۔
۴۔ سندھ کو صرف اسی صورت میں بمبئی سے الگ کیا جائے، جب اس بات کا مکمل اطمینان ہو جائے کہ یہ نیا صوبہ اپنے اخراجات برداشت کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔
۵۔ ایسا فرقہ جس کی آبادی دس فیصد سے کم ہو، اسے کسی طرح کا تحفظ فراہم نہ کیا جائے۔

۶۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں کسی طرح کی بھی اصلاحات نافذ نہ کی جائیں۔
۷۔ مرکز میں مسلمانوں کو 1/3 کی بجائے 1/4 نشستیں دی جائیں۔

نہرو رپورٹ کا رَدِّ عمل:

نہرو رپورٹ کے منظرِ عام پر آتے ہی مسلمانوں میں سخت مایوسی پھیل گئی۔ انہیں یہ معلوم ہو گیا کہ کانگرس، ہندو مہاسبھا کے زیرِ اثر آ گئی ہے اور وہ برِعظیم میں ہندو راج قائم کرنا چاہتی ہے۔

جہاں تک نہرو رپورٹ کی پہلی شق کا تعلق ہے، پنڈت مُوتی لعل نہرو نے اسے اپنے ہندو رفقاء کے مشورے سے برِعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کو ڈومینین سٹیٹس (نو آبادیاتی درجہ) دینے کا مطالبہ کیا تھا۔ جبکہ مولانا حسرت موہانی اور ان کے ہم خیال سیاست دان مکمل آزادی کے خواہاں تھے۔ اس لئے مولانا حسرت موہانی نے اس شق کو ملک و ملّت کے ساتھ غداری کے مترادف قرار دیا۔

دوسری شق میں وحدانی طرزِ حکومت رائج کرنے کی سفارش کی گئی تھی۔ اس طرزِ حکومت میں تمام اختیارات مرکز کے پاس ہوتے ہیں اور صوبوں کے پاس برائے نام اختیارات رہ جاتے ہیں۔ مسلمان یہ چاہتے تھے کہ برِعظیم میں وفاقی طرزِ حکومت رائج کیا جائے جس میں مرکز کے پاس صرف چار پانچ محکمے ہوں اور باقی تمام امور صوبوں کے پاس ہوں۔

جہاں تک مخلوط انتخاب کا تعلق ہے، کانگرس میثاقِ لکھنؤ میں جداگانہ انتخاب تسلیم کر چکی تھی۔ مسلمانوں نے دہلی تجاویز میں صرف اس شرط پر جداگانہ انتخاب کے حق سے دستبردار ہونے پر آمادگی ظاہر کی تھی کہ ہندو سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے ایک صوبہ بنا دیں اور صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اصلاحات کے نفاذ کو یقینی بنائیں۔ اسی طرح مرکز میں مسلمانوں کو 1/3 نشستیں دے دیں۔ کانگرس نے ہندو مہاسبھا کے زیرِ اثر ان شرائط کو مانے بغیر مخلوط انتخابات کا مطالبہ کر دیا۔ جن فرقوں کا تناسب دس فیصد سے کم تھا، پنڈت مُوتی لعل نہرو نے اسے فرقہ ہی ماننے سے انکار کر دیا۔ اس طرح وہ ہر قسم کے تحفظ سے محروم ہو گئے۔

مولانا محمد علی جوہر اور قائداعظم ان دنوں انگلستان میں تھے ۔ مولانا محمد علی جوہر نے نہرو رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اسے قبول کرنے کا مطلب ہندوؤں کی دائمی غلامی ہوگا اور اگر اس رپورٹ کے مطابق اصلاحات نافذ کی گئیں تو پھر ہندوؤں کا غلبہ ہو جائے گا ۔

مولانا محمد علی جوہر (م ۱۹۳۱ء) کے برادرِ بزرگ مولانا شوکت علی (م ۱۹۳۸ء) نے نہرو رپورٹ پڑھنے کے بعد فرمایا کہ انہیں جوانی میں شکاری کتے پالنے کا شوق تھا ۔ وہ کتے خرگوش کے ساتھ بھی ایسا ناروا سلوک نہ کرتے تھے ، جیسا نہرو رپورٹ میں مسلمانوں کے ساتھ روا رکھا گیا ہے ۔

قائداعظم نے نہرو رپورٹ پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ اب ہمارا اور ان کا راستہ الگ الگ ہو گیا ہے ۔

قائداعظم اس وقت تک کانگرس اور مسلم لیگ دونوں جماعتوں کے رکن تھے ۔ نہرو رپورٹ کی اشاعت کے بعد انہوں نے کانگرس کی بنیادی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا ۔

آغا خاں سر سلطان محمد شاہ سوم (م ۱۹۵۷ء) نے نہرو رپورٹ کے منصۂ شہود پر آنے کے بعد کہا کہ کوئی باشعور انسان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ مسلمان ان ذلت آمیز شرائط کو مان لیں گے ۔

دسمبر ۱۹۲۸ء کے آخری ہفتے میں خلافت کانفرنس کا اجلاس مولانا محمد علی جوہر کی صدارت میں منعقد ہوا تو حاضرین نے متفقہ طور پر نہرو رپورٹ مسترد کر دی ، اور تو اور کانگرس کی ذلہ ربا اور ذیلی جماعت جمعیت العلماء ہند نے بھی نہرو رپورٹ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ۔

مسلمانوں کے برعکس ہندو سیاستدان اس رپورٹ کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پائے جانے والے تمام مسائل کا حل سمجھ رہے تھے ، بلکہ انہوں نے یہاں تک کہا کہ دستوری خاکہ تیار ہے اور جو کام رائل کمیشن نے انجام دینا تھا وہ ہم نے کر دکھایا ہے ۔ اب برطانوی حکومت کو چاہیے کہ وہ ان سفارشات کو من و عن منظور کر لے ۔

ادھر برطانیہ کے سیاسی حلقوں میں بھی نہرو رپورٹ کی پذیرائی نہ ہوئی ۔ لندن کے موقر روزنامہ " ٹائمز " نے جو برطانیہ کے چوٹی کے سیاستدانوں کا ترجمان سمجھا جاتا ہے ، ان لوگوں کے ساتھ مکمل اتفاق رائے کیا جو نہرو رپورٹ کو ہندو راج کے قیام کی سکیم سمجھتے تھے ۔ برطانوی اخبارات نے برطانیہ کی رائے عامہ کو یہ باور کرا دیا کہ نہرو رپورٹ یک طرفہ ہے اور اس میں صرف ہندوؤں کے مفادات کو ہی مدِنظر رکھا گیا ہے ۔

○○○○

باب (23)

قائداعظم کے چودہ نکات

جس وقت نہرو رپورٹ منظرِ عام پر آئی اس وقت قائداعظم انگلستان میں تھے ۔ مسلم لیگ افتراق کی وجہ سے دو دھڑوں میں تقسیم ہو چکی تھی ۔ قائداعظم نے انگلستان سے واپسی کے بعد مارچ ۱۹۲۹ء میں دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس طلب کیا تاکہ نہرو رپورٹ پر غور و خوض کے بعد متفقہ لائحۂ عمل اختیار کیا جائے ۔

اس موقع پر کانگرس کے ایماء پر کانگرس کے چند حاشیہ بردار مسلم ارکان اجلاس کی فضا کو مکدّر کرنے کی غرض سے اجلاس میں پہنچ گئے ۔ کانگرس کے ان مُہروں میں خواجہ عبدالمجید (م ۱۹۶۲ء) رفیع احمد قدوائی اور ڈاکٹر عالم پیش پیش تھے ۔ خواجہ عبدالمجید خود کو نیشنلسٹ مسلمانوں کا سرخیل سمجھتے تھے ۔ وہ لالہ ہردیال (م ۱۹۳۹ء) جیسے مہاسبھائیوں کے ہمنوا ہو کر اس بات کے داعی تھے کہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کو اپنے نام ہندوانہ طرز کے رکھنے چاہئیں اور اپنا اسلامی تشخص ختم کرکے ہندوؤں کے دھارے میں ضم ہو جانا چاہیے ۔ ان کے بیٹوں کے نام ہندوانہ طرز کے تھے۔ ان میں سے ریوندر خواجہ کو راقم الحروف نے دیکھا ہے ۔ ان کی یہ خواہش تھی کہ مسلم لیگ کے اس اجلاس میں نہرو رپورٹ کو من و عن تسلیم کروا لیا جائے ۔ قائداعظم کی اجلاس میں تشریف آوری سے پہلے ان نیشنلسٹ مسلمانوں نے ڈاکٹر عالم کو کرسیٔ صدارت پر بٹھا کر نہرو رپورٹ منظور کرانے کی ناکام کوشش کی تو مسلم لیگ کے آفس سیکرٹری شمس الحسن (م ۱۹۸۱ء) نے پولیس طلب کرلی اور پولیس کی مدد سے ان کانگرسی مُہروں کو اجلاس سے نکالا ۔

جب قائداعظم تشریف لائے تو جلسہ کی باقاعدہ کارروائی شروع ہوئی ۔ اسی تاریخی اجلاس میں قائداعظم نے اپنے مشہور زمانہ چودہ نکات پیش کئے اور مسلم لیگ نے

کافی غور و خوض کے بعد ان کے پیش کردہ نکات منظور کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ جب تک ان نکات کو دستور کی اساس نہ بنایا جائے، اس وقت تک مسلمان اس دستور کو منظور نہیں کریں گے ۔

قائداعظم کے چودہ نکات درج ذیل ہیں:

۱ ۔ ملک میں وفاقی طرزِ حکومت رائج کیا جائے ، جس میں صوبوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات حاصل ہوں (یاد رہے کہ پنڈت مُوتی لعل نہرو نے وحدانی طرز حکومت کے قیام کا مطالبہ کیا تھا ، جس میں صوبوں کے پاس بہت کم اختیارات ہوتے ہیں اور مرکزی حکومت بہت مضبوط اور بااختیار ہوتی ہے) ۔

۲ ۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو 1/3 نشستیں دی جائیں (نہرو رپورٹ میں مسلمانوں کو 1/4 نشستیں دینے کی سفارش کی گئی تھی) ۔

۳ ۔ صوبہ سرحد اور صوبہ بلوچستان میں اصلاحات نافذ کرکے انہیں بھی دوسرے صوبوں کے مساوی درجہ دیا جائے (پنڈت مُوتی لعل نہرو نے مسلم اکثریت کے ان صوبوں میں اصلاحات نافذ کرنے اور انہیں دوسرے صوبوں کے مساوی درجہ دینے کی مخالفت کی تھی. اس کے باوجود بعض لوگ پنڈت مُوتی لعل نہرو کو بڑا آزاد خیال اور وسیع القلب سیاستدان مانتے ہیں) ۔

۴ ۔ سندھ کو بمبئی پریذیڈنسی سے الگ کرکے صوبہ کا درجہ دیا جائے (پنڈت مُوتی لعل نہرو نے اپنی رُسوائے زمانہ رپورٹ میں سندھ کو صوبہ بنانے کے لئے یہ شرط عائد کی تھی کہ ایک کمیٹی تشکیل دی جائے اور وہ اس بات کا جائزہ لے کر اگر سندھ کو بمبئی پریذیڈنسی سے الگ کرکے صوبے کا درجہ دے دیا جائے تو وہ اپنے وسائل سے اپنے مصارف برداشت کر لے گا ۔ اس زمانے میں بمبئی پریذیڈنسی میں موجودہ مہاراشٹر کے علاوہ گجرات ، کاٹھیاواڑ اور سندھ شامل تھے ۔ اس لئے بمبئی میں بیٹھ کر ایک گورنر کے لئے اتنے وسیع صوبے کا انتظام چلانا مشکل تھا ۔ اسے وہی دشواریاں پیش آ رہی تھیں جو لارڈ کرزن کے زمانے میں متحدہ بنگال کا نظم و نسق چلانے میں گورنر کو پیش آ رہی تھیں)۔

۵۔ اگر کبھی لسانی یا کسی اور بنا پر موجودہ صوبوں کی نئی حد بندی کی جائے، تو اس بات کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلمان اقلیت میں تبدیل ہو کر نہ رہ جائیں (آزادی کے بعد بھارت میں قریب قریب تمام صوبوں کی نئی حد بندیاں کی گئی ہیں۔ سابق ریاست حیدر آباد کو آندھرا پردیش، تامل ناڈو اور مہاراشٹر میں ضم کر دیا گیا ہے۔ جو ہندو سندھ کو بمبئی سے الگ کرنے کی مخالفت کر رہے تھے، انہوں نے گجرات اور کاٹھیاواڑ کو بمبئی سے الگ کر کے ایک نیا صوبہ بنا دیا ہے۔ راجستھان کے بعض علاقے مثلاً گوالیار کو مدھیہ پردیش میں شامل کر دیا ہے اور اسی طرح مدھیہ پردیش کا بہت سا علاقہ مہاراشٹر میں شامل کر دیا ہے۔ خالصتان کے ممکنہ قیام کو روکنے اور بصورت دیگر سکھوں کو بہت کم علاقہ دینے کی غرض سے مشرقی پنجاب کو تین صوبوں میں منقسم کر دیا ہے۔ انبالہ سے لے کر نارنول اور پٹودی تک کا علاقہ ہریانہ میں شامل کر دیا اور شملہ، منڈی، سکیت اور کانگڑہ کو ہماچل پردیش کے نام سے نیا صوبہ بنا دیا۔ ہندوؤں کی اسی ذہنیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے قائداعظم نے یہ فرمایا کہ اگر کبھی صوبوں کی نئی حد بندی کی جائے تو اس بات کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے کہ مسلم اکثریت اقلیت میں تبدیل نہ ہو جائے)۔

۶۔ حکومت مسلمانوں کے اداروں (مثلاً مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ندوۃ العلماء لکھنؤ اور مختلف شہروں میں قائم شدہ اسلامیہ کالجوں اور اسلامیہ ہائی سکولوں، رفاہی اداروں اور سماجی تنظیموں) اور ان کی تہذیب و ثقافت کو تحفظ فراہم کرے۔

۷۔ جب تک اسمبلی میں کسی فرقے کے نمائندوں کی 3/4 تعداد منظوری نہ دے اس وقت تک اس فرقے کے بارے میں کوئی قانون نہ بنایا جائے (اس شق سے مسلمانوں کے علاوہ سکھوں کو بھی تحفظ ملتا تھا)۔

۸۔ جب تک وفاق میں شامل تمام صوبے متفق نہ ہوں اس وقت تک دستور میں کوئی ترمیم نہ کی جائے۔

۹۔ برعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش میں بسنے والی تمام اقوام کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہونی چاہیے (یہ شق سکھوں، بدھوں، پارسیوں اور جینیوں کے بھی مفاد میں تھی)۔

۱۰۔ مسلمانوں کو ان کی قابلیت کی بنا پر ملازمتیں دی جائیں (اس وقت یہ ہو رہا تھا کہ

سرکاری ملازمتوں پر ہندوؤں کی قریب قریب اجارہ داری تھی۔ پنجاب جیسے مسلم اکثریت کے صوبے میں محکمہ تعلیم میں مسلمانوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ جب سر فضل حسین وزیر تعلیم بنے تو انہوں نے کہا کہ پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی ۵۶ فیصد ہے، اس لئے محکمہ تعلیم میں ان کا تناسب ۵۶ فیصد ہونا چاہیے۔ اس پر گاندھی جی نے بڑا واویلا مچایا اور کہا کہ سر فضل حسین کے اس بیان سے فرقہ پرستی کی بُو آتی ہے۔ کاش گاندھی جی کو فرقہ پرستی کی بُو نہرو رپورٹ سے بھی آ جاتی)

۱۱۔ وفاق میں شامل تمام صوبائی اسمبلیوں میں اقلیتوں کو موثر نمائندگی ملنی چاہیے (قائداعظم یہ چاہتے تھے کہ انہیں اپنی آبادی کے تناسب سے ذرا زیادہ نشستیں دے دی جائیں تاکہ وہ اسمبلی میں موثر کردار ادا کر سکیں)۔

۱۲۔ وفاق میں شامل تمام صوبوں کو مکمل آزادی حاصل ہو اور ان کے اختیارات میں یکسانیت ہو۔ (اس وقت یہ ہو رہا تھا کہ مدراس پریذیڈنسی اور بمبئی پریذیڈنسی کو دوسرے صوبوں کے مقابلے میں زیادہ اختیارات حاصل تھے۔ صوبہ سرحد میں گورنر کی جگہ لیفٹیننٹ گورنر کا تقرر ہوتا تھا، جس کے اختیارات گورنر سے کم ہوتے تھے۔ بلوچستان میں گورنر کی جگہ وائسرائے کا ایجنٹ یا کمشنر ہوتا تھا جس کے اختیارات لیفٹیننٹ گورنر سے بھی کم ہوا کرتے تھے)۔

۱۳۔ جداگانہ انتخاب کا طریقہ برقرار رکھا جائے (نہرو رپورٹ میں مخلوط انتخاب کی سفارش کی گئی تھی۔ اگر رپورٹ کے مطابق مخلوط انتخاب رائج ہو جاتے تو مسلمانوں کے لئے ۱۹۰۶ء سے پہلے کی صورت حال پیدا ہو جاتی۔ ہندو اپنی اکثریت کے بل بوتے پر تمام اداروں پر قابض ہو جاتے اور یوں ہندو راج کے قیام کے لئے زمین ہموار ہو جاتی)۔

۱۴۔ مرکزی اور صوبائی وزارتوں میں مسلمان وزیروں کی تعداد 1/3 ہونی چاہیے۔

چودہ نکات پر تبصرہ:

قائداعظم کے چودہ نکات ان کے تدبر اور سیاسی بصیرت کی بہترین مثال ہیں۔ انہوں نے ان نکات کے ذریعے برعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش میں مسلمانوں کا مستقبل محفوظ بنا دیا۔ قائداعظم نے مرکز اور صوبوں میں مسلم وزیروں کی تعداد 1/3

مقرر کرنے کا مطالبہ کیا اور جداگانہ انتخاب کو برقرار رکھ کر مسلمانوں کا تحفظ قائم رکھا اور اسمبلیوں میں ان کی نشستوں کو یقینی بنا دیا۔ دوسری جانب انہوں نے برطانوی حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ مسلمانوں کے تعلیمی اور سماجی اداروں، ان کی تہذیب و ثقافت اور ان کی تاریخی عمارات کے تحفظ کی ضمانت فراہم کرے۔ انہوں نے سندھ کو صوبہ بنانے اور سرحد اور بلوچستان کو دوسرے صوبوں کے مساوی درجہ دینے کی سفارش کی اور حکومت کو صوبوں کی ایسی نئی حد بندی سے روکا جس سے مسلم اکثریت اقلیت میں تبدیل ہوتی ہو۔ ہندوؤں کی مخالفت کے باوجود قائداعظم کے یہی چودہ نکات ۱۹۳۵ء کے آئین کی اساس بنے۔

ہندوؤں کا رَدِ عمل:

دوسری جانب قائداعظم کے چودہ نکات منظر عام پر آتے ہی ہندوؤں نے حسبِ معمول واویلا شروع کر دیا۔ ہندوؤں نے یہ کہنا شروع کیا کہ یہ چودہ نکات ہندوستانی نیشنل ازم (جس کے داعی خواجہ عبدالمجید، رفیع احمد قدوائی اور ڈاکٹر عالم وغیرہم تھے) کی رُوح کے منافی ہیں اور اگر برطانوی حکومت نے ان پر عمل کیا تو ہندوستان کی وحدت ختم ہو جائے گی۔ سندھ کو علیحدہ صوبہ بنانے کے بارے میں ہندوؤں نے حکومت کو یہ تاثر دیا کہ یہ ایک طرح سے عیاشی ہو گی۔ (کیا ہریانہ، ہماچل پردیش، اروناچل، ناگالینڈ، میزورام، کیرالا، کرناٹک اور گجرات کو صوبوں کا درجہ دینا عیاشی کے زمرہ میں نہیں آتا؟ ہندوؤں کی سوچ کے اسی دوہرے معیار نے مسلمانوں کو الگ وطن کے مطالبے پر مجبور کیا)۔ جس رُوز قائداعظم کے چودہ نکات منصۂ شہود پر آئے اسی رُوز سے کانگرس اور ہندوؤں کی مذہبی جماعتوں نے ان کی شدید مخالفت شروع کر دی اور فرقہ وارانہ نمائندگی اور فرقہ وارانہ مسائل کو گھمبیر بنا کر ان کے حل کی تمام راہیں مسدود کر دیں۔

علامہ سر محمد اقبال کا خطبۂ الہ آباد

جن دنوں لندن میں پہلی گول میز کانفرنس کی کاروائی جاری تھی، انہی ایام میں الہ آباد میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ کرسمس کی تعطیلات کی وجہ سے کانگرس اور مسلم لیگ کے اجلاس دسمبر کے آخری ہفتے میں منعقد ہوا کرتے تھے۔ اس سے لوگوں کو ان جلسوں میں شرکت کے لئے آسانی رہتی تھی۔

گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے مسلم لیگ کے بڑے بڑے رہنما مثلاً قائداعظم، سر محمد شفیع، ابوالقاسم فضلُ الحق، مولانا محمد علی جوہر اور سر غلام حسین ہدایت اللہ لندن میں قیام پذیر تھے۔ اس لئے الہ آباد کے اجلاس کی صدارت کا قرعہ فال علامہ سر محمد اقبال کے نام پڑا۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو انہوں نے اپنے صدارتی خطبے میں بڑے کام کی باتیں کیں۔

خطبۂ الہ آباد کے اہم نکات:

علامہ اقبال نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ وہ نہ ہی کسی پارٹی کے رہنما ہیں اور نہ ہی کسی لیڈر کے پیروکار۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسلام، اسلامی قانون و سیاست، اسلامی ثقافت، اسلامی تاریخ و ادب کے مطالعہ میں صرف کیا ہے۔ ان عناصر کے ساتھ مسلسل رابطہ رکھنے کی وجہ سے انہیں اسلام کی اہمیت کی پہچان عطا ہوئی ہے۔

اگر کوئی مذہب سے اخروی زندگی مراد لیتے ہیں تو پھر یورپ میں عیسائیت کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔ حضرت عیسٰے علیہ السلام کے آفاقی نظامِ اخلاق کی جگہ قومی نظام ہائے اخلاق و سیاست نے لے لی اور یورپ میں مذہب ایک فرد کا نجی معاملہ بن گیا جس کا انسان کی دنیوی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔

اسلام انسان کی وحدت کو دو متصادم حصوں رُوح اور مادہ میں تقسیم

نہیں کرتا۔ اسلام میں خدا اور کائنات، رُوح اور مادہ، دین اور ریاست ایک دوسرے کا حصہ ہیں۔

اسلام ایک زندہ قوت ہے جو انسان کو جغرافیائی حدود سے نکال کر (آفاقی قدروں کا قائل کر دیتا ہے) فرد اور ریاست کی زندگی میں مذہب کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ علامہ اقبال نے اس موقع پر واشگاف الفاظ میں فرمایا کہ ان کا یہ ایمان ہے کہ اسلام بذاتِ خود ایک تقدیر ہے، وہ کسی تقدیر کے تابع نہیں۔ اس موقع پر انہوں نے فرمایا کہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اس میں انسانی زندگی کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی مسائل کا حل موجود ہے جو جدید دور کے چیلنجوں کو قبول کرنے کی مکمل صلاحیت رکھتا ہے۔

متحدہ قومیت کے موضوع پر اظہارِ خیال فرماتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ اس ملک میں مختلف قوموں کا اپنی روایات اور ثقافتی انفرادیت کو ختم کرکے ایک قومیت اختیار کر لینا ممکن نہیں ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ عناد رکھتی ہے اور پُر سکون بقائے باہمی کا کوئی اصول ابھی تک وضع نہیں کیا جا سکا۔

علامہ صاحب نے اس موقع پر ببانگِ دُہل فرمایا کہ اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے کہ ہندوستانی مسلمان اپنے وطن میں اپنی ثقافت اور روایات کے مطابق آزادانہ ترقی کا حق رکھتے ہیں تو وہ اس ملک کی آزادی کے لئے سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہیں۔

علامہ صاحب نے برِ عظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کے نسلی، لسانی، سماجی اور ثقافتی تنوع کا ذکر کیا جو ہمیشہ سے اس ملک کا طرہ امتیاز رہا ہے۔ (اس ملک میں ہندو، مسلم، سکھ، بدھ، جینی، عیسائی، پارسی، یہودی اور بہت سے لادین قبائل آباد تھے، جو اپنے اپنے مذہب پر کاربند تھے۔ اس ملک میں ۲۸۰ کے لگ بھگ زبانیں بولی جاتی تھیں، جن میں سے درجن بھر زبانوں کو سرکاری سطح پر تسلیم کیا گیا تھا اور کرنسی نوٹوں پر انہی زبانوں میں رقم لکھی جاتی تھی۔ ان تمام قوموں کا لباس بلکہ خوراک بھی ایک دوسرے سے الگ تھی۔ ان کی تہذیب و ثقافت بھی آپس میں نہیں

ملتی تھی۔ ان کے فنِ تعمیر میں بھی نمایاں فرق تھا۔ ان حالات میں انہیں ایک قوم سمجھنا بڑی نادانی تھی)۔ ان اختلافات کے حل کے لئے حضرت علامہ نے فرمایا کہ اس کا بہترین حل یہ ہے کہ اس تنوع کو تسلیم کر لیا جائے، ورنہ یہاں کوئی سیاسی نظام کامیاب نہیں ہو سکتا۔

تقسیمِ ہند کی تجویز:

اس تاریخی خطبے میں حضرت علامہ نے یہ تاریخی الفاظ کہے:

"میں یہ دیکھنا پسند کروں گا کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک ریاست بنا دیا جائے۔ حکومت خود اختیاری خواہ سلطنت برطانیہ کے اندر ہو یا اس کے باہر، مجھے ایک متحد شمال مغربی ہندوستانی مسلم ریاست کی تشکیل مسلمانوں کا، کم سے کم شمال مغرب کے مسلمانوں کا، آخری مقدر معلوم ہوتی ہے۔

انہوں نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ہندوؤں اور انگریزوں کو مسلم ریاست کی تشکیل سے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ ہندوستان دنیا میں سب سے بڑا ملک ہے۔ ایک ثقافتی قوت کی حیثیت سے اس ملک میں اسلام کی بقاء کا انحصار اس بات پر ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرتکز کر دیا جائے۔ اسی بنا پر میں یہ مطالبہ کرتا ہوں کہ ہندوستان اور اسلام کے مفاد کے پیشِ نظر ایک مستحکم مسلم ریاست قائم کی جائے یہ امر ہندوستان کے لئے اندرونی توازنِ اقتدار اور اس کے نتیجہ میں امن و سکون کا باعث بنے گا اور اسلام کے لئے موقع فراہم کرے گا کہ اپنے اوپر سے اس نقش کو اُتار دے جو اسے عرب بادشاہت نے پہنا دیا تھا۔ اسلام اپنے قانون، اپنی تعلیم، اپنی ثقافت کو ترقی دے اور انہیں اصل اسلامی رُوح اور دورِ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر دے (ملخصاً)۔

یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ پنڈت جواہر لعل نہرو نے ۱۹۲۸ء میں شہرِ اقبال لاہور میں کانگرس کے سالانہ اجلاس میں ہندوستان کی آزادیٔ کامل کا مطالبہ کیا تھا اور ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال نے نہرو کے آبائی شہر الٰہ آباد میں "قیامِ پاکستان" کا مطالبہ کر دیا۔

گول میز کانفرنس

مئی ۱۹۲۹ء میں برطانوی پارلیمنٹ کے انتخابات میں برسر اقتدار کنزرویٹو پارٹی کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور لیبر پارٹی واضح اکثریت سے کامیاب ہوئی۔ لیبر پارٹی کے رہنما رمزے میکڈانلڈ نے وزیر اعظم کا منصب سنبھالا اور مسٹر ویجوڈ بین وزیر امور ہند مقرر ہوا۔ ان دونوں حضرات کے کانگرسی رہنماؤں کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے۔ رمزے میکڈانلڈ کی ہندو نوازی کی بناء پر مولانا محمد علی اسے رامجی مکندالی کہا کرتے تھے۔

رمزے میکڈانلڈ کے نام قائد اعظم کا خط:

انگلستان میں حکومت کی تبدیلی کے ساتھ برِعظیم کے بارے میں پالیسی میں بھی تبدیلی آئی۔ قائداعظم نے ۲۹ جون ۱۹۲۹ء کو رمزے میکڈانلڈ (م ۱۹۳۷ء) کے نام خط تحریر فرمایا۔ جس میں انہوں نے سائمن کمیشن کی تشکیل اور اس کی کارکردگی کی مذمت کرتے ہوئے برطانوی وزیر اعظم پر یہ بات واضح کر دی کہ برِعظیم کے باشندوں کو برطانیہ کے وعدوں پر اعتماد نہیں رہا، اس لئے یہ مناسب ہوگا کہ ملک معظم کی حکومت (برِعظیم کے سیاسی مسائل کے حل کے لئے) برِعظیم کے با اثر نمائندوں کو ایک کانفرنس میں شرکت کی دعوت دے۔ اگر یہ دعوت نامے وزیر اعظم برطانیہ کے نام سے جاری کئے جائیں گے تو پھر اس کانفرنس میں شرکت سے کسی کو انکار نہیں ہوگا۔

قائداعظم کی اس تجویز کی تائید مسلم لیگ کی ہم خیال جماعت مسلم کانفرنس نے بھی کی۔ علامہ اقبال اور پنجاب کے سیاسی رہنماؤں نے بھی اس تجویز کو سراہا اور ساتھ ہی حکومت پر واضح کر دیا کہ وہ صرف قوم کے صحیح نمائندوں کو ہی مدعو کرے بصورتِ دیگر کانفرنس کا انعقاد بے معنی ہوگا۔

کانگرس کا منفی رویہ

دوسری جانب کانگرس نے اپنے کلکتہ کے اجلاس میں حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لئے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اگر ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء تک برطانوی حکومت نے نہرو رپورٹ کو برِعظیم کے لئے نئے دستور کی اساس قرار نہ دیا تو وہ کامل آزادی کے لئے سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دے گی۔ ۱۹۲۸ء میں کانگرس کا سالانہ اجلاس لاہور میں دریائے راوی کے کنارے منعقد ہوا جس میں آزادیٔ کامل کی قرار داد پاس کی گئی تھی۔

پہلی گول میز کانفرنس:

کانگرس کے عدم تعاون کے باوجود ۱۲ نومبر ۱۹۳۰ء کو لندن میں جارج پنجم نے پہلی گول میز کانفرنس کا افتتاح کیا۔ اس کانفرنس میں ۵۷ نمائندوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ ان میں چودہ نمائندے دیسی ریاستوں کے اور اٹھارہ نمائندے مسلمانوں کے تھے۔ ریاستوں کے نمائندوں میں مہاراجہ بڑودہ، مہاراجہ پٹیالہ، مہاراجہ بیکانیر، حمید اللہ خان نواب بھوپال، راجہ ریوا اور راجہ صاحب جام نگر قابل ذکر ہیں۔ مسلمانوں کی نمائندگی سر آغا خان، قائداعظم، مولانا محمد علی جوہر، نواب احمد سعید چھتاری (م ۱۹۸۲ء) راجہ شیر محمد خان ڈومیلی، ابوالقاسم فضل الحق، سر شاہ نواز، سر غلام حسین ہدایت اللہ صاحبزادہ سر عبد القیوم خان (م ۱۹۳۷ء) ڈاکٹر شفاعت احمد، سید سلطان احمد، سر اے۔ کے غزنوی، سر میاں محمد شفیع، چودھری ظفر اللہ خان اور حافظ ہدا شاہین نے کی۔ بیگم جہاں آرا شاہنواز (م ۱۹۷۹ء) اپنے والد سر میاں محمد شفیع کی سیکرٹری بن کر لندن گئیں۔ ہندوؤں کے نمائندوں میں ہندو مہاسبھا کے صدر مونجے، سری نواس شاستری، سر تیج بہادر سپرو، سر رام سوامی آئر، سر چمن لال، دیوان بہادر رام سوامی، ایم آر جیکار، ڈاکٹر امبید کر اور مسز سبارویان قابل ذکر ہیں۔ پارسیوں کی نمائندگی سر فیروز سیٹھنا، سر ایچ پی مودی اور سر کاؤس جی جہانگیر نے کی۔

کانفرنس کے آغاز پر قائداعظم، سر آغا خان اور مولانا محمد علی جوہر نے ایک مضبوط دھڑا قائم کر لیا اور وہ مسلمانوں کی صحیح نمائندگی کا حق ادا کرتے رہے۔

کانفرنس کے فیصلے:

اس وقت تک برما برِعظیم کا ایک صوبہ تھا۔ پہلی گول میز کانفرنس میں

برما کو برِعظیم سے علیحدہ کرکے الگ ملک بنانے پر اتفاق رائے ہو گیا۔ اسی طرح جب سندھ کی بمبئی پریذیڈنسی سے علیحدگی کا مسئلہ زیرِ غور آیا تو صرف ہندو مہاسبھا کے صدر مونجے نے اس کی مخالفت کی۔ اس کانفرنس میں یہ بات طے ہو گئی کہ برِعظیم میں وفاقی طرزِ حکومت ہی مفید رہے گا۔ سر محمد شفیع، جو ایک زمانے میں دہلی تجاویز کے خلاف تھے، نے بھی وفاقی طرزِ حکومت کی حمایت کی اور دیسی ریاستوں کے نمائندوں کی طرف سے مہاراجہ صاحب بیکانیر نے بھی وفاقی طرزِ حکومت کی حمایت کی اور ہندوستانی ریاستوں کو بھی وفاق میں شامل کرنے پر زور دیا۔ قائداعظم نے اس موقع پر فرمایا کہ وہ مکمل حکومتِ خود اختیار کی حمایت کرتے ہیں، لیکن حکومت یہ جان لے کہ مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کئے بغیر اس مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔

مولانا محمد علی کی آخری تقریر:

مولانا محمد علی ان دنوں بڑے علیل تھے اور وہ ذیابیطس کے مریض تھے۔ برِعظیم سے روانہ ہوتے وقت ان کی یہ حالت تھی کہ انہیں سٹریچر پر ڈال کر جہاز میں سوار کرایا گیا تھا۔ انہوں نے پہلی گول میز کانفرنس میں اپنی آخری تقریر کرتے ہوئے برطانوی حکومت پر یہ واضح کیا کہ وہ صرف اسی صورت میں اپنے وطن جانا پسند کریں گے جب آزادی کی دستاویز ان کے ہاتھ میں ہو گی۔ بصورتِ دیگر وہ ایک غلام ملک میں جانے کی بجائے ایک آزاد ملک میں مرنا پسند کریں گے اور اگر برطانوی حکومت نے برِعظیم کو آزادی نہ دی تو پھر ان کی قبر کے لئے انگلستان میں جگہ دینا پڑے گی۔

مولانا محمد علی جوہر نے جو کہا، وہ سچ کر دکھایا۔ ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو انہوں نے لندن میں وفات پائی۔ ان کی وفات پر برِعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش سمیت تمام مسلم ممالک میں رنج و غم کی لہر دوڑ گئی۔ عالمِ اسلام اپنے ایک بہی خواہ سے اور برِعظیم اپنے ایک سپوت سے محروم ہو گیا۔ برِعظیم کے ہر شہر سے لندن تار روانہ کئے گئے کہ مولانا محمد علی کا جسدِ خاکی ان کے شہر میں دفن کیا جائے۔ اسی دوران میں مفتیٔ اعظم فلسطین نے مولانا شوکت علی کو یہ پیش کش کی کہ وہ اپنے عظیم بھائی کا جسدِ خاکی بیت المقدس لا کر مسجدِ اقصیٰ اور مسجدِ صخرہ کے جوار میں، جہاں سے ختم المرسلین صلی اللہ

علیہ وسلم کو معراج ہوئی تھی، دفن کریں۔ مولانا شوکت علی نے یہ پیش کش قبول کر لی اور مولانا محمد علی کا جسدِ خاکی بابُ السلسلہ سے ملحق ایک حجرے میں سپردِ خاک کر دیا۔ رحمۃ اللہ علیہ واسعاً کثیراً۔

مولانا محمد علی کا دورِ سیاست:

۱۹۱۱ء سے لے کر ۱۹۳۱ء تک کا دَور مولانا محمد علی کا دور تھا۔ ان بیس سالوں کے دوران انہوں نے کئی بار قید و بند کی تکلیف برداشت کی۔ دن رات کی محنت اور پُورے عالمِ اسلام کے درد نے انہیں ذیابیطس جیسے موذی مرض میں مبتلا کر دیا۔ انہوں نے کامریڈ اور ہمدرد جیسے اخبارات کے ذریعے خوابِ خرگوش کے مزے لینے والے مسلمانوں کو بیدار کیا۔ وہ میکالے کا قلم، برک کی زبان اور نپولین کا دل لے کر پیدا ہوئے تھے۔ وہ بیک وقت ایک سیاستدان، صحافی، شاعر اور عظیم مقرر تھے۔ وہ جب انگریزی میں تقریر کرتے تو انگریز انگشت بدنداں رہ جاتے۔ وائسرائے کے اہلِ خانہ کامریڈ کی اشاعت کا انتظار کرتے اور اس کے اداریے پڑھ کر زبان و ادب کا چٹخارہ لیتے۔ ان کی زندگی ایک مومنِ کامل کی زندگی تھی۔ اس لئے ان کی وفات پر جتنا بھی اظہارِ غم کیا جاتا کم تھا۔

پہلی گول میز کانفرنس میں شریک مندوبین اور برطانوی حکومت کے نمائندے وفاق میں شامل صوبوں اور مرکز کے درمیان اختیارات کی تقسیم اور ہندو مسلم تنازعہ جیسے اہم امور کا حل تلاش نہ کر سکے۔ اس کی ایک وجہ کانگرس کی گول میز کانفرنس میں عدمِ شرکت بھی تھی۔ کانفرنس میں شریک مندوبین اور برطانوی حکومت نے یہ محسوس کیا کہ کانگرس کی شرکت کے بغیر گول میز کانفرنس بے معنی رہے گی، کیونکہ موجودہ صورت میں وہ کانفرنس کے فیصلوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے گی، لہٰذا ۱۹ جنوری ۱۹۳۱ء کو پہلی گول میز کانفرنس ختم ہو گئی۔

کانگرس کی سول نافرمانی:

دوسری جانب کانگرس نے کلکتہ کے اجلاس میں یہ دھمکی دی تھی کہ اگر برطانوی حکومت نے ایک مقررہ تاریخ تک نہرو رپورٹ کو من و عن تسلیم نہ کیا تو وہ

سول نافرمانی کی تحریک چلائے گی۔ جب یہ تاریخ گزر گئی تو کانگرس کے فیصلے کے مطابق گاندھی جی نے بحیرۂ عرب کے ایک ساحلی مقام ڈانڈی کی جانب مارچ شروع کر دی۔ اثنائے سفر گروہ در گروہ کانگرسی ان کے شریک سفر ہوتے گئے۔ جب یہ قافلہ ڈانڈی پہنچا، تو انہوں نے سمندری پانی خشک کرکے نمک بنانا شروع کیا۔ اس طرح سے نمک سازی خلاف قانون تھی کیونکہ نمک پر ٹیکس عائد تھا، بدیں وجہ حکومت نے قانون شکنی کرنے پر کانگرس کی مجلس عاملہ کو خلاف قانون جماعت قرار دے کر گاندھی جی، پنڈت جواہر لعل نہرو سمیت متعدد رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے اندازے کے مطابق ساٹھ ہزار سے زائد کانگرسی جیلوں میں بند تھے۔

گاندھی اِروِن پیکٹ:

۵ مارچ ۱۹۳۱ء کو وائسرائے لارڈ اِروِن اور گاندھی جی کے مابین ایک سمجھوتے پر دستخط ہو گئے۔ تاریخ میں یہ سمجھوتہ "گاندھی اِروِن پیکٹ" کے نام سے مشہور ہے۔ اس سمجھوتے کی رو سے کانگرس نے سول نافرمانی کی تحریک ختم کر دی اور حکومت نے اس جماعت پر جو پابندیاں لگائی تھیں وہ ہٹالیں اور تمام قیدی رہا کر دیئے۔ گاندھی اِروِن پیکٹ کے بعد کانگرس نے بھی دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت پر آمادگی ظاہر کر دی۔ یہاں پھر کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے ایک خطرناک چال چلی۔ اس نے اپنی جماعت کی طرف سے گاندھی جی کو واحد نمائندہ مقرر کیا کیونکہ ان کے مہاسبھائی ذہنیت رکھنے والے کانگرس رفقاء یہ جانتے تھے کہ وہ اپنی ضد کے پکے ہیں اور وہ ہندوؤں کے مفادات کے خلاف اور مسلمانوں کے حق میں کوئی تجویز منظور نہ ہونے دیں گے۔

دوسری گول میز کانفرنس:

دوسری گول میز کانفرنس ۷ ستمبر ۱۹۳۱ء کو لندن میں شروع ہوئی اور یکم دسمبر ۱۹۳۱ء تک جاری رہی۔ اس بار نمائندوں میں گاندھی جی اور علامہ محمد اقبال کا اضافہ ہوا۔

دوسری جانب برطانیہ کے سیاسی حالات میں نمایاں تبدیلی آ چکی تھی۔ جب پہلی گول میز کانفرنس شروع ہوئی اس زمانے میں برطانیہ میں لیبر پارٹی برسر اقتدار

تھی اور وہ ہندو نوازی کے لئے مسلمانوں کے سیاسی حلقوں میں کافی حد تک بدنام تھی۔ دوسری گول میز کانفرنس کے انعقاد کے وقت قومی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ وزیر اعظم اگرچہ رمزے میکڈانلڈ ہی تھے لیکن حکومت میں کنزرویو پارٹی کا کافی عمل دخل تھا۔ اس لئے اب رامجی کمنداں راہ راست پر آ چکا تھا۔ بدیں وجہ دوسری گول میز کانفرنس میں گاندھی جی کی وہ ناز برداری نہ ہو سکی، جس کی انہیں توقع تھی۔ وہ کانفرنس میں شریک تو تھے لیکن حکومت کی تائید انہیں حاصل نہ تھی۔

کانفرنس کے دوران وفاقی حکومت کے ڈھانچے کی تفصیلات طے کرنے اور اقلیتوں کے تحفظات کے مسئلے پر غور کرنے کے لئے دو کمیٹیاں بنائی گئیں۔ گاندھی جی کانگرس کے واحد نمائندہ ہونے کی حیثیت سے ان دونوں کمیٹیوں کے رکن تھے۔ ایک ہفتے تک ان کمیٹیوں کے اجلاس ہوتے رہے لیکن ان دونوں مسئلوں پر اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ گاندھی جی کی ہٹ دھرمی اور بے جا ضد تھی۔ وہ یہ کہتے تھے کہ دستور کی تشکیل کے بعد اقلیتوں کے تحفظات کا مسئلہ ایک جوڈیشل کمیٹی (قانونی مجلس عدل) کے سپرد کر دیں گے۔ وہ کمیٹی اس مسئلے کا حل تلاش کر لے گی۔

اقلیتوں نے اس سے یہ مطلب اخذ کیا کہ گاندھی جی اقلیتوں کے تحفظات کو التوا میں ڈال رہے ہیں۔ دستور کی تشکیل کے بعد اعلیٰ ذات کے ہندو اقتدار پر قبضہ کرکے ان کے حقوق پس پشت ڈال دیں گے اور یہ مسئلہ حل طلب رہ جائے گا۔ لہٰذا یہ مسئلہ ابھی حل ہونا چاہیے۔ اس موقع پر اچھوت، مسلمان، ہندوستانی عیسائی، اینگلو انڈین اور برعظیم میں آباد یورپین باشندے وہی مطالب دہرا رہے تھے جو قائداعظم اپنے چودہ نکات میں اقلیتوں کے تحفظات کے بارے میں کر چکے تھے۔

گاندھی بے نقاب ہوا:

گاندھی جی کی ہٹ دھرمی اور بے جا ضد کی وجہ سے اقلیتوں کا مسئلہ طے نہ ہو سکا۔ اس لئے دوسری گول میز کانفرنس یکم دسمبر ۱۹۳۱ء کو ختم ہو گئی۔ بقول سید حسن ریاض دوسری گول میز کانفرنس میں گاندھی جی کے رویّے نے انہیں بے نقاب کر دیا اور پوری دنیا نے جان لیا کہ وہ حد درجے کے متعصب ہندو ہیں اور وہ صرف اور

صرف ہندوؤں کے لیڈر ہیں۔

راقم آثم کو یاد ہے کہ مشہور برطانوی مدبّر اور سیاست دان سر ونسٹن چرچل گاندھی جی کو Half Naked Faqir کہا کرتے تھے۔ اس میں ایک جانب ان کے لباس کی طرف اشارہ ہے اور دوسری جانب ان کی منافقت اور مسلمانوں کے ساتھ روّیے کا، جسے انہوں نے مہاتمائی کے لبادے میں چھپا رکھا تھا۔

ایک بار مشہور محقق اور فاضل ڈاکٹر ناظر حسن زیدی کی موجودگی میں قائداعظم اور گاندھی جی کی شکل و شباہت اور چال ڈھال پر گفتگو کرتے ہوئے راقم آثم نے کہا کہ گاندھی کی صورت دیکھ کر ذوقِ جمال کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ انہوں نے فوراً مجھے ٹوکا اور فرمایا کہ اسے دیکھ کر کراہت ہوتی ہے۔ اس پر راقم نے عرض کیا کہ مجھے حیرت ہے کہ اتنے بد وضع شخص کے ساتھ جمعیت العلماء ہند کے فرشتہ خصلت راہنما اور ابوالکلام آزاد جیسے نفیس الطبع حضرات کس طرح وقت گزارتے ہوں گے۔

کمیونل ایوارڈ

دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر برطانیہ کے وزیر اعظم رمزے میکڈانلڈ نے اپنی پالیسی کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ عبوری دور کے لئے وفاقی طرزِ حکومت اور داخلی صوبائی خود مختاری کے اصول کا پاس کیا جائے گا۔ فرقہ وارانہ مسائل اس راہ میں سب سے بڑی رُکاوٹ ہیں لیکن انہیں ترقی کی راہ میں مانع نہیں ہونا چاہیے۔ یہ کام برِعظیم کے باشندوں کا ہے کہ وہ فرقہ وارانہ مسائل کا حل باہمی گفت و شنید اور اتفاق رائے سے طے کریں۔ اگر وہ یہ مسائل حل نہ کر سکے تو پھر برطانوی حکومت کوئی عارضی سکیم نافذ کرنے پر مجبور ہو گی۔ حکومت کو یہ فیصلہ بھی کرنا ہو گا کہ اقلیتوں کو جمہوری اصولوں کے بے قید اور ظالمانہ استعمال سے بچایا جائے جو اکثریت کے زور پر برتے جائیں گے۔ نیز حکومت یہ بھی دیکھے گی کہ دستور میں کس قدر قیود اور توازن رکھنے ہوں گے۔

گاندھی کی سول نافرمانی:

دوسری گول میز کانفرنس سے گاندھی جی خود بھی مایوس ہو کے برِعظیم لوٹے تھے اور دوسروں کو بھی انگلستان میں مایوس کر کے آئے تھے۔ ادھر برِعظیم میں ایک بڑی انتظامی تبدیلی ہو چکی تھی۔ لارڈ اِروِن اپنے عہدے کی میعاد پوری کر کے انگلستان واپس جا چکے تھے اور ان کی جگہ لارڈ ویلنگڈن وائسرائے بن کر آئے تھے۔ وہ بڑے بد مزاج شخص تھے اور معاملات سے نپٹنا جانتے تھے۔ گاندھی جی نے دوسری گول میز کانفرنس کی ناکامی کے بعد برِعظیم واپس آکر حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لئے دوبارہ سول نافرمانی کی تحریک شروع کی اور عوام سے یہ اپیل کی کہ وہ حکومت کو ٹیکس ادا کرنا بند کر دیں۔ وائسرائے نے بروقت اقدام کیا اور گاندھی جی، جواہر لعل نہرو، سرحدی گاندھی عبدالغفار اور کئی نامور کانگرسی رہنماؤں کو زیرِ حراست لے لیا۔ وائسرائے نے چھ ہفتے

کے اندر تحریک دبا دینے کا عزم ظاہر کیا۔

گاندھی جی نے وائسرائے سے یہ شکایت کی کہ اس نے گاندھی اِروِن پیکٹ کو بالائے طاق رکھ کر دوستانہ مراسم ختم کر دیئے ہیں۔ وائسرائے نے جو جواب ارسال کیا گاندھی جی اس سے مطمئن نہ ہوئے کیونکہ حکومت نے فرقہ وارانہ مسائل کا حل اور اقلیتوں کی نمائندگی کا حل اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ حکومت دستور میں اقلیتوں کو مکمل تحفظات دے کر ہندو اکثریت کے مظالم سے بچانا چاہتی تھی۔ دوسری جانب گاندھی جی اور ان کے رفقاء مسلمانوں اور اچھوتوں کو تحفظات ملنے سے مضطرب ہو رہے تھے۔ حکومت نے بروقت کاروائی کرکے کانگرسی رہنماؤں کو گرفتار کر لیا اور ہمت سے کام لے کر سول نافرمانی کی تحریک دبا دی۔

رمزے میکڈانلڈ کا ایوارڈ:

برطانوی حکومت جانتی تھی کہ ہندو مسلم مسائل کا حل ان کی باہمی گفت و شنید سے ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح کانگرس اقلیتوں کو حقوق دینے پر کبھی بھی آمادہ نہ ہوگی ان حالات میں برطانیہ کے وزیر اعظم رمزے میکڈانلڈ نے ۱۹ اپریل ۱۹۳۲ء کو کمیونل ایوارڈ کا اعلان کیا۔

اس کمیونل ایوارڈ میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب کا طریقہ برقرار رکھا گیا۔ اسی طرح سکھوں، ہندوستانی عیسائیوں، اینگلو انڈین اور برِعظیم میں آباد یورپی باشندوں کے لئے بھی جداگانہ انتخاب کا حق تسلیم کیا گیا۔ بمبئی پریذیڈنسی کے بعض انتخابی حلقوں میں مرہٹوں کے لئے چند نشستیں مختص کر دی گئیں۔ اس کے علاوہ عورتوں، مزدوروں، تجارت پیشہ افراد، صنعت و حرفت اور معدنیات سے وابستہ افراد کے لئے بھی چند نشستیں مخصوص کی گئیں۔ نیز زمینداروں کی نمائندگی کا بھی مناسب انتظام کیا گیا (راقم کے بچپن میں صوبائی اسمبلیوں میں ایک نشست ریلوے ملازمین کے لئے اور ایک یونیورسٹی کے گریجوایٹس کے لئے محفوظ تھی۔ خلیفہ شجاع الدین (م ۱۹۵۵ء) پنجاب یونیورسٹی کی نشست سے انتخاب میں کامیاب ہو کر پنجاب اسمبلی کے سپیکر منتخب ہوئے تھے۔ "ترقی" کے موجودہ دَور میں یہ باتیں خواب و خیال ہو کر رہ گئی ہیں۔

کمیونل ایوارڈ کی نمایاں خوبی:

کمیونل ایوارڈ میں سب سے نمایاں چیز اچھوتوں کی نمائندگی تھی۔ برطانوی حکومت نے اچھوتوں کو ہندوؤں سے الگ قوم تسلیم کرکے ان کے لئے نشستیں مختص کر دیں۔ بالفاظ دیگر مسلمانوں کی طرح انہیں بھی جداگانہ انتخاب کا حق مل گیا۔

کمیونل ایوارڈ کی رُو سے مختلف صوبوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کی شرح حسب ذیل تھی:

صوبہ	مسلم آبادی کا تناسب	نشستوں کی مجموعی تعداد	مسلمانوں کا کوٹہ
سرحد	۹۱٫۸	۵۰	۳۶
سندھ	۷۰٫۷	۶۰	۳۴
پنجاب	۵۷٫۵	۱۷۵	۸۶
یو۔ پی	۱۵٫۳	۲۲۸	۶۶
بہار و اڑیسہ	۱۰٫۸	۱۷۵	۴۲
سی۔ پی	۴٫۷	۱۱۲	۱۴
بنگال	۵۴٫۷	۲۵۰	۱۱۹
بمبئی	۹٫۳	۱۷۵	۳۰
مدراس	۷٫۹	۲۱۵	۲۹
آسام	-	۱۰۸	۳۴

(میں اس چارٹ کے لئے سیّد حسن ریاض کا شکر گزار ہوں، موصوف نے بلوچستان اور آسام کا ذکر نہیں کیا۔ بلوچستان کو اس وقت تک صوبے کا درجہ نہیں ملا تھا، اس لئے کمیونل ایوارڈ میں اس کا ذکر نہیں آیا۔ آسام کا ذکر سیّد حسن ریاض نے سہواً نہیں کیا)۔

مسلمانوں کو اس ایوارڈ سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا۔ اس کے باوجود انہوں نے قومی اور ملکی مفاد کی خاطر اسے قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

پُونا پیکٹ

اچھوتوں سے ناروا سلوک:

کیمونل ایوارڈ کا اعلان گاندھی جی کے لئے ایٹم بم کے دھماکے سے کسی طرح بھی کم نہ تھا۔ برطانوی حکومت نے برِعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش میں بسنے والے تیرہ کروڑ اچھوتوں کو ہندوؤں سے الگ قوم تسلیم کرتے ہوئے انہیں جداگانہ انتخاب کا حق دے دیا۔ اچھوت ہزاروں سال سے ہندوؤں کے غلام بنے ہوئے تھے۔ گپتا عہد میں جو ہندوؤں کا سُنہری دَور کہلاتا ہے، اچھوتوں کو شہروں میں اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے درمیان رہنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ شہروں اور قصبوں سے باہر جھونپڑوں میں رہتے تھے۔ جب وہ شہر آتے تو اپنے ساتھ ایک گھنٹہ لاتے اور بازاروں اور گلیوں سے گزرتے وقت وہ گھنٹہ بجاتے جاتے تاکہ اعلیٰ ذات کے ہندو راستہ چھوڑ دیں۔ اگر کسی اچھوت کا سایہ کسی اعلیٰ ذات کے ہندو پر پڑ جاتا تو اس ہندو کے لئے اپنے کپڑے دھونے اور اشنان (غسل) کرنا واجب ہو جاتا تھا۔ اچھوتوں کو مندروں میں قدم رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں مرقوم ہے کہ اگر ویدوں کے مقدس الفاظ کسی اچھوت کے کانوں میں پڑ جائیں تو سیسہ پگھلا کر اس کے کانوں میں ڈال دیا جائے۔ جب کوئی اچھوت کسی ہندو کے گھر میں بیت الخلاء صاف کرنے آتا تھا تو اس کے جانے کے بعد وہ تمام فرش دُھویا جاتا تھا، جہاں اس کے قدم پڑتے تھے۔ انسانیت کی اس قدر تذلیل کی مثال دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں ملتی۔

اس غیر انسانی سلوک کے باوجود گاندھی جی انہیں ہندو سمجھتے تھے۔ جب اچھوتوں کو جداگانہ انتخاب کا حق ملا تو ہندو ان کے تیرہ کروڑ ووٹوں سے محروم ہو گئے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی آبادی دس کروڑ کے لگ بھگ تھی۔ اگر اچھوتوں اور مسلمانوں میں سمجھوتہ طے پا جاتا تو ہندوؤں کے مقابلہ میں تیئس کروڑ ووٹ ہو جاتے۔

عین ممکن تھا کہ اچھوت اور مسلمان مل کر ہندوؤں کو اقلیت میں بدل دیتے یا برابر ہو جاتے۔

گاندھی جی کا واویلا:

اس لئے جب کیمونل ایوارڈ کا اعلان ہوا اور ہندو اچھوتوں کے تیرہ کروڑ ووٹوں سے محروم ہو گئے تو یہ اعلان ایٹم بم بن کر گاندھی جی پر گرا۔ انہوں نے فوراً اعلان کر دیا کہ اگر اچھوتوں کے جداگانہ حق انتخاب کو ختم کر کے انہیں ہندوؤں میں ضم نہ کیا گیا تو وہ مَرن بَرت رکھ لیں گے۔ پہلے تو گاندھی جی نے دھمکیوں کے ذریعے برطانوی حکومت کو مرعوب کرنا چاہا، لیکن جب اس طرح سے ان کا مقصد حل نہ ہوا تو انہوں نے ۲۰ ستمبر ۱۹۳۲ء کو بطور احتجاج مَرن بَرت شروع کر دیا۔

گاندھی جی کا مَرن بَرت شروع ہوتے ہی کانگرسی حلقوں میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ کانگرسی بخوبی جانتے تھے کہ گاندھی اپنی ضد کا پکّا ہے اور اگر برطانوی حکومت نے کیمونل ایوارڈ واپس نہ لیا تو وہ اپنی جان دے دے گا۔ کانگرس کے بڑے بڑے نیتا (لیڈر) اچھوتوں کے راہنما ڈاکٹر امبیدکر سے ملے اور اس سے کہا کہ یہ آپس کا معاملہ ہے۔ اچھوتوں نے جو رعائتیں لینی ہیں وہ ہندوؤں سے لے لیں۔ ہندو اپنے کوٹے میں سے انہیں نشستیں دینے کے لئے تیار ہیں، لیکن وہ جداگانہ انتخاب کے حق سے دستبردار ہو جائیں ورنہ گاندھی جی اپنی جان دے دیں گے۔

ڈاکٹر امبیدکر کی حماقت:

کانگرسی راہنماؤں نے ڈاکٹر امبیدکر کو ایسے ایسے سبز باغ دکھائے کہ وہ ان کے دامِ تزویر میں پھنس گیا۔ ڈاکٹر امبیدکر نے پُونا کے مقام پر گاندھی جی سے ملاقات کی اور ان کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ یہ معاہدہ ہماری تاریخ میں "پُونا پیکٹ" کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدے پر دستخط ہوتے ہی گاندھی جی نے بَرت توڑ دیا۔

اس معاہدے کی رُو سے ڈاکٹر بھیم راؤ راجی امبیدکر نے اچھوتوں کو ہندو تسلیم کر کے برطانوی حکومت سے یہ استدعا کی کہ کیمونل ایوارڈ میں اچھوتوں کو جو

جداگانہ انتخاب کا حق دیا گیا ہے اسے واپس لے لیا جائے ۔ برطانوی حکومت نے اس کی یہ درخواست منظور کر لی ۔

پُونا پیکٹ کی رو سے ہندوؤں کو تیرہ کروڑ ووٹ مل گئے اور ان کی عددی نفری میں اضافہ ہو گیا ۔ دوسری جانب اچھوتوں کو ہزاروں سال بعد ہندوؤں کی غلامی سے جو آزادی ملی تھی ، وہ ڈاکٹر امبیدکر کی حماقت سے ختم ہو گئی اور اچھوت دوبارہ ہندوؤں کے غلام بن کر رہ گئے ۔ اب بھی بھارت کے اخبارات میں ہفتے عشرے بعد ایسی خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں کہ فلاں مقام پر اعلیٰ ذات کے ہندوؤں نے اچھوتوں کو زندہ جلا دیا ہے ۔

گاندھی جی بھنگی کالونی میں:

پُونا پیکٹ کی تکمیل کے بعد گاندھی جی نے " ہریجن " کے نام سے ایک اخبار نکالا ۔ گاندھی جی نے اچھوتوں کو ہریجن کہنا شروع کیا ۔ اس کا مطلب ہے "ہر کے جنے ہوئے" ۔ بالفاظِ دیگر خدا کے بیٹے ۔ ہریجن اخبار کے ذریعے گاندھی جی نے اچھوتوں کو رام کرنے کی کوشش کی ، دوسری جانب انہوں نے دہلی کی بھنگی کالونی میں اپنے لئے ایک کُٹیا (جھونپڑی) تعمیر کروا لی اور جب کبھی وہ دہلی آتے تو بھنگیوں کی بستی میں قیام کرکے انہیں یہ تاثر دیتے کہ وہ ان کے ہی آدمی ہیں ۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ گاندھی جی جتنی دیر بھنگی کالونی میں قیام کرتے اس دوران میں کھانے پینے سے پرہیز کرتے تاکہ ان کے کھانے اور پانی پر کسی اچھوت کا سایہ نہ پڑ جائے ۔ بھنگی کالونی سے وہ برلا ہاؤس جاتے اور وہاں جا کر نہاتے اور لباس تبدیل کرکے کھانا کھاتے اور پانی پیتے ۔ ترک اسکالر میم کمال اُوکے نے کیا خوب کہا ہے کہ گاندھی ایک ایسا معمّہ ہے جو ہنوز حل طلب ہے ۔

تیسری گول میز کانفرنس

تیسری گول میز کانفرنس کا انعقاد ۱۷ نومبر ۱۹۳۲ء کو ہوا ۔ اس اجلاس میں قائداعظم کو شرکت کی دعوت نہیں دی گئی ، دوسری جانب کانگرس نے بھی اس اجلاس کا بائیکاٹ کیا ۔ ایک روایت کے مطابق کانگرس کی عدمِ شرکت کی بنا پر برطانیہ کی لیبر پارٹی نے بھی اس اجلاس میں دلچسپی نہ لی ۔ ان حالات میں یہ اجلاس بڑا پھیکا رہا ۔

اس تیسری گول میز کانفرنس کی سب سے بڑی غرض و غایت مختلف کمیٹیوں کی رپورٹوں کا جائزہ لے کر انہیں آخری شکل دینا تھا ۔ بڑے اہم اصول گزشتہ دو کانفرنسوں میں طے ہو چکے تھے ، پُونا پیکٹ نے اچھوتوں کا مسئلہ حل کر دیا تھا ، اس لئے فرقہ اختلافات دُور کرنے اور اتفاق کی صُورت میں ان کو دستور میں شامل کرنا تھا ۔

سمجھوتہ ناممکن ہو گیا:

یہ بڑی ستم ظریفی ہے کہ وہ کانفرنس جو فرقہ وارانہ اختلافات دُور کرنے اور متفقہ آئین کا خاکہ تیار کرنے کے لئے طلب کی گئی تھی ، وہ مزید اختلافات کا سبب بنی سر آغا خان اپنی خود نوشت سوانح عمری میں رقمطراز ہیں کہ جب کوئی مسئلہ پیش ہوتا تو اس کی تان اس بات پر ٹوٹتی کہ آیا برِّ عظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش میں ایک قوم بستی ہے یا ہندو اور مسلم دو الگ قومیں ہیں ۔ گاندھی اور ان کے ہمنوا کانفرنس کے اندر اور باہر ایک ہی رٹ لگا رہے تھے کہ ہندو اور مسلم ایک ہی قوم ہیں ۔ وہ انہیں دو الگ قومیں تسلیم کرنے سے مسلسل انکار کر رہے تھے ۔ دوسری جانب مسلم نمائندوں کا کانفرنس کے اندر اور باہر یہ موقف تھا کہ دس کروڑ مسلمان ہندوؤں سے الگ قوم ہیں وہ اقلیت نہیں ، اتنی بڑی تعداد اقلیت نہیں ہوا کرتی ۔ وہ الگ ایک قوم ہیں جن کا اپنا تشخص اور اپنی عظیم روایات ہیں ۔ ان حالات میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سمجھوتہ ناممکن تھا ۔

تیسری گول میز کانفرنس ۲۴ دسمبر ۱۹۳۲ء کو ختم ہو گئی ۔ برطانوی حکومت نے تینوں کانفرنسوں کی سفارشات پر مبنی قرطاس اَبیض (وائٹ پیپر) White Paper تیار کر کے پارلیمنٹ کی جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کے سپرد کر دیا ۔ نومبر ۱۹۳۴ء میں اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ شائع کر دی ۔ یہ رپورٹ پہلے دارالعوام میں پیش کی گئی جہاں یہ بھاری اکثریت سے پاس ہو گئی ۔ اس کے بعد اسے دارالامراء میں پیش کیا گیا ۔ وہاں اس پر غور و خوض ہوا اور دارالامراء نے اسے پاس کر کے جارج پنجم کے پاس بھیج دیا ۔ جارج پنجم کے دستخط ہوتے ہی یہ قانون بن گیا ۔ یوں ۴ جولائی ۱۹۳۵ء کو ہندوستان میں نیا آئین نافذ ہوا ۔

باب (24)

تحریکِ مسجد شہید گنج

شاہجہان کے دورِ حکومت (۱۶۵۹ء ـــ ۱۶۲۸ء) میں لاہور کے لنڈا بازار کی جگہ اس کے سُسر اور وزیر اعظم ابوالحسن آصف جاہ کی شاندار حویلی تھی ، جو اس کی وفات کے بعد شاہجہان نے اس کے بڑے نواسے اور اپنے فرزند و ولی عہد شہزادہ داراشکوہ کو عطاء کی ۔ داراشکوہ (م ۱۶۵۹ء) کے یہاں رہائش اختیار کرنے کے بعد یہ علاقہ "محلہ داراشکوہ" کے نام سے مشہور ہو گیا ۔ اس کے میر سامان عبداللہ خان نے یہاں ایک مسجد تعمیر کرائی ، جس کے تین محراب اور اتنے ہی گنبد تھے ۔ حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدروی (م ۱۹۹۲ء) کے بقول مسجد میں دو مینار بھی موجود تھے ۔

اس زمانے میں یہ ایک پُر رونق علاقہ تھا ۔ اس مسجد کے قریب ہی نخاس بازار تھا ، جس کا صدر دروازہ وزیر خان کی مسجد کے صدر دروازے سے مشابہ تھا ۔ اس بازار میں عموماً گھوڑوں کی خرید و فروخت ہوتی تھی ۔ اب بھی جو بازار ، حضرت شاہ محمد غوث (م ۱۷۵۹ء) کی درگاہ کو لنڈا بازار سے ملاتا ہے وہاں گھوڑوں کا ساز و سامان بکتا ہے اور شاہ محمد غوث کی درگاہ اور دہلی دروازے کے درمیان گھوڑوں کی منڈی لگتی ہے ۔ یہ اسی نخاس بازار کی یادگاریں رہ گئی ہیں ۔ نخاس بازار کا دروازہ اور عبداللہ خان میر سامان کی مسجد ایک دوسرے سے چند قدم کے فاصلے پر تھے ۔

مسجد سے ملحق حضرت شاہ کاکو چشتی کا مزار تھا ۔ ان کے اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ (م ۱۳۲۵ء) کے درمیان صرف تین واسطے تھے ۔ لاہور کی خُوجہ برادری ان کا بڑا احترام کرتی تھی اور ماہِ ربیع الاول میں خوب ان کا عُرس منایا کرتے تھے ۔ جب نواب علی مردان خان نے اس علاقے میں نولکھا باغ تعمیر کیا تو حضرت شاہ کاکو چشتی کا مزار اس باغ کے اندر آگیا ۔ امتدادِ زمانہ سے وہ باغ اُجڑ گیا تو کاشت کاروں نے یہاں فصلیں

بُونا شروع کر دیں ۔ تحقیقاتِ چشتی کے مُصنّف مولوی نُور احمد چشتی (م ۱۸۶۷ء) نے فصل کے موسم میں اس مزار کو فصلوں میں چھپے ہوئے دیکھا تھا۔

مغلوں کے آخری دَور میں جب سکھوں نے پنجاب میں لُوٹ مار شروع کی تو سکھ اور باغی ہم معنی سمجھے جانے لگے ۔ نواب معین الملک (م ۱۷۵۳ء) کے دَور میں نخاس بازار میں اس کے انتظامی دفاتر تھے ۔ جب باغی سکھ گرفتار ہو کر اس کے سامنے پیش کئے جاتے تو انہیں اسی جگہ قتل کیا جاتا تھا ۔ نواب موصوف کی وفات کے بعد پنجاب کا امن و امان برباد ہو گیا اور دوسری جانب احمد شاہ ابدالی کے حملے شروع ہو گئے. معین الملک کے جانشینوں کے عہد میں دیوان لکھپت . جس کے نام پر کوٹ لکھپت نام کا ریلوے اسٹیشن بھی موجود ہے . ایک اہم سرکاری عہدے پر متمکن تھا ۔ سکھوں نے لاہور کی جانب پیش قدمی کی تو اس نے اپنے بھائی کو ان کی یلغار رُوکنے پر مامور کیا ۔ اس کی سکھوں کے ساتھ جھڑپ ہو گئی جس میں وہ ہلاک ہو گیا ۔ اس پر دیوان لکھپت نے قسم کھائی کہ وہ سکھوں سے اپنے بھائی کے قتل کا انتقام لے گا ۔ اتفاق سے ایک بار عید الاضحیٰ کے دن گیارہ صد سکھ گرفتار ہو کر آئے تو دیوان لکھپت نے انہیں عبداللہ خان کی مسجد کے نواح میں قتل کروا دیا (بعض مورّخوں نے یہ واقعہ معین الملک کی جانب بھی منسوب کیا ہے) سکھوں نے اسی دن سے اس جگہ کو شہید گنج کہنا شروع کر دیا۔

دَورِ سہ حاکمان (۱۷۶۸ء ـــ ۱۷۹۹ء) میں سکھوں نے عبداللہ خان کی مسجد پر قبضہ کر کے یہاں گرنتھ صاحب رکھ دیا ۔ رنجیت سنگھ کے زمانے میں بھی یہ مسجد سکھوں کے قبضے میں رہی ۔ انگریزوں کے ابتدائی دَور میں بھی مسجد پر سکھوں کا قبضہ برقرار رہا ۔ نُور احمد چشتی (م ۱۸۶۷ء) کے زمانے میں گنڈا سنگھ اور گوردت سنگھ نام کے دو بھائی اس مسجد پر قابض تھے ۔ شاہ کاکو چشتی کا مزار اس وقت تک ایک چبوترے پر موجود تھا، لیکن سکھوں نے وہاں عُرس منانے پر پابندی لگا رکھی تھی ۔ گنڈا سنگھ کے بیٹے جیون سنگھ نے مسجد سے ملحق آٹھ دکانیں تعمیر کر کے کرائے پر اُٹھا دی تھیں ۔ نُور احمد چشتی لکھتا ہے کہ شہید گنج کے مقام پر ایک بڑے کڑاہے میں بھنگ گھوٹ کر ڈال دی جاتی تھی اور وہاں آنے جانے والوں کو مفت پلائی جاتی تھی ۔ بہرحال انگریزوں کے دَورِ

حکومت میں ۱۹۳۵ء تک یہ معاملہ یُونہی چلتا رہا ۔

بیسویں صدی کے رُبعِ اوّل میں سکھوں نے " گوردوارہ پربندھک کمیٹی " بنا کر پنجاب بھر کے گوردواروں کا انتظام سنبھال لیا ۔ اس سے قبل لاکھوں روپے سالانہ کے نذرانے مہنت لے جاتے تھے ۔ اب یہ رقم گوردوارہ پربندھک کمیٹی کو ملنے لگی ۔ اس ادارے کا انتظام اکالی دَل کے ہاتھوں میں تھا ، اس لئے اکالی دَل کی مالی پوزیشن مستحکم ہو گئی اور وہ گوردواروں کا انتظام چلانے کے علاوہ پنجاب کی سیاست میں بھی حصہ لینے لگے ۔

۱۹۳۵ء کے نصفِ اوّل میں سکھوں نے مسجد شہید گنج کو منہدم کرنے کا پروگرام بنایا اور کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کو اس کا علم ہو گیا ۔ وہ ایک وفد کی صورت میں پنجاب کے گورنر اَیمرسن سے ملے ۔ اس نے انہیں اس بات کی یقین دہانی کرائی کہ مسجد اپنی موجودہ صورت میں برقرار رہے گی ۔ اسی طرح کا اعلان لاہور کے ڈپٹی کمشنر نے بھی کیا ، جس سے مسلمانوں کا اضطراب قدرے کم ہوا ۔ اس کے باوجود سکھ اندر خانہ مسجد کو گرانے کا پروگرام تیار کرتے رہے ۔ سکھوں کے عزائم دیکھ کر مسلمانوں میں دوبارہ تشویش کی لہر دوڑ گئی ۔ دوسری جانب سکھوں کے مسلح جتھے لاہور پہنچنے لگے ۔ مدیر رُوزنامہ " زمیندار " مولانا ظفر علی خان نے مسلمانوں سے صبر و تحمل کی اپیل کی اور ان سے کہا کہ وہ حالات خراب نہ کریں ۔

ان دنوں پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کی حکومت تھی اور سر سکندر حیات خان وزیر اعلیٰ تھے ۔ سر فضلِ حسین (م ۱۹۳۶ء) جو اس پارٹی کے رُوحِ رواں تھے ، ان دنوں وائسرائے کی کونسل کے رُکن تھے ، لیکن ان کی اشیر باد یُونینسٹ پارٹی کی وزارت کو حاصل تھی ۔ کابینہ کے دو مسلم وزراء ملک فیروز خان نُون (م ۱۹۷۰ء) اور ملک مظفر خان کا یہ کہنا تھا کہ چند مربع گز زمین چھن جانے سے اسلام خطرے میں نہیں پڑ جاتا ۔ ان حالات میں ان دونوں وزراء نے مسجد کے معاملے میں کوئی دلچسپی نہ لی ۔ سر سکندر حیات خان (م ۱۹۴۲ء) آیندہ انتخابات میں کامیابی کے بعد وزارت بنانے کے لئے اکالی دَل کی حمایت کے خواہاں تھے ۔ اس لئے وہ اس جھگڑے سے اپنا دامن بچانا چاہتے تھے ۔ وگرنہ اگر وہ چاہتے تو گورنر کو رضامند کر کے مسجد کو بچا سکتے تھے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ

بھی ملک فیروز خان نُون اور ملک مظفر خان کی پالیسی پر گامزن تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان دونوں نے جو بیان دیا تھا وہ الفاظ سر سکندر ہی کے ہوں۔

یُونینسٹ پارٹی کی مسجد کے معاملے میں عدم مداخلت اور گورنر ایمرسن کی سکھ نوازی کی وجہ سے سکھوں کو مزید شہ مل گئی اور سکھوں کے جتھے لاہور پہنچنے لگے۔ ایک سکھ زمیندار مہتاب سنگھ نے اس موقع پر یہ اعلان کیا کہ وہ ایک لاکھ روپے نقد، ایک ہزار بُوری آٹا اور دس ہزار رضا کار فراہم کرے گا تاکہ سکھ پُوری دلجمعی کے ساتھ مُورچہ لگا سکیں۔ جب مسلمانوں کو اطلاع ملی کہ سکھ مسجد کو منہدم کرنے پر تلے ہوئے ہیں تو انہوں نے ایک احتجاجی جلوس نکالا، اور دہلی دروازے سے مسجد کی جانب روانہ ہوئے۔ سٹی مجسٹریٹ نرندر سنگھ نے جلوس رُوکنے کی کوشش کی، لیکن جلوس آگے بڑھتا رہا۔ اس کے حکم پر جلوس پر لاٹھی چارج کیا گیا اور وقتی طور پر مسلمانوں کو منتشر کر دیا۔ پھر سکھوں نے مُورچہ لگانے کا اعلان کیا تو مولانا ظفر علی خان (م ۱۹۵۶ء) نے بھی نیلی پوش تحریک کی بنیاد ڈالی اور دس ہزار نیلی وردی والے رضا کار مسجد کو بچانے کے لئے جمع کر لئے۔

ان نازک حالات میں سکھ اور مسلمان راہنماؤں کے درمیان ایک میٹنگ ہوئی۔ سکھوں کی جانب سے ماسٹر تارا سنگھ، ایشر سنگھ، گورمکھ سنگھ مسافر اور ڈکن اسکلی منگل سنگھ نے شرکت کی۔ مسلمانوں کی نمائندگی مولانا ظفر علی خان (م ۱۹۵۶ء) سید حبیب شاہ (م ۱۹۵۲ء) مدیر "سیاست" مولانا داؤد غزنوی (م ۱۹۶۳ء) اور میاں امیر الدین (م ۱۹۸۹ء) نے کی۔ مولانا داؤد غزنوی ان دنوں کانگرس کے صفِ اوّل کے راہنما تھے اور میاں امیر الدین یُونینسٹ پارٹی کے رکن رکین۔ اس لئے مسلم راہنماؤں میں سوچ کا فرق تھا۔ باہمی کشیدگی کے باوجود میٹنگ خوشگوار ماحول میں ہوئی اور سکھ راہنماؤں نے مسلم راہنماؤں سے کہا کہ وہ اپنے کم سے کم مطالبات پیش کریں۔

اسی شام موچی دروازہ سے باہر برکت علی محمڈن ہال میں میاں عبدالعزیز مالواڈہ (م ۱۹۷۱ء) کی صدارت میں جلسہ منعقد ہوا، جس میں مسلمانوں نے یہ مطالبہ کیا کہ مسجد انہیں واگذار کی جائے اور گوردوارے اور مسجد کے درمیان کم از کم ایک فٹ کا فاصلہ برقرار رکھا جائے۔ سکھوں نے اس مطالبے کو تسلیم نہ کیا کیونکہ انہیں حکومت

کی بھرپُور حمایت حاصل تھی۔ گورنر ایمرسن کے سکھوں کی جانب جھکاؤ کی بنا پر مسلمان اسے امر سنگھ کہنے لگے تھے۔

اگلے رُوز مسلمانوں نے دوبارہ احتجاجی جلوس نکالا۔ سرکاری اہل کاروں نے اسے تشدّد کے ذریعے منتشر کر دیا۔ اس سے حالات مزید خراب ہو گئے اور حکومت نے قیامِ امن کی خاطر فوج طلب کر لی۔ ان نازک حالات میں مولانا ظفر علی خان، ماسٹر تارا سنگھ سے ملے اور بقول حکیم عنایت اللہ نسیم سُوہدروی مولانا نے اپنی ٹوپی سر سے اتار کر تارا سنگھ کے پیروں پر رکھ دی اور اس سے یہ التماس کی کہ وہ مسجد کو منہدم کر کے پنجاب کے اَمن و امان کو خراب نہ کرے۔ ماسٹر تارا سنگھ کو چونکہ حکومت کی مکمل حمایت حاصل تھی اس لئے اس نے مولانا کی بات ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اُڑا دی۔ اس پورے عرصے میں حکومت مسلمانوں کو جھُوٹی تسلیاں دیتی رہی کہ مسجد کو گرانے کی کوئی تجویز زیرِ غور نہیں ہے۔

ان سرکاری اعلانات کے باوجود سکھوں نے ۸ اور ۹ جولائی ۱۹۳۵ء کی درمیانی رات کو مسجد گرانی شروع کر دی۔ حکومت نے مسجد کو جانے والے تمام راستوں پر سخت قسم کا فوجی پہرہ بٹھا دیا۔ جب سکھ مسجد گرا رہے تھے تو فضاء میں رائل ائیر فورس کے طیارے پرواز کر کے سکھوں کو تحفّظ فراہم کر رہے تھے (سر سکندر اور ان کے رفقاء آئندہ الیکشن کے بعد وزارت بنانے کے لئے اکالیوں کے تعاون پر غور کر رہے تھے)۔ ان سرکاری انتظامات کے بارے میں حکومت نے یہ اعلان جاری کیا کہ سکھوں کو ان کے قانونی حق سے رُوکنا ممکن نہ تھا۔ اس لئے ممکنہ تصادم کے بچنے کے لئے مسلمانوں کو مسجد کی طرف آنے سے رُوکنا ضروری تھا۔

مشہور سیاسی کارکن ابُو سعید انور (م ۱۹۸۴ء) تحریکِ شہید گنج کے ایک کارکن تھے اور وہ اس تحریک کے دوران گرفتار بھی ہوئے تھے۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ مسجد کے گنبد، مینارے اور محراب اتنے مضبوط تھے کہ انہیں کرینوں کے بغیر گرانا ناممکن تھا۔ حکومت نے رات کے اندھیرے میں سکھوں کو کرین فراہم کئے اور راتوں رات مسجد کا صفایا کر دیا۔ صبح کے وقت وہاں سپاٹ میدان تھا اور شاہ کاکو چشتی کا مزار بھی غائب تھا۔

مسجد کی شہادت کے بعد مسلمانوں نے احتجاجی جلسہ منعقد کیا اور شہید گنج کی جانب بڑھے۔ دوسری جانب گورا فوج ان کا راستہ رُوکے کھڑی تھی۔ مسلمانوں نے آگے بڑھنے پر اصرار کیا تو گورا فوج نے گولی چلا کر جلیانوالہ باغ کی یاد تازہ کر دی۔ اس موقع پر بہت سے مسلمان خانۂ خدا کی حُرمت پر جانیں قربان کر گئے اور متعدد کلمہ گو زخمی ہوئے۔ سر سکندر حیات خان کی حکومت نے مولانا ظفر علی خان، سیّد حبیب شاہ، میاں فیروز الدین اور ملک لعل خان (م ۱۹۷۹ء) جیسے رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ اس واقعہ سے پشاور میں بڑا اشتعال پیدا ہوا۔ وہاں سے رضا کار لاہور آنا چاہتے تھے لیکن حکومت نے ان کے لاہور آنے کے تمام راستے بند کر دیئے۔

مسلمانوں نے انصاف کی خاطر ہائیکورٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میاں عبدالعزیز مالواڈہ جیسے نامور قانون دان نے مقدمے کی پیروی کی اور قائداعظم سے بھی رابطہ قائم رکھا۔ مسلمانوں کا یہ موقف تھا کہ اگر ایک بار مسجد بن جائے تو قیامت تک اس پر مسجد ہی کا اطلاق ہو گا خواہ وہ کھنڈر بن جائے۔ ہائیکورٹ کے عیسائی جج نے یہ کہا کہ یہ مسجد گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے سکھوں کے قبضے میں ہے، اس لئے اب یہ ان کی ملک ہی سمجھی جائے گی۔ چنانچہ فیصلہ سکھوں کے حق میں ہو گیا۔

مسجد کے انہدام کے بعد پورے پنجاب میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ مشہور مجاہدِ آزادی مولانا محمد اسحٰق مانسہروی (م ۱۹۷۱ء) نے راولپنڈی میں مسلمانوں کا ایک نمائندہ اجلاس طلب کیا، جس میں سردار عبدالرب نشتر (م ۱۹۵۸ء) پیر بخش ایڈووکیٹ (م ۱۹۷۵ء) رحیم بخش غزنوی، علّامہ عنایت اللہ خان مشرقی، غلام نبی انصاری، عزیز ہندی، مصطفےٰ شاہ گیلانی، ابُو سعید انور، پیر جماعت علی شاہ (م ۱۹۵۱ء) اور ڈاکٹر عالم نے بھی شرکت کی۔ اس اجلاس میں علّامہ مشرقی کی تجویز پر پیر صاحب کو تحریک کا امیر مقرر کیا گیا۔ پیر صاحب نے پنجاب کے دَورے کر کے مسلمانوں کو مسجد کی تعمیر کے لئے جدوجہد جاری رکھنے پر آمادہ کیا۔ اس کے جلد بعد پیر صاحب حج بیت اللہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ ان کی روانگی کے بعد حکومت نے سرحد کے زعماء کے علاوہ دوسرے تمام نمائندوں کو گرفتار کر لیا۔ ان کی گرفتاری کے بعد قیادت نوجوانوں کے ہاتھوں میں آ گئی۔ آغا شورش کاشمیری (م ۱۹۷۵ء) پروفیسر عنایت اللہ، یعسوب الحسن اور

امین الدین صحرائی نے تحریک چلانے کا عزم کیا، لیکن یہ حضرات بھی نظر بند کر دیئے گئے۔

تحریکِ مسجد شہید گنج کے دوران قائداعظم بھی لاہور تشریف لائے اور انہوں نے حکومت سے بات چیت کر کے قیدیوں کو رہا کرایا۔

علّامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خان نے اس موقع پر پُرزور نظمیں لکھیں جن میں خانۂ خدا کی بے حُرمتی اور شہداء کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ علّامہ صاحب نے ایک نظم میں فرمایا:

مومناں را گفت آن سلطانِ دیں
مسجدِ من ایں ہمہ رُوئے زمیں
الاماں از گردشِ نُہ آسماں
مسجدِ مومن بدستِ دیگراں
سخت کوشد بندۂ پاکیزہ کیش
تا بگیرد مسجدِ مولائے خویش

مولانا ظفر علی خان نے اس موقع پر اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

جس دن شہید گنج کی مسجد ہوئی شہید
اسلامیوں کے سر پہ قیامت گزر گئی
اپنوں کا اِک گروہ پرائیوں سے جا ملا
بازی جو ہم نے جیت ہی لی تھی وہ ہر گئی
اسلام کے حریف کی سنگین کی انی
سینے میں چیرتے ہوئے دل تک اُتر گئی
رُسوائی اپنے دین کی آنکھوں سے دیکھ لی
حسرت بھری نگاہ ہماری جدھر گئی
مومن سے پوچھتا ہے یہ کافر ز راہِ طنز
تیری ہزار سالہ حمیّت کدھر گئی

اس وقت ہائیکورٹ کے احاطے میں واقع مسجد شاہ چراغ حکومت کے

قبضے میں تھی اور اس میں دفتر بنایا ہوا تھا۔ سر سکندر حیات خان نے مسلمانوں کی تالیفِ قلب کے لئے اسے واگزار کر دیا۔ اس کے باوجود مسلمانوں نے حکومت کے خلاف تحریکِ سول نافرمانی چلانے اور ہائیکورٹ کے فیصلے کو پریوی کونسل میں چیلنج کرنے کا فیصلہ کیا لیکن تحریک چلانے کی نوبت نہ آئی۔

مولانا ظفر علی خان کا یہ موقف تھا کہ اس زمانے میں پنجاب میں مجلس احرارِ اسلام بڑی مقبول تھی۔ وہ اگر مسجد کو بچانے کے لئے ان کا ساتھ دیتی تو مسجد بچ جاتی۔ لیکن مجلس احرارِ اسلام نے کانگرس کی طرفدار ہونے کی وجہ سے ان کا ساتھ نہ دیا۔ مولانا نے اپنے روزنامہ "زمیندار" میں احرار کی خوب خبر لی اور اسے اشرار کہنے سے بھی گریز نہ کیا۔ احرار نے مولانا ظفر علی خان کے طعنوں کا جواب دینے کے لئے ایک روزنامہ جاری کیا جس کا نام "نیرنگ" تھا اس کا مقصد بقول حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدروی، مولانا ظفر علی خان اور کارکنانِ تحریکِ شہید گنج پر کیچڑ اچھالنا تھا۔ کچھ عرصے بعد احرار نے اپنی جماعت کا ترجمان روزنامہ "مجاہد" کے نام سے جاری کیا۔ اس پر مولانا ظفر علی خان نے طنزیہ انداز میں فرمایا:

مسجد ہوئی بُت خانہ تو زاہد نکل آیا
جب ختم ہوئی جنگ "مجاہد" نکل آیا

تحریکِ مسجد شہید گنج کے دوران مجلس احرارِ اسلام نے جو حکمت عملی اپنائی تھی، مولانا ظفر علی خان اس سے خوش نہ تھے۔ احرار اس زمانے میں پنجاب میں بڑی مقبول سیاسی جماعت تھی۔ مولانا کا خیال تھا کہ اگر یہ جماعت ان کا ساتھ دیتی تو پھر سکھوں کو یہ جرأت نہ ہوتی کہ وہ مسجد پر ہاتھ ڈالتے۔ احراری چونکہ کانگرس کے طرف دار تھے اس لئے وہ ہندو مسلم سکھ اتحاد کے حامی تھے۔ احرار کے عدمِ تعاون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا ظفر علی نے فرمایا

کھاتا ہے مسلمان کوئی سینے میں جو گولی
گالی اسے دیتی ہے ان احرار کی ٹولی
اسلامیوں کے خون سے چلے کھیلنے ہولی
احرار جنہیں زعم ہے میں سکھوں کا اشرار

پنجاب کے احرار اسلام کے غدار

دوسری جانب یونینسٹ پارٹی نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ مسجد شہید گنج کا ملبہ مجلس احرارِ اسلام پر ڈال دیا۔ یونینسٹ پارٹی کی سیاست اور مولانا ظفر علی خان کی مخالفت نے احرار کو سیاسی میدان میں مات دے دی اور اس کے بعد احرار نے اپنی تمام تر توجہ ختمِ نبوت پر مبذول کر دی۔

مسجد شہید گنج کی شہادت کے بعد مسلمانوں کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ مسلمانوں کی عبادت گاہیں غیر محفوظ ہو گئی ہیں۔ لہٰذا ان کے تحفظ کے لئے آئندہ مسلمانوں کو چوکنا رہنا ہو گا۔ اسی عدمِ تحفظ نے الگ وطن کے تصور کو پروان چڑھانے میں مدد دی۔ دوسری جانب مسجد کی شہادت کے بعد مسلمانوں اور سکھوں کے تعلقات کشیدہ ہو گئے اور غازی حسن دین (م ۱۹۳۶ء) نامی ایک جوشیلے مسلمان نے ایک سکھ کو قتل اور دوسرے کو زخمی کر دیا۔ عدالت نے حسن دین کو سزائے موت دی۔ اس کی آخری آرامگاہ غازی علم الدین کے مزار کی پائنتی جانب ہے۔ قیامِ پاکستان تک مسلمانوں اور سکھوں میں مفاہمت کی کوئی راہ نہ نکل سکی۔

باب (25)

۱۹۳۵ء کا ایکٹ

تیسری گول میز کانفرنس کے اختتام پر برطانوی حکومت نے تینوں کانفرنسوں کی سفارشات پر مبنی ایک قرطاسِ ابیض شائع کیا اور پارلیمنٹ میں اس پر بحث کے بعد اسے ایک جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کے سپرد کر دیا۔ اس کمیٹی میں سولہ نمائندے دارالعوام کے اور اتنے ہی دارالامراء کے شامل تھے۔ برطانوی ہند سے بیس نمائندے اور دیسی ریاستوں کے سات نمائندے بھی اس کمیٹی میں شامل کئے گئے تاکہ سائمن کمیشن والی غلطی کا اعادہ نہ ہو۔ مسلم نمائندوں میں سر آغا خان، سر شفاعت احمد خان، عبدالرحیم اور اے کے غزنوی قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ معروف مرزائی سر ظفر اللہ خان (م ۱۹۸۵ء) کو بھی اس کمیٹی کا رکن بنایا گیا۔ لارڈ لنلتھگو (م ۱۹۵۲ء) اس کمیٹی کے صدر مقرر ہوئے۔

اپریل ۱۹۳۳ء سے لے کر نومبر ۱۹۳۴ء تک اس کمیٹی کے اجلاس ہوتے رہے۔ اس دوران میں ۱۵۹ اجلاس ہوئے۔ اس کمیٹی نے اپنی سفارشات پر مبنی بل ۵ فروری ۱۹۳۵ء کو دارالعوام میں پیش کیا جہاں ۴۳ روز تک اس بل پر دارالعوام کے ارکین بحث کرتے رہے۔ دارالعوام نے اس بل کو منظور کرکے دارالامراء میں بھیجا، جہاں تیرہ دن کی بحث کے بعد اسے منظور کیا گیا۔ ایک ثقہ روایت کے مطابق یہ بل سب سے طویل ترین تھا جسے پارلیمنٹ نے منظور کیا۔ شاہِ انگلستان کے دستخط ہونے کے ساتھ ہی جولائی ۱۹۳۵ء میں اس نے قانون کی صورت اختیار کرلی۔

۱۹۳۵ء میں نافذ ہونے والے آئین کے تین بنیادی مقاصد تھے۔ انہیں اس ایکٹ کی نمایاں خصوصیات کا نام بھی دے سکتے ہیں:

۱۔ برطانوی ہند کے صوبوں اور ریاستوں پر مشتمل وفاق کا قیام

۲۔ صوبائی خود مختاری

۳۔ مرکزی حکومت میں دو عملی نظام کا اجرا۔

وفاقی اسمبلی:

مرکزی اسمبلی کونسل آف سٹیٹ اور وفاقی اسمبلی پر مشتمل تھی۔ وفاقی اسمبلی کی مدت پانچ سال رکھی گئی اور کونسل آف سٹیٹ ایک مستقل ادارہ تھا جس کے ایک تہائی اراکین ہر تین سال کے بعد ریٹائر ہوتے تھے۔ وفاقی اسمبلی کے اراکین کی تعداد ۳۷۵ مقرر کی گئی تھی اور کونسل آف سٹیٹ کے اراکین کی تعداد ۲۶۰ رکھی گئی۔

مرکزی اسمبلی کے اختیارات ایک حد تک محدود تھے اور وہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ میں ترمیم یا رد و بدل کرنے کی مجاز نہ تھی۔ اسی طرح اسی فیصد سالانہ بجٹ پر بحث یا منظوری بھی اس کے دائرہ اختیار سے باہر تھی۔

گورنر جنرل کے اختیارات:

۱۹۳۵ء کے ایکٹ میں گورنر جنرل کو لامحدود اختیارات دیئے گئے تھے۔ اس کے علاوہ اسے مندرجہ ذیل امور میں خصوصی اختیارات بھی تفویض کئے گئے تھے۔

۱۔ ملک میں امن و امان کا قیام اور اس سے متعلقہ امور

۲۔ سرکاری ملازمین اور ان کے لواحقین کے مفاد کی نگہداشت۔

۳۔ وفاقی حکومت کی مالیاتی ساکھ برقرار رکھنے کے لئے اقدامات۔

۴۔ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت۔

۵۔ دیسی ریاستوں سے متعلقہ امور اور ان کے حکمرانوں کے حفظ مراتب کا خیال۔

۶۔ برطانوی مال پر ٹیکس کی چھوٹ اور اگر کوئی صوبہ یا ریاست اس پر ٹیکس عائد کرنا چاہے تو اس کا انسداد۔

گورنر جنرل بعض امور میں اپنے وزراء کے مشورے پر عمل کرنے کا پابند تھا اور بعض امور میں وہ اپنی صوابدید سے کام لے سکتا تھا۔ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی رُو سے گورنر جنرل مندرجہ ذیل امور میں اپنے صوابدیدی اختیارات استعمال کرتا تھا:

۱۔ وزراء کا تقرر اور ان کی برطرفی۔
۲۔ آرڈی نینس کا اجراء۔
۳۔ کسی بل کو اسمبلی میں پیش ہونے سے رُوکنا۔
۴۔ آئین کو معطل کرنا۔
۵۔ اسمبلی کا اجلاس طلب کرنا۔
۶۔ اسمبلی برطرف کرنا۔

اس طرح گورنر جنرل کو ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی رُو سے لامحدود اختیارات مل گئے۔ اتنے اختیارات تو برطانیہ کے شاہ کو بھی حاصل نہ تھے جس کی نمائندگی برِعظیم پاک وہند اور بنگلہ دیش میں گورنر جنرل کرتا تھا۔

صوبائی گورنر:

صوبائی گورنر صوبے میں گورنر جنرل کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا۔ گورنر جنرل کی طرح اس کے اختیارات میں بھی اضافہ ہو گیا۔ مندرجہ ذیل امور کلیتہً اس کے اختیار میں تھے:

۱۔ صوبے میں اَمن و امان کا قیام۔
۲۔ سرکاری ملازمین اور ان کے لواحقین کے حقوق کی نگہداشت۔
۳۔ اقلیتوں کا تحفظ۔

صوبائی حکومت:

۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی رُو سے صوبوں کے نظم و نسق میں یہ تبدیلیاں رُونما ہوئیں۔

۱۔ صوبوں کو داخلی آزادی حاصل ہو گئی۔
۲۔ صوبائی امور میں مرکزی مداخلت بہت کم ہو گئی۔
۳۔ دو عملی کا خاتمہ ہو گیا۔
۴۔ مختلف محکمے وزراء کے سپرد کر دیئے گئے۔
۵۔ وزراء اسمبلی کے سامنے جوابدہ تھے۔

۶۔ صوبائی اسمبلی کو مزید وسعت دی گئی۔
۷۔ حق رائے دہی (ووٹنگ) میں مزید وسعت پیدا کی گئی۔

انڈین کونسل کا خاتمہ:

۱۹۳۵ء کے آئین کی رُو سے وزیر امور ہند کی کونسل، جو انڈین کونسل کے نام سے موسوم تھی، توڑ دی گئی اور اس کی جگہ مشیروں کا تقرر عمل میں آیا جن کی تعداد تین تا چھ مقرر کی گئی۔

فیڈرل کورٹ:

۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت فیڈرل کورٹ کا قیام عمل میں آیا۔ مرکز اور صوبوں کے تعلقات، ان میں اختلافی امور کا تصفیہ اور آئین کی تشریح فیڈرل کورٹ کے دائرۂ اختیار میں تھی۔ فیڈرل کورٹ کی یہ بھی ذمہ داری تھی کہ وہ اس بات کا خیال رکھے کہ مرکز اور صوبے اپنے اختیارات سے تجاوز نہ کریں۔ فیڈرل کورٹ کو براہ راست مقدمات سُننے اور اپیلوں کی سماعت کا اختیار حاصل تھا۔

۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی قباحتیں:

۱۔ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی رُو سے مرکز میں دو عملی رائج ہو گئی۔ حالانکہ اس سے قبل ۱۹۱۹ء کے آئین کی رُو سے صوبوں میں دو عملی رائج ہو گئی تھی، جو بُری طرح ناکام ہو گئی۔ اب یہی تجربہ مرکز میں دہرایا گیا۔
۲۔ اس ایکٹ کی رُو سے گورنر جنرل اور گورنروں کو وسیع اختیارات مل گئے لیکن برِعظیم پاک وہند اور بنگلہ دیش کے باشندوں کو کچھ نہ ملا۔
۳۔ گورنر جنرل اور گورنروں کے وسیع اختیارات کی بناء پر مجلس قانون ساز صحیح معنوں میں اپنا فرض انجام نہ دے سکی، اس لئے عوام کو اس سے بڑی مایوسی ہوئی۔
۴۔ دیسی ریاستوں کو مرکزی اسمبلی اور کونسل آف سٹیٹ میں زیادہ نمائندگی دی گئی تھی۔ بدقسمتی سے ان اداروں میں بھیجے جانے والے نمائندوں کا فیصلہ ریاستوں کے حکمران کرتے تھے۔ اس لئے دیسی ریاستوں میں بسنے والے کروڑوں عوام حق رائے دہی سے محروم رکھے گئے۔ جس سے عوام میں ریاستی حکمرانوں کے خلاف نفرت پھیل گئی۔

۵ ۔ ریاستوں کے حکمران پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے ماتحت تھے اس لئے اس محکمے کے دباؤ کے زیر اثر ریاستوں کے نمائندے حکومت کے وفادار سمجھے جاتے تھے ۔ کیونکہ ان کے ووٹ حکومت کی مرضی کے خلاف استعمال نہیں ہو سکتے تھے ۔

صوبائی خود مختاری وفاقی نظام حکومت کا طرۂ امتیاز سمجھی جاتی ہے ۔ اس آئین کی رُو سے جو اختیارات صوبوں کو ملنے تھے وہ نہ مل سکے ۔ گورنر جنرل نے صوبوں کے اختیارات میں مداخلت کرکے صوبائی حکومتوں کو مزید کمزور کر دیا ۔ ۱۹۳۵ء کے آئین کی رُو سے اقلیتوں کو آئینی تحفظ فراہم کیا گیا تھا لیکن ان کے امور گورنر کے سپرد کر دیئے گئے ۔ اس طرح اقلیتیں اپنے امور میں گورنروں کی محتاج ہو کر رہ گئیں ۔ اس سے ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کے لئے بہت سی مشکلات پیدا ہو گئیں ۔

۱۹۳۵ء کے آئین کا ردِ عمل:

مسلم لیگ کے خیال میں یہ آئین ہندوستانی ریاستوں اور خود برطانوی ہند کے لئے مفید ہونے کی بجائے نقصان دہ ثابت ہوا ۔ اس سے برِعظیم کے عوام کو ذمہ دار حکومت تفویض کرنے کی راہ میں مشکلات حائل ہو گئیں ۔ مسلم لیگ صوبوں کو ملنے والے اختیارات سے مطمئن نہ تھی ۔ تاہم اس نے یہ پالیسی اپنائی کہ اب جو کچھ بھی ملا ہے ، اسی سے فائدہ اٹھایا جائے ۔

شیرِ بنگال مولوی ابُوالقاسم فضل الحق نے ۱۹۳۵ء کے آئین پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اس آئین کی رُو سے برِعظیم میں نہ تو مسلم راج قائم ہوا ہے اور نہ ہی ہندو راج ، بلکہ برطانوی راج مسلّط ہو گیا ہے ۔

مسلم لیگ کے علاوہ کانگرس نے بھی ۱۹۳۵ء کے آئین پر کڑی تنقید کی پنڈت جواہر لعل نہرو نے اسے ایک ایسی مشین کے ساتھ تشبیہ دی جس میں انجن موجود نہ ہو لیکن بریکیں موجود ہوں ۔ کانگرس کی ہائی کمان نے اس آئین کے وفاقی اور صوبائی حصوں کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ کوئی بھی آئین جو برِعظیم کے عوام کے اختیارات سلب کرتا ہو وہ قابلِ قبول نہیں ہے ۔

برطانیہ نے یہ آئین ایک طویل مذاکرات کے بعد نافذ کیا تھا ۔ اس لئے

اتنی جلدی سے اسے بدلنا ممکن نہ تھا ۔ ان حالات میں دونوں بڑی جماعتوں نے بادلِ نخواستہ اسے قبول کر لیا اور اس کے تحت انتخابات کی تیاری شروع کر دی۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمی جنگ چھڑ گئی اور برطانیہ کی تمام تر توجہ اس کی جانب مبذول ہو کر رہ گئی ۔ اس لئے ۱۹۳۵ء کا آئین جنگ کے خاتمے کے بعد آزادی ملنے تک چلتا رہا اور پاکستان کی قومی اسمبلی نے ایک قرارداد کے ذریعے اسے اپنا لیا ۔ ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو جب پاکستان کا پہلا آئین نافذ ہوا تو اس روز عوام نے ۱۹۳۵ء کے آئین سے چھٹکارا حاصل کیا ۔

باب (26)

۱۹۳۷ء کے انتخابات

۱۹۳۵ء کا آئین کانگرس اور مسلم لیگ نے بادلِ نخواستہ قبول کیا تھا، اس کے باوجود جب اس آئین کے تحت انتخابات منعقد کرانے کا اعلان ہوا تو دونوں حریف جماعتیں، کانگرس اور مسلم لیگ خم ٹھونک کر میدان میں اُتریں۔ اس وقت مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی واحد ملک گیر جماعت تھی، جس کی جڑیں، جیسی کیسی بھی تھیں، تمام صوبوں میں تھیں۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی اور جتنی بھی جماعتیں تھیں، وہ علاقائی تھیں یا وہ کسی خاص پیشے سے وابستہ تھیں۔ اسی طرح چند جماعتیں مخصوص مذہبی گروہوں کی نمائندگی کرتی تھیں۔

پنجاب میں یونینسٹ پارٹی برسرِ اقتدار تھی۔ یہ سر فضلِ حسین اور سر سکندر حیات خان کی قائم کردہ جماعت تھی۔ جس میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو اور سکھ بھی شامل تھے۔ سر چھوٹو رام (م ۱۹۴۵ء)، سردار ہندو سنگھ، ہری سنگھ اور بلدیو سنگھ کی حمایت بھی اس پارٹی کو حاصل تھی۔ پنجاب کے تمام بڑے بڑے زمیندار اس جماعت میں شامل تھے۔ اس لئے عوام میں یہ جماعت "زمیندار لیگ" کے نام سے جانی پہچانی جاتی تھی۔ ان زمینداروں کی وفاداریاں انگریزوں کے ساتھ تھیں اس لئے وہ انگریز حکام کو ہر حال میں خوش رکھنا چاہتے تھے۔ بدیں وجہ کانگرس اور مسلم لیگ پنجاب میں اپنے لئے جگہ نہ بنا سکیں۔

انتخابات سے قبل سر فضلِ حسین اور سر سکندر حیات خان یونینسٹ پارٹی کو مضبوط بنانے میں لگے رہے۔ سر فضلِ حسین انتخابات سے قبل ہی ۸ اگست ۱۹۳۶ء کو فوت ہو گئے۔ ان کے جانشین سر سکندر حیات خان نے یہ دوغلی پالیسی اختیار کی کہ کل ہند سطح پر مسلم لیگ کی حمایت کی جائے لیکن پنجاب کی سیاست سے مسلم

لیگ کو دور رکھا جائے۔

بنگال میں شیرِ بنگال مولوی ابوالقاسم فضل الحق نے اپنی جدوجہد سے کرشک پرجا پارٹی کو عوام میں مقبول بنا دیا تھا۔ مشرقی بنگال میں ذرائع رسل و رسائل کی کمی، آمد و رفت میں دشواری اور ناخواندگی کی وجہ سے کرشک پرجا پارٹی کے مقابلے میں مسلم لیگ عوام کے دلوں میں اپنے لئے جگہ نہ بنا سکی۔ اس کے باوجود خواجہ ناظم الدین نے انتخابات میں مسلم لیگ کی قیادت سنبھالنے کا بیڑا اٹھایا۔

صوبہ سرحد میں سرحدی گاندھی عبدالغفار خان اور ان کے برادرِ بزرگ ڈاکٹر خان صاحب نے مسلم لیگ کی ڈٹ کر مخالفت کی۔ ان کی قائم کردہ سُرخ پوش تحریک نے سرحد میں مسلم لیگ کے قدم نہ جمنے دیئے۔ سُرخ پوش جماعت نے اپنے قائدین کے ساتھ کانگرس کا بھرپور ساتھ دیا۔

سندھ میں سر غلام حسین ہدایت اللہ نے سندھ یونائیٹڈ پارٹی قائم کر لی تھی۔ سندھ کے ہندوؤں نے انتخابات میں مسلم لیگ کو ناکام بنانے کے لئے سر غلام حسین ہدایت اللہ کا بھرپور ساتھ دیا۔

ان علاقائی جماعتوں کے علاوہ وسطی ہند میں بافندوں نے "مومن کانفرنس" کے نام سے اپنی الگ تنظیم قائم کی ہوئی تھی، جو صرف اپنے ہی پیشے سے وابستہ لاکھوں افراد کی نمائندہ جماعت ہونے کی دعویدار تھی۔ یو۔ پی کے ہزاروں بافندے بھی "مومن کانفرنس" کی حمایت کر رہے تھے۔

جمعیت العلماء ہند، جسے کانگرس کا علماء ونگ کہنا زیادہ مفید رہے گا، انتخابات میں مسلم لیگ کی حمایت کرنے پر آمادہ ہو گئی تھی، لیکن اس جماعت نے مسلم لیگ سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ مذہبی امور میں اس سے مشورہ لیا کرے۔ یہ جماعت چونکہ دیوبندی مکتبِ فکر کے صرف ایک گروپ کی نمائندگی کرتی تھی اس لئے مسلم لیگ نے یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کے علاوہ اس جماعت نے مسلم لیگ سے ایک بڑی رقم بھی طلب کی تھی جو مسلم لیگ جیسی غریب جماعت ادا کرنے سے قاصر تھی۔ اس لئے جمعیت العلماء ہند مسلم لیگ کی حمایت سے دستکش ہو گئی۔

مجلس احرارِ اسلام میں بھی اکثریت دیوبندی مکتبِ فکر کے علماء کی تھی

اس لئے اس جماعت نے بھی انتخابات میں مسلم لیگ کا ساتھ نہ دیا۔

قوم پرست مسلمان خود کو سیکولرازم کا حامی ظاہر کرتے تھے اس لئے انہوں نے ان انتخابات میں کانگرس کا بھرپور ساتھ دیا۔

اہل حدیث کے بھی متعدد گروپ تھے۔ ان میں سے سید داؤد غزنوی (م ۱۹۶۳ء) جو اہل حدیث کے ایک گروپ کے صدر تھے اور جماعتی حلقے میں بڑی احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے، ابوالکلام آزاد کے زیراثر کھل کر کانگرس کے ہمنوا تھے۔ کانگرسی ہندوؤں کی حمایت سے موصوف پنجاب کانگرس کے صدر بھی بن گئے تھے۔

مسلم یونینی بورڈ نے بھی ابتداء میں مسلم لیگ کا ساتھ دیا۔ لیکن جب انتخابات عین سر پر آگئے تو اس جماعت کے قائدین نے بھی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ قائم کر لی۔

یُو پی میں شیعہ پولٹیکل کانفرنس ایک اہم جماعت تھی۔ یوپی کے شیعہ تعلقہ دار اور لکھنؤ کے کھاتے پیتے حضرات اس جماعت میں شامل تھے۔ ان کا اپنا تشخص تھا جسے وہ برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ قیامِ پاکستان کی صورت میں ان کا تشخص ختم ہو جائے گا اور وہ اکثریت کے رحم و کرم پر رہ جائیں گے۔

خاکسار تحریک کا صدر دفتر لاہور میں تھا۔ صوبہ سرحد اور حیدر آباد دکن میں بھی ان کا بڑا اثر تھا۔ اس جماعت نے انتخابات میں براہ راست حصہ نہیں لیا۔ اس جماعت کی ہمدردیاں مسلم لیگ کے ساتھ لیکن ان کے ووٹ بہت کم تھے۔

مسلمانوں میں سیاسی انتشار کی وجہ سے انتخابات میں مسلم لیگ اکیلی رہ گئی۔ مسلم اکثریت کے صوبوں بنگال، سندھ، پنجاب اور سرحد میں اس کی حالت بڑی پتلی تھی۔ ان صوبوں میں بالترتیب کرشک پرجا پارٹی، سندھ یونائیٹڈ پارٹی، یونینسٹ پارٹی، اور سرخپوشوں کا زور تھا۔ ان حالات میں مسلم لیگ کا سارا زور ہندو اکثریت کے صوبوں میں انتخابات لڑنے پر رہا۔ مسلم لیگ کے مقابلے میں کانگرس بڑی امیر جماعت تھی۔ احمد آباد اور بمبئی کے ہندو صنعت کار اور کروڑ پتی سیٹھ کھل کر کانگرس کی حمایت کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ کانگرس نے انتخابات کے دوران گاندھی جی کو "مہاتما" بنا کر ہندوؤں کے سامنے پیش کیا اور ان کے بارے میں یہ مشہور کیا کہ مہاتما بدھ کے

اڑھائی ہزار سال بعد برعظیم میں دوسرا "مہاتما" گاندھی جی کے رُوپ میں پیدا ہوا ہے۔ کانگرس کے اس حربے اور سرمائے نے انتخابات میں بڑا کام دکھایا۔

مسلم لیگ نے ۵۴ ارکان پر مشتمل ایک پارلیمانی بورڈ قائم کیا اور قائداعظم اس کے صدر مقرر ہوئے۔ ابتداء میں اس بورڈ میں جمعیت العلماء ہند، مجلس احرار اسلام، مسلم یونینی بورڈ اور چند نام نہاد قوم پرست بھی شامل تھے۔ لیکن جوں جوں انتخابات قریب آتے گئے ان جماعتوں کے قائدین اپنے مفادات میں مسلم لیگ سے الگ ہوتے گئے۔

مسلم لیگ نے بڑے غور و خوض کے بعد اپنا انتخابی منشور تیار کیا اور اسے ۲ جون ۱۹۳۶ء کو لاہور میں منعقدہ ایک جلسہ میں منظور کر کے مشتہر کیا۔ اس منشور کے اہم نکات یہ تھے:

۱۔ برطانوی حکومت تمام جابرانہ قوانین منسوخ کرے۔
۲۔ ملک کی اقتصادی لُوٹ رُو کی جائے۔
۳۔ انتظامیہ کے اخراجات گھٹا کر وہی رقم تعمیری کاموں پر خرچ کی جائے۔
۴۔ دیہی آبادی کی ترقی کے لئے مناسب اقدام کئے جائیں۔
۵۔ ابتدائی تعلیم مفت ہو گی۔
۶۔ فوج میں مقامی لوگوں کو شامل کر کے اسے قومیایہ جائے۔
۷۔ ملک میں صنعت کو ترقی دی جائے۔
۸۔ کرنسی اور شرح مبادلہ کا خیال رکھا جائے۔
۹۔ کاشتکاروں پر سے زرعی قرضوں کا بوجھ کم کیا جائے۔
۱۰۔ مسلمانوں کے مذہب، زبان اور رسم الخط کی حفاظت کی جائے (اُردو کو اس کا صحیح مقام دیا جائے)۔
۱۱۔ مسلمانوں کی حالت بہتر بنائی جائے۔
۱۲۔ رائے عامہ کو بیدار کیا جائے۔

یہ منشور لے کر مسلم لیگ میدان میں اُتری۔ دوسری جانب کانگرس نے جو منشور شائع کیا وہ بڑی حد تک مسلم لیگ کے منشور سے مماثلت رکھتا تھا۔ اس میں

صرف دو باتیں مسلم لیگ کے انتخابی منشور سے الگ تھیں:

۱۔ جداگانہ انتخاب کا طریقہ ختم کر کے مخلوط انتخاب کا طریقہ رائج کیا جائے۔

۲۔ ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط کو اپنایا جائے۔

جوں جوں انتخابات قریب آ رہے تھے کانگرس کا پراپیگنڈہ تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ ہندو سرمایہ داروں کا سرمایہ اور ہندو پریس اس کی پُشت پر تھے۔ ادھر مسلم لیگ کے پاس صرف ایک ہی اخبار تھا "دی سٹار آف انڈیا"۔ مسلم لیگ کے پاس نہ ہی ڈھنگ کا کوئی دفتر تھا اور نہ ہی دفتری عملہ۔ قائداعظم اپنے ہاتھ سے خطوط کا جواب دیتے اور جگہ جگہ عوام کو خطاب کرنے کے لئے نکلتے۔ اس بے سرو سامانی کے ساتھ مسلم لیگ نے انتخاب لڑا۔

صوبائی اسمبلیوں میں کل ۵۸۵ نشستیں تھیں۔ چھ صوبوں بنگال، بہار، آسام، بمبئی، مدراس اور یوپی کے ایوان ہائے بالا کی ۱۸۶ نشستیں تھی۔ اس طرح کل نشستوں کی تعداد ۷۷۱ تھی۔ ان میں ۴۸۲ نشستیں مسلمانوں کے لئے مخص تھیں۔

جب انتخابات کے نتائج سامنے آئے تو دونوں بڑی سیاسی جماعتوں کو بڑی مایوسی ہوئی۔ مسلم لیگ نے ۴۸۲ میں سے ۱۰۸ نشستیں حاصل کیں۔ کانگرس نے ۵۸ مسلم نشستوں پر اپنے امیدوار کھڑے کئے تھے۔ ان میں سے صرف ۲۶ کامیاب ہوئے۔

کل ہند سطح پر ساڑھے تین کروڑ ووٹ ڈالے گئے۔ ان میں سے ڈیڑھ کروڑ کانگرس کو ملے۔ کل ہند سطح پر کانگرس کو ۷۱۱ نشستیں ملیں۔ اس طرح وہ پچاس فیصد ووٹ بھی حاصل نہ کر سکی۔ مزید برآں ہندوؤں کے لئے مخص نشستوں پر ۲۱۱ غیر کانگرسی ہندو اُمیدوار کامیاب ہوئے۔ ان حالات میں اگر کانگرس کا ایک طرف تمام ہندوستانیوں کی نمائندہ جماعت ہونے کا دعویٰ باطل ہو گیا، تو دوسری جانب وہ تمام ہندوؤں کی نمائندہ جماعت ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

پنجاب کانگرس کو ۱۷۵ میں سے ۱۸ نشستیں ملیں اور بنگال میں ۲۵۰ نشستوں پر اس کے صرف ۶۰ امیدوار کامیاب ہوئے۔ سندھ میں اسے ۶۰ میں سے صرف ۸ نشستیں ملیں اور اس کے مقابلے میں سندھ "ہندو سبھا" نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ آسام میں ۱۰۸ نشستوں پر مقابلہ ہوا جس میں کانگرس کے ۳۵ امیدوار

کامیاب ہوئے۔

مدراس میں کانگرس کا تناسب ۷۷ فیصد رہا اور بمبئی میں ۴۸ فیصد۔ اسی طرح یوپی میں اسے ۵۹ فیصد نشستیں ملیں اور سی پی میں ۶۳ فیصد۔ بہار میں کانگرس کی کامیابی کا تناسب ۹۲ فیصد تھا۔ سرحد میں کانگرس نے ۳۸ فیصد نشستیں حاصل کیں۔ اُڑلیسہ میں بھی کانگرس کو اکثریت حاصل تھی۔

صوبہ سرحد میں اگرچہ کانگرس کو صرف ۳۸ فیصد نشستیں ملی تھی لیکن ابُوالکلام آزاد (م ۱۹۵۸ء) اور سرحدی گاندھی عبدالغفار خان (م ۱۹۸۸ء) کی ناپاک کوششوں سے ان کے بھائی ڈاکٹر خان صاحب (م ۱۹۵۸ء) ہم خیال ممبران اسمبلی کو اپنے ساتھ ملا کر وزارت بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ بہار میں سری کرشنا سنہا نے وزارت عظمٰی کا قلمدان سنبھالا۔ سی پی میں پہلے مسٹر کھارے اور بعد ازاں مسٹر شکلا وزیر اعلیٰ بنے۔ بمبئی میں کانگرس کے پاس صرف ۴۸ فیصد نشستیں تھیں لیکن جی بی کھیر (م ۱۹۵۷ء) اپنے ہم خیال ممبران اسمبلی کو ساتھ ملا کر وزارت تشکیل دینے میں کامیاب ہو گئے۔ مدراس میں راج گوپال اچاریہ (م ۱۹۷۲ء) نے وزیر اعلیٰ کا حلف اٹھایا اور اُڑیسہ میں بسوا ناتھ داس وزیر اعلیٰ کے منصب پر فائز ہوئے۔ یوپی میں پنڈت گووند ولبھ پنت وزیر اعلیٰ مقرر ہوا۔ پنجاب اسمبلی میں ۱۷۵ نشستیں تھیں۔ یونینسٹ پارٹی ان میں سے ۸۸ نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ مسلم لیگ کے فقط دو امیدوار ملک برکت علی (م ۱۹۴۶ء) اور راجہ غضنفر علی خان (م ۱۹۶۳ء) کامیاب ہوئے۔ راجہ صاحب کو بھی یونینسٹ پارٹی نے پانچ صد روپے ماہانہ پر پارلیمانی سیکرٹری بنانے کا لالچ دے کر توڑ لیا۔ اس طرح پورے ایوان میں صرف ملک برکت علی مسلم لیگ کے نمائندے رہ گئے۔

سندھ میں سر غلام حسین ہدایت اللہ (م ۱۹۴۸ء) کی سندھ یونائیٹڈ پارٹی کو دوسری سیاسی جماعتوں پر برتری حاصل رہی۔ انہوں نے اپنی ہم خیال جماعتوں سے مل کر وزارت تشکیل دی۔

بنگال میں سب سے زیادہ نشستیں ابُوالقاسم فضل الحق (م ۱۹۶۲ء) کی کرشک پرجا پارٹی کو ملیں اور وہ بنگال کے وزیر اعلیٰ بن گئے۔

آسام کی اسمبلی میں ۱۰۸ نشستوں میں سے ۳۵ کانگرس کے پاس تھیں۔

مسلم لیگ کے پاس ۹، آسام ویلی مسلمز کے پاس ۵ اور سرما ویلی مسلمز کے پاس بھی ۵ نشستیں تھیں۔ یوں مسلمانوں کے پاس ۱۹ نشستیں تھیں۔ وہاں کانگرس اس پوزیشن میں نہ تھی کہ وہ وزارت بنا سکتی۔ ان حالات میں سر محمد سعد اللہ (م ۱۹۵۵ء) وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔

یہ وزارتیں سوا دو سال تک قائم رہیں۔ اس عرصے میں بڑے اکھاڑ پچھاڑ ہوئے۔ صرف سندھ میں پانچ بار وزیر اعلیٰ کا تختہ الٹا گیا۔

یُوپی کی پوزیشن بڑی دلچسپ تھی۔ وہاں اسمبلی میں مسلم لیگ کی پوزیشن کافی حد تک بہتر تھی۔ قائداعظم یہ اعلان فرما چکے تھے کہ مسلم لیگ کی پالیسی دوسری سیاسی جماعتوں کے ساتھ تعاون کی ہے اور مسلم لیگ کا دستور اس میں آڑے نہیں آتا۔ یُوپی اسمبلی میں نواب محمد اسمٰعیل خاں (م ۱۹۵۸ء) اور چوہدری خلیق الزمان (م ۱۹۷۳ء) مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کے رہنما تھے۔ انہوں نے کانگرس کے ساتھ مل کر مخلوط وزارت بنانے کی پیش کش کی، کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ یُوپی جیسے صوبے میں جو اسلامی تہذیب و تمدن کا گہوارہ ہے، کانگرس بلا شرکتِ غیرے وزارت بنا کر ہندو راج قائم کرے۔

چوہدری خلیق الزمان کی پیش کش کا جواب دینے کے لئے کانگرس نے اپنے مُہرے ابُوالکلام آزاد کو آگے بڑھایا۔ ابُوالکلام آزاد نے چوہدری خلیق الزمان کے سامنے درج ذیل شرائط رکھیں:

۱۔ مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی یُوپی اسمبلی میں اپنا جداگانہ تشخص ختم کر دے۔
۲۔ یُوپی اسمبلی کے مسلم لیگی ارکان کانگرس میں ضم ہو جائیں اور وہ خود کو ہر طرح سے کانگرسی ارکان سمجھیں۔
۳۔ وہ کانگرس کی ہدایات پر عمل کریں۔
۴۔ کانگرسی ارکان کے لئے جو ضابطہ تیار کیا جائے گا، انہیں بھی اس کی پابندی کرنا ہو گی۔
۵۔ ہر رُکن اسمبلی کا ایک ووٹ ہو گا اور تمام امور کثرت رائے سے طے کئے جائیں گے۔

۶۔ یُوپی اسمبلی میں مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کو توڑ دیا جائے گا اور مسلم لیگ آئندہ اپنے ٹکٹ پر کسی اُمیدوار کو ضمنی الیکشن میں کھڑا نہیں کرے گی۔
۷۔ اگر کبھی کانگرس نے وزارت چھوڑنے یا اسمبلی سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کیا تو مسلم ارکان کو بھی اس فیصلے کی پابندی کرنا ہو گی۔

ابُوالکلام آزاد نے چوہدری خلیق الزمان سے کہا کہ اگر وہ ان شرائط کو تسلیم کرتے ہیں تو صوبائی وزارت میں ان کے نمائندے لئے جائیں گے۔ چوہدری صاحب نے جواب میں کہا کہ وہ مسلم لیگ کے پروانۂ موت پر دستخط نہیں کر سکتے۔

ہمارے نقادوں کا کہنا ہے کہ کوئی غیرت مند شخص جسے ذرہ برابر بھی عزتِ نفس کا خیال ہو، وہ ایسی ذلیل شرائط پر کابینہ میں شامل ہونے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ ابُوالکلام آزاد کی پیش کردہ شرائط سے، جہاں ایک طرف ان کی مسلم لیگ سے دشمنی کا اظہار ہوتا ہے، وہاں ان کی ہندو سے زیادہ ہندووانہ ذہنیت کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔

کانگرس نے انتخابات میں کامیابی کے بعد ہندو اکثریت کے صوبوں میں وزارتیں تشکیل دیں اور اقتدار پر قابض ہوتے ہی پنڈت جواہر لعل نہرو نے بڑھک ماری کہ ہندوستان میں صرف دو ہی طاقتیں ہیں، ایک کانگرس اور دوسری انگریز۔ اس پر قائداعظم نے فرمایا کہ ایک تیسری قوت بھی ہے اور وہ ہیں مسلمان۔

oooo

صوبائی وزارتوں کی تشکیل

انتخابات کے فوراً بعد مارچ ۱۹۳۷ء میں کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے ابوالکلام آزاد (م ۱۹۵۸ء) بابو راجندر پرشاد (م ۱۹۶۳ء) اور سردار ولبھ بھائی پٹیل (م ۱۹۵۰ء) پر مشتمل ایک پارلیمانی سب کمیٹی قائم کی۔ اس سب کمیٹی کی یہ ذمہ داری تھی کہ اسمبلیوں میں اپنی جماعت کے کام کی نگرانی کرے۔ انہیں مختلف امور میں مشورے دے اور ضرورت کے وقت فوری کارروائی کرے۔ یہ الفاظ تو ان کے حقیقی کام پر پردہ ڈالنے کے لئے استعمال کئے گئے تھے دراصل اس سب کمیٹی کا کام صوبائی اسمبلیوں میں جوڑ توڑ کرکے کانگرس پارٹی کو مضبوط بنانا اور مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلم لیگ کی مخالف جماعتوں کو بغض معاویہ کی بنا پر متحد کرکے وزارت بنانا اور مسلم لیگ کو اقتدار سے محروم رکھنا تھا۔

کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے سب کمیٹی کے کام کی تقسیم یوں کی کہ ابوالکلام آزاد کو بنگال، یو۔ پی، پنجاب اور سرحد کا نگران بنایا۔ بابو راجندر پرشاد کو بہار اڑیسہ اور آسام کے صوبے تفویض کئے اور سردار ولبھ بھائی پٹیل کو بمبئی، مدراس، سی پی اور سندھ کا ذمے دار بنایا۔ بعد ازاں کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے سب کمیٹی کو وسیع اختیارات دے دیئے اور اسے صوبائی اسمبلی کے کانگرسی ارکان یا صوبائی کانگرس کمیٹی سے صلاح و مشورہ کئے بغیر کارروائی کرنے کا اختیار تفویض کر دیا۔

قانون کی رُو سے صوبے کا وزیر اعلیٰ اور اس کی کابینہ اسمبلی کو جوابدہ تھی لیکن کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے انہیں پارلیمانی سب کمیٹی کے سامنے جوابدہ کر دیا۔ اس کے علاوہ پارلیمانی سب کمیٹی کو یہ اختیار بھی دے دیا گیا ہے کہ وہ جس وزیر اعلیٰ کو چاہے برطرف کر سکتی ہے اور اسی طرح اپنی مرضی سے کابینہ میں رد و بدل اور عزل و نصب کرنے کی بھی مجاز ہے۔ یہ پارلیمانی سب کمیٹی ایک ڈکٹیٹر کی طرح پالیسی وضع کرتی اور وزرائے اعلیٰ کو اس پر عمل کرنے کا حکم دیتی تھی۔ اسی طرح صوبائی حکومتیں

انگریز گورنروں کی بجائے پارلیمانی سب کمیٹی کی نگرانی میں کام کرنے لگیں۔ بالفاظ دیگر ملک میں کانگرس کا راج قائم ہو گیا اور گاندھی جی در پردہ ملک کے ڈکٹیٹر بن گئے۔ ان خیالات کا اظہار سر البین بینز جی نے اپنے ایک مضمون Dictatorship By Proxy in India میں کیا ہے۔ ایسے ہی موقع پر کسی نے کہا تھا کہ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ گاندھی جی براہ راست حکم صادر نہیں کرتے تھے۔ ان کے پاس کانگرس کا کوئی معمولی سا عہدہ بھی نہ تھا، یہاں تک کہ وہ کانگرس کے بنیادی رکن بھی نہیں تھے۔ اس کے باوجود سب کچھ انہی کے ایما پر ہوتا تھا اور ان کے اشارۂ ابرو کو مذہبی فریضہ جان کر عملی جامہ پہنایا جاتا تھا۔ ان حالات میں جمہوریت کی دعویدار جماعت کانگرس میں جمہوریت نام کی کوئی شے نہ تھی۔ سر ولیم بارٹن نے بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے کہ گاندھی جی وزیروں کے عزل و نصب میں اپنی مرضی سے کام لیتے تھے اور وہ اس کی پرواہ نہیں کرتے تھے کہ انہیں عوام نے منتخب کرکے ایوان میں بھیجا ہے۔

پروفیسر رشبروک ولیمز کی یہ رائے ہے کہ کانگرس کے ارکان اسمبلی نے ملک کے مفاد کو پارٹی کی قربان گاہ پر بھینٹ سمجھ کر چڑھا دیا اور کانگرسی راہنماؤں نے اپنے اعمال اور عقل و حواس کو ایک غیر ذمہ دار شخص (گاندھی) کے تابع کر دیا۔ یہ ارکان اسمبلی قانون کی نظر میں اپنے ووٹروں کے نمائندے تھے اور صوبائی اسمبلی کے قواعد و ضوابط کے تابع تھے۔ کانگرس کے حکمران ایوان سے اعتماد کا ووٹ لے کر حکومت کا کاروبار چلا رہے تھے۔ اس کے باوجود وہ ایوان کی پرواہ کئے بغیر گاندھی جی کے اشارے پر چل رہے تھے۔ پروفیسر رشبروک ولیمز لکھتے ہیں کہ ایسا کرکے کانگرس نے یہ بتا دیا کہ اس کے نزدیک "سوراج" سے کیا مراد ہے۔

ایک انگریز مدبر ایچ وی ہوڈسن کانگرسی وزارتوں کی کارکردگی پر تنقید کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ان کی حکومت صریحاً ایک ڈکٹیٹر شپ تھی اور یہ ایک ذمہ دار پارٹی حکومت کی بگڑی ہوئی صورت تھی۔ انہوں نے مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کو یہ باور کرا دیا کہ اسمبلیوں میں ان کا پاسنگ اور ان کے حقوق بے معنی سی چیز ہیں۔ کیونکہ اس پورے نظام کو چلانے والا وہ غیر ذمہ دار انسان (گاندھی) ہے جو واردھا میں مقیم ہے۔

ایک انگریز دانشور سی بی برڈوڈ کے الفاظ میں کانگرس کی پالیسی جمہوریت کی کسی بھی

صورت سے قریب ہونے کی بجائے ہمعصر جرمنی میں نازی پارٹی کی پالیسی ... ست تھی۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی یہ رائے ہے کہ اس پالیسی نے ایک ذمہ دار حکومت کی کارکردگی کو کمزور کر دیا اور وہ اپنے بنیادی مقاصد کے حصول میں ناکام ہو گئی۔ ایک جمہوری نظام میں عوام کی مرضی کے مطابق حکومت کا کاروبار چلایا جاتا ہے لیکن کانگرسی راج میں یہ ہوا کہ جونہی انتخابات مکمل ہوئے، عوام کی رائے کو نظر انداز کرکے کانگرس کی ہائی کمان کو مسلط کر دیا گیا۔ کانگرس کو ووٹ دینے والوں کی یہ خواہش تھی کہ ان کے منتخب نمائندے حکومت چلائیں۔ انہوں نے کانگرس کی ہائی کمان کو حکومت چلانے کا حق نہیں دیا تھا۔ ۱۹۳۵ء کے آئین کا بنیادی مقصد برِعظیم کے عوام کو حکومت خود اختیاری چلانے کی تربیت دینا تھا لیکن کانگرس نے اس سے رُوگردانی کرتے ہوئے گاندھی اور کانگرس کی ہائی کمان کو عوام اور حکومت کے درمیان کھڑا کرکے اس تجربے کو ناکام بنا دیا۔ دوسری جانب کانگرس کی ہائی کمان نے صوبائی خود مختاری پر کاری ضرب لگائی اور اس نے وفاق کو ناکام بنا دیا۔ کانگرس کی ایسی ہی نازیبا حرکات نے برِعظیم کو متحد رکھنے کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہونے دیا۔ تیسری جانب کانگرس نے ایسا رویّہ اپنایا کہ وہ دوسری سیاسی جماعتوں سے بات تک کرنے کی رُوادار نہ تھی، حالانکہ سیاست ہمیشہ کچھ دو اور کچھ لو کے اصول پر چلتی ہے۔ آگے چل کر کانگرس کی اسی پالیسی نے سمجھوتے کے تمام راستے مسدود کر دیئے۔

پنجاب کی وزارت:

انتخابات میں پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کو دوسری جماعتوں کے مقابلے میں زیادہ ووٹ ملے اور اس نے ۱۷۵ نشستوں کے ایوان میں سے ۸۸ نشستیں حاصل کیں۔ ضابطۂ اخلاق کے تحت اکثریتی جماعت کا رُکن ہی سپیکر چنا جاتا ہے۔ چوہدری سر شہاب الدین (م ۱۹۴۹ء) کے سپیکر منتخب ہونے سے یونینسٹ پارٹی کا ایک ووٹ اور کم ہو گیا، اس طرح وہ وزارت سازی کی پوزیشن میں نہ تھی اور اسے کسی دوسری جماعت کے تعاون کی ضرورت تھی۔ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر دو ارکان ملک برکت علی (م ۱۹۴۶ء)

اور راجہ غضنفر علی خان (م ۱۹۶۳ء) منتخب ہوئے تھے۔ انتخاب کے بعد راجہ صاحب پارلیمانی سیکرٹری بنائے جانے کے لالچ میں یونینسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے۔

کانگرس کی ہائی کمان نے جو پارلیمانی سب کمیٹی بنائی تھی اس کے رُکن ابوالکلام آزاد پنجاب، سرحد، یوپی اور بنگال میں وزارتیں بنانے اور انہیں اپنے ڈھب پر چلانے کے ذمہ دار تھے، وہ فوراً لاہور پہنچے۔ کانگرس کے ۱۸ ارکان تو ان کی جیب میں تھے۔ ان کے علاوہ ۳۶ غیر کانگرسی ہندو اور سکھ ارکان بھی ان کی بات رد نہیں کر سکتے تھے۔ ابوالکلام نے اپنا پورا بوجھ یونینسٹ پارٹی کے پلڑے میں ڈال دیا اور سر سکندر حیات خان پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ بن گئے۔ سر سکندر ۲۶ دسمبر ۱۹۴۲ء کو اچانک فوت ہو گئے تو ان کی جگہ ملک خضر حیات خان ٹوانہ پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ مقرر ہوئے۔ وہ ۱۹۴۶ء کے انتخابات تک اس عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کو ۱۷۵ نشستوں میں سے ۷۵ نشستیں ملیں اور ملک خضر حیات خاں ٹوانہ (م ۱۹۷۵ء) کی یونینسٹ پارٹی نے صرف ۲۰ نشستیں حاصل کیں۔ ان میں سے بھی چار ممبر مسلم لیگ سے جا ملے۔ اب یونینسٹ پارٹی کے پاس صرف ۱۶ نشستیں رہ گئیں۔ ایسے آڑے وقت میں ابوالکلام آزاد، ملک خضر حیات خاں کے کام آئے۔ آزاد نے مسلم لیگ کو وزارت بنانے سے محروم رکھا اور کانگرس اور اکالی دل کے ۸۴ ارکان اسمبلی ملک صاحب کی حمایت میں کھڑے کر دیئے۔ ۱۶ نشستیں ملک صاحب کے پاس تھیں، اس طرح وہ ایک بار پھر وزارت بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ ابوالکلام آزاد نے اسے کانگرس کی فتح سے تعبیر کیا اور بڑے فخر کے ساتھ یہ کہا کہ "میں نے پنجاب کی وزارت سازی کے بارے میں ہونے والی گفت و شنید میں بڑی مہارت اور تدبّر کا ثبوت دیا ہے"۔ یہاں مہارت اور تدبّر سے یہ مراد ہے کہ ایوان کی سب سے بڑی جماعت مسلم لیگ کو جس کے ارکان کی تعداد ۷۹ تھی، وزارت بنانے سے محروم رکھا۔ اگر ابوالکلام آزاد (م ۱۹۵۸ء) کی ریشہ دوانی سے خضر حیات خاں وزارت بنانے میں کامیاب نہ ہوتا اور مسلم لیگ وزارت سازی میں کامیاب ہو جاتی تو پنجاب کبھی تقسیم نہ ہوتا۔

سندھ کی وزارت:

سندھ اسمبلی انتخابات میں سر غلام حسین ہدایت اللہ (م ۱۹۴۸ء) کی سندھ یونائیٹڈ پارٹی نے اسمبلی میں ۱۸ نشستیں حاصل کرکے دوسری سیاسی جماعتوں پر برتری حاصل کرلی ۔ سندھ ہندو سبھا نے ۱۱ نشستیں اور کانگرس نے ۸ نشستیں حاصل کیں ۔ کانگرس کی ایک ذیلی جماعت سندھ آزاد پارٹی کے ۳ امیدوار کامیاب ہوئے اور دو ہندو آزاد ارکان کی حیثیت سے اسمبلی میں پہنچ گئے ۔

کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے تین ارکان پر مشتمل جو پارلیمانی سب کمیٹی بنائی تھی اس کے ایک رکن سردار ولبھ بھائی پٹیل سندھ کے نگران بنائے گئے تھے ۔ ولبھ بھائی پٹیل نے ہندو ارکان کے تعاون سے سر غلام حسین ہدایت اللہ (م ۱۹۴۸ء) کو وزیر اعلیٰ بنا دیا ۔ آٹھ ماہ بعد جب مارچ ۱۹۳۸ء میں اسمبلی میں بجٹ پیش ہوا تو سر غلام حسین ہدایت اللہ اسے منظور نہ کروا سکے ۔ اس بنا پر انہیں اپنے منصب سے الگ ہونا پڑا ۔ ان کی جگہ خان بہادر اللہ بخش (م ۱۹۴۳ء) سندھ کے وزیر اعلیٰ بنے ۔ انہیں اسمبلی میں صرف ۲۲ ارکان کی حمایت حاصل تھی ۔ اس لئے انہوں نے اپنی وزارت کو بچانے کے لئے کانگرسی ارکان سے تعاون کی اپیل کی ۔ انہوں نے اس شرط پر تعاون کا یقین دلایا کہ خان بہادر اللہ بخش کانگرس کی ہدایت کے مطابق حکومت کا کاروبار چلائیں گے ۔ انہوں نے یہ شرط قبول کرلی اور سردار ولبھ بھائی پٹیل سے احکام لینے لگے ۔

اسی زمانے میں حکومت کی طرف سے یہ حکم ملا کہ لائیڈ بیراج سکھر کی تعمیر کے اخراجات پورے کرنے کے لئے مالیئے میں اضافہ کیا جائے ۔ کانگرسی ارکان اسمبلی نے اس کی مخالفت کی اور وہ خان بہادر اللہ بخش کے خلاف ہو گئے ۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل نے اختلافات ختم کرنے کی سعی کی لیکن کانگرسی ارکان رضامند نہ ہوئے ۔ دوسری جانب مسلم لیگ خان بہادر پر دباؤ ڈال رہی تھی کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں لیکن وہ نہ مانے ۔ خان بہادر نے سر غلام حسین ہدایت اللہ کو رضامند کرکے اپنی کابینہ میں شامل کرلیا ۔

اکتوبر ۱۹۳۹ء میں کانگرسی وزارتوں کے مستعفی ہونے کے بعد بھی سندھ کی وزارت چلتی رہی ۔ مارچ ۱۹۴۰ء میں ایک نوزائیدہ سیاسی جماعت نیشلسٹ پارٹی کے سربراہ میر بندے علی تالپور نے مسلم لیگ اور آزاد ہندوؤں کی مدد سے اسمبلی میں اپنی

اکثریت ثابت کر دی ۔ مجبوراً خان بہادر اللہ بخش کو میر صاحب کے لئے وزارت اعلیٰ کی مسند خالی کرنا پڑی ۔ میر بندے علی کی کابینہ میں محمد ایوب کھوڑو (م ۱۹۸۰ء) اور جی ایم سید (م ۱۹۹۵ء) بھی شامل تھے ۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے بقول میر بندے علی تالپور کو بھی کانگرس کی اشیر باد حاصل رہی ۔ اسی دوران میں خان بہادر اللہ بخش بھی میر صاحب کے حمایتی بن گئے ۔

میر بندے علی تالپور کو خان بہادر کی حمایت بڑی مہنگی پڑی ۔ خان بہادر نے اندر خانہ اکھاڑ پچھاڑ شروع کر دی اور مارچ ۱۹۴۱ء میں میر صاحب کو ایوان کے اعتماد سے محروم کرکے خود وزیر اعلیٰ بن گئے ۔ ان کی کابینہ میں مسلم لیگ کا کوئی نمائندہ شامل نہ تھا ۔ یہ بات بڑی حیران کن ہے کہ مسلم اکثریت کے صوبے میں ایک مسلمان کابینہ تشکیل دے اور اس میں مسلم لیگ کا کوئی نمائندہ موجود نہ ہو ۔

اگست ۱۹۴۲ء میں جب کانگرس نے "ہندوستان چھوڑ دو تحریک" شروع کی اور خطاب یافتہ افراد سے یہ اپیل کی کہ وہ سرکاری خطابات اور اعزازات واپس کر دیں تو اللہ بخش نے بھی خان بہادر کا خطاب واپس کر دیا ۔ یہ بات گورنر کو ناگوار گزری اور اس نے اللہ بخش کو بلا کر کہا کہ اس نے اپنے عہدے کا حلف اٹھاتے وقت حکومت کا وفادار رہنے کا عہد کیا تھا ۔ اس کا خطاب واپس کرنا اس حلف نامے کے خلاف ہے ۔ اسی بنا پر گورنر نے اکتوبر ۱۹۴۲ء میں اللہ بخش کو اس کے عہدے سے برطرف کر دیا ۔

اللہ بخش کی برطرفی کے بعد سر غلام حسین ہدایت اللہ دوبارہ وزیر اعلیٰ کے منصب پر فائز ہوئے ۔ انہوں نے دو مسلم لیگیوں کو بھی اپنی کابینہ میں شامل کیا ۔ نئے وزیر اعلیٰ کانگرس کے رویے سے شاکی تھے ۔ اس لئے انہوں نے وزیر اعلیٰ بننے کے ساتھ ہی مسلم لیگ میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا ۔ ان کا یہ اعلان کانگرسی حلقوں پر بجلی بن کر گرا ۔

بنگال کی وزارت:

بنگال اسمبلی میں کل ۲۵۰ نشستیں تھیں اور ان میں سے ۴۰ نشستیں مسلم لیگ نے جیتیں اور ۴۳ نشستیں آزاد مسلمان لے گئے ۔ اسی طرح ۳۸ نشستیں

دوسری جماعتوں کے مسلمانوں نے حاصل کیں۔ اسمبلی میں سب سے بڑی سیاسی جماعت کرشک پرجا پارٹی تھی۔ کانگرس نے ۵۴ نشستیں حاصل کیں اور غیر کانگرسی ہندو ۴۲ حلقوں سے اسمبلی کے رُکن منتخب ہوئے۔ بنگال اسمبلی میں یورپین اور اینگلو انڈینز کی بھی ۳۱ نشستیں تھیں۔ دو مسلمان ارکان ایسے بھی تھے جو کسی پارٹی سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ ان حالات میں بنگال میں وزارت سازی کسی حد تک دشوار تھی۔ یہ صوبہ کانگرس نے اَبُوالکلام آزاد کی نگرانی میں دیا تھا اس لئے وہاں کی تمام اکھاڑ پچھاڑ کے وہی ذمہ دار تھے۔

کرشک پرجا پارٹی کے سربراہ مولوی اَبُوالقاسم فضل الحق (م ۱۹۶۲ء) وزیر اعلیٰ بنے اور انہوں نے اپنی کابینہ میں ۵ مسلم اور ۵ غیر مسلم وزیر شامل کئے۔ کانگرس اس پر بھی خوش نہ تھی اور اس کی یہ خواہش تھی کہ جس طرح بھی بن پڑے، وزیر خزانہ این آر سرکار (سابق رکن کانگرس) سے استعفیٰ لکھوالیں۔ کانگرس کے اس ناجائز دباؤ نے مسلمانوں کو اسمبلی کے اندر اور باہر متحد ہونے میں بڑی مدد دی۔ ۱۹۳۹ء کے اواخر میں این آر سرکار نے اس بہانے کابینہ سے علیحدگی اختیار کرلی کہ وہ اس سرکاری بل کی حمایت نہیں کر سکتا جس میں جنگِ عظیم دوم کے خاتمے پر اقلیتوں کے تحفظات کی شرط پر برِّعظیم کو ڈومینین سٹیٹس دینے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ وہ اس زعم میں تھا کہ اس کے مستعفی ہونے سے اقلیتوں کو برِّعظیم میں ہونے والی آئینی ترقی کو ویٹو کرنے کا موقع مل جائے گا لیکن اس کی یہ آرزو بر نہ آئی۔

جونہی دوسری عالمی جنگ کا آغاز ہوا مولوی اَبُوالقاسم فضل الحق کی حکومت نے جنگ کے دوران برطانیہ کی مکمل حمایت کا اعلان کر دیا۔ کانگرسی وزارتوں کے مستعفی ہونے کے باوجود مولوی اَبُوالقاسم فضل الحق کی حکومت مزید دو سال تک بغیر کسی دشواری کے چلتی رہی۔ ۱۹۴۱ء میں ان کی پارٹی کے مسلم ارکان میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ مولوی اَبُوالقاسم فضل الحق نے مسلم لیگ سے مشورہ کئے بغیر ڈیفنس کونسل کی میں شمولیت اختیار کرلی۔ اس پر مسلم لیگ نے بنگال، پنجاب اور آسام کے وزرائے اعظم سے کہا کہ وہ فوراً ڈیفنس کونسل کی رُکنیت سے استعفیٰ دے دیں۔ پہلے تو اَبُوالقاسم فضل الحق نے اس حکم کے خلاف احتجاج کیا، پھر کونسل کی رُکنیت ترک

کر دی اور اس کے ساتھ ہی مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی سے بھی مستعفی ہو گئے۔ مسلم لیگ کے حکم کے خلاف احتجاج کرنے پر ان کے دو بڑے مسلم حامی خواجہ ناظم الدین (م ۱۹۶۴ء) اور حسین شہید سہروردی (م ۱۹۶۳ء) نے مولوی صاحب کی حمایت ترک کر دی۔ اس وقت تو معاملہ ذرا ٹھنڈا پڑ گیا لیکن نومبر ۱۹۴۳ء میں طرفین کھُل کر ایک دوسرے کے مقابل آگئے۔ مولوی اَبُوالقاسم فضل الحق نے کرشک پرجا پارٹی، کانگرس کے فارورڈ بلاک اور چند دوسرے ارکان کو ساتھ ملا کر ۱۱ دسمبر ۱۹۴۱ء کو نئی کابینہ بنا لی جس میں مولوی صاحب سمیت پانچ وزراء مسلمان تھے اور چار ہندو، ان چار ہندوؤں میں ایک اچھوت تھا اور ایک (ایس پی مکرجی) بڑا متعصب مہاسبھائی تھا۔ بقیہ دو ہندو وزیر کانگرس کے فارورڈ بلاک سے تعلق رکھتے تھے۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی (م ۱۹۸۱ء) کے بقول مسلمانوں میں انتشار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مولوی اَبُوالقاسم فضل الحق حکومت چلاتے رہے۔ ۱۹۴۲ء کے آغاز میں ایک ضمنی انتخاب میں مولوی اَبُوالقاسم فضل الحق (م ۱۹۶۲ء) کی جماعت سے تعلق رکھنے والے امیدوار کو صرف ۸۳۰ ووٹ ملے جبکہ اس کے بالمقابل مسلم لیگی امیدوار نے ۴۸۲۳ ووٹ حاصل کئے۔ اس سے مولوی صاحب کو مسلمانوں میں اپنی غیر مقبولیت کا اندازہ ہو گیا تاہم وہ کسی نہ کسی طرح اپریل ۱۹۴۳ء تک اپنے عہدے سے چمٹے رہے۔ اسی مہینے وہ مستعفی ہونے پر مجبور ہو گئے اور ان کی جگہ خواجہ ناظم الدین بنگال کے وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ اس طرح مسلم لیگ کو اقتدار میں آنے کا موقع ملا۔

آسام کی وزارت:

۱۹۳۷ء کے انتخاب میں آسام میں تیرہ سیاسی جماعتیں کامیاب ہوئیں۔ اسمبلی میں ۹۴ نشستیں تھیں، جن میں سے ۳۵ کانگرس نے جیتیں۔ مسلم لیگ نے ۹ نشستیں حاصل کیں اور ۱۰ نشستیں آسام ویلی مسلمز اور سرما ویلی مسلمز نے جیتیں۔ اس طرح مسلمانوں کے پاس ۱۹ نشستیں تھیں۔ کانگرس بلا شرکتِ غیرے حکومت بنانے سے قاصر تھی اور وہ کسی دوسری جماعت سے تعاون کرنے پر آمادہ نہ تھی۔ کانگرس نے بابو راجندر پرشاد کو آسام کا نگران بنایا تھا۔ اس کی ہدایت پر کانگرس نے وزارت نہ

بنانے کا فیصلہ کیا۔ اسمبلی نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

۱۹۳۷ء کے اواخر میں کانگرس کے باغی ارکان اسمبلی کے قائد گوداوری مصرا نے مہاراجہ صاحب پرلا کی ویدی کی حمایت کی اور مہاراجہ صاحب نے ۲۳ نومبر ۱۹۳۷ء کو تین ارکان پر مشتمل کابینہ تشکیل دی جس میں ان کے علاوہ گوداوری مصرا اور ایک مسلمان وزیر شامل تھے۔ کانگرس کی ہائی کمان کی ناراضگی اور دھمکیوں کے باوجود مہاراجہ صاحب اپنا کام کرتے رہے۔

بقیہ کانگرسی وزارتیں:

بقیہ چھ صوبوں میں کانگرسی وزارتوں کی ہیئت اور کارکردگی قریب قریب ایک جیسی تھی۔ مدراس میں کانگرس کو اسمبلی میں ۷۰ فیصد نشستیں ملی تھیں۔ اس لئے وہاں راجگوپال اچاریہ بڑے اطمینان کے ساتھ کام کرتے رہے۔ بمبئی اسمبلی میں کانگرس کو ۴۸ فیصد نشستیں ملی تھیں لیکن بی جی کھیر نے اپنے ہم خیال ارکان اسمبلی کو ساتھ ملا کر پائدار کابینہ بنا لی۔

یوپی میں کانگرس کو اسمبلی میں ۷۰ فیصد نشستیں ملی تھیں۔ اس سے لئے وہاں پنڈت گووند ولبھ پنت (م ۱۹۶۱ء) کو کابینہ بنانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ سی پی میں کانگرس کے پاس ۶۳ فیصد نشستیں تھیں۔ وہاں پہلے مسٹر کھارے اور بعد ازاں شری شکلا وزیر اعلیٰ کے منصب پر فائز ہوئے۔ انہیں بھی حکومت کا کاروبار چلانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ بہار میں کانگرس نے ۶۲ فیصد نشستیں جیتی تھیں۔ وہاں سری کرشنا سنہا وزیر اعلیٰ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ صوبہ سرحد میں کانگرس نے صرف ۳۸ فیصد نشستیں حاصل کی تھیں یہ صوبہ پارلیمانی سب کمیٹی کے رکن ابُوالکلام آزاد کے کنٹرول میں تھا۔ لہٰذا انہوں نے اپنی رُوباہ بازی سے کام لیتے ہوئے دوسری جماعتوں کو ڈاکٹر خاں صاحب کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ کر لیا۔

یہ وزارتیں اکتوبر ۱۹۳۹ء تک قائم رہیں۔ جب برطانوی حکومت نے جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کیا تو وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو (م ۱۹۵۲ء) نے بھی جرمنی اور اس کے حلیفوں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ اس پر کانگرس سیخ پا ہو گئی کہ

وائسرائے نے اعلان جنگ کرنے سے پہلے اس کے ساتھ مشورہ کیوں نہیں کیا۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۳۹ء میں کانگرس کی ہائی کمان کے حکم پر کانگرسی وزارتوں نے بطورِ احتجاج استعفے دینے شروع کر دیئے اور وسطِ نومبر تک عوام کو کانگرس کے راج سے نجات مل گئی۔

یومِ نجات:

کانگرسی وزارتوں کے خاتمے پر مسلمانوں نے سکھ کا سانس لیا۔ ہندو اکثریت کے صوبوں میں اس دن مسلمانوں کے گھروں میں جشن کا سماں تھا۔ انہیں سوا دو سال کے بعد مہاسبھائی ذہنیت کے حامل ہندو ڈکٹیٹروں کے مظالم اور ناانصافیوں سے نجات ملی تھی۔ اس دوران میں بقول قائداعظم ہندوؤں نے اپنا نقطۂ نظر واضح کر دیا تھا کہ ہندوستان ہندوؤں کا ملک ہے۔ انہوں نے کیا خوب فرمایا کہ کانگرس جس کام کو نیشلزم کے دلکش لفظ میں لپیٹ کر پیش کرتی ہے، ہندو مہاسبھا (اس کے لئے ہندو، ہندی اور ہندوستان کے الفاظ استعمال کرتی ہے اور وہ) الفاظ کے چکر میں نہیں پڑتی۔

قائداعظم نے ۲ دسمبر کو ملک بھر کے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ ۲۲ دسمبر بروزِ جمعہ یومِ نجات منائیں۔ مسلمانوں نے مساجد میں شکرانے کے نوافل ادا کئے اور اپنے گھروں اور مساجد پر چراغاں کیا، جگہ جگہ مسلم لیگ کے پرچم لہرائے اور اپنے عظیم قائد کی تصاویر آویزاں کیں۔ کھانا پکا کر غربا میں تقسیم کیا گیا اور مٹھائی بانٹی گئی۔ مسلمانوں نے مختلف شہروں اور اہم قصبوں میں جلسے منعقد کئے اور جلوس نکالے گئے۔

یُوپی میں سب سے زیادہ خوشی کا اظہار کیا گیا۔ وہاں کے مسلمانوں کو پنڈت گووند ولبھ پنت کی متعصب اور ظالم حکومت سے نجات کے علاوہ ابُوالکلام کی بالادستی سے بھی چھٹکارا حاصل ہوا تھا، جن کی نگرانی میں یُوپی کی حکومت مسلمانوں پر ظلم ڈھاتی رہی اور انہیں ہندی پڑھنے، بندے ماترم کا ترانہ گانے، مسلم لیگ کی رُکنیت ترک کر کے کانگرس میں ضم ہو جانے، گاندھی کی مُورتی کے آگے ہاتھ جوڑ کر پرنام کرنے، واردھا سکیم اور وِدیا مندر کے ضوابط کو اپنانے اور ہندوؤں کے مرتب کردہ تعلیمی نصاب پڑھنے اور السلام علیکم کی جگہ "جے رام جی کی" کہنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ یہ وہ ناانصافیاں تھیں جن پر کانگرس کی ذیلی جماعت جمعیت العلماء ہند نے بھی صدائے احتجاج بلند کی

تھی ۔ لیکن ابُوالکلام نے پیرپُور رپورٹ، شریف رپورٹ اور فضل الحق رپورٹ میں بیان کئے گئے حقائق کے بارے میں کہا تھا کہ یہ سب جھوٹ ہے ۔ ایسی ہی وجوہات کی بنا پر قائداعظم نے ابُوالکلام آزاد کو (Show Boy of Congress) کہا تھا۔

جولائی ۱۹۳۷ء میں ہندو اکثریت کے صوبوں میں کانگرسی وزارتیں قائم ہوئیں تو جلد ہی ہندوؤں کی تنگ دلی، مسلم آزاری، مسلمانوں کے ساتھ ناانصافیوں اور ہندوؤں کی چیرہ دستیوں کی شکایتیں مسلم لیگ کے صدر دفتر میں وصول ہونے لگیں۔ ان شکایات پر غور کرنے کے لئے ۲۰ مارچ ۱۹۳۸ء کو مسلم لیگ کی ہائی کمان کا اجلاس منعقد ہوا ۔ اس اجلاس میں پیرپُور کے راجہ سیّد محمد مہدی کی صدارت میں آٹھ ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جسے ان شکایات کا جائزہ لے کر مسلم لیگ کے صدر اور ہائی کمان کی خدمت میں گاہے ماہے رپورٹ پیش کرنے کے لئے کہا گیا۔

پیرپُور رپورٹ:

۱۵ نومبر ۱۹۳۸ء میں راجہ صاحب پیرپُور سیّد محمد مہدی نے مسلم لیگ ہائی کمان کی خدمت میں اپنی تحقیقی رپورٹ پیش کی ۔ اس رپورٹ میں صوبہ سرحد کے علاوہ دوسرے تمام صوبوں میں مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا بڑے عمدہ پیرائے میں ذکر کیا گیا تھا۔

راجہ صاحب پیرپُور نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ کوئی ذی ہوش انسان جو برِعظیم کے سیاسی کوائف سے واقف ہے اس حقیقت کا انکار نہیں کر سکتا کہ کانگرسی حکومتیں اقلیتوں کی حفاظت کرنے میں بُری طرح ناکام رہی ہیں ۔ اسی طرح کانگرسی حکومتیں اقلیتوں کو مذہبی آزادی اور ان کی تہذیب و ثقافت کو تحفظ فراہم کرنے میں ناکام رہی ہیں ۔ اقتدار سنبھالتے ہی کانگرس مکمل طور پر ہندوؤں کی نمائندہ جماعت بن گئی ہے اور وہ کسی دوسرے کی بات سُننے کی رَوادار بھی نہیں ۔ کانگرس نے مسلمانوں کے جائز مطالبات نظرانداز کر دیئے ہیں ۔ وہ اسمبلیوں میں موجود مسلم ارکان پر دباؤ ڈال کر انہیں اپنا جماعتی وجود ختم کرنے پر مجبور کر رہی ہیں ۔ کانگرس یہ چاہتی ہے کہ مسلم ارکانِ اسمبلی کانگرس میں ضم ہو جائیں، اور غیر مشروط طور پر اس کے احکام کی پابندی

کریں ۔

راجہ صاحب پیرپُور نے اپنی رپورٹ میں یہ بھی تحریر کیا کہ کانگرس نے مسلم لیگ کے خلاف زہریلا پروپیگنڈہ کرنے کی مہم شروع کی اور اس کام کے لئے قوم پرست مسلمانوں کو شطرنج کے مُہروں کی طرح استعمال کیا ۔ دوسری جانب کانگرس نے مسلمانوں کو مسلم لیگ سے برگشتہ کرنے کے لئے رابطہ عوام مہم شروع کی اور اپنے زر خرید مولویوں کو اس کام کے لئے آگے بڑھایا ۔

شریف رپورٹ:

دوسری رپورٹ بہار کی صوبائی مسلم لیگ کی فرمائش پر ایس ایم شریف نے تیار کی ۔ اس رپورٹ میں صرف صوبہ بہار میں مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں، انہیں انتظامیہ اور عدلیہ کی ملازمتوں سے دُور رکھنے اور ان کے ساتھ ہونے والی چیرہ دستیوں کا ذکر تھا ۔ اس رپورٹ کا دیباچہ ایس اے عزیز نے لکھا تھا ۔ شریف رپورٹ میں بڑے چونکا دینے والے واقعات ملتے ہیں ۔

فضل الحق رپورٹ:

تیسری رپورٹ شیرِ بنگال مولوی اَبُوالقاسم فضل الحق نے انگریزی زبان میں تیار کی تھی جو انہوں نے ایک کتابچے کی شکل میں شائع کی ۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے اس کتابچے کے انگریزی نام کا ترجمہ "کانگرس حکومت میں مسلمانوں کے مصائب" کے عنوان سے کیا ہے ۔ مولوی صاحب کی رپورٹ کا خلاصہ یہ ہے کہ کانگرسی حکومتوں نے ہندو غنڈوں کی سرپرستی کی اور انہیں مسلمانوں کو ہر طرح کا نقصان پہنچانے کے لئے تیار کیا ۔

ہندوؤں نے گائے کی حفاظت کا نعرہ بلند کیا اور گئو رکھشا کے نام سے ایک تنظیم قائم کرکے اس کی شاخیں جا بجا کھول دیں ۔ انہوں نے اس بات کا عزم کیا کہ وہ مسلمانوں کو گائے کا گوشت کھانے سے بزور قوت روکیں گے اور اگر کوئی مسلمان گائے ذبح کرے گا تو اسے مع اہل و عیال ذبح کر دیں گے ۔ ہندوؤں نے یہ بھی دھمکی دی کہ گائے ذبح کرنے والے مسلمانوں کا گھر نذرِ آتش کر دیا جائے گا ۔ ایسے گاؤں

جہاں ہندو اور مسلمان دونوں قومیں آباد تھیں، وہاں ہندوؤں نے مسلمانوں کو کنوؤں سے پانی نکالنے سے روک دیا۔

ہندوؤں نے اسلام کی تضحیک کو اپنا شعار بنا لیا۔ ایسے گاؤں اور قصبات جہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی، وہاں مساجد میں اذان دینے پر پابندی لگا دی۔ کئی مقامات پر ہندوؤں نے مساجد پر حملے کئے اور بعض مساجد میں سور داخل کر دیئے۔ ہندو نمازوں کے اوقات میں مساجد کے سامنے نازیبا حرکات کرتے اور بینڈ باجے بجا کر نمازیوں کو تنگ کرتے۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ لین دین بند کرنے کی مہم شروع کی اور صرف ہندو دکانداروں سے ہی ضرورت کا سامان خریدنے لگے۔ جب کبھی کوئی جھگڑا ہوتا تو کانگرسی حکومت ہندوؤں کی حمایت کرتی۔

مولوی ابوالقاسم فضل الحق نے صوبہ بہار میں پیش آنے والے ۴۲ سانحات، یوپی میں رونما ہونے والے ۴۳ واقعات اور سی پی میں ہونے والے متعدد حادثات کا ذکر اپنی رپورٹ میں کیا ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ ۱۹۳۵ء کے آئین کی رو سے صوبے کے گورنر کو اقلیتوں کے امور سونپے گئے تھے اور یہ اس کے فرائض میں شامل تھا کہ وہ اقلیتوں کو تحفظ فراہم کرتا۔ ہندو اکثریت کے صوبوں میں کانگرس کے راج میں گورنر اقلیتوں کو تحفظ فراہم کرنے میں ناکام رہے، اس طرح وہ بھی ہندوؤں کے ساتھ جرم میں شریک ہو گئے۔ دنیا کا کوئی بھی انصاف پسند انسان ان گورنروں کو مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں سے بری الذمہ قرار نہیں دے سکتا۔

حکیم اسرار احمد رپورٹ:

حکیم اسرار احمد نامی ایک غیور مسلمان نے سی پی میں مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں اور چیرہ دستیوں پر مبنی ایک کتابچہ شائع کیا، جس سے شکلا کی وزارت بے نقاب ہو گئی۔

ان چاروں رپورٹوں کی زد براہ راست صوبائی گورنروں پر پڑتی تھی، کیونکہ وہ اپنے فرائض منصبی کما حقہ انجام دینے سے قاصر رہے تھے۔ اس لئے انہوں نے ان

رپورٹوں کو صحیح ماننے سے انکار کر دیا۔ دوسری جانب کانگرس کے ترجمان ابوالکلام آزاد نے ان رپورٹوں کو جھوٹ کا پلندہ بتلایا، گویا ان کے نزدیک کانگرس کے راج میں مسلمانوں کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوئی۔

عزیز الحق رپورٹ:

کانگرس کے راج میں ہندوؤں کی تعلیمی پالیسی نے مسلمانوں کو چوکنا کر دیا۔ ہندوؤں نے نصابی کتابوں میں ہندوؤں کے دیو مالائی قصے بھر دیئے اور اپنی تہذیب و ثقافت کو اجاگر کرنے کی ہر ممکن سعی کی۔ ۱۹۳۸ء کے اواخر میں کلکتہ میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا باون واں سالانہ جلسہ منعقد ہوا تو حاضرین جلسہ نے ہندوؤں کی تعلیمی پالیسی پر بڑی تشویش کا اظہار کیا اور نواب کمال یار جنگ بہادر کی سربراہی میں ایک کمیٹی تشکیل دی جس کے ذمہ یہ کام سونپا گیا کہ وہ پورے ملک کے نظام تعلیم کا جائزہ لے اور اس کے بعد ایک ایسی سکیم تیار کرے جس میں اسلامی اقدار اور مسلم تہذیب و ثقافت کا خاص خیال رکھے۔

نواب کمال یار جنگ بہادر نے ایک سب کمیٹی قائم کی، جس کا صدر بنگال اسمبلی کے سپیکر اور کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر عزیز الحق کو بنایا گیا۔ اس سب کمیٹی نے ملک بھر کا دورہ کر کے معلومات فراہم کیں جس میں ہندوؤں کی زیادتیوں کا نوٹس لیا گیا اور مسلمان طلبہ کی تعلیم کے لئے سفارشات پیش کی گئیں۔ یہ رپورٹ قدرے تاخیر کے ساتھ ۱۹۴۲ء میں منظر عام پر آئی۔

باب (27)

کانگرس کے راج میں مسلمانوں پر مظالم کی انتہا
اور
مسلم لیگ کو ختم کرنے کی ناکام کوشش

کانگرس کے راج میں مسلم لیگ کو ختم کرنے کے لیے ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کئے گئے۔ یُوپی اسمبلی کے مسلم لیگی ارکان سے یہ کہا گیا کہ وہ اپنا الگ تشخص ختم کرکے کانگرس میں ضم ہو جائیں۔ وہ آئندہ کسی ضمنی الیکشن میں اپنے اُمیدوار کھڑے نہ کریں اور کانگرس کی ہائی کمان کی طرف سے جو ہدایات موصول ہوں ان پر دل و جان کے ساتھ عمل کریں۔ اگر کبھی کانگرسی ارکانِ اسمبلی اجتماعی طور پر اسمبلی کی رُکنیت سے استعفیٰ دیں تو مسلم لیگی ارکان بھی ان کی پیروی کریں۔

کانگرس کے راج میں کانگرسیوں نے "رابطہ عوام مہم" چلائی جس کا مقصد گھر گھر جا کر مسلمانوں کو مسلم لیگ اور اس کی قیادت سے بدظن کرنا تھا۔ کانگرسی مسلمانوں سے مل کر ان سے کہتے کہ ان کے اقتصادی، سماجی اور سیاسی مسائل کا حل کانگرس میں شامل ہونے پر منحصر ہے۔ اس موقع پر انہوں نے قائداعظم کے خلاف بے بنیاد پروپیگنڈہ شروع کیا۔ بقول اشتیاق حسین قریشی کانگرسیوں نے اپنے زر خرید یا وظیفہ یاب مولویوں کو آگے بڑھایا۔ انہوں نے قائداعظم کے خلاف کفر کے فتوے صادر کئے۔ مولوی حشمت علی پیلی بھیتی اور ان کے داماد مولوی طیب ہمدانی نے "تجانب اہل السنۃ" کے عنوان سے ایک کتاب شائع کی۔ مولوی صاحب کانگرسی نہ تھے لیکن انہوں نے مسلم لیگ میں شامل مسلمانوں اور قائداعظم کو بَرملا کافر کہا۔ لاہور سے حزب الاحناف کے مفتیِ اعظم، علامہ اقبال اور قائداعظم کی تکفیر پر مبنی فتوے شائع کر چکے تھے

ان فتووں سے کانگرسیوں کو مزید مواد مل گیا۔

کانگرسیوں نے متعدد نامور اشخاص کو مسلم لیگ سے بدظن کرکے کانگرس میں شامل کر لیا۔ سیاسی ارتداد کے اس سیلاب میں نگینہ ضلع بجنور کے حافظ محمد ابراہیم، مدراس کے سیٹھ یعقوب حسن، بہار کے ڈاکٹر سید محمود (م ۱۹۷۱ء) اور بمبئی کے یٰسین نوری اور سی پی کے محمد یوسف شریف بہہ گئے۔ راقم کو مولانا عبدالصمد صارم نے بتایا کہ حافظ محمد ابراہیم کو ورغلا کر کانگرس میں لے جانے والے مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی (م ۱۹۶۲ء) تھے۔ یہ دونوں صارم صاحب کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔

کانگرس کی یہ پالیسی تھی کہ اس کے علاوہ اور کوئی سیاسی جماعت بَرِّعظیم میں باقی نہیں رہنی چاہیے۔ مسلم لیگ چونکہ اس کی سب سے بڑی حریف تھی اس لئے اس نے مسلم لیگ کے خلاف مورچہ لگایا۔ کانگرسیوں نے مسلم لیگ کے مقابلے میں "آزاد مسلم لیگ" کے نام سے ایک تنظیم قائم کرنے کی ناپاک کوشش کی تاکہ باقی مسلم لیگی اس جماعت میں شامل ہو جائیں۔

انتظامیہ کے کام میں مداخلت:

کانگرس نے اقتدار سنبھالنے کے بعد ضلعی انتظامیہ کو یہ ہدائت کی کہ وہ تمام انتظامی امور کانگرس کے عہدہ داروں اور کارکنوں کے مشورے سے انجام دیں۔ کانگرس کے عہدہ داروں اور کارکنوں سے مراد ہندو تھے۔ جو اس جماعت کے عہدے دار اور کارکن تھے۔ اس طرح ضلع اور تحصیل کی سطح پر تمام اہم امور ہندوؤں کے مشورے اور ان کی خواہش کے مطابق طے ہونے لگے۔ کانگرس کی اس پالیسی سے انتظامیہ میں دو عملی شروع ہو گئی جس سے نظم و نسق تباہ ہو گیا اور امن و امان کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ اس بدنظمی اور بدامنی کی زد براہِ راست مسلمانوں پر پڑی اور ان کی جان، مال اور آبرو خطرے میں پڑ گئی۔

ہندو مسلم فسادات:

کانگرس کی حکومتیں قائم ہوتے ہی ہندوؤں نے فرقہ وارانہ فسادات کو ہوا دی۔ ہندوؤں نے خالص مذہبی نوعیت کے تہوار بڑی دُھوم دَھام کے ساتھ منانے

شروع کر دیئے ۔ دُرگا پُوجا، گنپتی پُوجا، رتھ یاترا، کالی ماتا کی پُوجا کے علاوہ دیوالی، دسہرہ، شوراتری، ہُولی، جنم اشٹمی، رام نومی، مہابیر جینتی، رکھشا بندھن، رام لیلا، جھاکیوں کے جلوس، گینش پُوجا جیسے موقعوں پر ہندو جارحیت کا مظاہرہ کرتے ۔ محرم اور عید الاضحیٰ کے موقعوں پر خواہ مخواہ مسلمانوں سے اُلجھ پڑتے ۔ ایسے موقعوں پر فرقہ وارانہ فسادات ایک معمول بن گئے تھے ۔ ہندو جہاں کہیں مسلمانوں کو خوشحال دیکھتے اور ان کی دکانوں کو بارونق پاتے وہیں کسی بہانے سے فساد کر کے دکانیں نذرِ آتش کر دیتے ۔ گائے یا بندر کو مارنے اور پیپل یا برگد کے پیڑ کو کاٹنے کا بہانہ بنا کر مسلمانوں کو قتل کر دیتے ۔ پیر پُور رپورٹ اور مولوی اَبُوالقاسم فضل الحق کے کتابچے میں ایسے بے شمار واقعات مل جاتے ہیں جہاں ہندوؤں نے معمولی سی بات کو بہانہ بنا کر فساد برپا کیا اور مسلمانوں کو قتل کر دیا۔

عدلیہ میں نا انصافی:

کانگرس کے راج میں عدلیہ میں مسلمانوں کے ساتھ نا انصافیاں ہونے لگیں ۔ پنجاب کا مہا سبھائی ذہنیت کا مالک چیف جسٹس سر شادی لعل کسی پنجابی مسلمان کو ہائی کورٹ کا جج نہ بننے دیتا تھا ۔ علامہ اقبال (م ۱۹۳۸ء) اور خلیفہ شجاع الدین (م ۱۹۵۵ء) کا نام کئی بار حکومت کے زیرِ غور آیا لیکن سر شادی لعل نے ہر بار ان کے بطور جج تقرر کی مخالفت کی ۔ ہائی کورٹ میں مسلمان ججوں کی آسامیوں پر اس نے الہ آباد ہائی کورٹ سے مسلم جج لاہور بلوائے لیکن پنجابی مسلمان کو جج نہ بننے دیا۔

اس کے علاوہ عدالتوں میں مسلمانوں کے ساتھ بڑی نا انصافیاں کی جاتی تھیں ۔ آزادی کے بعد سر شادی لعل کا ایک بیان اخبارات میں شائع ہوا تھا ۔ جس میں اس نے اس حقیقت کا اعتراف کیا تھا کہ اس کے دورِ اقتدار میں پنجاب کے مسلمانوں کی چار ارب رُوپے ملکیت کی جائیداد ہندوؤں کے نام منتقل ہوئی تھی ۔

ہندو سیشن جج، سول جج اور مجسٹریٹ فیصلے کرتے وقت ہندو مجرموں کو رہا کر دیتے یا ان کی سزا میں تخفیف کر دیتے لیکن مسلمانوں کو معمولی سے جُرم پر سخت سزا دیتے ۔ ایک ہندو وزیر قانون مسٹر مہتہ نے ایک ہندو کو، جس نے زُہرہ نامی ایک

مسلمان لڑکی کو زہر دے کر مار ڈالا تھا اور ہائی کورٹ سے اس کی رحم کی اپیل مسترد ہو چکی تھی، باعزت طور پر بری کر دیا ۔ مسلمانوں نے اس پر سخت احتجاج کیا لیکن کانگرس کی ہائی کمان کے کان پر جُوں تک نہ رینگی ۔

صوبہ بہار کے ایک گاؤں تلکوری میں ایک غریب مسلمان نے اپنی بیٹی کی شادی کے موقع پر بارات کی تواضع کے لئے ایک قصاب کی دکان سے بڑا گوشت خریدا ۔ ہندوؤں نے الزام لگایا کہ لڑکی کے والد نے بچھڑا ذبح کیا ہے ۔ قصاب نے موقع پر پہنچ کر گواہی دی کہ اس نے اس کی دکان سے بھینس کا گوشت خریدا ہے ۔ اس کے باوجود مشتعل ہندوؤں نے مسلمانوں کو مارا پیٹا اور ایک زندہ سؤر لا کر اس کا مُنہ مسلمانوں کے مُنہ سے لگایا اور گھروں کے اندر گھس کر خواتین کی بے حُرمتی کی ۔ جب یہ مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو ہندو جج نے کہا کہ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے ۔ جب مسلمانوں نے اس پر اصرار کیا کہ تو اس نے ہندوؤں سے کہا کہ وہ دو صد روپے ہرجانے کے طور پر تلکوری کے متاثرین کو ادا کریں ۔ یہ رقم بھلا کس نے ادا کرنا تھی ۔

ضلع فیض آباد میں ٹانڈہ تحصیل ہیڈ کوارٹر ہے اور یہ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کا آبائی وطن ہے ۔ مولانا کانگرس کے بہت بڑے ہم نوا تھے ۔ اس کے باوجود ان کے وطنِ مالوف میں ہندوؤں نے ایک مسجد کے سامنے بینڈ باجے بجائے ۔ جب مسلمانوں نے احتجاج کیا تو پولیس نے وارننگ دیئے بغیر مسلمانوں پر گولی چلا دی اس کے بعد جتنے مسلمان گرفتار کئے انہیں زد و کوب کیا اور زخمیوں کو طبی امداد پہنچانے سے انکار کر دیا ۔ پولیس نے بہت سے مسلمانوں کو حوالات میں بند کر دیا اور انہیں زبردستی پیشاب پینے پر مجبور کیا ۔ مقامی کانگرسی حکام نے تار گھر کے انچارج کو حکم بھیجا کہ وہ کوئی احتجاجی تار وصول نہ کرے اور اسٹیشن کے باہر پہرہ بٹھا دیا کہ کوئی مسلمان ٹانڈہ سے باہر جا کر ان کے مظالم کی تشہیر نہ کرنے پائے ۔ ٹانڈہ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا شیخ العرب والعجم حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کا وطنِ مالوف تھا اور مولانا کانگرس کے بہت بڑے حمایتی تھے ۔ اس کے باوجود ان کے ہم وطنوں کے ساتھ یہ انسانیت سوز سلوک ہوا ۔

ثانیاً اسلام اور مسلمانوں کی بدقسمتی سے کانگرس کی ہائی کمان نے یُوپی

کی کانگرسی حکومت کا نگران ابوالکلام آزاد کو بنایا ہوا تھا اور یہ سب کچھ ان کے سامنے ہوا۔ اس کے باوجود انہوں نے آنکھیں بند کر کے پیرپور رپورٹ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور راجہ محمد مہدی کے پیش کردہ ایسے حقائق کو جھوٹ پر محمول کیا۔

سی پی کے ایک گاؤں "چندر بسواس" میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ آبادی تھی۔ وہاں کا ایک ہندو مسمی جگ دیو اسلام اور مسلمانوں کا بڑا مخالف تھا۔ اس نے ہندو غنڈوں کو ساتھ لے کر ایک جلوس نکالا اور مسجد کے سامنے کھڑے ہو کر پہلے بینڈ باجے بجائے اور پھر دشنام طرازی پر اتر آیا۔ مسلمانوں نے اس کی اس نازیبا حرکت پر احتجاج کیا تو اس بدمعاش نے بلوہ شروع کروا دیا۔ طرفین کے متعدد افراد زخمی ہوئے۔ جگ دیو بھی زخمی ہوا اور زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چند گھنٹوں بعد جہنم میں پہنچ گیا۔ اس سانحہ کی خبر ملتے ہی سی پی کا وزیر اعلیٰ شری شکلا "چندر بسواس" پہنچا اور اس نے وہاں شعلہ بار تقریر کر کے بڑی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا۔ اس کے حکم پر پولیس نے جگ دیو کے قتل کے الزام میں "چندر بسواس" کی پوری مسلم آبادی کو، جس کی تعداد ۱۵۷ تھی، گرفتار کر کے ایک تنگ و تاریک کمرے میں بند کر دیا۔ پولیس نے ان میں سے ۲۲ افراد کے خلاف کیس تیار کیا۔ جب یہ مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو پولیس کے خوف سے کوئی مسلمان گواہی دینے کی جرأت نہ کر سکا۔ ہندو جج نے ۲ بیگناہ مسلمانوں کو سزائے موت سنائی اور ۲۲ ناکردہ گناہ مسلمانوں کو عمر قید کی سزا دی۔ ان افراد کو جیل بھیج کر پولیس نے ان کے اہلِ خانہ کے ساتھ بہیمانہ سلوک کیا۔

یہ چند مثالیں نمونہ مشتے از خروارے کے طور پر پیش کی جا رہی ہیں۔ یہاں شریف رپورٹ، پیرپور رپورٹ اور فضل الحق رپورٹ کے تمام واقعات نقل کرنے مقصود نہیں، ورنہ پوری کتاب ایسے ہی واقعات سے بھر جائے گی۔

ذبیحہ گاؤ پر پابندی:

ازمنہ قدیم سے کاشت کار معاشرے میں گائے کی قدر چلی آ رہی ہے۔ وہ دودھ، مکھن اور دہی فراہم کرنے کے علاوہ بچھڑوں کو جنم دیتی تھی جو بڑے ہو کر کھیتوں میں ہل چلانے، اناج گاہنے، اسے منڈیوں تک پہنچانے، بیل گاڑیاں اور بہلیاں کھینچنے

کے کام آتے تھے۔ آج سے ڈیڑھ دو سو سال پہلے تک بنجارے بیلوں پر اناج لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پہنچاتے تھے۔ اس لئے گائے کی بڑی قدر و منزلت تھی جس نے رفتہ رفتہ ہندو معاشرے میں تقدّس کا درجہ حاصل کر لیا اور ہندوؤں نے اس کی باقاعدہ پرستش شروع کر دی۔

گزشتہ صدی کے اواخر اور موجودہ صدی کے نصف اوّل میں ہندوؤں نے گئو رکھشا کے نام سے کئی انجمنیں قائم کیں۔ بوڑھی اور اپاہج گائیوں کی دیکھ بھال کے لئے بڑے بڑے شہروں میں گئو شالے قائم کئے اور ہندو سرمایہ داروں نے اس کام کے لئے رقوم فراہم کیں۔

کانگرس کے راج میں ہندو اکثریت کے صوبوں میں ذبیحۂ گاؤ پر پابندی عائد کر دی گئی۔ عید الاضحیٰ کے موقع پر اس کی سختی کے ساتھ ممانعت کر دی گئی۔ اگر کوئی مسلمان گائے ذبح کرتا تو ہندو اسے مع اہل و عیال قتل کر کے اس کے گھر کو آگ لگا دیتے۔ متعدد مقامات پر گائے ذبح کرنے کا بہانہ بنا کر ہندوؤں نے فرقہ وارانہ فسادات کو ہوا دی۔

آزادی کے بعد یہ راز افشاء ہوا کہ انگریزی دور میں متعدد فوجی چھاؤنیوں میں بیف سپلائی کرنے کا ٹھیکہ ہندوؤں نے لیا ہوا تھا اور ان کے مسلمان کارندے بیف چھاؤنیوں میں پہنچا دیتے تھے اس پر جو منافع ہوتا وہ ہندوؤں کی جیبوں میں چلا جاتا تھا۔ حکیم نبی احمد خان رام پوری (م ۱۹۹۳ء) نے راقم الحروف کو بتایا کہ وہ چار پانچ سال قبل جب لاہور سے رام پور گئے تو ان کی واپسی کے موقع پر ان کے احباب نے ایک پُر تکلف ضیافت کا اہتمام کیا جس میں دس تن گائے کا گوشت صرف ہوا۔ راقم نے عرض کیا کہ بھارت میں مسلمانوں کو بھینس ذبح کرنے کی اجازت ہے کیا گائے کہیں چھپ کر ذبح کی تھی۔ حکیم صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ وہاں کے مذبح خانے میں روزانہ دس گائیں ذبح ہوتی ہیں اور مذبح خانے کا ہندو داروغہ فی گائے دس روپے رشوت لیتا ہے۔ اس طرح اسے ماہانہ تین ہزار روپے آمدنی ہوتی ہے۔ اگر کبھی مسلمان مہینے میں ۳۰۰ سے کم گائیں ذبح کرتے ہیں تو وہ سخت ناراض ہوتا ہے کیونکہ اس میں اسے مالی نقصان ہوتا ہے۔ راقم نے عرض کیا کہ پھر یہ گئو ہتیا اور گئو رکھشا کیا ہے، حکیم صاحب نے

ارشاد فرمایا کہ یہ سب سیاسی شعبدہ بازی ہے۔

مسلمانوں سے نفرت اور امتیازی سلوک:

ہندو ہمیشہ ہی سے خود کو دوسروں کے مقابلے میں عالی نسب تصور کرتے رہے ہیں۔ برہمن خود کو دوسرے ہندوؤں سے بھی اعلیٰ و ارفع تصور کرتے ہیں۔ کھتریوں کے بعض خاندان اپنا شجرۂ نسب سُورج اور چاند کے ساتھ ملا کر سُورج بنسی اور چندر بنسی کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ان حالات میں وہ مسلمانوں کو نیچ ذات کے افراد اور ملیچھ سمجھتے تھے بنکم چندرچیٹرجی کے ناول آنند مٹھ میں مسلمانوں کے بارے میں ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ جن کے وجود سے بھارت کی پَوِتّر (پاک) دھرتی ناپاک ہو گئی ہے۔

ہندو مسلمان دکانداروں اور پھیری والوں سے سودا سلف نہیں خریدتے تھے۔ وہ مسلمان فرموں کے ساتھ کاروبار نہیں کرتے تھے۔ ہندو حلوایوں اور شربت فروشوں نے مسلمانوں کے لئے الگ برتن رکھے ہوئے تھے۔ بعض علاقوں میں وہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے براہِ راست اپنے ہاتھوں میں نقدی پکڑنے کی بجائے کسی کڑچھے میں نقدی وصول کر کے اسے پانی میں ڈال دیتے تھے۔ پھر وہ اس نقدی کو دُھو کر ہاتھ لگاتے تھے۔ بعض مقامات پر اعلیٰ ذات کے ہندو چُولہوں میں جلانے والی لکڑیاں دُھو کر جلاتے تھے کہ اسے کسی نیچ ذات کے فرد یا مسلمان کے ہاتھ لگے ہوں گے۔ ہندو پانی کی سبیلیں لگا کر عوام کو پانی پلانا بڑا پُن (ثواب) سمجھتے تھے۔ اگر مسلمان پانی طلب کرتا تو اسے برتن کی بجائے اُوک سے پانی پینے پر مجبور کرتے اور اسے پانی پلاتے وقت اپنے برتن سے پانی بانس کی ایک پُور پر ڈالتے اور پُور کے دوسرے سرے سے پانی مسلمان کی اُوک میں گرتا براہِ راست برتن سے اُوک میں پانی ڈالنے سے وہ برتن ناپاک ہو جاتا تھا۔

سکولوں میں مسلمان بچوں کو ہندوؤں کے بچوں سے الگ بٹھایا جاتا تھا۔ انہیں اس نلکے سے پانی پینے کی اجازت نہ تھی جس سے ہندو طلبہ پانی پیتے تھے۔ ہندو سکول ٹیچر بھی مسلمان طلبہ کے ساتھ امتیازی سلوک کرتے۔ اگر کسی ہندو ممتحن کو یہ پتہ چل جاتا کہ اس کے پاس جو پرچے جانچنے کے لئے آئے ہیں ان میں کسی مسلمان

اُمیدوار کا بھی پرچہ ہے تو وہ قرائن سے معلوم کر لیتے کہ فلاں پرچہ کسی مسلمان کا ہے تو پھر اس پرچے کے نمبر لگاتے وقت اُمیدوار کو مسلمان ہونے کی سزا ضرور دیتے۔ سائنس کے امتحان میں پریکٹیکل کے وقت مسلمان طلبہ کو خصوصی ہدایت کی جاتی تھی کہ وہ قمیض اور پتلون پہن کر امتحان دینے جائیں اور مسلمانوں جیسا لباس استعمال نہ کریں۔ اسی طرح امتحانی پرچے میں اگر درخواست لکھنے پر سوال آتا یا والد کو خط لکھ کر خرچ منگوانے کے لئے کہا جاتا تو خط کے آغاز میں السلام علیکم کی جگہ آداب عرض لکھتے اور آخر میں اپنے نام کی جگہ XYZ لکھتے تاکہ کسی طرح بھی یہ معلوم نہ ہو کہ یہ پرچہ کسی مسلمان اُمیدوار کا ہے۔ (یہ دور راقم نے دیکھا ہے)

سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں سے ناانصافی:

کانگرس کے راج میں جہاں مسلمانوں پر اتنے مظالم ہوئے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ان پر سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ کانگرسیوں نے تمام محکمے ہندوؤں سے بھر دیئے۔ جب کوئی مسلمان ملازمت کے لئے انٹرویو دینے جاتا تو اس کے ساتھ بڑا ناگوار سلوک کیا جاتا۔

قدرت اللہ شہاب (م ۱۹۸۶ء) نے اپنی خود نوشت "شہاب نامہ" میں اپنا ذاتی واقعہ نقل کیا ہے جس سے ہندو ذہنیت کی صحیح عکاسی ہوتی ہے۔ جب وہ I.C.S. کا انٹرویو دینے کے لئے فیڈرل سروس کمیشن کے سامنے پیش ہوئے تو کمیشن کے ہندو رُکن ڈاکٹر رادھا کرشنن نے ان سے یہ سوال کیا کہ ان کا مشغلہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا "مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ" اس پر رادھا کرشنن نے کہا کہ وہ مذاہب عالم کا مطالعہ اسلامی آنکھ سے کرتے ہیں یا انسانی آنکھ سے" ان کا جواب سن کر وہ قدرے ناراض ہوا اور مزید سوال کرنے سے انکار کر دیا۔ کمیشن کے انگریز صدر سر گورڈن ایرے نے بمشکل اسے مزید سوالات کرنے پر رضامند کیا۔

اس بار رادھا کرشنن نے ان سے یہ سوالات پوچھے:

۱۔ ٹینس کے گیند کا وزن کتنا ہوتا ہے؟

۲۔ چار اَونس وزن پُورا کرنے کے لئے ٹیبل ٹینس کے کتنے بال درکار ہوں گے؟

۳ - ہاکی کے گول کی چوڑائی اور اونچائی کتنی ہوتی ہے ؟
۴ - اٹلی کے آس پاس کے جزیروں میں سے کس کس جزیرے کو کہاں کہاں چسپاں کیا جائے تو یہ مردانہ بُوٹ نہ رہے اور اونچی ایڑی کا زنانہ شُو نظر آئے -

یہ سوالات سن کر سر گورڈن ایرے نے صورت حال کو سنبھالا اور چند سوال کرکے انہیں رُخصت کیا - اس دوران میں کمیشن کے مسلمان رکن سر عبدالرحمٰن خاموش بیٹھے رہے - بقول قدرت اللہ شہاب وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر انہوں نے کوئی سوال پوچھا تو رادھا کرشنن اسے ایک مسلمان اُمیدوار کی طرف داری پر محمول کریں گے -

نصابِ تعلیم میں تبدیلی:

کانگرس کے راج میں نصابِ تعلیم از سر نو مرتب کیا گیا - ہندو ماہرین تعلیم نے ہندوؤں کے دیو مالائی قصے کتابوں میں بھر دیئے - راقم کے بچپن میں اُردو کی کتابوں میں رامائن اور مہا بھارت سے لئے گئے واقعات ، سَرُون کا اپنے بُوڑھے والدین کو بہنگی میں بٹھا کر ہندوستان بھر کے تیرتھوں کی یاترا کرانا اور اس کے مرنے کے بعد اس کی نیکیوں کے صلے میں آسمان پر تین تاروں کا اضافہ ہونا (یہ تین تارے ایک دوسرے سے قریب ایک ہی سیدھ میں ہیں - ہندوؤں کے خیال میں درمیانی تارا سَرُون ہے اور اس کے آگے پیچھے اس کے ماتا پتا ہیں جنہیں وہ بہنگی میں اُٹھائے ہوئے ہے) رام چندر کا بَن باس پر جانے سے پہلے اپنی ماتا کو شلیا سے رُخصت ہونے کا دلخراش واقعہ ، رَاوَن کا سیتا کو اُٹھا لے جانا اور پھر رام چندر کا ہنومان کی مدد سے لنکا پر حملہ کرکے رَاوَن کو ہلاک کرکے سیتا کو لے کر اَیُودھیا آنا ، موجود تھے - بچپن میں جو نقش راقم کے ذہن پر بیٹھا تھا وہ اب تک موجود ہے - ان نصابی کتابوں میں کسی مسلمان بزرگ کا نام تک موجود نہ تھا - خدا کے لئے ایشور اور بھگوان جیسے نام استعمال کئے گئے تھے اور یہ کوشش کی گئی تھی کہ کہیں " اللہ " کا ذکر کتاب میں نہ آ جائے -

نئی نئی تحقیقات:

اسی زمانے میں ہندوؤں نے تحقیق کے نام پر بڑے مضحکہ خیز انکشافات کئے - ان کے خیال میں جنوبی امریکہ کا ملک اَرجنٹائن ، دَروپدی کے پانچ خاوندوں میں

سے ایک خاوند اَرجن نے آباد کیا تھا - وسطی امریکہ کا ملک گوئٹے مالا ، دراصل گوتم مالا ہے - وہاں بُدھ بھکشو مہاتما بدھ کی مالا (تسبیح) لے گئے تھے - اسی طرح ہنگری کا موجودہ دارالحکومت بُڈاپسٹ بھی بُدھا پوسٹ کی بگڑی ہوئی شکل ہے - وہاں مہاتما بدھ کے نام پر ایک پوسٹ (چوکی) قائم کی گئی تھی -

ہندوؤں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ ان کے دیو مالائی قصوں میں جہاں اُڑن کھٹولے کا ذکر آتا ہے اس سے مراد ہوائی جہاز ہیں - مہابھارت کی جنگ میں پاتال (امریکہ) کے راجہ نے اَگن بان استعمال کئے تھے - اس سے مُراد راکٹ ہیں - انہوں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ ان کی مقدس کتاب مہابھارت میں ٹیلی وِژن کا ذکر ہے - کرشن جی نے رانی کُنتی کو ، جو بڑھاپے کی وجہ سے میدان جنگ میں جا کر جنگ کا منظر نہیں دیکھ سکتی تھی ، اپنے محل میں ٹیلی وِژن پر جنگ کا پُورا منظر دکھا دیا تھا -

اب حال ہی میں ایک ہندو اسکالر نے اَگن بان کا ترجمہ ایٹم بم کیا ہے - ان مَحک بندیوں کا مطلب مسلمانوں پر اپنی برتری ظاہر کرنا اور ہندو دھرم کو بڑا ترقی یافتہ بتانا تھا -

وَاردَھا سکیم:

جامعہ ملّیہ دہلی کے شیخُ الجامعہ اور مشہور قوم پرست ماہرِ تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین نے ، جو آزادی کے بعد بھارت کے صدر بھی رہ چکے ہیں ، گاندھی جی کی رہنمائی میں ایک سکیم تیار کی جو " واردھا سکیم " کے نام سے مشہور ہوئی - اس میں ڈاکٹر ذاکر حسین (م ۱۹۶۹ء) نے گاندھی جی سے زبان مستعار لے کر کہا کہ سات سال کی عمر سے لے کر چودہ سال کی عمر تک کے طالب علموں کے لئے ایسا نصاب تعلیم تیار کیا جائے جس میں " ہندوستانی قومیت " کو اُجاگر کیا جائے اور اس نصاب میں مذہبی تعلیم شامل نہ ہو - گاندھی جی کا کہنا تھا کہ مذہبی تعلیم سے مذہبی اختلافات پیدا ہوتے ہیں جو آگے چل کر مختلف قوموں کے درمیان جھگڑوں کا سبب بنتے ہیں - اس لئے طلبہ کو تعلیمی اداروں میں مذہبی تعلیم نہ دی جائے -

واردھا سکیم میں بھگت کبیر ، گُورُو نانک ، مغل بادشاہ اکبر اور شہزادہ

داراشکوہ کے مذہبی خیالات کو بہت اہمیت دی گئی تھی کیونکہ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے ہندو مت اور اسلام کو ملا کر ایک درمیانی راستہ نکال لیا تھا۔ گاندھی جی اسے ہی "ہندوستانی قومیت" کا نام دیتے تھے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا ان چاروں "مصلحین" نے تمام مذاہب کی سچائیاں یکجا کر دی ہیں۔

مسلمانوں کا واردھا سکیم کے بارے میں یہ خیال تھا کہ یہ طریق تعلیم کبیر پنتھی، برہمو سماجی اور وحدت ادیان کے حاملین تو پیدا کر سکتا ہے لیکن کسی مسلمان کے گھر میں پیدا ہونے والے بچے کو مسلمان نہیں بنا سکتا۔ واردھا سکیم کے پیچھے یہی جذبہ کار فرما تھا۔ افسوس صد افسوس کہ گاندھی جی نے یہ کام بھی ایک "مسلمان" کے ہاتھوں کرایا۔

باشعور مسلمانوں نے واردھا سکیم کی شدید مخالفت کی۔ علی گڑھ والے اس مخالفت میں اتنے آگے بڑھ گئے تھے کہ وہاں اگر کسی طالب علم کو پیشاب کی حاجت ہوتی تو وہ اپنے ساتھیوں سے کہتا "میں ذرا واردھا تک ہو آؤں"۔

وِدّیا مَندِر سکیم:

واردھا سکیم سے بڑھ کر ضرر رساں وِدّیا مندر سکیم تھی جو سی پی کے وزیر اعلیٰ شری شُکلا کے مہا سبھائی ذہن کی اختراع تھی۔ وہ بنارس ہندو یونیورسٹی کے بانی مبانی پنڈت مدن موہن مالوی (م ۱۹۴۶ء) کا خاص چیلا تھا۔ جس طرح ہمارے ہاں مکتب سکیم چلی تھی کہ جن مواضعات میں سکول نہیں ہیں وہاں بچوں کو مساجد میں مولوی صاحب کی نگرانی میں پرائمری تک پڑھایا جائے۔ بالکل اسی طرز پر شری شُکلا نے وِدّیا مندر سکیم تیار کی کہ دیہات میں بچے بلا تفریق مذہب و ملت مندروں میں پنڈتوں اور ہندو اُستادوں سے تعلیم حاصل کریں۔ پنڈت اور ہندو اساتذہ بچوں کو ہندو تہواروں کی اہمیت بتاتے اور آئے دن سکول نما مندر میں کوئی نہ کوئی تہوار بڑی دُھوم دھام سے مناتے جس میں مسلم طلبہ کو ضرور شریک کرتے۔

جب وزیر اعلیٰ شری شُکلا نے سی پی کی اسمبلی میں وِدّیا مندر سکیم شروع کرنے کے لئے بل پیش کیا تو بعض غیرت مند مسلمانوں نے اس پر بڑا اعتراض کیا۔

یہاں تک کہ کابینہ میں شامل ایک مسلم وزیر یوسُف شریف نے بھی لفظ "مندر" پر سخت اعتراض کیا۔ گاندھی جی نے اس موقع پر یہ بیان جاری کیا کہ مندر کوئی قابل اعتراض لفظ نہیں ہے لہٰذا اس سکیم کا نام نہیں بدلنا چاہیے۔

وِدّیا مندروں میں مسلم طلبہ بھی ہندوؤں جیسا لباس استعمال کرتے اور انہی کی طرح دُھوتی باندھ کر وِدّیا مندر میں آتے۔ انہیں ہندو طلبہ کے ساتھ مُورتی پوجا میں بھی شرکت کرنا پڑتی اور وہ السّلام علیکم کی بجائے "جے رام جی کی" کہتے۔ اسی زمانے میں بابائے اُردو مولوی عبدالحق (م ۱۹۶۱ء) نے گاندھی جی کے نام ایک خط میں لکھا کہ ان کے ایک نمائندے نے واردھا سکیم اور وِدّیا مندر سکیم کے ناموں سے قائم ہونے والے سکولوں کا دَورہ کیا۔ سکول میں پڑھائی شروع ہونے سے پہلے تمام طلبہ بلا تفریق مذہب و ملت، سَرَسوَتی کے بُت کے سامنے ہاتھ جوڑ کر پرارتھنا کرتے ہیں۔ ان مدارس میں پڑھنے والے مسلم طلبہ سلام کرنا بھول گئے ہیں اور وہ نمستے اور "جے رام جی کی" کہتے ہیں۔

مسلم لیگ کے علاوہ کانگرس کی حاشیہ بردار جماعت جمعیتُ العلماء ہند نے بھی ان سکیموں کو مسلمانوں کے لئے ضرر رساں کہا۔ جمعیتُ العلماء کے ایک مرکزی رہنما سحبانُ الہند مولانا احمد سعید دہلوی (م ۱۹۵۹ء) نے اپنی پارٹی کے اجلاس میں کہا کہ اگر کانگرس نے یہ منصوبے مسلمانوں پر جبراً نافذ رکھے تو پھر جمعیتُ العلماء مجبوراً سول نافرمانی سے بھی گریز نہیں کرے گی۔

دوسری جانب بمبئی کے غیرت مند مسلم والدین کے اصرار پر گورنر نے نصاب میں شامل بعض دل آزار کتابیں نصاب سے خارج کرنے کا حکم صادر کیا جس سے مسلمانوں نے کسی حد تک سُکھ کا سانس لیا۔

ہندی زبان کی ترویج:

ہندوؤں نے ۱۸۶۷ء میں اُردو کی بجائے ہندی کو سرکاری دفاتر میں رائج کرنے کی مہم چلائی تھی۔ اس مہم کا آغاز بنارس سے ہوا۔ سرسیّد احمد خان کی زندگی میں ہی اُردو۔ ہندی تنازعہ نے بڑی نازک صورت اختیار کر لی تھی۔ سرسیّد کی وفات کے دو سال بعد ۱۹۰۰ء میں یُوپی کے ہندو نواز گورنر انتونی میکڈانل نے ہندوؤں کا مطالبہ تسلیم

کر لیا۔ اس پر نواب محسن الملک کو اُردو ڈیفنس ایسوسی ایشن قائم کرنا پڑی تھی۔

۱۹۳۷ء میں جب "سیاں بھئے کوتوال" تو ہندوؤں نے اپنی اکثریت کے صوبوں میں بیک جنبش قلم ہندی زبان دیوناگری رسم الخط میں رائج کر دی۔ مسلمانوں کو اس کا بجا طور پر رنج ہوا۔ کیونکہ زبان یا رسم الخط محض زبان یا رسم الخط ہی نہیں ہوتے ان کے پیچھے باقاعدہ ایک تاریخ، مذہب، تہذیب اور ثقافت بھی ہوتی ہے۔ سرکاری سطح پر ہندی کی ترویج سے ایک تہذیب و ثقافت مِٹ رہی تھی۔ اُردو صرف مسلمانوں کی زبان ہی نہ تھی، یہ پُورے ملک میں سمجھی اور بُولی جاتی تھی۔ برِعظیم سے باہر برما، ملایا، سنگاپور، لنکا اور عدن میں کسی حد تک یہ سمجھی اور بُولی جاتی تھی۔ ہندو اسکالرز میں سے آنند نرائن مُلّا، رام بابُو سکسینہ (م ۱۹۵۷ء) برج نرائن چکبست (م ۱۹۲۶ء) مالک رام (م ۱۹۹۳ء) پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی (م ۱۹۵۵ء) تلوک چند محروم (م ۱۹۶۶ء) رتن ناتھ سرشار (م ۱۹۰۲ء) لالہ سری رام (م ۱۹۳۹ء) دیا نرائن نگم (م ۱۹۴۲ء) اور لبھو رام جوش ملسیانی (م ۱۹۷۶ء) جیسے منصف مزاج حضرات نے یہ تسلیم کیا ہے کہ اُردو محض مسلمانوں کی زبان نہیں ہے یہ برِعظیم میں بسنے والی تمام اقوام کی مشترکہ زبان ہے۔ اس کے باوجود کانگرسی نیتاؤں نے اُردو کو مسلمانوں کی زبان سمجھ کر اسے ختم کرنے کی بھرپُور کوشش کی۔ انہوں نے جو ہندی زبان رائج کی اس میں سنسکرت زبان کے بھاری بھرکم الفاظ ٹھونس کر اسے ناقابلِ فہم بنا دیا۔ آج بھی آل انڈیا ریڈیو اور دُور درشن سے جس زبان میں خبریں نشر کی جاتی ہیں، وہ زبان بھارت کے کسی حصے میں بھی نہیں بُولی جاتی۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے گاندھی جی کے نام ایک خط میں اُردو کی بجائے ہندی رائج کرنے پر گلہ کیا۔

ترنگا جھنڈا:

تمام اہم سرکاری عمارات اور دفاتر پر قومی پرچم لہرائے جاتے ہیں۔ برِعظیم پر برطانیہ کی حکومت تھی اس لئے یہاں سرکاری دفاتر اور اہم عمارات پر "یُونین جیک" لہرایا جاتا تھا۔ جب کانگرسی وزارتیں قائم ہوئیں تو یُونین جیک کے ساتھ کانگرس کا ترنگا جھنڈا بھی لہرایا گیا۔ حالانکہ یہ ایک خاص سیاسی جماعت کا جھنڈا تھا اور

اسمبلیوں میں دوسری جماعتیں بھی موجود تھیں۔

قائداعظم نے اس دھاندلی پر پنڈت جواہر لعل نہرو کی توجہ مبذول کرائی تو پنڈت جی نے کہا کہ ترنگے میں مختلف رنگوں کا بڑا حسین امتزاج ہے اور یہ مختلف قوموں کے اتحاد کی علامت ہے۔ یہ جھنڈا لہراتا ہوا بھی خوبصورت لگتا ہے۔ پنڈت جی نے مسلم لیگ کے پرچم ستارہ و ہلال کو فرقہ وارانہ جھنڈا قرار دیا۔

بہرحال جب تک کانگرسی وزارتیں قائم رہیں، ترنگا سرکاری دفاتر پر لہراتا رہا اور اس کے منحوس سائے تلے مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی اور ظلم ہوتا رہا۔

مُورتی پُوجا:

کانگرس کے راج میں سرکاری مدارس میں گاندھی جی کے مجسمے بنا کر نصب کئے گئے اور طلبہ کو بلاتمیز مذہب و ملت اس کا احترام کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ پڑھائی شروع ہونے سے پہلے طلبہ ہاتھ جُوڑ کر گاندھی جی کے مجسمے کو پرنام بھی کرتے تھے۔

اُوپر ذکر ہو چکا ہے کہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق (۱۹۶۱ء) کے ایک نمائندے نے ایک سکول میں ہندو اور مسلم طلبہ کو سرسوتی کی مُورتی کے آگے پرارتھنا کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ راجہ صاحب پیرپُور سید محمد مہدی نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ سی پی کے ایک سرکاری سکول میں گاندھی جی کا یَوم ولادت بڑی دُھوم دھام کے ساتھ منایا گیا۔ اس رُوز طلبہ کے والدین بھی مدعو کئے گئے۔ اس موقع پر طلبہ کے علاوہ ان کے والدین کو بھی مورتی پُوجا میں شریک کیا گیا۔ مُورتی پوجا صریحاً شرک ہے اس لئے مسلمانوں نے سرکاری سکولوں میں مسلمانوں سے سرسوتی اور گاندھی جی کی مُورتیوں کی تعظیم کرانے پر شدید اعتراض کیا۔

بندے ماترم:

کانگرس کے راج میں مدارس میں "بندے ماترم" کو قومی ترانہ قرار دیا گیا۔ سکولوں میں پڑھائی شروع ہونے سے پہلے تمام طلبہ مل کر یہ ترانہ گاتے تھے۔ سکولوں کے علاوہ سرکاری تقریبات میں بھی یہ ترانہ گایا جانے لگا۔ بات یہیں پر ختم نہیں

ہو جاتی ۔ کانگرسیوں نے اسمبلی کا اجلاس شروع ہونے سے پہلے وہاں بھی یہ ترانہ گانا لازمی قرار دیا ۔ جب یہ ترانہ شروع ہوتا تو اسمبلی میں موجود مسلم ارکان واک آؤٹ کر جاتے تھے ۔

ایک متعصب بنگالی ہندو بنکم چندر چیٹرجی (م ۱۸۹۴ء) نے ۱۸۸۲ء میں "آنند مٹھ" کے عنوان سے ایک ناول لکھا ۔ اس ناول میں اس نے بندے ماترم کے نام سے ایک گیت شامل کیا جس کا ایک ایک لفظ مسلمانوں کے خلاف زہر میں بجھایا ہوا نشتر تھا ۔

"آنند مٹھ" کا خلاصہ یہ ہے کہ اس ناول کا ہیرو بھاوتند مسلم حکومت کے خلاف بغاوت کا منصوبہ تیار کرکے ایک فوج تیار کرتا ہے ۔ اسے سرراہ ایک شخص مہندرا نامی ملتا ہے جس کی بیوی اور بیٹی کو بھاوتند نے مسلمانوں کے چنگل سے چھڑایا تھا ۔ بھاوتند ، مہندرا کو بندے ماترم کا گیت سنا کر مسلمانوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرتا ہے اور اس سے اس مقصد کے لئے حلف لینا چاہتا ہے ۔ مہندرا اسے مسلمانوں کی قوت سے ڈراتا ہے تو بھاوتند اس کا خوف دُور کرنے کے لئے کئی جتن کرتا ہے اور بالآخر اسے آنند مٹھ نامی ایک مندر میں لے جاتا ہے ۔ بھاوتند وہاں مہندرا کو وشنو ، لکشمی ، سرسوتی اور جگت دھرتی کے خوبصورت بتوں کے درشن کراتا ہے ۔ جگت دھرتی کا خوبصورت بت دکھانے کے بعد وہ مہندرا کو ایک عقبی کمرے میں کالی دیوی کے درشن کراتا ہے اور اسے یہ باور کراتا ہے کہ کالی دیوی ہی دراصل جگت دھرتی ہے ۔ اس کا اصلی چہرہ اور رنگ و رُوپ وہی ہے جو وہ جگت دھرتی کی شکل میں دیکھ چکا ہے ۔ جب سے مسلمانوں کے "ناپاک" قدم یہاں پڑے ہیں اس کی شکل بگڑ گئی ہے اور اب وہ کالی دیوی کا رُوپ دھار چکی ہے ۔ اس لئے اسے اپنے اصلی رُوپ میں لانے کے لئے مسلمانوں کو اس ملک سے نکالنا ضروری ہے ۔ اس دوران میں بھاوتند برابر بندے ماترم کا گیت گاتا جاتا ہے ۔ اس کے ترغیب دلانے پر مہاتند اس کی فوج میں شامل ہو جاتا ہے ۔

مشہور مؤرخ کوپ لینڈ نے بندے ماترم کا انگریزی ترجمہ شائع کیا ہے ۔
اس میں بنگالی ہندو نوجوان چلّا چلّا کر کہتے ہیں:

مارو ، مارو ، مارو ، بھائیو وہ وقت کب آئے گا جب ہم مسجدوں کو گرا کر ان کی جگہ مندر تعمیر کریں گے ۔

کانگرس برّ عظیم میں بسنے والے تمام باشندوں کی نمائندہ جماعت ہونے کی دعویدار تھی اور اس کے رُوحِ رواں گاندھی جی ستیہ اور اہنسا کا دیوتا کہلاتے تھے ، وہ بزعم خویش عدم تشدّد کے سب سے بڑے علمبردار تھے ۔ ہندوؤں کا یہ کہنا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد گاندھی جی عدم تشدّد کے سب سے بڑے پرچارک (مبلغ) تھے ۔ یہ بات راقم کی سمجھ سے باہر ہے کہ "عدم تشدّد کا سب سے بڑا علمبردار" بندے ماترم کے تشدّد آمیز ترانے کو کس زبان سے بھارت کا قومی ترانہ کہتا تھا ۔ میم کمال اُوکے نے کتنی صحیح بات کی ہے کہ گاندھی ایک ایسا معمّہ ہے جو اب تک حل نہیں ہو سکا ۔

نوٹ:

بھارت کا موجودہ قومی ترانہ بھی ہمارے نزدیک بڑا قابلِ اعتراض ہے ۔ راقم کو اس پر حیرت ہے کہ آج تک حکومتِ پاکستان نے اس پر اعتراض کیوں نہیں کیا.
اس کے ابتدائی بول ملاحظہ ہوں:

جن گن من اَدھی نائک جے ہے
بھارت بھاگ وداتا
پنجاب سندھ گجرات مَراٹھا
دَراوڑ اُتکل بنگا

اس قومی ترانہ میں پنجاب ، سندھ اور بنگال (بنگا) کو بھارت کا حصہ دکھایا گیا ہے ۔ پنجاب کا مشرقی حصہ اور بنگال کا مغربی علاقہ بھارت کا حصہ ہیں لیکن مشرقی بنگال ، اب بنگلہ دیش بن چکا ہے اور پنجاب کا بڑا حصہ پاکستان میں شامل ہے ۔ سندھ کی ایک انچ زمین بھی بھارت کے پاس نہیں ہے اس کے باوجود بھارت سندھ پر اپنا حق جتا رہا ہے ۔

بھارت ماتا کی پُوجا:

کانگرس راج میں بھارت کو ماں کا درجہ دے کر اس کی پرستش شروع کی

گئی ۔ گاندھی جی نے بھارت ماتا کو گئو ماتا کا درجہ دے کر اعلان کیا کہ جس طرح گئو ماتا نہیں کٹ سکتی اسی طرح بھارت ماتا کے بھی ٹکڑے نہیں ہو سکتے ۔ بھارت کو ماتا (ماں) کا درجہ دینے کا خیال شاید انہیں بندے ماترم کا ترانہ رائج کرنے کے بعد آیا ہو ۔ بنارس کو مندروں کا شہر کہتے ہیں ۔ وہاں بارہ صد کے قریب مندر موجود ہیں ۔ ان میں ایک مندر " بھارت ماتا کا مندر " کہلاتا ہے ۔ ۱۹۵۴ء میں راقم اور پروفیسر سعید الدین احمد ڈار بنارس گئے تو اس مندر کو بھی دیکھنے گئے ۔ وہاں ایک تالاب نما گڑھے میں بھارت کا اُبھرا ہوا (EMBOSS) نقشہ بنا ہوا تھا جس میں پاکستان اور موجودہ بنگلہ دیش بھی شامل تھے ۔ اس پر پجاریوں نے پھول چڑھائے ہوئے تھے ۔ بھارت ماتا کے پجاری وہاں آتے ، نقشے پر پھولوں کی بھینٹ چڑھاتے اور دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتے تھے ۔

ایک بار مولانا محمد علی جوہر کی حیات میں ہندوؤں نے بھارت ماتا کے تقدس اور احترام کا مسئلہ اُٹھایا تو مولانا محمد علی جوہر نے برملا فرمایا کہ ایک مسلمان کے لئے وطن کی مٹی استنجے کے ڈھیلے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی ۔

یہ ان دھاندلیوں اور چیرہ دستیوں کی مختصر داستان ہے ، جو عدم تشدد کے سب سے بڑے علمبردار گاندھی جی کی اشیر باد سے کانگرسیوں نے مسلمانوں کے ساتھ روا رکھیں ۔ ہماری یہ رائے ہے کہ اگر مسلمانوں کو کانگرس کے ماتحت اس طرح کی غلامانہ زندگی گزارنے کا تجربہ نہ ہوتا تو شاید قرار دادِ لاہور مزید چند سال تک مؤخر ہو جاتی ۔ انہوں نے یہ سوچا کہ انگریزوں کے ہوتے ہوئے اگر کانگرسی ان کے ساتھ ایسا ناروا سلوک کر سکتے ہیں تو انگریزوں کے یہاں سے جانے کے بعد وہ کیا کچھ نہ کریں گے ۔ اس خیال کے آتے ہی انہوں نے الگ وطن کا مطالبہ کر دیا ۔

اسی زمانے میں مسلم لیگ نے ایک پمفلٹ بعنوان " دوبارہ ایسا کبھی نہیں ہو گا " شائع کیا ۔ اس پمفلٹ کی اشاعت نے مسلمانوں کو چوکنا کر دیا اور وہ ہندوؤں کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑے ہو گئے ۔

باب (28)

تقسیمِ ہند کی تجاویز

انیسویں صدی کے وسط میں ہندوؤں میں ہندو دھرم کے احیاء اور برِ عظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش میں ہندوؤں کی بالا دستی کے لئے تحریکیں شروع ہوئیں ۔ ان تحریکوں کے بانی سوامی دیانند سرسوتی (۱۸۸۳ء ۔ ۱۸۲۵ء) ، بنکم چندر چیٹرجی (۱۸۹۴ء ۔ ۱۸۳۸ء) اور بال گنگا دھر تلک (۱۹۲۰ء ۔ ۱۸۵۶ء) جیسے متعصب ہندو تھے ۔ انہوں نے اپنے ہم مذہبوں کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی کہ مسلمان ان کے ازلی و ابدی دشمن ہیں ۔ انہوں نے اپنے ناپاک وجود سے بھارت کی پوتر دھرتی (مقدس زمین) کو ناپاک کر دیا ہے لہٰذا ان کے ساتھ بقاء باہمی (Co-Existence) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ متعصب ہندو راہنماؤں کے بیانات کی وجہ سے مختلف فرقوں کے درمیان اس قدر نفرت پیدا ہو گئی کہ برِ عظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش میں آئے دن فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے ۔ اس لئے انیسویں صدی کا تیسرا ربع ختم ہونے سے پہلے ہی بعض حلقوں کی جانب سے ایسی تجاویز منظر عام پر آنے لگیں کہ اتنے بڑے ملک کو متعدد خود مختار ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ عوام امن و چین کے ساتھ زندگی گزار سکیں ۔

راقم آثم ڈاکٹر محمد سلیم احمد کا صمیمِ قلب سے شکر گزار ہے کہ انہوں نے میری توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ ۱۸۷۴ء میں بمبئی میں بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ فسادات ہوئے جن میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے علاوہ پارسی بھی متاثر ہوئے ۔ اسی سال بمبئی کے ایک پارسی عالم ڈنشا اردشیر طالع یار نے فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام کے لئے چند تجاویز پیش کیں ۔ اس کے خیال میں ان فسادات کے پیچھے فرقہ واریت کے علاوہ ایک عنصر یہ بھی تھا کہ برِ عظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش پر تسلط قائم کرنے کے بعد انگریزوں نے مقامی صنعتوں کو تباہ کر کے دستکاروں اور مزدوروں کے لئے معاشی

مسائل پیدا کر دیئے۔ اسی طرح مقامی راجوں، نوابوں، تعلقہ داروں اور امیروں کے ہاں لاکھوں کی تعداد میں لوگ ملازم تھے، جب ان کی ریاستوں کا انگریزی سلطنت سے الحاق ہوا، جاگیریں ضبط ہوئیں، تعلقہ داریاں ختم ہوئیں تو وہ تمام ملازمین بے کار ہو گئے۔ اس لئے وہ فرقہ وارانہ فسادات میں ملوث ہو گئے۔

ڈنشا اُردشیر طالع یار:

ڈنشا اُردشیر طالع یار نے ۱۸۷۳ء میں بمبئی سے ایک کتابچہ شائع کیا جس میں فرقہ وارانہ فسادات کے مستقل حل کے لئے ملک کو کئی حصوں میں تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ ملاحظہ فرمایئے:

The Riots of 1854 : The History and Philosophy
and Thorough Remedies as Applicable to
The Continent in General.

جان برائٹ:

مشہور مؤرخ ڈاکٹر وحید الزمان (م ۱۹۸۸ء) اپنی مایہ ناز تصنیف Towards Pakistan میں تحریر فرماتے ہیں کہ ایک انگریز دانشور جان برائٹ نے ۱۸۷۷ء میں اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ برِّعظیم کو متعدد صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے اور یہ صوبے ایک دوسرے سے علیحدہ ہونے کے علاوہ براہِ راست تاجِ برطانیہ کے ماتحت ہوں۔ اگر کبھی برِّعظیم سے برطانوی اقتدار کا خاتمہ ہو جائے تو وہ اسی صورت میں آزاد و خود مختار رہ سکیں گے۔ اس صورت میں برِّعظیم میں یورپ کی طرح پانچ یا چھ بڑی مملکتیں بن جائیں گی۔

علامہ جمال الدین افغانی:

علامہ جمال الدین افغانی (م ۱۸۹۷ء) اتحاد بین المسلمین کے بہت بڑے داعی تھے۔ انہوں نے اپنی عمرِ عزیز کا بیشتر حصہ افغانستان، ایران، مصر اور ترکی میں گزارا۔ موصوف جامعہ اَزہر قاہرہ میں بطور استاد رہ چکے ہیں۔ علامہ صاحب نے برِّعظیم کا بھی دورہ کیا تھا۔ انہوں نے بڑے غور و خوض کے بعد ایک مسلم جمہوریہ کا تصور پیش

کیا تھا جس میں وسطِ ایشیا کی مسلم جمہوریتیں، اُزبکستان، تاجکستان، قازقستان، کرغیزیہ ترکمانستان، افغانستان اور برِّعظیم کے شمال مغرب کے مسلم اکثریت والے علاقے شامل تھے۔

عبدالحلیم شرر:

عبدالحلیم شرر (م ۱۹۲۶ء) لکھنؤ کے مشہور ناول نگار اور صحافی تھے۔ وہ "تہذیب" کے نام سے ایک ماہنامہ شائع کیا کرتے تھے۔ انہوں نے اس ماہنامہ میں ۳ اگست ۱۸۹۰ء کو ایک مضمون شائع کیا، جس میں تقسیمِ ہند کی تجویز پیش کی۔

تھیوڈر ماریسن:

تھیوڈر ماریسن (م ۱۹۳۶ء) ایم اے اُو کالج علی گڑھ سے ملحقہ سکول کے ایک لائق و فائق ہیڈ ماسٹر تھے۔ سر سیّد احمد خان، محسن الملک، وقار الملک اور زین العابدین جیسے مسلمانوں کے بہی خواہوں کے ساتھ رہتے ہوئے وہ مسلمانوں کے مسائل کو بخوبی سمجھنے لگے تھے۔ انہوں نے ۱۸۹۹ء میں متعدد مضامین لکھ کر مؤقر جرائد میں شائع کرائے، جن میں تقسیمِ ہند کی تجویز پیش کی گئی تھی۔

چوہدری رحمت علی:

چوہدری رحمت علی (م ۱۹۵۰ء) جنہوں نے ۱۹۳۳ء میں مجوّزہ مسلم ریاست کا نام "پاکستان" تجویز کیا تھا، ۱۹۱۵ء میں اسلامیہ کالج لاہور کے طالب علم تھے۔ انہوں نے "بزمِ شبلی" کے زیرِ اہتمام ایک جلسے میں حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

> "شمالی ہند آبادی کے لحاظ سے مُسلم ہے اور ہم اسے مُسلم ہی برقرار رکھیں گے، یہی نہیں بلکہ ہم اسے مُسلم ریاست بنائیں گے۔ لیکن ہم ایسا تبھی کر سکتے ہیں جبکہ ہم خود اور ہمارا شمالی ہند، ہندوستانی نہ رہیں۔ کیونکہ یہ پہلی شرط ہے۔ ہم جس قدر جلد "ہندیت" اُتار پھینکیں گے، اسی قدر یہ ہمارے لئے اور اسلام کے لئے بہتر ہو گا"۔

(بشکریہ صاحبزادہ عبدالرسول صاحب)

لووٹ فریزر:

لووٹ فریزر ایک مشہور صحافی تھا جو "ٹائمز آف انڈیا" کا مدیر رہ چکا تھا۔ اس نے پہلی عالمی جنگ کے ابتدائی زمانے میں لندن کے مشہور روز نامہ "ڈیلی ایکسپریس" میں ایک نقشہ شائع کیا تھا جس میں ایک تیر استانبول سے لے کر سہارنپور تک (بالفاظ دگر آبنائے باسفورس سے دریائے جمنا تک) کھینچا ہوا تھا۔ اس نے اسے ایک مسلم رہگذر بتایا تھا۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ استانبول سے لے کر سہارنپور تک مسلسل مسلم آبادی چلی جاتی ہے۔ بالفاظ دگر یہ ایک مسلم بلاک ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ:

مولانا عبید اللہ سندھیؒ (م ۱۹۴۴ء) اقبال شیدائی (م ۱۹۷۴ء) کے نام ۲۸ جنوری ۱۹۲۵ء کو تحریر کردہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"تقسیم ہند سے ہندو ناراض ہوں گے، مگر افتراق کی پہل انہوں نے کی۔ سوامی شردھانند، (مدن موہن) مالوی اور راجہ مہندر پرتاپ علیحدہ ہو گئے۔ ہندو مہا سبھا اور سنگھٹن اسی کا نتیجہ ہیں۔ ہم پر کوئی الزام نہیں لگا سکتے اور ہمارے لئے کوئی چارہ کار نہیں رہا۔ آپ دیکھیں گے علی گڑھ پارٹی اور مسلم لیگ سب مان جائیں گے۔ سب سے پہلے مسئلہ تقسیم کا نظریہ میں نے کابل میں ۱۹۱۹ء میں لکھا تھا، مولوی احمد علی (م ۱۹۶۲ء) کو اس کی پوری تعلیم دے کر واپس بھیجا تھا۔ ڈاکٹر اقبال اور سر فضل حسین پہلے ہی یہ نظریہ قبول کر چکے ہیں"۔

خیری برادران:

۱۹۱۷ء میں سویڈن کے دارالحکومت سٹاک ہام میں بین الاقوامی سوشلسٹ انٹرنیشنل کانفرنس منعقد ہوئی جس میں دنیا بھر سے سوشلسٹوں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ برعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش سے عبدالجبار خیری اور عبدالستار خیری نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔ انہوں نے برعظیم کے گھمبیر سیاسی مسائل کے حل کے بارے میں اس رائے کا اظہار کیا کہ ملک کو مذہب کے لحاظ سے مختلف آزاد وحدتوں میں تقسیم کر دیا جائے اور پھر ان وحدتوں کے ایک یا ایک سے زائد وفاق بنا دیئے جائیں۔

قاضی عزیز الدین احمد بلگرامیؒ:

قاضی عزیز الدین احمد بلگرامی (م ۱۹۵۴ء) ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھے۔ انہوں نے علی گڑھ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کا وسیع و عریض بنگلہ اب تک "اللہ والی کوٹھی" کے نام سے موسوم ہے۔ ان کے ایک فرزند قاضی معراج الدین احمد پاکستان میں وفاقی حکومت کے ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور اب ریٹائرمنٹ کے بعد کراچی میں مقیم ہیں۔ ان کی صاحبزادی بیگم ادریس احمد بینائی بھی کراچی میں سکونت پذیر ہیں (یہ میں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ شکوک رفع کر لئے جائیں)۔

قاضی عزیز الدین احمد نے "ہندو مسلم اتحاد پر کھلا خط مہاتما گاندھی کے نام" سے بدایوں کے ایک موقر ہفت روزہ "ذوالقرنین" میں مارچ / اپریل ۱۹۲۰ء میں شائع کرایا۔ انہوں نے تقسیم ہند کی جو تجویز پیش کی تھی وہ قریب قریب وہی ہے جو آج پاک و ہند کی بین الاقوامی سرحد تسلیم کی جاتی ہے۔ قاضی عزیز الدین احمد چونکہ سرکاری ملازم تھے، اس لئے انہوں نے یہ خط اپنے نام کی بجائے اپنے چھوٹے بھائی عبدالقدیر بلگرامی کے نام سے شائع کرایا۔ مجھے قاضی مظہر الدین احمد بلگرامی الازہری (م ۱۹۹۵ء) نے بتایا کہ ان کے چچا عبدالقدیر معمولی پڑھے لکھے تھے اور وہ بلگرام میں خاندانی زمینوں کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔ ان کا سیاست سے یا "ذوالقرنین" میں چھپنے والی تحریر سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

نادر علی ناگپوری:

۱۹۲۲ء میں آگرہ کے ایک نامور وکیل نادر علی ناگپوری نے ایک کتابچہ شائع کیا جس میں ہندو مسلم مسائل کا جائزہ لینے کے بعد اس کا واحد حل برعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش میں ایک اسلامی ریاست کا قیام بتایا۔

سردار گل محمد خان:

۱۹۲۲ء میں کوہاٹ میں بڑا خونریز ہندو مسلم فساد ہوا۔ یہ وہی فساد تھا جس کی ذمہ داری گاندھی جی نے حسب عادت مسلمانوں پر ڈالی اور مولانا شوکت علی نے یہ الزام قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ ۱۹۲۳ء میں برطانوی حکومت نے اس

خونریز فساد کے پس منظر کا جائزہ لینے کے لئے ایک تحقیقی کمیٹی مقرر کی ۔ اس کمیٹی کے رُوبرو بیان دیتے ہوئے انجمن اسلامیہ ڈیرہ اسمٰعیل خان کے صدر اور اس علاقے کے ممتاز سیاست دان سردار گُل محمد خان نے یہ تجویز پیش کی کہ ہندو مسلم تنازعہ اسی صورت میں حل ہو سکتا ہے کہ برّعظیم کو تقسیم کر دیا جائے اور پشاور سے لے کر آگرے تک کا علاقہ مسلمانوں کو دے دیا جائے ۔

سردار گُل محمد خان نے یہ بھی کہا کہ ہم ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ الگ (مملکتوں میں) دیکھنا پسند کریں گے ۔ ۲۲ کروڑ ہندو جنوب میں اور ۸ کروڑ مسلمان شمال میں ۔ راس کماری سے لے کر آگرہ تک کا علاقہ ہندوؤں کو اور آگرہ سے پشاور تک کا علاقہ مسلمانوں کو دیدیں ۔

بھائی پرمانند:

۱۹۲۴ء میں بھائی پرمانند نامی ایک آریا سماجی ہندو نے آریہ سماجیوں کے ترجمان "آریہ سماج" میں ایک مقالہ تحریر کیا، جس میں تقسیمِ ہند کی تجویز پیش کی اور اسے ہندو مُسلم تنازعہ کا واحد حل بتایا۔

لالہ لاجپت رائے:

مہاسبھائی ذہنیت رکھنے والے مشہور آریہ سماجی راہنما ترکی میں مولانا عبید اللہ سندھی سے مل کر سیاسی مسائل پر گفتگو کر چکے تھے ۔ ان کی باہم خط و کتابت بھی رہتی تھی ۔ مولانا سندھیؒ نے اقبال شیدائی کے نام ایک خط میں انہیں مطلع کیا کہ لالہ لاجپت رائے پنجاب کو تقسیم کرنے پر آمادہ ہیں ۔

لالہ لاجپت رائے (م ۱۹۲۸ء) نے رُوز نامہ "ٹریبیون" لاہور میں ۱۴ دسمبر ۱۹۲۴ء کو ایک مقالہ شائع کروایا جس میں مسلم اکثریت کے صوبوں ، سرحد ، مشرقی بنگال ، پنجاب اور سندھ کو چار مسلم ریاستوں میں بانٹ دینے کی تجویز پیش کی ۔ وہ اتفاق سے بلوچستان کا ذکر کرنا بھول گئے جہاں مسلمانوں کی سب سے زیادہ آبادی تھی ۔ ناقدین کا یہ کہنا ہے کہ لالہ لاجپت رائے کی یہ تجویز مُسلم دوستی کی بنا پر نہ تھی بلکہ وہ مسلمانوں کی اکثریت کے علاقوں کو ہندوستان سے الگ کر کے مسلمانوں سے "نجات"

حاصل کرنا چاہتے تھے ۔

سیّد سجّاد حیدر یلدرم:

مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے ۲۸ جنوری ۱۹۲۵ء کو اقبال شیدائی کے نام ایک خط لکھا ۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ۱۹۲۳ء میں سیّد سجّاد حیدر یلدرم (م ۱۹۴۳ء) جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے رجسٹرار اور ترکی زبان و ادب کے شیدائی تھے، ایک ماہ استنبول میں رہے تھے ۔ اس دوران میں وہ مولانا سندھیؒ سے ملتے رہے ۔ مولانا سندھیؒ ، اقبال شیدائی کو بتاتے ہیں کہ انہوں نے تقسیم ہند کا نظریہ یلدرم کے سامنے رکھا اور وہ پُوری طرح سے اس کے مؤید تھے ۔

مولانا محمد علی جوہرؒ:

۱۹۲۴ء میں ہندو مسلم اتحاد کے لئے ایک کانفرنس منعقد ہوئی ، لیکن ہندوؤں کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے یہ کانفرنس ناکام ہو گئی ۔ اس کانفرنس میں بطلِ حریت مولانا محمد علی جوہر نے فرمایا کہ اگر ہندو مسلم مسئلہ حل نہ ہوا تو ہندوستان ، ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان میں بٹ جائے گا ۔ انہوں نے اس کانفرنس میں شمال مغربی خطّے (یعنی موجودہ پاکستان) کے حق خود ارادیت کی ڈٹ کر حمایت کی ۔

مولانا عبید اللہ سندھی نے ۲۸ جنوری ۱۹۲۵ء کو اقبال شیدائی کے نام ایک خط میں لکھا کہ استانبول سے سہارن پور تک یا مسلم آبادی ہے یا مسلم اکثریت ۔

حسرت موہانی:

مولانا فضل الحسن حسرت موہانی (م ۱۹۵۱ء) نے ۱۹۲۱ء میں کانگرس ، مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی کے اجلاسوں میں برّعظیم کی کامل آزادی کے لئے ایک قرار داد پیش کرنا چاہی مگر انہیں اجازت نہ ملی ۔

۱۹۲۴ء میں حسرت موہانی نے متعدد ہندو رہنماؤں سے تبادلہ خیال کے بعد فرمایا کہ مستقبل کے آزاد ہندوستان کا قیام دو قومی نظریے پر ہو گا ۔ مسلم اکثریتی صوبے مسلم ریاست اور ہندو اکثریتی صوبے ہندو ریاست بنیں گے پھر ان کا مرکزی وفاق قائم کیا جائے جس کا انتظام ہندو اور مسلم مل کر چلائیں ۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ (بارِ دوم):

۱۹۲۵ء کے اوائل میں مولانا عبید اللہ سندھی نے تقسیم ہند کے موضوع پر دوبارہ اظہارِ خیال فرمایا۔ ۱۹۱۹ء میں انہوں نے صرف تقسیم ہند کی بات کی تھی۔ ۱۹۲۵ء کے اوائل میں انہوں نے دو ریاستوں کا تصور پیش کرتے ہوئے آگرہ کو ہندو ریاست کا دارالحکومت بنانے کی تجویز پیش کی اور لاہور کو مسلم ریاست کا صدر مقام بنانے کی سفارش کی۔

آرچبولڈ:

جولائی ۱۹۲۵ء میں آرچبولڈ نامی ایک انگریز دانشور اور صحافی نے تقسیم ہند کے موضوع پر مضمون قلمبند کیا۔ جس سے انگریزی دان طبقہ بھی تقسیم ہند کو ہندو مسلم مسئلے کا واحد حل سمجھنے لگا۔

رُوز نامہ "ٹائمز" لندن:

مارچ ۱۹۲۸ء میں رُوزنامہ ٹائمز لندن کے نامہ نگار مقیم دہلی نے انگلستان کے اس موقر اخبار میں، جسے برطانوی سیاستدانوں کا ترجمان سمجھا جاتا تھا، تقسیم ہند کے موضوع پر مقالہ تحریر کیا۔

مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش:

مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش (م ۱۹۵۹ء) کا تعلق ضلع جالندھر کے ایک گاؤں بہدم سے تھا۔ وہ ایک معروف صحافی اور اسلامی علوم کے ماہر تھے۔ انہوں نے علامہ اقبال کے مشورے پر رُوز نامہ "انقلاب" لاہور میں دسمبر ۱۹۲۸ء میں "ہندی مسلمانوں کے لئے علیحدہ وطن" کے عنوان سے مضامین لکھنے کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ مولانا میکش نے فرمایا کہ حقِ خود ارادیت کی بنیاد پر پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک آزاد ریاست کی حیثیت دے دی جائے۔ ان کے خیال میں صرف اسی صورت میں مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کی حفاظت ہو سکتی تھی۔

سر آغا خان:

سر سلطان محمد شاہ آغا خان سوم (م ۱۹۵۷ء) مسلم لیگ کے بانیوں میں سے تھے۔ انہوں نے اکتوبر ۱۹۰۶ء میں اس وفد کی قیادت کی تھی جو شملہ میں وائسرائے لارڈ منٹو سے ملا تھا۔ سر آغا خان نے ۱۹۲۸ء میں آل پارٹیز کنونشن منعقدہ کلکتہ میں ہر صوبے کے لئے کامل آزادی کا مطالبہ کیا۔ ۱۲ اور ۱۳ اکتوبر ۱۹۲۸ء کو لندن کے موقر رُوزنامے ٹائمز میں انہوں نے ایک مقالہ شائع کرایا جس میں شمال مغربی علاقوں کو ملا کر ایک آزاد مسلم ریاست قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔

ایک گمنام سیاسی کارکن:

اسی سال ایک گمنام سیاسی کارکن نے (Indian Muslims) کے عنوان سے ایک کتابچہ شائع کرایا جس میں دو قومی نظریے کی اساس پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے الگ ریاستوں کا مطالبہ کیا۔

حکیم الأمت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ:

حکیم الأمت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ (م ۱۹۴۳ء) حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (م ۱۸۹۹ء) کے خلیفۂ مجاز اور موجودہ صدی کے نصفِ اوّل کے عظیم رُوحانی پیشوا تھے۔ انہوں نے ہزاروں افراد کی رُوحانی تربیت فرمائی۔ موصوف نے مسلم لیگ کی کھل کر حمایت کی، جس سے مسلم لیگ کا دینی حلقوں میں وقار بڑھا۔ حکیم الأمت اور ان کے خلفاء و مریدین نے قائداعظم کا بھرپور ساتھ دیا اور بڑھ چڑھ کر تحریکِ پاکستان میں حصہ لیا۔ کانگرس کے ژلہ رُبا مولویوں نے انہیں قتل کرنے کی دھمکی دی لیکن ان پر بھلا ایسی گیدڑ بھبکیوں کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔ حکیم الأمت نے ۱۹۲۸ء میں عبدالماجد دریا بادی (م ۱۹۷۷ء) سے فرمایا تھا کہ برِّعظیم میں "خالص دارالاسلام" قائم ہونا چاہیے۔

ایف کے دُرّانی:

فروری ۱۹۲۹ء میں لاہور کے ایک سیاستدان ایف کے دُرّانی نے ایک تحقیقی مقالہ شائع کیا جس میں مسلمانوں کے لئے الگ وطن کا مطالبہ کیا۔

سرراس مسعود:

سرراس مسعود (م ۱۹۳۷ء) سیّد محمود (م ۱۹۰۳ء) کے فرزند اور سر سیّد احمد خان کے پوتے تھے ۔ موصوف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور علامہ محمد اقبال کے جگری دوست تھے ۔ موصوف اس وفد میں بھی شامل تھے جس نے نادر شاہ والیٔ افغانستان کی دعوت پر کابل کا دورہ کیا تھا ۔ ۱۹۲۹ء میں سرراس مسعود نے بھی تقسیم ہند کا نظریہ پیش کیا تھا ۔

نوّاب مالیر کوٹلہ:

مشرقی پنجاب میں مالیر کوٹلہ ایک مشہور ریاست تھی ۔ اس ریاست کے حکمران نواب سر ذوالفقار علی خان (م ۱۹۳۳ء) ، علامہ محمد اقبال کے دوست تھے ۔ علامہ مرحوم نے ان کی موٹر (کار) پر ایک نظم بھی لکھی ہے جو ان کی کلیات میں شامل ہے ۔ نواب موصوف نے دسمبر ۱۹۲۹ء میں آل انڈیا خلافت کانفرنس کے اجلاس منعقدہ لاہور میں مسلمانوں کے لئے الگ وطن کا مطالبہ کیا ۔ ان کے خیال میں یہ مسلم ریاست سندھ ، پنجاب اور بنگال پر مشتمل ہونی چاہیے تھی ۔

علّامہ سر محمد اقبال:

علّامہ اقبال نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد میں ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو اپنے صدارتی خطبے میں ارشاد فرمایا:

"میں یہ دیکھنا پسند کروں گا کہ پنجاب ، صوبہ سرحد ، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک ریاست بنا دیا جائے ۔ حکومت خود اختیاری خواہ سلطنت برطانیہ کے اندر ہو یا باہر ، مجھے ایک متحد شمال مغربی ہندوستانی ریاست کی تشکیل مسلمانوں کا ، کم سے کم شمال مغرب کے مسلمانوں کا آخری مقدر معلوم ہوتی ہے ۔"

گول میز کانفرنس:

مارچ ۱۹۳۱ء میں گول میز کانفرنس کی کارروائی کے دوران بھی تقسیم ہند کا

ذکر آیا ۔

مجلّہ اکانومسٹ اور تقسیم ہند:

لندن کے بین الاقوامی شہرت کے جریدے "اکانومسٹ" میں نومبر ۱۹۳۱ء میں ایک مقالہ شائع ہوا جس میں ہندو مسلم تنازعہ کے حل کی خاطر تقسیم ہند کی تجویز پیش کی گئی تھی ۔

دارالعوام لندن:

برطانوی پارلیمنٹ کے دو ایوان ہیں ۔ دارالامراء (House of Lords) اور دارالعوام (House of Commons)۔ دسمبر ۱۹۳۱ء میں دارالعوام میں تقسیم ہند کے مسئلے پر بحث ہوئی جس کا ریکارڈ دارالعوام میں موجود ہے ۔

سر ریجنالڈ کریڈک:

۱۹۳۲ء میں ایک انگریز مدبّر سر ریجنالڈ کریڈک نے تقسیم ہند کے موضوع پر ایک مقالہ تحریر کیا ۔ اس مقالے کی اساس دو قومی نظریے کی بنیاد پر تھی ۔ سر ریجنالڈ کے مقالے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تقسیم ہند کا نظریہ اس قدر اہمیت اختیار کر چکا تھا کہ برطانیہ کے سیاست دان بھی اس مسئلے پر غور کرنے لگے تھے ۔

پارلیمنٹری سبجیکٹس کمیٹی:

برطانیہ کی پارلیمنٹ نے ایک سبجیکٹس کمیٹی مقرر کی تھی ۔ اس کمیٹی نے ۱۹۳۳ء میں تقسیم ہند کا ذکر کیا ۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ برطانیہ کے دارالعوام میں دو قومی نظریے کی اساس پر تقسیمِ ہند پر غور و خوض ہونے لگا تھا ۔

چوہدری رحمتؒ علی (بار دوم):

چوہدری رحمت علی نے ۱۹۱۵ء میں "بزمِ شبلی" کے زیر اہتمام ایک تقریب میں اسلامیہ کالج لاہور میں مسلم ریاست کے قیام کا ذکر کیا تھا ، جس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں موجود ہے ۔

۱۹۳۳ء میں موصوف کیمبرج یونیورسٹی کے طالب علم تھے ۔ انہوں نے

مجوزہ مسلم ریاست کا نام پاکستان تجویز کیا اور اپنے چند احباب، جس میں شیخ محمد صادق، محمد اسلم خان اور خان عنایت اللہ خان بھی شامل تھے، سے مل کر ۲۸ جنوری ۱۹۳۳ء کو ایک کتابچہ بعنوان Now or Never شائع کیا۔ اس کتابچے میں انہوں نے گول میز کانفرنسوں کے شرکاء پر تنقید کی کہ انہوں نے کل ہند وفاق کو تسلیم کر لیا ہے۔ چوہدری رحمت علی نے مسلمانوں کے لئے الگ وطن کا مطالبہ کیا اور اس کا نام "پاکستان" تجویز کیا۔

بعض حلقوں کی جانب سے حال ہی میں یہ آواز بھی اٹھائی گئی ہے کہ "پاکستان" کے مجوز خواجہ عبدالرحیم (م ۱۹۷۴ء) تھے۔ وہ قاضی عزیز الدین احمد بلگرامی کی طرح سرکاری ملازم تھے، اس لئے انہوں نے چوہدری رحمت علی سے کہا کہ وہ اسے اپنے نام سے پیش کر دیں۔ راقم نے "خفتگانِ خاکِ لاہور" میں خواجہ عبدالرحیم کے "ترجمہ" میں اس کا قدرے تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

علامہ اقبال (بارِ دوم):

۱۹۳۳ء میں علامہ اقبال نے تیسری گول میز کانفرنس کے موقع پر مسلمانوں کے لئے الگ وطن کے موقف پر اصرار کیا۔ ۱۹۳۷ء میں انہوں نے قائداعظم کے ساتھ اپنی خط و کتابت میں اپنے نظریے کی وضاحت بھی کی۔

سید علی جواد:

اکتوبر ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ کے مشہور اخبار "پائنیر" میں سید علی جواد نے ایک مقالہ طبع کرایا جس میں دو قومی نظریے کی اساس پر تقسیمِ ہند کی تجویز پیش کی۔

مسلم کانفرنس:

۱۵ اگست ۱۹۳۷ء کو لکھنؤ میں مسلم کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا، جس میں مسلم لیگ کے زعماء بھی شامل تھے۔ اس تاریخی اجلاس میں مسلمانوں کے لئے الگ وطن کے حصول پر غور ہوا۔

شکیب ارسلان:

۱۹۳۷ء میں فرانسیسی زبان میں انسائیکلو پیڈیا آف سکولز شائع ہوا۔ جس میں شام کے مشہور سیاستدان اور دانشور علامہ شکیب ارسلان (م ۱۹۴۶ء) نے "پاکستان" کے عنوان سے ایک مقالہ تحریر کیا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عالم عرب کے دانشور بھی ہندو مسلم تنازعہ کے حل کے لئے مسلمانوں کے لئے الگ وطن کے قائل ہو رہے تھے۔

گھنشام داس برلا:

برِعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کے مشہور صنعت کار اور "گاندھی بھگت" گھنشام داس برلا نے فروری ۱۹۳۸ء میں وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو کے ساتھ گفتگو میں مسلم کانفرنس کے اجلاس منعقدہ لکھنؤ کے حوالے سے تقسیمِ ہند کے موضوع پر اپنے خیال کا اظہار کیا۔

جی ایل شنزلین:

اپریل ۱۹۳۸ء میں مشہور دانشور جی ایل شنزلین نے "ماڈرن ریویو" نامی مجلے میں تقسیمِ ہند کے موضوع پر ایک مقالہ شائع کرایا۔

عبدالجبار پہلوان:

۱۸ اپریل ۱۹۳۸ء کو مسلم لیگ کے اجلاس میں ایک بنگالی سیاستدان عبدالجبار پہلوان نے تقسیمِ ہند کے بارے میں ایک قرار داد پیش کرنا چاہی جو ایک قانونی سقم کی بنیاد پر نائم بارڈ قرار دی گئی۔

سندھ مسلم لیگ کی قرار داد:

۷ تا ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو سندھ صوبائی مسلم لیگ کا اجلاس کراچی میں قائداعظم محمد علی جناح کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں ایک جرأت مندانہ قرارداد منظور کی گئی۔ اس قرارداد میں یہ کہا گیا کہ برِعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش میں ہندو اکثریت کے صوبوں اور مسلم اکثریت کے صوبوں کے دو الگ الگ وفاق قائم کئے جائیں۔ صوبائی مسلم لیگ نے آل انڈیا مسلم لیگ سے یہ سفارش کی کہ وہ دستور میں

ایک ایسی سکیم وضع کرے جس کی رو سے مسلم اکثریتی صوبے، مسلم دیسی ریاستیں اور وہ علاقے جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں، ایک وفاق کی شکل میں مکمل آزادی حاصل کر سکیں۔ دستور وضع کرتے وقت ایک شق ایسی بھی رکھی جائے کہ برعظیم سرحد کے پار واقع کوئی مسلم ریاست (مثلاً افغانستان اور ایران) اگر چاہے تو اس وفاق میں شامل ہو سکے۔ اس مسلم وفاق میں غیر مسلموں کو ویسے ہی تحفظات فراہم کئے جائیں گے، جیسے تحفظات ہندو وفاق میں بسنے والے مسلمانوں کو دیئے جائیں گے۔

جمیل الدین احمد:

۱۹۳۸ء میں جمیل الدین احمد نامی ایک دانشور نے ایک مقالہ شائع کیا جس میں تقسیمِ ہند کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر سید عبداللطیف:

ڈاکٹر سید عبداللطیف جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن میں انگریزی زبان و ادب کے استاد تھے۔ انہوں نے ۹-۱۹۳۸ء میں تین مایہ ناز کتابیں شائع کیں:

1 - The Cultural Future of India.

2 - The Muslim Problem in India.

3 - A Federation of Cultural Zones of India.

موخر الذکر کتاب میں انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ برعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کو ثقافتی اور لسانی بنیادوں پر چار مسلم اور گیارہ ہندو منطقوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ چار مسلم منطقے یہ ہوں گے:

۱۔ شمال مغربی منطقہ: مشتمل بر بلوچستان، سندھ، پنجاب، سرحد و ریاستہائے خیرپور میرس و بہاولپور۔

۲۔ شمال مشرقی منطقہ: مشتمل بر مشرقی بنگال و آسام۔

۳۔ مرکزی منطقہ: مشتمل بر دہلی و لکھنؤ۔

۴۔ جنوبی منطقہ: مشتمل بر سلطنتِ آصفیہ و ریاست میسور۔

ڈاکٹر سید عبداللطیف نے اپنی سکیم کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ہندو

اور مسلم منطقے "آل انڈیا فیڈریشن" میں شامل ہوں۔ ان کے خیال میں تبادلہ آبادی اشد ضروری تھا۔ اس موقع پر انہوں نے کہا کہ ہندو منطقوں میں رہنے والے مسلمان اپنے قریب ترین مسلم منطقے میں جا بسیں اور مسلم منطقوں میں بسنے والے ہندو اپنے قریبی ہندو منطقے میں منتقل ہو جائیں۔ انہوں نے اس موقع پر یہ دعویٰ کیا کہ ان کی سکیم دوسری تمام سکیموں سے جامع اور قابل عمل ہے کیونکہ اس میں مختلف منطقوں کی حد بندی کرتے وقت وہاں کی مشترکہ تہذیب و ثقافت کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ان کی یہ رائے تھی کہ صرف اسی صورت میں ملک کی آبادی کا ہر طبقہ اپنی تہذیب و ثقافت کے مطابق ترقی کر سکے گا۔

چوہدری خلیق الزمان:

قرار دادِ پاکستان کے مؤید اور "شاہراہِ پاکستان" کے مصنف چوہدری خلیق الزمان (م ۱۹۷۳ء) نے مارچ ۱۹۳۹ء میں دو انگریز مدبروں لارڈ میور ہیڈ اور لارڈ زٹ لینڈ کے سامنے مسلم اکثریت کے علاقوں کو علیحدہ خود مختار ریاست کی شکل دینے کی تجویز پیش کی۔

سر سکندر حیات خان:

متحدہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ اور قائم مقام گورنر سر سکندر حیات خان (م ۱۹۴۲ء) نے:

Outline of A Scheme Of Indian Federation

کے عنوان سے ایک کتابچہ شائع کیا اور ۳ جون ۱۹۳۸ء کو وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو کی خدمت میں پیش کیا اور اس کے ساتھ اس موضوع پر تبادلہ خیال کیا۔

سر سکندر نے اس کتابچے میں اس حقیقت کا برملا اظہار کیا کہ ۱۹۳۵ء کے آئین کو برعظیم کی کسی بھی سیاسی جماعت نے خوش دلی کے ساتھ قبول نہیں کیا۔ ان حالات میں متبادل سکیم پر غور و خوض کرنا اشد ضروری ہے۔ سر سکندر نے یہ تجویز پیش کی کہ برعظیم کو سات حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

۱۔ آسام، بنگال اور ریاست سکم۔

۲۔ بہار اور اڑیسہ

۳۔ یوپی اور اس کی حدود میں شامل دیسی ریاستیں۔

۴۔ مدراس، ٹراونکور اور کورگ۔

۵۔ بمبئی، حیدر آباد، میسور اور مغربی ہند کی دیسی ریاستیں۔

۶۔ راجپوتانہ، گوالیار، سی پی، برار اور مرکزی ہند کی دیسی ریاستیں۔

۷۔ پنجاب، سندھ، بلوچستان، سرحد، کشمیر، بلوچستان اور جیسلمیر۔

ان ساتوں حصوں کی اپنی اپنی اسمبلیاں ہوں۔ یہ ساتوں حصے مل کر ایک فیڈریشن قائم کریں جس کے پاس صرف محکمہ جات امورِ خارجہ، دفاع، رسل و رسائل، کسٹم اور کرنسی ہو۔ مرکزی اسمبلی اور مرکزی ایگزیکٹو کونسل میں مسلمانوں کا تناسب تین چوتھائی ہو۔ اس فیڈریشن کو ڈومینین سٹیٹس حاصل ہو اور اس کا سربراہ گورنر جنرل ہو۔

سر سکندر کے فارمولے میں کامل آزادی کا تصور مفقود تھا۔ اس لئے اسے سیاستدانوں نے مسترد کر دیا۔ انہوں نے ڈومینین سٹیٹس مانگ کر اور گورنر جنرل کے لئے گنجائش نکال کر برطانیہ کی خیر خواہی کا ثبوت دیا تھا۔ اس لئے آزادی کے متوالوں نے ان کا فارمولا مسترد کر دیا۔

"بے باک" کے مقالات:

سہ روزہ "مدینہ" بجنور کا ایک مشہور اخبار تھا۔ جس سے بڑے بڑے نامور صحافی منسلک رہ چکے ہیں۔ ان میں سے نصر اللہ خان عزیز اور محمد وارث کامل کے نام گنوائے جا سکتے ہیں۔ اس اخبار میں ایک سیاسی کارکن نے "بے باک" کے قلمی نام سے فروری کے اواخر اور مارچ ۱۹۳۹ء کے آغاز میں چار قسطوں میں ایک مقالہ شائع کرایا جس میں تقسیم ہند کی تجویز پیش کی گئی تھی۔

نوابزادہ لیاقت علی خاں:

۲۵ مارچ ۱۹۳۹ء کو نوابزادہ لیاقت علی خان نے میرٹھ ڈویژنل کانفرنس میں اپنے صدارتی خطبے میں تقسیم ہند کی تجویز پیش کی اور مسلمانوں کے لئے ایک الگ ملک

کا مطالبہ کیا۔

ایک پنجابی:

۱۹۳۹ء میں لاہور سے ایک سیاست دان نے "ایک پنجابی" کے قلمی نام سے Confederacy of India کے عنوان سے ایک کتاب شائع کی۔ فاضل مصنف نے اپنا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ مورخ شہیر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے خیال میں اس کتاب کے مصنف نواب محمد شاہنواز خان والیٔ ممدوٹ تھے۔ ایک راجح قول کے مطابق اس کے مصنف میاں کفایت علی تھے۔

"ایک پنجابی" نے برِ عظیم کو پانچ زونوں میں تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی:

۱۔ وادیٔ سندھ، اس میں انبالہ ڈویژن (موجودہ ہریانہ) چھوڑ کر بقیہ پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان اور کشمیر شامل تھے۔

۲۔ راجستھان (اس میں راجپوتانے کی ۵۲ ریاستیں، اجمیر کا انگریزی علاقہ اور سی پی شامل تھا)۔

۳۔ دکن، اس میں سلطنتِ آصفیہ اور ریاست میسور شامل تھیں۔

۴۔ بنگال، ایک پنجابی نے بنگال کے ہندو اکثریت کے چند اضلاع نکال کر آسام کے مسلم اکثریت کے علاقے (سلہٹ اور ضلع میمن سنگھ) شامل کر دیئے۔

۵۔ ہندو انڈیا، اس میں یوپی، بہار، مغربی بنگال، اڑیسہ، بمبئی اور مدراس شامل تھے۔

"ایک پنجابی" نے یہ تجویز پیش کی کہ یہ پانچوں زون اپنی اپنی جگہ فیڈریشن ہوں اور یہ سب مل کر ایک کنفیڈریشن بنا لیں۔ اپنی اپنی جگہ یہ پانچوں ملک آزاد ہوں، ان کا اپنا اپنا بجٹ ہو، البتہ ان کا دفاع مشترک ہو، اور یہ پانچوں ملک دفاعی اخراجات مساوی طور پر برداشت کریں۔

"ایک پنجابی" کی سکیم میں کنفیڈریشن کے دفاعی اخراجات کا زیادہ تر بوجھ مسلمانوں کو برداشت کرنا تھا۔ اس لئے یہ سکیم بھی فلوپ ہو گئی۔

علی گڑھ سکیم:

۱۹۳۹ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے دو نامور پروفیسروں ، ڈاکٹر سیّد ظفر الحسن (م لاہور: ۱۹۴۹ء) اور ڈاکٹر افضال حسین قادری (م کراچی: ۱۹۷۴ء) نے مل کر ایک سکیم تیار کی جو "علی گڑھ سکیم" کے نام سے مشہور ہوئی ۔ مؤخر الذکر ڈاکٹر افضال حسین قادری ، چوہدری رحمت علی سے بڑے متاثر تھے ۔ اس لئے انہوں نے سیّد ظفر الحسن جیسے نامور فلسفی کے ساتھ مل کر جو سکیم تیار کی اس میں چوہدری رحمت علی کے مجوزہ "پاکستان" کی صاف جھلک دکھائی دیتی ہے ۔ ان کی سکیم یہ تھی کہ برِعظیم کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا جائے:

۱۔ شمال مغربی ہند ، یعنی پنجاب ، سرحد ، سندھ اور بلوچستان ۔

۲۔ بنگال ، جس میں بہار کا ضلع پورنیا اور آسام کا سلہٹ ڈویژن شامل ہو ۔

۳۔ ہندو اکثریت کے صوبے ۔

ان حضرات نے دیسی ریاستوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اپنے قریب ترین وفاق میں شامل ہو جائیں ۔ ان حضرات کا یہ کہنا تھا کہ مسلمان ہر لحاظ سے ایک الگ قوم ہیں ۔ اس لئے انہیں انگریزوں کے علاوہ ہندوؤں کے غلبے سے بھی چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے ۔ اس لئے وہ کل ہند فیڈریشن کے بھی خلاف تھے ۔

قرار دادِ لاہور:

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو منٹو پارک (جسے اب اقبال پارک کہتے ہیں) لاہور میں مسلمانان برِعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کے نمائندوں کا تاریخی اجتماع ہوا ، جس کی صدارت بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح نے کی ۔ اس نمائندہ تاریخی اجلاس میں شیر بنگال مولوی ابوالقاسم فضل الحق نے درج ذیل قرار داد پیش کی:

"قرار پایا کہ غور و خوض کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کے اس اجلاس کی یہ رائے ہے کہ کوئی آئینی منصوبہ بغیر اس کے اس ملک میں قابل عمل اور مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہیں ہو گا کہ وہ مندرجہ ذیل بنیادی اصولوں پر مبنی ہو: یعنی یہ کہ حد بندی کرکے اور ملکی تقسیم کے اعتبار سے حسب ضرورت رد و بدل کرکے متصل واحدوں کو ایسے منطقے بنا دیا جائے کہ وہ علاقے

جن میں مسلمان بہ اعتبار تعداد اکثریت میں ہیں ۔ جیسے ہندوستان کے شمال و مغربی اور مشرقی منطقوں میں ، اس طرح یک جا ہو جائیں کہ وہ ایسی خود مختار ریاستیں بنیں جن کے واحدے اندرونی طور پر باامتیاز اور خود مختار ہوں" ۔

چوہدری خلیق الزمان نے اس قرار داد کی تائید کی ۔ ان کے بعد مولانا ظفر علی خان ، سردار اورنگ زیب خان ، سر عبداللہ ہارون ، نواب محمد اسمٰعیل خان ، قاضی محمد عیسیٰ ، آئی آئی چندریگر ، سیّد عبدالرؤف شاہ ، ڈاکٹر محمد عالم ، سیّد ذاکر علی ، بیگم مولانا محمد علی ، عبدالحمید خان اور مولانا عبدالحامد بدایونی نے اپنے طور پر اس قرار داد کی تائید کی ۔ ان حضرات کا تعلق مختلف صوبوں سے تھا ۔ اس طرح قریب قریب پورے برِعظیم کی نمائندگی ہو گئی ۔ یوں ۱۹۶۳ء میں ڈنشا اردشیر طائع یار نے جس عمارت کی نیو رکھی تھی ، ۱۹۶۸ء میں مولوی ابوالقاسم فضل الحق کے ہاتھوں اس کی تکمیل ہوئی ۔

قرار دادِ لاہور کی منظوری کے بعد مسلمانانِ برِعظیم کی تمام تر توجہ حصول پاکستان کی طرف لگ گئی اور سات سال کی انتھک محنت اور قائداعظم جیسے مخلص اور عظیم سیاستدان کی قیادت میں وہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے ۔

چکرورتی راجگوپال اچاریہ:

قرار دادِ لاہور کی منظوری کے بعد بھی تقسیم ہند کی تجاویز منظر عام پر آتی رہیں ۔ ان میں سے ایک تجویز کانگریس کے نامور لیڈر اور بھارت کے پہلے ہندوستانی گورنر جنرل (پہلا ہندوستانی اس لئے کہ اچاریہ جی سے پہلے لارڈ ماؤنٹ بیٹن بھارت کا پہلا گورنر جنرل مقرر ہوا تھا اور وہ انگریز تھا) کی طرف سے آئی ۔

کرپس مشن کی ناکامی کے بعد راجگوپال اچاریہ (م ۱۹۷۲ء) کو اس بات کا یقین آ گیا تھا کہ مسلمانوں سے سمجھوتہ کئے بغیر ہندوستان کو آزادی نہیں مل سکتی ۔ وہ یہ بھی جان گیا تھا کہ مسلمان برِعظیم میں ایک اقلیتی فرقہ نہیں ہیں ، بلکہ وہ ایک قوم ہیں ۔ راجگوپال اچاریہ نے کانگرسی راہنماؤں کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ اگر مسلمانانِ برِعظیم کے ایک حصے میں الگ مملکت قائم کرنے پر مُصر ہیں تو ان کے ساتھ

اسی شرط پر سمجھوتہ کر لیں (تاکہ برِعظیم جلد از جلد آزادی حاصل کر لے) ۔ راجگوپال اچاریہ نے کانگرس کی ہائی کمان کو اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ مسلمانوں کے ساتھ اس شرط پر سمجھوتہ کرنا، اس سے بہتر ہے کہ کوئی سمجھوتہ نہ ہو ۔

راجگوپال اچاریہ نے ۲۳ اپریل ۱۹۴۲ء کو مدراس کی معطل شدہ اسمبلی کا اجلاس طلب کرکے کانگرس کے نمائندوں کو اُصولی طور پر پاکستان کا قائل کر دیا ۔ راجہ جی نے اس اجلاس میں ایک قرار داد پیش کی جس میں کانگرس سے اپیل کی گئی کہ وہ مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان کو تسلیم کر لے اور اسی بنیاد پر مسلم لیگ سے مفاہمت کی بات چیت کرے ۔

راجہ جی کی اس تجویز سے کانگرسی حلقوں میں کھلبلی مچ گئی اور ۲۹ اپریل کو کانگرس کی مجلس عاملہ کا اجلاس الہ آباد میں منعقد ہوا تو کانگرس کی مجلس عاملہ نے اس تجویز کو مسترد کر دیا ۔

ایک بار دوبارہ راجگوپال اچاریہ نے ۱۹۴۴ء میں مسلم لیگ کے ساتھ مفاہمت کی تجویز پیش کی اور وہ قائداعظم سے ملے، لیکن کانگرس نے ان کی پیش نہ چلنے دی ۔

قائداعظم محمد علی جناح:

دوسری عالمی جنگ میں جاپان کی شمولیت کے بعد مشرقِ بعید میں سیاسی توازن بگڑ گیا ۔ جاپان نے بڑی سرعت کے ساتھ انڈونیشیا، جزائر انڈیمان ونکو بار، ملایا اور برما پر قبضہ کرکے آسام کی دو ریاستوں منی پور اور امپھل پر بھی اپنا تسلّط قائم کر لیا ۔ جاپان کی ایئر فورس نے کلکتہ پر بمباری کرکے برِعظیم میں سنسنی پھیلا دی ۔ مشرقِ بعید کے محاذ پر انگریزوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انڈین نیشنل کانگرس نے Quit India Movement (ہندوستان چھوڑ دو تحریک) شروع کر دی ۔ اس موقع پر قائداعظم نے واشگاف الفاظ میں انگریزوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

Divide and Quit (تقسیم کرو اور چلے جاؤ) ۔

کابینہ وفد:

برِعظیم پاک و ہند کے سیاسی مسائل کے حل کے لئے برطانوی حکومت نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۶ء کو کابینہ کے تین وزراء پیتھک لارنس، اے وی الیگزینڈر اور سٹیفورڈ کرپس پر مشتمل ایک وفد دہلی بھیجا ۔ وفد نے مختلف سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں سے تبادلہ خیال کیا لیکن کانگرس اور مسلم لیگ میں کئی امور پر اتفاق رائے نہ ہو سکا ۔ جب مفاہمت کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو وفد نے اپنی جانب سے یہ تجویز پیش کی کہ برِعظیم کے صوبوں کے تین گروپ بنائے جائیں ۔

گروپ اے: اس گروپ میں ہندو اکثریت کے صوبے بمبئی، مدراس، اڑیسہ، بہار، یوپی اور سی پی شامل ہوں گے ۔

گروپ بی: اس گروپ میں پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان شامل ہوں گے ۔

گروپ سی: یہ گروپ بنگال اور آسام پر مشتمل ہوگا ۔

کابینہ وفد نے یہ شرط لگائی کہ ان گروپوں کی اپنی اپنی اسمبلیاں ہوں گی اور یہ داخلی طور پر آزاد ہوں گے ۔ ان تینوں گروپوں کی ایک کنفیڈریشن بنائی جائے گی جس کے پاس محدود اختیارات ہوں گے ۔ یہ کنفیڈریشن دس سال تک یونہی کام کرے گی ۔ اس کے بعد اگر کوئی گروپ چاہے تو وہ کنفیڈریشن سے الگ ہو سکتا ہے ۔

کانگرس نے یہ تجاویز اس لئے مسترد کر دی کہ اسے دس سال کے بعد پاکستان بنتا ہوا نظر آ رہا تھا اور مسلم لیگ نے اس بنا پر ان تجاویز کو ٹھکرا دیا کہ اسے قیامِ پاکستان کے لئے مزید دس سال انتظار کرنا پڑتا تھا ۔

لارڈ مونٹ بیٹن:

۲۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو لارڈ ویول کی جگہ لارڈ مونٹ بیٹن وائسرائے بن کر آیا۔ اس نے یہاں آنے کے بعد حالات کا جائزہ لیا اور اس نے جون ۱۹۴۸ء کی بجائے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو برِعظیم کو آزاد کر دینے کا فیصلہ کیا ۔

لارڈ مونٹ بیٹن نے سیاسی رہنماؤں کے ساتھ گفت و شنید کے بعد ۳ جون ۱۹۴۷ء کو یہ اعلان کیا کہ برطانیہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو انتقالِ اقتدار کر دے گا ۔

۱ ۔ بنگال اور پنجاب کی اسمبلیوں کے مسلم اور غیر مسلم ارکان کے الگ الگ



اجلاس ہوں گے ۔ اگر کسی اجلاس میں سادہ اکثریت سے ان صوبوں کو تقسیم کرنے کا فیصلہ ہوا تو ایک باؤنڈری کمیشن قائم کیا جائے گا جو ان صوبوں کی نئی حد بندی کرے گا۔

۲۔ صوبہ سرحد میں استصواب کرایا جائے گا اور وہاں کے عوام بھارت یا پاکستان میں شمولیت کے بارے میں فیصلہ کریں گے ۔

۳۔ بلوچستان کا شاہی جرگہ اور کوئٹہ میونسپل کمیٹی کے ارکان پاکستان یا بھارت میں شمولیت کا فیصلہ کریں گے ۔

۴۔ بنگال کی تقسیم کی صورت میں آسام کے علاقے سلہٹ میں ریفرنڈم کے ذریعے عوام کی رائے معلوم کی جائے گی کہ وہ پاکستان یا بھارت میں سے کس کے ساتھ شامل ہونا پسند کریں گے ۔

۵۔ سندھ اسمبلی کے ارکان سندھ کے مستقبل کا فیصلہ کریں گے ۔

۳ جون پلان کے مطابق صوبہ سرحد اور سلہٹ کے عوام نے بھاری اکثریت سے پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ کیا ۔ بلوچستان کے شاہی جرگے اور کوئٹہ میونسپل کمیٹی نے بھی پاکستان کے حق میں فیصلہ دیا ۔ سندھ اسمبلی نے بھی پاکستان میں شامل ہونے کو ترجیح دی ۔ پنجاب اور بنگال کی تقسیم عمل میں آئی ۔

محمد شجاع ناموس:

ڈاکٹر محمد شجاع ناموس (م لاہور ۱۹۸۳ء) ایک معروف ماہرِ تعلیم تھے ۔ جن کے پاس ایم اے اور ایم ایس سی کی گیارہ بارہ ڈگریاں تھیں ۔ انہوں نے ڈاکٹریٹ بھی کی ہوئی تھی ۔ وہ اپنے نام سے پہلے "ڈا۔ الملک فریدون عصر" لکھا کرتے تھے اور خود کو ارسطو کی ٹکر کا عالم سمجھتے تھے ۔ ڈاکٹر صاحب نے ۳ جون پلان کے اعلان کے بعد تقسیم ہند کی غرض سے ایک نقشہ تیار کیا تھا جس میں برِعظیم کو کئی حصوں میں تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی ۔ یہ نقشہ ڈاکٹر محمد سلیم احمد کے پاس محفوظ ہے ۔

باب (29)

قراردادِ لاہور

سندھ مسلم لیگ کا اجلاس:

ہندوؤں کی مسلسل ناانصافیوں اور چیرہ دستیوں سے تنگ آ کر ۱۹۳۸ء کے اوائل میں سندھ صوبائی مسلم لیگ نے کراچی کے اجلاس میں مسلمانوں کے لئے الگ وطن کا مطالبہ کیا۔ اس اجلاس میں کانگرس کی بے جا ضد اور ہٹ دھرمی، اس کے آمرانہ رویے اور مسلمانوں میں افتراق پیدا کرنے کی پالیسی کی پُر زور مذمت کی گئی۔ کانگرس نے جس انداز سے مسلمانوں کو اقتدار میں شریک کرنے سے انکار کیا تھا (جس کی مثال ابوالکلام آزاد اور چوہدری خلیق الزمان کے مابین ہونے والی بات چیت میں سامنے آئی تھی) اس پر بھی غور کیا گیا۔

سندھ مسلم لیگ کی سفارش:

اس اجلاس کے شرکاء نے وِدیا مندر سکیم، واردھا سکیم، دیوناگری رسم الخط میں ہندی کی ترویج، بندے ماترم گانے پر اصرار، مخلوط انتخابات کے لئے راہ ہموار کرنے اور مسلمانوں کو ان کے جائز حقوق نہ دینے پر بھی غور کیا۔ ان حالات میں انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو الگ الگ قومیں قرار دیتے ہوئے ایسے دستور کے نفاذ کا مطالبہ کیا جس میں مسلمانوں کو عزت کا مقام حاصل ہو۔ اس اجلاس نے آل انڈیا مسلم لیگ سے یہ سفارش کی کہ وہ ایک ایسی سکیم تیار کرے جس میں مسلمان مکمل طور پر آزاد ہوں۔

یہ پہلا موقع تھا کہ مسلم لیگ کی صوبائی شاخ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کا دو مختلف قوموں کے طور پر ذکر کیا اور پہلی بار خود مختاری کا مطالبہ کرتے

ہوئے تقسیم ہند کی تجویز پیش کی۔ کراچی کے اس تاریخ ساز اجلاس کے بعد قائداعظم اور مسلم لیگی رہنما اپنی تقریروں میں تقسیمِ ہند کے موضوع پر اظہار رائے کر کے مسلم رائے عامہ کو اس کے لئے ہموار کرتے رہے۔

مسلم لیگ کا اجلاس منعقدہ پٹنہ:

دسمبر ۱۹۳۸ء میں صوبہ بہار کے دارالحکومت پٹنہ میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں حاضرین نے متفقہ طور پر قائداعظم کو مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کے لئے کوئی مناسب حل تلاش کرنے کا اختیار دیا۔

مارچ ۱۹۳۹ء میں مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ نے قائداعظم کی صدارت میں ایک کمیٹی تشکیل دی اور اس کمیٹی کے ذمے یہ کام لگایا کہ مسلمانوں کے سیاسی مسائل کے حل کے لئے اب تک جتنی تجاویز اور سفارشات سامنے آئی ہیں ان پر غور کر کے ایک رپورٹ تیار کرے۔ اس کے ساتھ ہی ستمبر ۱۹۳۹ء میں مسلم لیگ کی پالیسی میں ایک اہم تبدیلی یہ آئی کہ اس نے وفاق کے نظریے کو یکسر مسترد کر دیا کیونکہ اس میں اکثریتی فرقے کا ہمیشہ کے لئے اقلیتی فرقے پر مسلط ہونے کا اندیشہ تھا۔

دوسری عالمی جنگ کا آغاز:

دوسری جانب بین الاقوامی سطح پر ایک اہم تبدیلی رونما ہوئی۔ ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ جنگ کے آغاز میں جرمنی اس سرعت سے آگے بڑھا کہ پولینڈ، ہالینڈ اور بلجیم جیسے ملکوں نے چند روز میں اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور فرانس جیسی سامراجی قوت بھی جرمنی کے آگے سرنگوں ہو گئی۔ لندن جرمنی کے راکٹوں کی زد میں تھا۔ برطانیہ کے دفاع اور جرمنی کے ساتھ مقابلے کا تمام دار و مدار برِ عظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش پر تھا۔ یہیں سے اسے سپاہی اور سامان خور و نوش ملتا تھا۔ اس لئے برطانیہ نے زمانۂ جنگ میں برِ عظیم کی سیاسی جماعتوں سے تعاون کی اپیل کی جس کا مسلم لیگ نے مثبت اور کانگرس نے منفی جواب دیا۔ کانگرسی حلقے اور خصوصاً گاندھی جی کو اس بات کا کامل یقین تھا کہ اس جنگ میں جرمنی کو فتح ہو گی اور انگریزوں کا نام و نشان مٹ جائے گا۔ اس لئے کانگرس کا رویہ سخت ہو گیا۔

مانچسٹر گارڈین میں قائداعظم کا بیان:

۲۲ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ نے یہ اعلان کیا کہ وہ ایسے کسی بھی دستور کی مخالفت کرے گی، جس میں ۱۹۳۵ء کے آئین کے وفاقی حصے کو مکمل طور پر ختم کرنے کی ضمانت نہ دی گئی ہو۔ ۱۹۳۹ء کے اواخر میں لندن کے ایک کثیر الاشاعت روز نامے مانچسٹر گارڈین میں قائداعظم کا ایک بیان شائع ہوا جس میں انہوں نے دو ٹوک الفاظ میں یہ کہا تھا کہ ہندوستان میں جمہوری طرزِ حکومت چلانا ممکن نہیں ہے کیونکہ جمہوری نظام کا مطلب ہندوؤں کا راج ہوگا اور مسلمان کسی صورت میں اسے قبول نہیں کریں گے۔ مسلمان آزاد ہو کر اپنے سیاسی، اقتصادی اور سماجی ادارے اپنی قابلیت کے مطابق چلائیں گے۔ وہ کسی کے ماتحت رہ کر اور دب کر ایسا نہیں کر سکتے۔ ان کی یہ خواہش ہے کہ ہندو اپنی مملکت میں خوش رہیں۔ نیز ہندوستان میں مسلمانوں کو اقلیت سمجھنا مناسب نہیں ہے وہ شمال مغرب (سرحد) بلوچستان، کشمیر، سندھ، پنجاب اور بنگال میں اکثریت میں ہیں (ان حالات میں دس کروڑ مسلمان جن کی آبادی برطانیہ کے باشندوں سے دوگنا ہے، کسی طرح بھی اقلیت نہیں ہیں، وہ ایک قوم ہیں)۔

زمانۂ جنگ میں تعاون کی پیشکش:

عالمی جنگ کے دوران کانگرس کے ساتھ اشتراکِ عمل کے لئے قائداعظم نے نومبر ۱۹۳۹ء میں سمجھوتے کی ایک اور کوشش کی اور اس کے لئے چند شرائط رکھیں۔

۱۔ تمام صوبوں میں مخلوط وزارتیں قائم کی جائیں۔
۲۔ مسلمانوں کے لئے ایسا کوئی قانون وضع نہ کیا جائے، جس کی مخالفت اسمبلی کے 2/3 مسلم ممبران کریں۔
۳۔ سرکاری عمارات پر کانگرس کا جھنڈا نہ لہرایا جائے۔
۴۔ بندے ماترم کو بطور ترانہ ختم کر دیا جائے۔
۵۔ کانگرس، مسلم لیگ کو ختم کرنے کی تمام مساعی ترک کر دے۔

وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو نے قائداعظم کی پیش کردہ شرائط پر غور کرنے کے لئے بمبئی میں کانگرس کے رہنما بھولا بھائی ڈیسائی کے ساتھ ملاقات کی اور اس سے قائداعظم کی تجاویز کے بارے میں کانگرس کے ردِ عمل سے متعلق استفسار کیا۔ بھولا بھائی ڈیسائی نے کانگرسی رہنماؤں کے ساتھ تبادلۂ خیال کے بعد وائسرائے کو جواب دیا کہ کانگرس صرف اور صرف اسی صورت میں مخلوط وزارتوں کے قیام پر آمادہ ہوگی جب کابینہ میں شامل مسلم وزراء کانگرس کی پالیسی پر چلیں گے۔ وائسرائے اور بھولا بھائی ڈیسائی کی بات چیت شاید آگے بڑھتی اور قائداعظم سے بھی وہ مشورہ کرتے لیکن گاندھی جی نے مداخلت کرکے یہ معاملہ یہیں ختم کر دیا کیونکہ ان کا یہ پختہ یقین تھا کہ اس بار عالمی جنگ میں انگریز ہار جائیں گے۔ لہٰذا ان کے ساتھ دورانِ جنگ سخت رویہ اپنانے کی ضرورت ہے۔ ثانیاً انگریز جرمنی کے خلاف پوری تندہی سے لڑ رہے ہیں ان حالات میں برِعظیم کے معاملات ان کے لئے ثانوی حیثیت اختیار کر چکے ہیں اس لئے کانگرس کو انگریزوں کی اس مجبوری سے جتنا زیادہ ہو سکے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

لندن کے اخبار میں دو قومی نظریہ کا ذکر:

۱۹۴۰ء کے آغاز میں قائداعظم کے بیانات غیر ملکی اخبارات میں شائع ہونے لگے جس سے بین الاقوامی سطح پر مسلمانانِ برِعظیم کے مسائل زیرِ بحث آنے لگے۔ اسی زمانے میں لندن کے ایک مشہور اخبار ٹائم اینڈ ٹائیڈ (Time & Tide) نے قائداعظم کا ایک بیان شائع کیا جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو الگ الگ قومیں قرار دیا گیا تھا اور اس دعوے کے حق میں ناقابلِ تردید دلائل پیش کیے گئے تھے۔

قائداعظم کا خط گاندھی جی کے نام:

یکم جنوری ۱۹۴۰ء کو قائداعظم نے گاندھی جی کے خط کے جواب میں انہیں لکھا، "مجھے اس معاملے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہے کہ ہندوستان میں ایک قوم نہیں ہے اور نہ ہی یہ (ہندوستان) ایک ملک ہے۔ یہ برِعظیم ہے جس میں بہت سی قومیں آباد ہیں۔ ان میں ہندو اور مسلمان دو بڑی قومیں ہیں۔"

مسلم لیگ کی مقبولیت میں اضافہ:

کانگرسی وزارتوں کے مستعفی ہونے کے بعد مسلم لیگ کی مقبولیت میں

بے حد اضافہ ہوا اور جہاں کہیں بھی کسی مسلم نشست پر ضمنی انتخاب ہوا وہ مسلم لیگ کے امیدوار نے بھاری اکثریت سے جیتا اور بسا اوقات اپنے مخالف امیدوار کی ضمانت ضبط کروا کے اسے ذلت آمیز شکست دی۔

۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس پٹنہ میں لاہور کے ایک جوشیلے مسلم لیگی کارکن میاں فیروز الدین (م ۱۹۳۶ء) نے "قائداعظم زندہ باد" کا ایسا پُرخلوص نعرہ لگایا کہ قائداعظم محمد علی جناح کے نام کا جز بن گیا۔ اس کے بعد قائداعظم کی مقبولیت میں دن بدن اضافہ ہونے لگا اور لوگ جوق در جوق مسلم لیگ میں شامل ہو کر قائداعظم کے ہاتھ مضبوط کرنے لگے۔ مسلمان ۱۹۳۷ء تا ۱۹۳۹ء ہندو ذہنیت کا تلخ مظاہرہ کر چکے تھے۔ اس لئے وہ کانگرس اور اس کی ہم نوا جماعتوں پر تین حرف بھیج کر مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے اور قائداعظم مسلمانوں کے مسلّمہ لیڈر بن کر اُبھرے۔ انہوں نے کانگرس کے درجنوں رہنماؤں کے مقابلے میں اکیلے جنگِ آزادی لڑی اور ان سب کو سیاسی میدان میں مات دی۔

مسلم لیگ کے اجلاسِ دہلی کا تاریخی فیصلہ:

فروری ۱۹۴۰ء میں دہلی میں مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کا اجلاس منعقد ہوا جس میں اس بات پر اتفاق رائے ہو گیا کہ مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں منعقد ہونے والے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں برطانوی حکومت سے مسلمانوں کے لئے برِعظیم میں ایک علیحدہ مملکت کے قیام کا مطالبہ کیا جائے۔ چنانچہ اسی اجلاس میں ۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو منٹو پارک (موجودہ اقبال پارک) میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے انعقاد کا اعلان کیا گیا۔

خاکساروں اور سر سکندر حیات خان میں ٹکراؤ

جن دنوں لاہور میں مسلم لیگ کے تاریخ ساز اجلاس کی تیاریاں زور و شور کے ساتھ جاری تھیں انہیں دنوں لاہور میں ایک خونریز سانحہ پیش آ گیا اور ۱۹ مارچ ۱۹۴۰ء کو خاکساروں کا سر سکندر حیات خان کی حکومت کے ساتھ ٹکراؤ ہو گیا۔

خاکسار تحریک:

خاکسار تحریک علامہ عنایت اللہ خان مشرقی (م ۱۹۶۳ء) کے فکر و عمل کی پیداوار تھی۔ علامہ مشرقی قرآنِ حکیم کے بغور مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ مسلمانوں کو درپیش تمام مسائل کا حل صرف اور صرف "جہاد" میں ہے۔ انہوں نے اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے خاکسار تحریک کی داغ بیل ڈالی اور یہ مسلمانانِ برِعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کی واحد منظم جماعت تھی، جس کا نصب العین "غلبۂ اسلام" اور بلاتفریق مذہب و ملت انسانیت کی خدمت تھا۔

علامہ مشرقی نے خاکسار تحریک کی بنیاد فوجی ڈسپلن پر اُٹھائی تھی۔ ان کی پارٹی کے ارکان میں سخت قسم کا فوجی ڈسپلن پایا جاتا تھا اور حکم عدولی پر "کورٹ مارشل" کیا جاتا تھا اور ڈسپلن کی خلاف ورزی پر کوڑے لگائے جاتے تھے۔

خاکساروں کے مثالی کردار، اطاعتِ امیر، اخوتِ اسلامی اور خدمتِ خلق کے مظاہروں نے بہت جلد اس جماعت کو عوام میں مقبول بنا دیا اور برِعظیم کا کوئی شہر یا قصبہ ایسا نہ تھا جہاں اس تنظیم کے کارکن موجود نہ ہوں۔ سرکاری ملازم اور دکاندار فارغ اوقات میں پریڈ کرتے اور تحریک کے قواعد و ضوابط سے آگاہی حاصل کرتے تھے۔

خاکساروں کی عسکری قوت سے سر سکندر کی حکومت اور ہندو سکھ خائف ہو گئے۔ راقم کو لاہور کے مائیکل آرٹسٹ نے بتایا کہ ایک بار بیس ہزار باوردی خاکساروں نے چمکدار بیلچے کندھوں پر رکھ کر راولپنڈی کے بازاروں میں مارچ پاسٹ کیا تو کئی ہندو مرد و زن یہ نظارہ دیکھ کر بے ہوش ہو گئے تھے۔

علامہ نے اس تحریک کو مزید فروغ دینے کے لئے مسلمانوں سے اپیل کی کہ اگر انہیں پریڈ کرنے کے لئے کوئی میدان میسّر نہ ہو تو وہ قبرستانوں کو ہموار کر کے پریڈ گراؤنڈ بنا لیں۔ اگر قبرستان بھی اس مقصد کے لئے نہ مل سکیں تو اپنے مکانوں کی چھتوں پر پریڈ کی مشق کریں۔ راقم کو غلام نبی خاکسار نے بتایا کہ وہ اور اس کے بھائی غلام حیدر گڑھی شاہو لاہور میں اپنے مکان کی چھت پر چپ راست کی مشق کیا کرتے تھے۔

علامہ مشرقی اور مذہبی طبقے میں کشمکش:

اسے بدقسمتی کے علاوہ اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ علامہ مشرقی کا روایت

پرست مولویوں کے ساتھ ٹکراؤ ہو گیا۔ علامہ موصوف نے انہیں رسم و رواج ترک کرکے اور سوئم، دسواں، چہلم، ششماہی اور برسی کی تقریبات کو تیاگ کر جہاد کی طرف توجہ دینے کے لئے کہا تو کھانے پینے کے شوقین مولویوں نے ان کے خلاف ایک محاذ کھول لیا۔ مولانا حشمت علی پیلی بھیتی اور ان کے داماد مولوی طیب ہمدانی نے "تجانب اہل السنۃ" میں علامہ صاحب کو کافر اور ان کی خاکسار تحریک کو غیر اسلامی تحریک قرار دیا۔ اس سے قبل یہ دونوں مفتی مسلم لیگ کے خلاف بھی "گولہ باری" کر چکے تھے۔ انہوں نے قائداعظم کو بھی کافر کہا اور مسلم لیگ کو کافروں کی جماعت قرار دے کر مسلمانوں کو اس سے دور رہنے کا مشورہ دیا۔ لاہور سے حزب الاحناف کے "مفتی اعظم" نے بھی جلتی پر تیل کا کام کیا اور علامہ مشرقی کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کر دیا۔ ادھر علامہ صاحب کب چپ بیٹھنے والے تھے۔ انہوں نے "مولوی کا غلط مذہب" کے عنوان سے نمبروار کتابچے شائع کرنے شروع کر دیئے۔ علامہ صاحب کی ان تحریروں کا لب لباب یہ تھا کہ "مولویوں کے منہ حلوے مانڈے کا پلستر کرکے بند کر دیئے گئے ہیں۔ اس لئے وہ حق بات کہنے سے قاصر ہیں"۔

علامہ مشرقی کے خلاف مولویوں کے فتووں نے سر سکندر حیات خان کے ہاتھ مضبوط کر دیئے۔ دوسری جانب سر سکندر کی شہ پر ہندوؤں نے گیلنٹی دل، مہابیر دل اور سکھوں نے اکالی دل کے نام سے فوجی طرز کی تنظیمیں قائم کرکے عسکری مظاہرے شروع کر دیئے تاکہ سر سکندر حیات کے لئے قیامِ امن کے بہانے تمام عسکری تنظیموں پر پابندی لگانے کا جواز نکل آئے۔ چنانچہ سر سکندر نے خاکسار تحریک سمیت تمام عسکری تنظیموں پر پابندی عائد کر دی۔

پابندی توڑنے کا فیصلہ:

اس پر خاکساروں نے علامہ مشرقی کی ہدایت پر پابندی توڑ کر سر سکندر کی حکومت سے ٹکر لینے کا فیصلہ کیا۔ علامہ موصوف نے خاکساروں کے نام احکام جاری کئے اور انہیں یہ حکم دیا کہ وہ لاہور پہنچ کر سر سکندر کی چارپائی کے گرد اپنی لاشوں کے ڈھیر لگا دیں۔ علامہ صاحب کا حکم ملتے ہی خاکسار دھڑا دھڑ لاہور پہنچنے لگے اور انہوں نے

۱۹ مارچ کو پابندی توڑنے کا اٹل فیصلہ کیا۔ یہ وہ دن تھے جب منٹو پارک میں مسلم لیگ کے تاریخ ساز اجلاس کی تیاریاں زوروں پر تھیں اور مسلم لیگی مندوبین دور دراز کے علاقوں سے لاہور روانہ ہو چکے تھے۔ اس لئے ہماری دانست میں ۱۹ مارچ کو پابندی توڑنے کا فیصلہ صحیح نہ تھا اسے چند روز کے لئے مؤخر بھی کیا جا سکتا تھا۔

علامہ صاحب خاکساروں کو ۱۹ مارچ کو پابندی توڑنے کا حکم دے کر خود لاہور سے دہلی کی جانب روانہ ہو گئے۔ حالانکہ ایسے نازک موقع پر ان کا لاہور میں موجود رہنا اشد ضروری تھا۔ وہ خاکساروں کو سر سکندر کی چارپائی کے گرد لاشوں کے ڈھیر لگا دینے کا حکم دے کر خود پنجاب سے یوپی کی جانب روانہ ہو گئے۔

پولیس سے ٹکراؤ:

۱۹ مارچ ۱۹۴۰ء کو صبح دس بجے کے قریب خاکسار اقبال منزل اندرون بھاٹی گیٹ کے سامنے جمع ہونا شروع ہوئے۔ ان میں پشاور سے آنے والے خاکساروں کی تعداد زیادہ تھی۔ گیارہ بجے کے قریب ۳۳ سر فروش کفن بردار خاکساروں کا جیش اقبال منزل سے بادشاہی مسجد کی جانب روانہ ہوا۔ اس وقت ہراول دستے کی کمان پشاور کا ایک سرفروش خاکسار آغا فرمان شاہ کر رہا تھا اور علم کو صدیق بہادر اٹھائے ہوئے تھا۔ پورے جیش کی کمان خان الٰہی بخش خان کے ہاتھ میں تھی۔

تھانہ ٹبی (صحیح لفظ ٹبی ہے) کے پاس خاکساروں کا پولیس کے گھوڑ سوار دستے کے ساتھ پہلا تصادم ہوا۔ اس تصادم میں پولیس کے دو افراد ہلاک ہو گئے اور گھوڑ سواروں نے راہِ فرار اختیار کی۔ اس کے بعد جیش آگے بڑھا۔

چوک نوگزا ہیرا منڈی میں پولیس کی بھاری نفری جیش کو روکنے کے لئے تیار کھڑی تھی۔ ڈی ایس پی پولیس بیٹی، ڈی بورن اور گینسفورڈ جیسے کھاگ انگریز آفیسرز پولیس کے دستوں کی قیادت کر رہے تھے۔ بیٹی نے ایک خاکسار کے گال پر تھپڑ مارا تو اس نے بیلچے کی ایک ضرب سے اس کا سر قلم کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی مسلح تصادم شروع ہو گیا۔ ایک خاکسار نے ڈی بورن کو شدید زخمی کر دیا اور گینسفورڈ اپنی ناک اور جبڑہ کٹوا کر گندے نالے میں چھپ گیا۔ پولیس نے خاکساروں کو گھیرے میں

لے کر اندھا دھند گولی چلا دی۔ ظاہر ہے کہ گولیوں کا مقابلہ بیلچوں کے ساتھ نہیں ہو سکتا تھا اس لئے میدان پولیس کے ہاتھ رہا۔ جن خاکساروں نے بھاگ کر مسجدوں یا نزدیکی گھروں میں پناہ لی انہیں پولیس نے مکانوں کی چھتوں پر سے زمین پر دے مارا۔ مسجدوں کا محاصرہ کرکے خاکساروں کو مسجدوں سے باہر آنے پر مجبور کر دیا گیا۔ سرکاری اعلان کے مطابق ۲۰ خاکسار جاں بحق تسلیم ہوئے اور سیکڑوں کی تعداد میں زخمی ہوئے۔

خاکسار تحریک کا زوال:

اس سانحہ کے بعد جو مسلمان سرکاری ملازمین رات کو فوجی پریڈ کیا کرتے تھے انہوں نے اپنی وردیاں جلا کر خاکسار تحریک سے لاتعلقی کا اعلان کیا۔ ۱۹ مارچ ۱۹۴۰ء خاکسار تحریک کے عروج کا دن تھا۔ اس کے فوراً بعد اس تحریک کا زوال شروع ہو گیا۔ اس تحریک کے نقادوں کا یہ خیال ہے کہ اگر علامہ مشرقی ۱۹ مارچ کو حکومت کے ساتھ ٹکر نہ لیتے اور پابندی کے بعد اپنی تحریک کا رخ کچھ عرصے کے لئے سماجی خدمت کی جانب موڑ دیتے تو وہ تحریک کو بچا سکتے تھے۔ جب حالات سازگار ہوتے تو وہ دوبارہ خاکسار تحریک کو منظم کر لیتے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو تقسیم ہند کے موقع پر ہر شہر اور قصبے میں تربیت یافتہ مسلح مسلمان موجود ہوتے تو مشرقی پنجاب میں کسی مسلمان کی نکسیر بھی نہ پھوٹتی۔ بہرحال ہمیں اس تحریک سے یہ سبق ملا کہ جب تک مکمل تیاری نہ ہو اس وقت تک حکومت کے ساتھ ٹکر نہیں لینی چاہیے۔

یونینسٹ حکومت کے ہاتھوں خاکساروں کا قتل عام سانحہ جلیانوالہ سے کسی طرح بھی کم نہ تھا۔ اس سے قبل یہی حکومت ۱۹۳۵ء میں مسجد شہید گنج کا ملبہ مجلس احرار اسلام پر گرا کر اس جماعت کو سیاست سے بے دخل کر چکی تھی۔ ۱۹۴۰ء میں یونینسٹ حکومت نے خاکسار تحریک کو چوک نوگزا میں دفن کر دیا۔ اس سانحہ کا سب سے افسوسناک پہلو یہ تھا کہ یہ ایک ایسے وقت پر رُونما ہوا جب ملک بھر سے مسلم لیگ کے مندوبین لاہور میں منعقد ہونے والے تاریخی جلسے میں شرکت کے لئے ٹرینوں میں سوار ہو چکے تھے۔

مسلم لیگ کا جلسہ ملتوی کرانے کی کوشش:

۲۰ مارچ کی صبح سر سکندر حیات خان نے یونینسٹ پارٹی کے ایک پرانے رکن میاں امیر الدین کو جو اب مسلم لیگ میں شامل ہو چکے تھے، اور نواب سر شہنواز خان ممدوٹ (م ۱۹۴۲ء) کو سول سیکریٹریٹ میں اپنے دفتر میں بلا کر کہا کہ لاہور کے حالات خراب ہو چکے ہیں اور "ان کے مخالفین" نے خاکساروں کو اُکسا کر ان کے ساتھ لڑوا دیا ہے۔ ان حالات میں مسلم لیگ کا جلسہ ملتوی کر دیا جائے۔ ان دونوں حضرات نے ٹیلی فون پر قائداعظم کے ساتھ رابطہ قائم کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ اسی شام فرنٹیئر میل میں دہلی سے روانہ ہو کر اگلے روز صبح لاہور پہنچیں گے اس لئے اب جلسہ ملتوی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یونینسٹ حکومت کے ہتھکنڈے:

جلسہ ملتوی کرانے کے لئے یونینسٹ حکومت نے ایک چال اور چلی۔ حکومت نے جلسہ کے منتظمین سے کہا کہ جس جگہ وہ جلسہ منعقد کرنا چاہتے ہیں وہ جگہ محکمۂ زراعت کی ملکیت ہے اس لئے اس محکمے سے اجازت لینا ضروری ہے۔ جب منتظمینِ جلسہ نے محکمۂ زراعت سے رجوع کیا تو محکمہ نے زمین استعمال کرنے کے عوض آٹھ ہزار روپے طلب کئے جو اس زمانے کے لحاظ سے ایک خطیر رقم تھی۔ حالانکہ محکمۂ زراعت چند روز پہلے یہی زمین پانصد روپے لے کر سکھوں کو ایک جلسہ منعقد کرنے کے لئے دے چکا تھا۔ بہرحال مسلم لیگی زعما نے اس رقم کی ادائیگی کا وعدہ کر لیا۔ راقم کی اطلاع کے مطابق اس کے باوجود محکمۂ زراعت نے یونینسٹ حکومت کے ایما پر اس جگہ نہر کا پانی چھوڑ دیا۔ میاں امیر الدین (م ۱۹۸۹ء) کی زرعی اراضی موجودہ کریم پارک کی جگہ واقع تھی۔ انہوں نے راتوں رات درجنوں مزدور لگا کر اس زمین سے فصل کٹوا کر جلسہ گاہ میں بچھا دی۔ یوں ۲۲ مارچ کو منعقد ہونے والے جلسے کو یقینی بنا دیا۔

قائداعظم کی آمد لاہور:

قائداعظم اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق ۲۱ مارچ کو صبح فرنٹیئر میل سے لاہور پہنچے۔ زندہ دلانِ لاہور ان کا شاندار جلوس نکالنا چاہتے تھے۔ وہ ایک بگھی سجا کر لائے تھے جس میں قائداعظم کو بٹھا کر اسے خود کھینچتے ہوئے "ممدوٹ ولا" لے جانا

چاہتے تھے۔ قائداعظم نے اس بگھی میں سوار ہونے سے انکار کر دیا اور ممدوٹ ولا جانے کی بجائے زخمی خاکساروں کی عیادت کے لئے اسٹیشن سے سیدھے میوہسپتال تشریف لے گئے۔ قائداعظم ہسپتال جا کر زخمی خاکساروں سے فرداً فرداً ملے اور انہیں تسلی دی۔ ان کے اس اخلاق کا خاکساروں پر بڑا اثر ہوا۔

دوسری جانب یونینسٹ پارٹی خوش تھی کہ اس نے ۱۹۳۵ء میں مسجد شہید گنج کا ملبہ مجلس احرار اسلام پر گرا کر اسے سیاسی میدان میں بری طرح مات دی اور ۱۹۴۰ء میں چوک نوگزا ہیرا منڈی لاہور میں خاکسار تحریک کو کچل کر رکھ دیا۔ مسلمانوں کی مخالفت کے باوجود کانگرس اور اکالی دل کی ملی بھگت سے یونینسٹ پارٹی ۱۹۴۷ء تک پنجاب میں برسراقتدار رہی۔

مسلم لیگ کا تاریخ ساز جلسہ:

خاکساروں کے قتل عام کے بعد لاہور پر افسردگی چھائی ہوئی تھی اور عام شہری بھی سر سکندر کو موردِ الزام ٹھہرا رہے تھے۔ ان حالات میں بھی پچاس ہزار کے لگ بھگ افراد اجلاس میں شریک ہوئے۔ پابندیوں کے باوجود پشاور سے پانصد خاکساروں کا ایک دستہ مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے لاہور پہنچ گیا اور انہوں نے جلسے کی حفاظت کی ذمہ داری سنبھال لی۔

قائداعظم کا خطبۂ صدارت:

قائداعظم نے ۲۲ مارچ کو اپنے صدارتی خطبے میں ارشاد فرمایا کہ یہ مسئلہ جو ہندوستان میں ہے، فرقوں اور فرقوں کے درمیان نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے اور اس کو بین الاقوامی ہی مان کر حل کرنا چاہیے۔ جب تک یہ بنیادی حقیقت سمجھ میں نہ آئے گی اس وقت تک کوئی بھی دستور وضع کیا جائے وہ تباہی پر منتج ہو گا اور صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ ہندوؤں اور انگریزوں کے لئے بھی مضر اور تباہ کن ثابت ہو گا۔ اگر حکومتِ برطانیہ اس برصغیر کے باشندوں کے لئے یہ چاہتی ہے کہ ان کو امن اور خوشی حاصل ہو اور اس کی یہ خواہش واقعی مخلصانہ ہے تو اس کی صرف یہ ایک صورت ہے کہ ہندوستان کو تقسیم کر کے بڑی اقوام کے لئے جداگانہ قومی وطن منظور کئے جائیں جن میں

وہ خود اختیاری کے ساتھ قومی ریاستیں قائم کریں۔ اس کی کوئی وجہ نہیں کہ ان ریاستوں میں باہم عداوت ہو البتہ ان کی یہ رقابت اور یہ طبعی خواہش اور کوشش جاری رہے گی کہ ایک دوسرے کے اجتماعی نظام پر چھا جائے اور ملک کی حکومت میں سیاسی برتری حاصل کرے۔ بین الاقوامی معاہدات کے ذریعے سے ان کے درمیان خیر خواہی اور خیر سگالی پیدا ہو جائے گی اور اپنے ہمسایوں کے ساتھ وہ امن سے رہ سکیں گے۔ مزید یہ کہ اس سے اقلیتوں کا مسئلہ حل کرنے میں بڑی آسانی ہو گی۔ ہندوستان اور مسلم ہندوستان کے درمیان باہمی رضا و رغبت سے معاملات طے ہو جائیں گے اور اس سے مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے حقوق و مفاد کی زیادہ مؤثر طریقے پر حفاظت ہو جائے گی۔

یہ سمجھنا بہت ہی مشکل ہے کہ اسلام اور ہندومت کی حقیقی فطرت ہمارے ہندو دوستوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔ وہ مذہب کے عام مفہوم میں مذہب ہیں ہی نہیں بلکہ دو جداگانہ اور مختلف اجتماعی نظام ہیں اور یہ محض خواب ہے کہ ہندو اور مسلمان کبھی ایک مشترکہ قوم بن سکیں گے اور ایک ہندوستانی قوم کا مغالطہ حدود سے بہت ہی گزر گیا ہے اور ہماری بہت سی مصیبتوں کا باعث ہے اور اگر ہم نے جلد اپنے خیالات و عقائد پر نظر ثانی نہ کی تو ہندوستان تباہ ہو جائے گا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا تعلق دو مختلف مذہبی فلسفوں، معاشرتی رواجوں اور ادبیات سے ہے نہ ان کے درمیان شادیاں ہوتی ہیں، نہ یہ ایک ساتھ بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں دو ایسی تہذیبوں کے پیرو ہیں جن کی بنیاد متصادم خیالات اور تصورات پر ہے۔ یہ بالکل واضح ہے کہ وہ تاریخ اور ہے جس پر ہندوؤں کو فخر اور ناز ہے اور وہ اور ہے جس پر مسلمان نازاں ہیں اور جس سے ان کے دلوں میں امنگ پیدا ہوتی ہے۔ ان کی رزمیات الگ ہیں۔ ان کے وہ بہادر مختلف ہیں جن کی یہ تعریف کرتے ہیں اور ان کے وہ واقعات مختلف ہیں جو قابلِ یادگار ہیں۔ اکثر یہ صورت ہے کہ ایک کے نزدیک شجاعت میں جو مثالی شخصیت ہے وہ دوسرے کی نظر میں دشمن ہے اور اسی طرح یہ ہے کہ ایک کی فتح دوسرے کی شکست ہے۔ دو ایسی قوموں کو ایک نظام ریاست میں اس طرح باندھنے کا نتیجہ، جبکہ ان میں ایک اکثریت ہو اور دوسری اقلیت، یہ ہو گا کہ ان میں بے

چینی بڑھے گی اور بالآخر وہ نظام تباہ و برباد ہو جائے گا۔

تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں۔ جیسی برطانیہ عظمیٰ اور آئرلینڈ اور چیکو سلاویکیہ اور پولینڈ کے اتحادوں کی تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ برصغیر کے مقابلے میں بہت ہی چھوٹے چھوٹے جغرافیائی رقبے جو یکجا رہنے کی صورت میں ایک ملک کہے جاتے اتنی ہی ریاستوں میں تقسیم کر دیئے گئے جتنی ان میں قومیں آباد تھیں۔ جزیرہ نمائے بلقان میں سات یا آٹھ خود مختار ریاستیں ہیں۔ اسی طرح جزیرہ نما آئی بیریا ہے، جو پرتگالیوں اور ہسپانویوں کے درمیان تقسیم ہوا۔ مگر ہندوستان کے اتحاد کے لئے اور ایک قوم کی بنیاد پر، جس کا کوئی وجود نہیں، یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ ایک مرکزی حکومت ہونی چاہیے۔ حالانکہ بارہ سو برس کی تاریخ شاہد ہے کہ یہ اتحاد حاصل نہیں ہو سکا اور ہندوستان ہمیشہ ہندو اور مسلم ہندوستان میں تقسیم رہا۔ ہندوستان کا موجودہ مصنوعی اتحاد صرف اس وقت سے ہے کہ انگریزوں نے اس ملک پر تسلط حاصل کیا اور برطانوی سنگینوں سے یہ قائم ہے۔ لیکن جہاں برطانوی حکومت ختم ہوئی جس کا ملک معظم کی گورنمنٹ کے حالیہ بیان میں کنایۃً ذکر ہے ایسی کامل ٹوٹ پھوٹ ہو گی اور ایسی سخت تباہی کے ساتھ کہ مسلمانوں کے ماتحت گزشتہ ایک ہزار برس میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔ یقیناً یہ وہ بڑا ورثہ ہو گا جو ڈیڑھ سو برس کی حکومت کے بعد اہل برطانیہ ہندوستان کے لئے چھوڑنا پسند نہ کریں گے اور نہ ہندو اور مسلمان اس انتشار کا خطرہ گوارا کرنے کے لئے تیار ہوں گے۔

مسلم ہندوستان کوئی ایسا دستور قبول نہیں کرے گا جو لازماً ہندو اکثریت پر مبنی ہو۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو اگر کسی ایسے جمہوری نظام کے تحت یک جا کیا جائے گا جو اقلیتوں پر مسلط کیا گیا ہو، تو اس کے معنی صرف ہندو راج ہوں گے جس قسم کی جمہوریت کانگرس کی اعلیٰ قیادت چاہتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اسلام میں جو سب سے زیادہ قیمتی (اثاثہ) ہے وہ تباہ ہو جائے گا گزشتہ اڑھائی سال کے اندر ہمیں صوبائی دستوروں کا خوب تجربہ ہو چکا ہے۔ ایسی حکومت کا اگر پھر اعادہ کیا گیا، تو خانہ جنگی ہوگی اور ایسی نجی فوجیں بھرتی کی جائیں گی جن کے لئے مسٹر گاندھی نے سکھر کے ہندوؤں سے کہا ہے کہ اپنی حفاظت کریں، خواہ عدم تشدد سے یا تشدد سے، چوٹ کے

بدلے میں چوٹ اور اگر ان سے یہ نہ ہو سکے تو ان کو چاہیے کہ ترک وطن کریں۔

جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے اور سمجھا جاتا ہے مسلمان اقلیت نہیں ہیں ذرا کوئی آنکھیں کھول کر دیکھے تو اس کو معلوم ہو گا کہ اس نقشے کی رُو سے جو انگریزوں نے بنایا ہے ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے چار میں مسلمانوں کو کم و بیش غلبہ حاصل ہے اور وہ اس کے باوجود حکومتیں چلا رہے ہیں کہ کانگرس کی اعلیٰ ہندو قیادت عدم تعاون اور سول نا مساعدت کے لئے تیاریاں کر رہی ہے۔ قومیت کی ہر تعریف کی رُو سے مسلمان ایک قوم ہیں اور چاہیے کہ ان کے پاس قومی وطن ہو، ان کا اپنا ملک ہو اور اپنی ریاست و دولت ہو۔ ہماری یہ خواہش ہے کہ آزاد اور خود مختار قوم کی حیثیت سے اپنے ہمسایوں کے لئے ساتھ باامن و اتحاد رہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری قوم، اپنے تصورات اور مزاج کے مطابق اور جس طرح ہمارے خیال میں بہتر ہو، رُوحانی، ثقافتی، اقتصادی اور سیاسی زندگی میں ترقی کرے۔ دیانت کا یہ تقاضہ ہے اور ہماری قوم کے کروڑوں آدمیوں نے ہم پر یہ مقدس فرض عاید کر دیا ہے کہ ہم کوئی ایسا باعزت اور پُر امن حل نکالیں جو سب کے حق میں منصفانہ ہو مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم پر دھمکیوں اور تخویف کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا اور جو نصب العین ہم نے متعین کر لیا ہے اور جو مقصد ہمارے سامنے ہے ان کی وجہ سے ہم اس کو ہرگز نہیں چھوڑیں گے۔ جو مطمع نظر ہم نے اپنے سامنے رکھ لیا ہے اس کو حاصل کرنے کے لئے ہم کو چاہیے کہ تمام دشواریوں اور نتائج کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو جائیں اور وہ تمام قربانیاں کرنے کے لئے کمربستہ رہیں جن کی ضرورت ہو۔ (بشکریہ حسن ریاض مرحوم)

قائداعظم نے تمام ابہام دُور کر دیئے:

قائداعظم نے اپنے صدارتی خطبے میں جس انداز سے دو قومی نظریے کی وضاحت اور وکالت کی یہ انہیں کا حصہ ہے۔ ہماری یہ دیانتدارانہ رائے ہے کہ برِعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش میں ہندوؤں کو صرف دو ہی اشخاص نے کماحقہ سمجھا ہے اور وہ ہیں: سرسید احمد خان اور قائداعظم محمد علی جناح۔ قائداعظم نے ۲۲ مارچ کو اپنی صدارتی تقریر میں کوئی ابہام نہیں رہنے دیا انہوں نے صاف الفاظ میں حکومتِ برطانیہ کو بتا دیا

کہ ہندوستان ایک ملک نہیں ہے یہ ایک برعظیم ہے جس کے نقشے میں یورپ کے کئی ملک سما سکتے ہیں۔ اگر جزیرہ نما یونان میں سات آٹھ آزاد مملکتیں قائم ہو سکتی ہیں تو برعظیم میں دو مملکتیں کیوں قائم نہیں ہو سکتیں۔ انہوں نے بارہ سو سالہ تاریخ کے حوالے سے یہ ثابت کیا کہ ہندوستان کبھی بھی ایک اکائی نہیں رہا۔ اس کے علاوہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی چیز بھی مشترک نہیں ہے اس لئے ہندوستان کو دو ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ مسلم ہندوستان کے باشندے اپنی عظیم روایات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ قائداعظم نے مسلم ہندوستان کی اصطلاح استعمال کی ہے انہوں نے "پاکستان" کا نام نہیں لیا۔

۲۲ مارچ کو قائداعظم کا خصوصی پیغام:

اس روز قائداعظم نے صدارتی خطبہ ختم کرنے سے پہلے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

دوستو! میں یہ چاہتا ہوں کہ تم قطعی فیصلہ کر لو اور پھر تدابیر پر غور کرو اپنی تنظیم کو مستحکم کرو۔ پورے ہندوستان میں مسلمانوں کو متحد کرو۔ میرا یہ خیال ہے کہ عام مسلمان بالکل بیدار ہیں وہ صرف تمہاری رہنمائی اور قیادت چاہتے ہیں۔ اسلام کے خادم بن کر آگے بڑھو اور اقتصادی معاشرتی، تعلیمی اور سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کی تنظیم کرو۔ مجھے یقین ہے کہ تم وہ طاقت ہو گے جس کو ہر شخص تسلیم کرے گا۔

قرار دادِ لاہور کی تیاری:

قائداعظم کی اس ولولہ انگیز تقریر نے قوم کو ایک نیا عزم دیا۔ اسی رات مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا خصوصی اجلاس منعقد ہوا جس میں قرار داد لاہور پر غور و خوض ہوا۔ اگلے روز یہ قرار داد سبجکٹس کمیٹی کے روبرو پیش ہوئی۔ وہاں اس پر بڑی بحث ہوئی اور خاص طور پر ہندو اکثریت کے صوبوں میں بسنے والے مسلمانوں کی مشکلات اور ان کے مستقبل پر غور و خوض ہوا۔ سبجکٹس کمیٹی کے اراکین قیامِ پاکستان کے بعد ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کے بارے میں بڑے متفکر تھے اور اس وقت ان کے ذہن میں یہ بات تھی کہ ہندو اپنے علاقے میں مسلمانوں کو جس قدر

مراعات دیں گے مسلمان اپنی مملکت میں ویسی ہی مراعات ہندوؤں اور دوسری اقلیتوں کو دیں گے۔

اس موقع پر ہندو اکثریت کے صوبوں میں بسنے والے مسلمانوں کے نمائندوں نے یہ کہا کہ ان کی فکر نہ کریں۔ مسلمانوں کے لئے آزاد مملکت کے حصول کی خاطر اگر انہیں مزید قربانیاں بھی دینا پڑیں تو وہ اس سے گریز نہیں کریں گے۔ وہ تو پہلے ہی ہندوؤں میں رہ کر مصائب برداشت کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔

(راقم الحروف کو بھارت کے نامور عالم دین پروفیسر مولانا سعید احمد اکبرآبادی سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ، استاد سینٹ سٹیفنس کالج دہلی، ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور ڈائریکٹر شیخ الہند اکیڈمی دیوبند (م ۱۹۸۵ء) نے بتایا کہ ان کی تمام زندگی ہندو اکثریت کے صوبے یوپی میں گزری اور کلکتے میں انہوں نے جو دس سال بطور پرنسپل کام کیا وہ آزادی کے بعد ہندوؤں کی وزارت کے زمانے میں کیا۔ اس لئے وہ بچپن ہی سے ہندوؤں کی ناانصافیوں اور چیرہ دستیوں کے عادی ہو چکے تھے لہٰذا قیام پاکستان کے بعد انہوں نے ہجرت کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ جانتے تھے کہ ہندو مسلمانوں کے ساتھ ہمیشہ سے ناروا سلوک کرتے چلے آئے ہیں۔ آزادی کے بعد اس میں قدرے اضافہ ہو جائے گا اور بس)۔

قرار داد لاہور کا متن:

سبجکٹس کمیٹی نے بڑی بحث و تمحیص کے بعد عام اجلاس میں پیش کرنے کے لئے ایک قرار داد تیار کی اور اسی رات یعنی ۲۳ مارچ کے اجلاس میں قائداعظم کی صدارت میں شیرِ بنگال مولوی ابو القاسم فضل الحق (م ۱۹۶۲ء) نے وہ تاریخی قرار داد پیش کی۔ انہوں نے کہا:

"قرار پایا کہ غور و خوض کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی یہ رائے ہے کہ کوئی آئینی منصوبہ بغیر اس کے اس ملک میں قابل عمل اور مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہیں ہوگا کہ وہ مندرجہ ذیل بنیادی اصولوں پر مبنی ہو۔ یعنی یہ کہ حد بندی کر کے اور ملکی تقسیم کے اعتبار سے حسب ضرورت رد و بدل کر کے متصل واحدوں

کو ایسے منطقے بنا دیا جائے کہ وہ علاقے جن میں مسلمان بہ اعتبار تعداد اکثریت میں ہیں جیسے ہندوستان کے شمال و مغربی اور مشرقی منطقوں میں، اس طرح یکجا ہو جائیں کہ وہ ایسی خود مختار ریاستیں بنیں جن کے واحدے اندرونی طور پر بااختیار اور خود مختار ہوں:

یہ کہ ان واحدوں میں اور ان علاقوں میں اقلیتوں کے لئے ان کے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی، انتظامی اور دوسرے حقوق و مفاد کے تحفظ کے لئے ان کے مشورے سے بقدرِ ضرورت موثر اور واجب التعمیل تحفظات ان کے اور دوسری اقلیتوں کے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی، انتظامی اور دوسرے حقوق و مفاد کی حفاظت کے لئے ان کے مشورے سے معین طور پر دستور کے اندر رکھے جائیں۔

یہ اجلاس ورکنگ کمیٹی کو یہ مزید اختیار دیتا ہے کہ ان بنیادی اصولوں کے مطابق دستور کی ایسی ایک سکیم مرتب کرے، جس میں اس کا انتظام ہو کہ بالآخر یہ جداگانہ علاقے ایسے تمام اختیارات لے سکیں، جیسے دفاع، امور خارجیہ، رسل و رسائل کروڑ گیری (کسٹمز) اور دوسرے امور جو ضروری ہوں (قرار دادِ لاہور کا یہ متن اقبال پارک میں مینار پاکستان پر کندہ ہے)۔

قرار دادِ لاہور کی تائید:

شیرِ بنگال مولوی ابو القاسم فضل الحق کی پیش کردہ قرار داد کی تائید یو پی اسمبلی کے رکن چوہدری خلیق الزمان (م ۱۹۷۳ء) نے کی۔ ان کے بعد یو پی کی نمائندگی کرتے ہوئے بیگم مولانا محمد علی، مولانا عبدالحامد بدایونی (م ۱۹۷۰ء) اور سید ذاکر علی نے قرار داد کی تائید کی۔ پنجاب کی نمائندگی مولانا ظفر علی خان (م ۱۹۵۶ء) اور ڈاکٹر محمد عالم نے کی۔ مسلمانانِ بمبئی کی نمائندگی کا حق اسمٰعیل ابراہیم چندریگر (م ۱۹۶۰ء) نے ادا کیا اور صوبہ سرحد کی نمائندگی کا شرف سردار اورنگ زیب خان کو حاصل ہوا۔ خان بہادر نواب محمد اسمٰعیل خان نے مسلمانانِ بہار کی جانب سے قرار داد کی تائید کی اور سی پی کی نمائندگی سید عبدالرؤف شاہ کی۔ قاضی محمد عیسیٰ (م ۱۹۷۶ء) نے بلوچستان کے مسلمانوں کی طرف سے قرار داد کے حق میں تقریر کی۔ سندھ کے مسلمانوں کی طرف سے سر عبداللہ ہارون (م ۱۹۴۲ء) نے قرار داد کی تائید کی۔ اس طرح قریب قریب برِعظیم کے تمام

صوبوں کے نمائندوں نے قرار داد کے حق میں تقریریں کیں اور اس دن کے بعد برِعظیم کے مسلمان حصولِ پاکستان کے لئے میدان عمل میں نکل آئے۔

ایک ریاست کا تصوّر:

قرار دادِ لاہور میں برِعظیم کے شمال مغرب اور مشرق میں مسلمانوں کی دو آزاد ریاستوں کا ذکر کیا گیا تھا۔ یہ قرارداد ورکنگ کمیٹی اور سبجکٹس کمیٹی میں بڑی عجلت کے ساتھ پاس ہوئی تھی۔ اس لئے اس وقت اور اس کے بعد بھی کسی نے دو ریاستوں کے تصوّر پر غور نہیں کیا۔ ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے حسین شہید سہروردی (م ۱۹۶۳ء) کی تحریک پر دو ریاستوں کی بجائے ایک ریاست کا تصوّر پیش کیا۔ اس لئے جب ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان دنیا کے نقشے پر ایک آزاد ملک کی حیثیت سے اُبھرا تو مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے نام سے اس کے دو حصے دکھائے گئے تھے جو ۱۹۵۵ء میں وَن یونٹ بن گئے۔

ہندوؤں کا ردِّ عمل:

اس زمانے میں برطانیہ یورپ کے مختلف محاذوں پر جرمنی کے خلاف نبرد آزما تھا۔ اس لئے برطانوی پریس کی تمام تر توجہ جنگ کی خبریں چھاپنے پر لگی ہوئی تھی اور یورپ کے کئی شاہی خانوادے اپنے ملک جرمنی کے سپرد کر کے انگلستان میں پناہ گزیں تھے۔ ان حالات میں برطانوی پریس نے قرار دادِ لاہور کو اہمیت نہ دی۔

انگریزوں کے برخلاف ہندو صحافیوں نے قرار داد لاہور کے خلاف ایک محاذ کھول دیا۔ بیگم مولانا محمد علی نے قرارداد لاہور کو "قراردادِ پاکستان" کہا تھا اس لئے ہندوؤں نے یہی اصطلاح استعمال کرنا شروع کر دی۔

لاہور کے ہندو اخبارات میں سے ملاپ اور پرتاپ تو مسلمانوں اور پاکستان کے خلاف اُدھار کھائے بیٹھے تھے۔ انگریزی رُوز نامہ ٹریبون بھی ہندوؤں کی نمائندگی کرتا تھا۔ ان کے علاوہ امرت بازار پتریکا، ہندوستان ٹائمز اور سٹیٹسمین جیسے اخباروں نے ایک طوفان بپا کر دیا۔ مسلمانوں کی طرف سے رُوز نامہ زمیندار اور رُوزنامہ احسان مدافعت کا حق ادا کر رہے تھے۔

ہندوؤں کا یہ کہنا تھا کہ ہندوستان ایک جغرافیائی وحدت ہے لہٰذا وہ ناقابلِ تقسیم ہے۔ ثانیاً ہندوستان میں آباد مسلمانوں میں اکثریت ایسے مسلمانوں کی ہے جن کے آباؤ اجداد ہندو تھے۔ اس لئے مذہب تبدیل کرنے سے قومیت نہیں بدل جاتی۔ اس طرح تمام ہندوستانی بلاتفریق مذہب ایک قوم ہیں۔ ثالثاً پاکستان کے معاشی وسائل اتنے نہیں ہوں گے کہ وہ اپنی کفالت کر سکے۔ ہندوؤں کا یہ بھی کہنا تھا کہ پنجاب کے علاوہ سندھ، سرحد اور بلوچستان خسارے کے صوبے ہیں۔ اس لئے اگر پاکستان قائم بھی ہو گیا تو وہ اقتصادی طور پر بہت جلد ختم ہو کر دوبارہ ہندوستان میں مدغم ہو جائے گا۔

گاندھی جی نے تقسیم ہند کی قرار داد پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ بھارت ماتا کو ایک وحدت سمجھتے ہیں۔ بھارت کے ٹکڑے کرنا گئو ماتا کے ٹکڑے کرنے کے مترادف ہو گا۔ مدراس کے سابق وزیر اعلیٰ اور کانگرس کے رہنما راج گوپال اچاریہ نے کہا کہ ہندوستان کی تقسیم کی مثال ایسے ہے جیسے دو بھائیوں میں گائے کی ملکیت پر جھگڑا ہو جائے اور وہ گائے کے ٹکڑے کر کے آپس میں بانٹ لیں۔ ابوالکلام آزاد نے حسبِ معمول ہندوانہ ذہنیت سے سوچنے کے بعد کسی مہا سبھائی سے زبان مستعار لے کر یہ بیان جاری کیا:

"مجھے اس کا اعتراف ہے کہ پاکستان کا نام ہی میرے حلق سے نیچے نہیں اترتا۔ اس سے یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ دنیا کے کچھ حصے پاک اور کچھ ناپاک ہیں۔ پاک اور ناپاک علاقوں کی تقسیم سراسر غیر اسلامی ہے بلکہ اسلام سے انحراف ہے۔ اسلام ایسی کسی تقسیم کو تسلیم نہیں کرتا"۔

کاش اس وقت کوئی مسلمان طالب علم بزعمِ خویش اسلامی علوم کے اس "سب سے بڑے اسکالر" کو یہ بتاتا کہ دارالاسلام اور دارالحرب کی اصطلاحات ہم نے نہیں گھڑیں۔ یہ پاک اور ناپاک زمین کی تقسیم ہے جو ہمارے آئمہ کرام نے کی تھی اور فقہ میں ان کے مسائل الگ الگ ہیں۔

ایک کانگرسی لیڈر نے قرار دادِ لاہور پر تبصرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ آج مسلمان الگ وطن کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ کل ہندوستان بھر کے ہیجڑے اپنے لئے

الگ وطن "ہیجڑستان" کا مطالبہ کریں گے۔

جب کانگرس کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ مسلمان پاکستان ضرور حاصل کر لیں گے اور انہوں نے اس کے حصول کی خاطر تن من اور دھن کی بازی لگا دی ہے تو انہوں نے سرحدی گاندھی عبدالغفار خاں سے کہا کہ وہ پختونستان کا شوشہ چھوڑے اور انگریزوں سے مطالبہ کرے کہ صوبہ سرحد اور ضلع میانوالی کی تحصیل عیسیٰ خیل میں پٹھانوں کی اکثریت ہے۔ لہٰذا اس علاقے کو پاکستان میں شامل کرنے کی بجائے پختونستان کے نام سے آزاد مملکت بنا دے۔ قصہ کوتاہ قرار دادِ لاہور پاس ہونے کے بعد مجلس احرارِ اسلام، جمعیت العلماء ہند، سرخپوش، قوم پرست مسلمان، یونینسٹ پارٹی، اکالی دل، شیعہ پولیٹیکل کانفرنس اور جولاہوں کی نمائندہ جماعت "مومن کانفرنس" بقول ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، کانگرس کی جانب جھک گئیں اور کانگرس نے بھی ان کے ساتھ "ہمدردانہ رویہ اختیار کیا"۔

ہندو سرمایہ داروں اور صنعت کاروں میں سے سیٹھ گھنشام داس برلا، رام کرشن ڈالمیا اور گوبر مل مودی جیسے کروڑ پتیوں نے قیامِ پاکستان کو روکنے کے لئے اپنی تجوریوں کے منہ کھول دیئے۔ مسلم لیگ کی مخالف جماعتوں کو بڑی بڑی رقمیں ملنے لگیں اور کانگرس کے ہمنوا مولویوں نے قائد اعظم اور مسلم لیگ کے خلاف فتووں کے انبار لگا دیئے۔ ایسے ہی فتوے باز کانگرسی مولویوں کے لئے "گاندھی کی پالیسی کا عربی ترجمہ" کی اصطلاح وضع کی گئی۔ جناب شمس الحسن (م ۱۹۸۱ء) کی تصنیف دلپذیر "پلین مسٹر جناح" (Plain Mr. Jinnah) میں "غلام مردود" اور "مولانا ولدالزنا" جیسی رکیک قسم کی اصطلاحات ملتی ہیں جو اس زمانے میں صحافیوں نے اپنائی تھیں۔

باب (30)

دوسری عالمی جنگ کا آغاز
اور
برِ عظیم کی سیاست

یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر کے دوسری عالمی جنگ کا آغاز کیا ۔ ۳ ستمبر کو برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ۔ اُسی روز وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو نے بھی جرمنی کے خلاف جنگ میں شریک ہونے کا اعلان کر دیا ۔ اس اعلان کے ساتھ ہی برِعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کی سیاست میں نمایاں تبدیلی آ گئی اور وائسرائے نے کانگرس ، مسلم لیگ اور دوسری سیاسی جماعتوں سے دورانِ جنگ تعاون کی اپیل کی ۔

برِعظیم کی امداد اور تعاون کے بغیر انگریزوں کے لئے جرمنی اور اس کے حلیفوں کا مقابلہ کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا ۔ برِعظیم میں بسنے والی اقوام میں سے پنجابی مسلمان ، جاٹ اور مرہٹوں کے علاوہ نیپال کے گورکھے جنگ میں لڑنے کے بڑے ماہر تھے اور یہ پہلی عالمی جنگ میں مختلف محاذوں پر اپنی بہادری کا لوہا منوا چکے تھے ۔ اس ملک سے برطانیہ سولہ سترہ روپے ماہانہ مشاہرہ پر فوجی بھرتی کر سکتا تھا اور یہاں انفرادی قوت کی کمی نہ تھی ۔ ثانیاً ، جنگ کے زمانے میں برِعظیم سامان خور و نوش وافر مقدار میں فراہم کر سکتا تھا ۔ اس لئے وائسرائے نے برِعظیم کے باشندوں اور سیاسی رہنماؤں سے تعاون کی اپیل کی ۔

گاندھی ۔ وائسرائے ملاقات

وائسرائے نے ۵ ستمبر کو گاندھی جی اور قائداعظم سے الگ الگ ملاقات کی اور زمانۂ جنگ میں ان سے حکومت کے ساتھ تعاون کی اپیل کی ۔ گاندھی جی نے وائسرائے کے ساتھ ملاقات میں حسبِ معمول اس بات پر زور دیا کہ وہ تو کانگرس کے بنیادی رکن بھی نہیں ہیں ۔ اس لئے وہ کانگرس کے نمائندے کی حیثیت سے نہیں بلکہ انفرادی طور پر ان کے ساتھ ملاقات کے لئے آئے ہیں ۔ اس لئے ان کے اور وائسرائے کے مابین ہونے والی بات چیت کی کانگرس پابند نہیں ہے ۔ اس موقع پر گاندھی جی نے اپنی " مہاتمائیت " کا مظاہرہ کرتے ہوئے وائسرائے کو عدمِ تشدد اور اہنسا کا اصول اپنانے اور جرمنی کا مقابلہ ہتھیاروں کی بجائے اخلاق و محبت کے اصول اپنا کر کرنے کا مشورہ دیا ۔ ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں کہ وائسرائے ان کی باتیں سُن کر بھونچکا رہ گیا اور اس نے ملاقات کے اختتام پر گاندھی جی کو کوئی پروٹوکول نہ دیا اور انہیں یونہی چلتا کیا ۔ آزاد صاحب نے وائسرائے سے یہ گلہ کیا ہے کہ اس نے گاندھی جی کو ڈھنگ سے رخصت نہیں کیا ۔ وہ یہ بات بھول گئے کہ گاندھی جی کانگرس کے نمائندے کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک عام آدمی کی حیثیت سے وائسرائے سے ملنے آئے تھے ۔ اندرِ خانہ وہ کانگرس کے آمرِ مطلق تھے اور بیرونِ خانہ یہ ڈھنڈورا پیٹتے تھے کہ کانگرس ان کی رائے کی پابند نہیں ہے کیونکہ وہ تو کانگرس کے باقاعدہ رکن بھی نہیں ہیں ۔ یہی وہ معمّہ ہے جو بقول میم کمال او کے اب تک حل نہیں ہو سکا ۔

قائداعظم ۔ وائسرائے ملاقات:

قائداعظم نے بڑے خوشگوار ماحول میں وائسرائے سے ملاقات کی اور چلتے وقت اس سے کہا کہ وہ تو قواعد و ضوابط کے سختی کے ساتھ پابند ہیں ۔ اس لئے وہ ذاتی طور پر اس کے ساتھ کوئی وعدہ نہیں کرتے ۔ وہ ضابطے کے مطابق مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس طلب کر کے کمیٹی کے ساتھ صلاح و مشورہ کر کے جواب دیں گے ۔ مسلم لیگ اس سے خوش تھی کہ وائسرائے نے قائداعظم کو گاندھی جی کا ہم پلہ قرار دے کر ملاقات کے لئے طلب کیا ہے ۔

وائسرائے نے دیسی ریاستوں کے حکمرانوں کے نمائندوں کے ساتھ بھی

ملاقات کی ۔ انہوں نے وائسرائے کو مکمل تعاون کا یقین دلایا ۔

کانگرس اور مسلم لیگ کے اختلافات بڑھے:

اکتوبر ۱۹۳۹ء کے اواخر تک کانگرس کی صوبائی وزارتیں مستعفی ہو گئیں۔ انہوں نے استعفے دافعے کی یہ وجہ بتائی کہ وائسرائے نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کرتے وقت ان کے ساتھ مشورہ کیوں نہیں کیا ۔ اس کے علاوہ حکومت کے ساتھ عدم تعاون کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ گاندھی جی اور ان کے رفقا، اس خوش فہمی کا شکار تھے کہ اس جنگ میں انگریز اور ان کے حلیفوں کو ناکامی سے دوچار ہونا پڑے گا اور فتح جرمنی کی ہو گی ۔ اس خوش فہمی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جرمنی کو بڑی برق رفتاری کے ساتھ فتوحات ہو رہی تھیں ۔ پولینڈ جیسا ملک جرمنی کا ایک ہفتے تک مقابلہ نہ کر سکا ۔ ہالینڈ اور بلجیم چند دن بھی مقابلہ نہ کر سکے ۔ فرانس جیسی استبدادی قوت جو افریقہ کے بیشتر ممالک پر قبضہ جمائے ہوئے تھی ۔ سرنگوں ہو گئی ۔ فرانس کا دارالحکومت پیرس جرمنوں نے بلاکشت و خون فتح کر لیا اور فرانس نے لندن میں جلا وطن حکومت کا دفتر کھول لیا ۔ لندن خود جرمنی کے میزائلوں کی زد میں تھا ۔ ان حالات میں گاندھی جی اور ان کے رفقا، کا خوش فہمی میں مبتلا ہونا ہماری سمجھ میں آتا ہے ۔

دوسری جانب مسلم لیگ نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو قرارداد لاہور منظور کرکے تقسیم ہند کا مطالبہ کر دیا تھا ۔ کانگرسی نیتا (لیڈر) اس مطالبے کو مقدس گائے کے ٹکڑے کرنے کے مترادف سمجھتے تھے اور وہ تقسیم ہند اور قیام پاکستان کو ہر قیمت پر روکنا چاہتے تھے ۔ اس لئے وہ اس کوشش میں تھے کہ انگریز جیسے کیسے بھی ہو برعظیم کو فوراً خالی کرکے چلے جائیں تاکہ کانگرس اس پر قابض ہو کر ممکنہ تقسیم ہند کو روک لے۔ انہی ایام میں گاندھی جی نے اپنے اخبار "ہریجن" میں قائداعظم اور مسلم لیگ کو کوسنے دینے شروع کئے اور ہر روز ایک نیا الزام تراشنا شروع کر دیا ۔ قائداعظم گاندھی جی کے الزامات کا جواب دے کر رائے عامہ کو مطمئن کرتے اس طرح کی بیان بازی بڑی مدت تک جاری رہی ۔

وائسرائے کی پیشکش:

۸ اگست ۱۹۴۰ء کو وائسرائے ہند نے طویل سکوت توڑا اور سیاسی جماعتوں سے حکومت کے ساتھ تعاون اور مصالحت کے لئے چند شرائط پیش کیں ۔ حکومت نے ایک قرطاس ابیض شائع کیا جس میں کانگرسی وزارتوں کے مستعفی ہونے پر روشنی ڈالی ۔ وزیر امور ہند نے یہی قرطاس ابیض برطانوی پارلیمنٹ میں پیش کرکے برعظیم کے صوبوں میں گورنر راج قائم کرنے کی منظوری حاصل کر لی ۔

دوسری جانب وائسرائے نے اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ حکومت اور سیاسی جماعتوں کے درمیان اختلافات موجود ہیں ۔ انہیں باہمی افہام و تفہیم سے دور کیا جا سکتا ہے ۔

وائسرائے نے اس موقع پر یہ پیش کش کی کہ وہ اپنی ایگزیکٹو کونسل میں توسیع کرے گا اور جنگی حکمت عملی وضع کرنے میں عوام کا اشتراک چاہے گا ۔ اس نے اس موقع پر ایک مشاورتی کونسل تشکیل دینے کا بھی اعلان کیا ۔ وائسرائے نے عوام کے شک و شبہات دور کرنے کی غرض سے اس موقع پر دو نکتوں کی وضاحت ضروری سمجھی ۔ اس نے یہ کہا:

۱۔ آیندہ کوئی بھی منصوبہ تیار کرتے وقت اقلیتوں کی رائے کو وزن دیا جائے گا (وائسرائے کے اس اعلان سے کانگرس کی بائی کمان بوکھلا گئی ۔ کیونکہ وہ خود کو پورے ملک کی نمائندہ جماعت سمجھتے ہوئے کسی دوسری جماعت یا فرقے کو درخور اعتنا نہ سمجھتی تھی) ۔

۲۔ دستور ساز اسمبلی قائم کی جائے گی جو ایک نمائندہ اسمبلی ہو گی اور یہ اسمبلی نیا آئین تیار کرے گی ۔

وائسرائے نے اسمبلی کے قیام کے لئے دو شرطیں لگا دیں:

(الف) ۔ اسمبلی جنگ کے خاتمے پر قائم ہو گی ۔

(ب) ۔ یہ اسمبلی حکومت کی ذمہ داریاں اور عوام سے کئے گئے وعدے کماحقہ پورے کرے گی ۔

وائسرائے نے اس موقع پر یہ بھی کہا کہ زمانہ جنگ میں تمام سیاسی جماعتیں حکومت کیساتھ تعاون کریں اور جنگی تیاری میں مدد دیں ۔ علاوہ ازیں تمام

سیاسی جماعتیں برعظیم کو برطانوی دولتِ مشترکہ میں مساویانہ درجہ حاصل کرنے کے لئے راہ ہموار کریں۔

وائسرائے کے اعلان کی اہمیت:

یہ پہلا موقع تھا کہ برعظیم کے عوام کے ساتھ دستور ساز اسمبلی کے قیام کا وعدہ کیا گیا۔ کانگرس مدت سے ایسی اسمبلی کے قیام کی خواہش مند تھی، لیکن جیسی اسمبلی کا قیام وہ چاہتی تھی وائسرائے کا اعلان اس کی توقعات پوری نہ کر سکا۔ کانگرس یہ چاہتی تھی کہ یہ اسمبلی اس کی مرضی کے مطابق مخلوط انتخابات کی بنا پر قائم ہو اور اس میں دیسی ریاستوں اور اقلیتوں کو نمائندگی نہ دی جائے۔ وائسرائے کے اس اعلان سے کہ آئندہ کوئی منصوبہ اقلیتوں کی رضامندی اور منظوری کے بغیر تیار نہیں کیا جائے گا، اس سے جہاں اقلیتوں کے حقوق محفوظ ہو گئے اور انہیں تحفظات مل گئے وہاں کانگرس کی امیدوں پر اوس پڑ گئی کہ وہ بلا شرکتِ غیرے برعظیم پر حکومت نہیں کر سکے گی۔

اقلیتوں نے اس اعلان کو اپنے لئے نیک فال سمجھا کیونکہ اس اعلان سے کانگرس کی آمریت ختم ہو گئی اور لوگوں کا یہ خدشہ بھی دُور ہو گیا کہ موجودہ نازک حالات میں حکومت کانگرس کے آگے نہیں جھکی۔ مسلم لیگ اس حد تک تو مطمئن تھی کہ قراردادِ لاہور کی منظوری کے بغیر کوئی منصوبہ تیار نہ کرنے کا اعلان کر دیا ہے، لیکن مجموعی طور پر اس اعلان سے خوش نہ تھی کیونکہ اس میں بہت سے ابہام تھے۔ مثلاً وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں جتنے ارکان کا اضافہ کیا جائے گا، اس میں کتنے مسلم ارکان ہوں گے، اسی طرح جنگی مشاورتی کونسل میں مسلمانوں کی تعداد کتنی ہو گی۔

۱۷ اور ۱۸ ستمبر کو مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں پولینڈ، انگلینڈ اور فرانس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا گیا۔ اس اجلاس میں حکومت سے یہ اپیل کی گئی کہ جن صوبوں میں کانگرسیوں نے مسلمانوں کے ساتھ ناانصافیاں کی ہیں وائسرائے وہاں کے گورنروں کو ہدایت کرے کہ مسلمانوں کے معاملے میں اپنے خصوصی اختیارات استعمال کریں۔ اس کے ساتھ ہی برطانوی حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ مسلم لیگ کو یقین دلائے کہ اس کی رضامندی کے بغیر برعظیم کی آئینی ترقی کے

لئے نہ ہی کوئی اعلان کیا جائے گا اور نہ ہی کوئی دستور وضع کیا جائے گا۔

قائداعظم کی وائسرائے سے ملاقات:

قائداعظم نے ۱۲ اور پھر ۱۳ اگست ۱۹۴۰ء کو وائسرائے سے ملاقات کی، جس میں بہت سے امور زیرِ بحث آئے۔ یکم اور دو ستمبر کو بمبئی میں مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں اس ملاقات میں زیرِ بحث آنے والے امور پر غور و خوض ہوا۔ ورکنگ کمیٹی نے اس پر اطمینان کا اظہار کیا کہ وائسرائے نے مسلمانوں کو اس کی ضمانت دی ہے کہ آئندہ ان کی مرضی اور رضامندی کے بغیر کوئی دستور نافذ نہیں کیا جائے گا۔

مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے قراردادِ لاہور کے موقف پر اصرار کیا اور یہ اعلان کیا کہ مسلمان ایک قوم ہیں (یعنی اقلیت نہیں ہیں) اور وہ اپنا حقِ خود ارادیت استعمال کریں گے۔ تاہم مسلم لیگ نے درج ذیل وجوہات کی بنا پر وائسرائے کے اعلان کو غیر تسلی بخش قرار دیا۔

۱۔ وائسرائے نے مسلم لیگ سے مشورہ نہیں کیا کہ اس کی کونسل میں کتنے ارکان کا اضافہ ہو گا۔

۲۔ وائسرائے نے یہ نہیں بتایا کہ کونسل کی تشکیلِ نو کس طرح کی جائے گی۔

۳۔ مسلم لیگ کو اس کا علم نہیں کہ اسے کن کن جماعتوں کے ساتھ کام کرنا ہو گا۔

۴۔ مسلم لیگ اس سے لاعلم ہے کہ کون سے شعبے اضافی ارکان کو سونپے جائیں گے۔

۵۔ جنگی مشاورتی کونسل کے بارے میں وائسرائے کی تجاویز غیر واضح ہیں اور ان میں ابہام پایا جاتا ہے۔

۲۴ ستمبر کو قائداعظم اور وائسرائے کے درمیان ایک اور ملاقات ہوئی جس میں قائداعظم نے وائسرائے سے بعض امور کے بارے میں وضاحت چاہی۔ اگلے روز وائسرائے نے وضاحتی جواب تحریری طور پر قائداعظم کو بھجوایا۔ ۲۸ ستمبر کو مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی

کا اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں باہمی صلاح و مشورے کے بعد وائسرائے کی پیشکش مسترد کر دی گئی۔ کیونکہ اس نے اپنی کونسل میں مسلم لیگ کے دو نمائندے لینے کی یقین دہانی کرائی تھی۔ ورکنگ کمیٹی کے خیال میں مسلمانوں کی آبادی کے تناسب سے یہ تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس موقع پر ورکنگ کمیٹی نے یہ اعلان کیا کہ حکومت عوامی خواہش کے مطابق گورنری راج والے صوبوں میں غیر سرکاری مشیر مقرر کرنے پر رضامند نہیں ہے۔ اس لئے حکومت کے ساتھ تعاون ممکن نہیں ہے۔

تاہم نقادوں کا یہ کہنا ہے کہ مسلم لیگ نے نہ ہی کھلے الفاظ میں وائسرائے کی تجاویز رد کیں اور نہ ہی ان کو من و عن تسلیم کیا۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اصولاً تجاویز پر مسلم لیگ نے صاد کر دیا، لیکن انہیں غیر تسلی بخش قرار دیا۔

کانگرس کا ردعمل:

کانگرس نے وائسرائے کی پیشکشوں پر برہمی کا اظہار کیا۔ کانگرس کے صدر ابوالکلام آزاد نے ۸ اگست کو وائسرائے سے ملنے سے انکار کر دیا۔ آزاد نے اس کی یہ وجہ بتائی کہ کانگرس کی پالیسی اور وائسرائے کی تجاویز آپس میں متصادم ہیں اور برطانیہ اس نازک وقت میں بزور شمشیر برعظیم پر قبضہ برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ نیز وائسرائے کی پیشکش سے اختلافات بڑھنے کا احتمال ہے، کیونکہ اس نے اقلیتوں کے تحفظ کی جو بات کی ہے وہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن جائے گی۔ (سبحان اللہ! کیا منطق ہے!) آخر میں آزاد نے اپنے رفقاء کی شہ پر وائسرائے کو یہ دھمکی دی کہ اگر اس نے کانگرس کی بات نہ مانی تو پھر وہ سخت ترین قدم اٹھانے پر مجبور ہو جائے گا۔

وائسرائے کو اس بات کا بڑا رنج ہوا کہ مسلم لیگ اور کانگرس نے اس کی پیشکش کو مسترد کر دیا ہے۔ اس کے باوجود اس نے اپنی تجاویز واپس نہ لیں اور یہ کہا کہ جب سیاسی جماعتیں رضامند ہو جائیں ان تجاویز کو عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔ تاہم وقتی طور پر وہ ایگزیکٹو کونسل اور جنگی مشاورتی کونسل کا قیام ملتوی کر رہا ہے۔ اس طرح وائسرائے کی پیش کش کا کوئی عملی نتیجہ نہ نکلا۔

اس کے باوجود مسلم لیگ نے اسے اپنی فتح سے تعبیر کیا کیونکہ برطانیہ

نے یہ اعلان کیا تھا کہ آئندہ دستور مسلمانوں کی مرضی اور رضامندی کے بغیر نافذ نہیں کیا جائے گا۔ قرارداد لاہور کی منظوری کے صرف پانچ ماہ بعد اتنی کامیابی حیرت انگیز تھی۔

پنڈت نہرو اور راجندر پرشاد کی وائسرائے سے ملاقات:

۲ اکتوبر ۱۹۴۰ء کو وائسرائے کی دعوت پر گاندھی جی نے پنڈت جواہر لعل نہرو اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کو وائسرائے کے ساتھ ملاقات کے لئے بھیجا۔ انہوں نے اس سے کہا کہ وہ کانگرس کا تعاون حاصل کرنے کے لئے اعلان کرے اور اس میں کسی بھی قسم کا ابہام نہ ہو۔ انہوں نے وائسرائے سے یہ بھی مطالبہ کیا کہ وہ فوری طور پر مرکزی حکومت میں کانگرس کو اس کا حصہ دے۔

اقلیتی فرقوں اور کانگرس کی مخالف جماعتوں کا احتجاج:

پنڈت جواہر لعل نہرو اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کی وائسرائے کے ساتھ ملاقات کے اگلے روز ۳ اکتوبر ۱۹۴۰ کو لبرل پارٹی کے سربراہ سر چمن لال سیتل وادی اچھوتوں کے رہنما ڈاکٹر بھیم راؤ رامجی امبیدکر، ہندو مہاسبھا کے صدر ونائک دمودر ساورکر اور پارسی لیڈر کاؤس جی جہانگیر نے ایک مشترکہ مراسلے میں وائسرائے سے احتجاج کیا کہ کانگرس برعظیم کے عوام کی واحد نمائندہ جماعت نہیں ہے۔ اس لئے اگر اس نے گاندھی کے مشورے پر عمل کیا تو اس سے بڑا نقصان ہو گا اور یہ مشورہ اسے گمراہ بھی کر سکتا ہے۔

کانگرس کے صدر ابوالکلام آزاد نے وائسرائے کی پیشکش مسترد کرتے ہوئے سخت ترین قدم اٹھانے کی دھمکی دی تھی۔ جب پنڈت جواہر لعل نہرو اور ڈاکٹر راجندر پرشاد وائسرائے کو اس بات پر آمادہ نہ کر سکے کہ وہ کانگرس کو مرکزی حکومت میں حصہ دار بنائے، تو کانگرس کی ہائی کمان کو بڑی مایوسی ہوئی۔ وہ ان نازک حالات میں برطانوی حکومت کو بلیک میل کرنا چاہتی تھی۔ اس کے علاوہ اسے یہ بھی اُمید تھی کہ انگریز بہت جلد جرمنی کے ہاتھوں پٹ جائیں گے۔

کانگرس کی سول نافرمانی:

۱۳ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو گاندھی جی نے کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے سامنے اپنا منصوبہ پیش کیا۔ بظاہر وہ کانگرس کے بنیادی رکن بھی نہ تھے۔ ورکنگ کمیٹی نے گاندھی جی کا منصوبہ منظور کرکے انہیں یہ اختیار دے دیا کہ وہ اپنی مرضی سے افراد منتخب کرکے ستیہ گرہ شروع کر دیں۔

گاندھی جی نے پہلے "انفرادی ستیہ گرہ" شروع کی اور بھوَدان تحریک کے سربراہ ونوبا بھاوے کو سب سے پہلے گرفتاری دینے کا حکم دیا۔ وہ ایک مخلص گاندھی بھگت تھا اور اس نے گاندھی جیسا ہی حلیہ بنا رکھا تھا۔ ان دونوں کے بارے میں کسی نے کیا خوب کہا ہے:

گاندھی از گجرات بھاوے از دکن
ننگے پاؤں، ننگے سر، ننگے بدن

گاندھی جی کے حکم پر سب سے پہلے ونوبا بھاوے نے اپنی گرفتاری پیش کی اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ ۱۷ اکتوبر کو گاندھی جی نے جنگ کے خلاف زبردست تقرر کی جس میں اپنے خود ساختہ فلسفہ عدم تشدد اور اہنسا کا پرچار کیا۔ انہوں نے جو بات وائسرائے سے کہی تھی وہی یہاں بھی دہرائی اور انگریزوں سے اپیل کی کہ وہ جرمنی کے ہتھیاروں کا مقابلہ عدم تشدد اور اہنسا کے اصولوں پر عمل کے ذریعے کریں۔

جب انہوں نے یہ دیکھا کہ انفرادی ستیہ گرہ کا حربہ کامیاب نہیں ہوا تو انہوں نے "نمائندہ ستیہ گرہ" کی بنا ڈالی۔ کانگرس کا کوئی رکن رضاکاروں کی ایک ٹولی کے ہمراہ بازاروں میں حکومت کے خلاف نعرے لگاتے ہوئے گرفتار ہو جاتے۔ ۱۹۴۰ء کے اختتام تک پانچ سو سے زائد افراد جیلوں میں پہنچ گئے۔ ان میں کانگرس کے چند بڑے رہنما بھی تھے۔ گاندھی جی کا یہ خیال تھا کہ جب انفرادی یا نمائندہ ستیہ گرہ شروع ہوگی تو یہ عوامی تحریک کی شکل اختیار کر لے گی اور عوام جیلوں کو بھر دیں گے اور حکومت ان کے آگے سرنگوں ہو جائے گی۔ یہ گویا "ہندوستان چھوڑ دو تحریک" کی ریہرسل تھی۔ گاندھی جی کی توقع کے برعکس جب یہ حربہ کامیاب نہ ہوا تو انہوں نے اپریل ۱۹۴۱ء میں "عام ستیہ گرہ" شروع کر دی اور جون کے آخر تک بیس ہزار کارکن جیل بھجوا دیئے۔

نقادوں کا یہ خیال ہے کہ کانگرس کی نمائندہ حیثیت اور ہندوؤں کی بڑی

تعداد میں اس جماعت میں شمولیت کے پیش نظر بیس ہزار افراد کی گرفتاری ایک معمولی سی بات ہے۔ کانگرس اس وقت اس سے زائد افراد جیل نہ بھجوا سکی۔ جولائی ۱۹۴۱ء کے بعد یہ تحریک کمزور پڑنے لگی اور حکومت نے بتدریج گرفتار شدگان کو رہا کرنا شروع کر دیا۔ اکتوبر ۱۹۴۱ء میں صرف ۵۶۰۰ کارکن جیل میں تھے۔ جو کارکن حکومت نے رہا کئے تھے ان میں سے کسی نے دوبارہ گرفتاری پیش نہیں کی۔ ابوالکلام آزاد جیل سے رہا ہوئے تو انہیں اس بات کا غم تھا کہ انہیں قید ہو کر بھی کچھ نہ ملا۔ اکتوبر کے بعد بھی بظاہر یہ تحریک چلتی رہی لیکن اس میں جان نہ تھی۔ اس طرح کانگرس کا یہ حربہ بھی ناکام ثابت ہوا۔

مسلم لیگ کا طرزِ عمل:

اس تمام عرصے میں مسلم لیگ سول نافرمانی سے الگ تھلگ رہی کیونکہ وہ کانگرس کے اصل عزائم اور گاندھی جی کے ہتھکنڈوں سے خوب واقف تھی۔ مسلم لیگ کو اس کا احساس تھا کہ گاندھی جی حکومت پر دباؤ ڈال کر برعظیم میں ہندو راج کے قیام کے لئے راہ ہموار کر رہے ہیں۔ قائداعظم نے اس زمانے میں برملا فرمایا کہ گاندھی حکومت کو بلیک میل کر رہا ہے۔

مسلمانوں کی یہ رائے کس قدر صحیح تھی کہ انگریزوں کا مزید کچھ عرصہ کے لئے برعظیم میں رہنا مسلمانوں کے لئے بڑا سود مند ہوگا۔ اگر انگریز پاکستان قائم کئے بغیر یہاں سے چلے گئے تو مسلمان ہمیشہ کے لئے ہندوؤں کے غلام بن کر رہ جائیں گے۔ دوسری جانب خود زمانۂ جنگ میں انگریزوں کا یہاں رہنا ان کے حق میں بھی بہتر ہے، کیونکہ وہ یہیں سے فوج بھرتی کر رہے ہیں۔

ڈیفنس کونسل کا مسئلہ:

۱۹۴۱ء تک مسلم لیگ بڑی مقبولیت حاصل کر چکی تھی اور قائداعظم بڑی اہمیت حاصل کر چکے تھے۔ ۲۰ جولائی کو گورنر بمبئی نے قائداعظم کو مطلع کیا کہ وائسرائے اپنی ایگزیکٹو کونسل میں پانچ ممبروں کا اضافہ کر رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی نیشنل ڈیفنس کونسل قائم کی جا رہی ہے، جس کے کل تیس ارکان ہوں گے اور پنجاب،

آسام ، بنگال اور سندھ کے وزرائے اعلیٰ (بلحاظ عہدہ) اس کے رکن ہوں گے ۔ قائداعظم نے اس پر برہمی کا اظہار کیا کہ مسلم لیگ سے مشورہ کئے بغیر مسلم لیگی ارکان کو کونسل میں کیونکر شامل کیا گیا ہے ۔

اگلے روز یعنی ۲۱ جولائی کو نیشنل ڈیفنس کونسل کے قیام کا اعلان ہوا ۔

۲۵ جولائی کو مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے اجلاس میں مسلم لیگی ارکان کو کونسل سے مستعفی ہونے کا حکم دیا ۔ اس پر سر سکندر حیات خان ، مولوی ابوالقاسم فضل الحق اور سر محمد سعد اللہ نے استعفے داغ دیئے ۔ بیگم جہاں آرا، شاہنواز اور سر سلطان احمد نے اس حکم سے سرتابی کی تو انہیں پانچ سال کے لئے مسلم لیگ سے خارج کر دیا گیا ۔ وائسرائے کے اس یک طرفہ فیصلے کے خلاف مسلم لیگ نے مرکزی اسمبلی کے پورے سیشن کا بائیکاٹ کیا ۔ اتفاق سے مولوی ابوالقاسم فضل الحق دوبارہ ڈیفنس کونسل میں شامل ہو گئے تو مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے انہیں بھی مسلم لیگ سے خارج کر دیا ۔

نیشنل ڈیفنس کونسل کے مسئلے پر مسلم لیگ کے مختلف دھڑوں میں اتحاد پیدا ہوا اور ورکنگ کمیٹی نے نظم و ضبط کا مثالی مظاہرہ کیا ۔

باب (31)

کرپس مشن

۱۹۴۱ء کے اختتام تک عالمی سیاست میں زبردست تبدیلی رونما ہوئی ۔ ۷ دسمبر ۱۹۴۱ء کو جاپان نے اچانک بحرالکاہل کے جزیرہ ہوائی کی بندرگاہ پرل ہاربر پر حملہ کر کے امریکی بحری بیڑا تباہ کر دیا ۔ اس پر امریکہ بھی دوسری عالمی جنگ میں کود پڑا ۔ اس سے پہلے اس کی ہمدردیاں اتحادیوں کے ساتھ ضرور تھیں اور وہ ان کی مالی اور اخلاقی امداد بھی کر رہا تھا لیکن جنگ میں براہ راست شامل نہیں ہوا تھا ۔

دوسری جانب جرمنی اور روس نے مل کر اتحادیوں کے خلاف اعلان جنگ کیا تھا ۔ لیکن دو سال بعد ہی ان میں پھوٹ پڑ گئی اور روس نے اتحادیوں کے ساتھ مل کر جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا ۔ ان حالات میں جرمنی نے روس پر حملہ کر دیا اور بہت جلد جرمن فوجیں روس کے یورپی حصے پر قابض ہو گئیں ۔

جاپان کی پیش قدمی:

ادھر جاپان ، انڈونیشیا ، مشرق بعید ، ملایا ، برما اور جزائر انڈیمان و نکوبار پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا ۔ برما پر قبضہ کرنے کے بعد جاپانی فوجیں آسام میں داخل ہو گئیں اور یوں جنگ کے شعلے برعظیم کی دہلیز تک پہنچ گئے ۔ جاپانیوں نے آسام کی دو ریاستوں منی پور اور امپھل پر قبضہ کر کے کلکتے پر بمباری کر دی ۔ جس سے بنگال میں افراتفری پھیل گئی اور کلکتہ کے باشندے شہر چھوڑ کر فرار ہونے لگے ۔

گاندھی جی کے رفقاء میں سے سبھاش چندر بوس ، شاہنواز (م ۱۹۸۳ء) سہگل اور ڈھلوں بہت سے رضا کاروں کے ساتھ جاپانیوں سے مل گئے ۔ انہوں نے

جاپان کی مدد سے برِعظیم کو انگریزوں کے پنجے سے آزاد کرنے کے لئے "آزاد ہند فوج" تیار کر لی۔ جاپانی فوجوں کی برق رفتاری اور یورپ کے محاذ پر برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کی ہزیمت نے گاندھی جی کے دل میں خوشی کی لہر پیدا کر دی۔ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ انگریز جاپانیوں کی آمد سے قبل برِعظیم خالی کر دیں گے اور کانگرس وہاں کا نظم و نسق سنبھال لے گی۔ انہی ایام میں گاندھی جی نے ہٹلر کی کامیابیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے دل کی بات ان الفاظ میں اُگل دی کہ قدرت نے ہٹلر کو انگریزوں کے جرائم کی سزا دینے کے لئے پیدا کیا ہے۔ خدا جانے گاندھی جی اس وقت اپنے خود ساختہ اصولوں یعنی اہنسا اور عدم تشدد کو کیونکر فراموش کر گئے۔

برطانیہ پر امریکی دباؤ:

امریکہ کی جنگ میں شرکت کے بعد امریکہ کے صدر رُوز ویلٹ (م ۱۹۴۵ء) نے برطانیہ کے وزیرِاعظم سرونسٹن چرچل کے ساتھ بحر اوقیانوس میں بحری جہاز پر ملاقات کی جس میں دونوں رہنماؤں نے جنگی امور پر تبادلہ خیال کیا۔ جاپان کی پیش قدمی کے خطرے سے نپٹنے کے لئے رُوز ویلٹ نے چرچل کو مشورہ دیا کہ وہ جیسے کیسے بھی ہو اس نازک مرحلے پر برِعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کے سیاسی رہنماؤں کی خوشنودی حاصل کرے۔ یہیں سے امریکہ نے برِعظیم کے مسئلے میں دلچسپی لینا شروع کی اور آزادی ملنے تک اپنا دباؤ جاری رکھا۔ ورنہ شاید برطانیہ ۱۹۴۷ء کے بعد بھی چند سال تک اپنا قبضہ نہ چھوڑتا۔

انڈیا کمیٹی کی تشکیل:

دوسری جانب فروری ۱۹۴۲ء میں جب سنگاپور میں برطانوی فوجیوں نے جاپانی فوج کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور جاپانی فوجیں ملایا اور برما کی جانب بڑھنے لگیں تو سرتیج بہادر سپرو نے چرچل سے خط و کتابت شروع کی۔ چرچل نے سرتیج بہادر سپرو کے خط کے جواب میں لکھا کہ اس نے ہندوستان کی حکومت سے یہ کہا ہے کہ وہ اپنے نمائندے برطانیہ کی جنگی کابینہ اور پسیفک کونسل میں شامل کرنے کے لئے بھیجے تا ہم

قومی حکومت کے قیام کے سلسلے میں چرچل نے خاموشی اختیار کی اور صرف اتنا کہا کہ اس سے کئی مسائل پیدا ہوں گے۔

انہی ایام میں وزیرِاعظم چرچل نے "انڈیا کمیٹی" بنائی اور کابینہ کے ایک سینئر وزیر مسٹر اٹیلی کو اس کا چیئرمین مقرر کیا۔ مسٹر اٹیلی لیبر پارٹی کا سربراہ تھا اور اس کا اپنا اور اس کی پارٹی کا جھکاؤ کانگرس کی طرف تھا۔ اتفاق سے اس کمیٹی کے ایک رکن سراسٹیفورڈ کرپس بھی تھے جو ان دنوں برطانوی کابینہ کے رکن، دارالعوام کے قائد اور لارڈ پریوی سیل جیسے اہم عہدے پر فائز تھے، ان کا جھکاؤ بھی کانگرس کی طرف تھا۔

دسمبر ۱۹۳۹ء میں سراسٹیفورڈ کرپس چین جاتے ہوئے برِعظیم میں رُکے اور الہ آباد میں پنڈت جواہر لعل نہرو کی قیام گاہ "آنند بھون" میں ان کے ذاتی مہمان کے طور پر ٹھہرے تھے۔ اس وقت انہوں نے یہ بیان دیا تھا کہ جنگ کے خاتمے پر برِعظیم کی اپنی دستور ساز اسمبلی ہونی چاہیے جو برِعظیم کے لئے دستور تیار کرے۔ سر اسٹیفورڈ کرپس نے یہ بھی کہا کہ برطانیہ میں ان کے اس خیال کے بہت سے مؤید موجود ہیں۔ کرپس کے اس بیان سے ہندو بہت خوش ہوئے اور وہ کانگرس کے حلقے میں مقبول ہوگئے۔

"انڈیا کمیٹی" نے یہ فیصلہ کیا کہ کرپس کو برِعظیم بھیجا جائے اور وہ وہاں مختلف سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں سے مل کر اتحاد و تعاون کی فضا پیدا کریں۔ چرچل نے سقوطِ رنگون کے چار دن بعد ۱۱ مارچ کو کرپس کو برِعظیم بھیجنے کا اعلان کیا اور وہ ۲۰ مارچ کو خصوصی مشن پر دہلی پہنچے۔ انہوں نے دہلی پہنچتے ہی یہ اعلان کیا کہ وہ برِعظیم کے سیاسی مسائل کا ایسا حل لے کر آئے ہیں کہ اس سے نہ اقلیت ناراض ہوگی اور نہ ہی اکثریت۔ تاہم کرپس کا ذاتی جھکاؤ کانگرس کی جانب تھا۔

کرپس کی تجاویز:

کرپس نے برِعظیم آنے کے بعد یہ تجویز پیش کی کہ برِعظیم میں ہندوستانی یونین قائم کی جائے گی جو داخلی اور خارجی امور میں خود مختار ہوگی۔ نیز جنگ کے خاتمے پر برِعظیم کو آزاد کر دیا جائے گا۔

کرپس کی تجویز کے دو حصے:

۱۔ جنگ کے بعد کے وعدے۔ اس میں انہوں نے کہا کہ جنگ کے خاتمے پر ایک یا ایک سے زائد نوآبادیات کی صورت میں برِّعظیم کو آزاد کر دیا جائے گا۔

۲۔ مختلف سیاسی جماعتوں کے نمائندوں کو فوراً وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں شامل کیا جائے گا۔

اس کے ساتھ ہی کرپس نے یہ شرط عائد کی کہ ان کی تجاویز کے دونوں حصے اکٹھے منظور کئے جائیں یا اکٹھے رَد کئے جائیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک حصہ مان لیا جائے اور دوسرا رَد کر دیا جائے۔ ثانیاً کانگرس اور مسلم لیگ دونوں جماعتیں راضی ہوں تو ان تجاویز پر عمل ہوگا ورنہ نہیں۔

جنگ کے بعد آزادی دینے کا طریق کار:

کرپس نے جنگ کے خاتمے پر برِّعظیم کو آزاد کرنے کے طریق کار کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

۱۔ تمام صوبوں میں نئے انتخابات کرائے جائیں گے۔

۲۔ صوبائی اسمبلیوں کے منتخب ارکان کی رائے سے دستور ساز اسمبلی قائم کی جائے گی، جو درجہ نوآبادیات کی طرز پر دستور تیار کرے گی۔

۳۔ ہر صوبے میں استصواب کرایا جائے گا اور عوام انڈین یونین میں شامل ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کریں گے۔ یہ فیصلہ ساٹھ فیصد ووٹوں کے ذریعے ہوگا۔

۴۔ اگر کوئی صوبہ ساٹھ فیصد ووٹوں کے ساتھ انڈین یونین میں شامل ہونے کا فیصلہ کرے تو وہ خود اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا مجاز ہوگا۔

۵۔ یونین میں شامل صوبوں کو اپنی مرضی سے الگ الگ یا ایک نوآبادی کے طور پر اپنا دستور بنانے کی آزادی ہوگی۔

۶۔ جنگ کے دوران برطانوی حکومت دفاع کی ذمہ سنبھالے گی۔ وائسرائے کی کونسل میں سیاسی جماعتوں کے نمائندے شامل ہوں گے، لیکن دفاع کا محکمہ کسی انگریز کے پاس رہے گا۔

کرپس نے مختلف رہنماؤں کے ساتھ ملاقاتیں کیں اور ان کے ساتھ اپنی تجاویز پر تبادلۂ خیال کرنے کے بعد ۳۰ مارچ کو ریڈیو پر اپنی تجاویز کی وضاحت کی۔ کرپس نے تمام سیاسی رہنماؤں سے یہ اپیل کی کہ وہ اس کی تجاویز کو مان لیں ورنہ جنگ کے خاتمے تک ایسا موقع دوبارہ ہاتھ نہیں آئے گا اور دنیا بھر میں ہندوستان کے دوستوں کو اس سے رنج پہنچے گا۔

اس کے بعد کرپس نے تمام سیاسی رہنماؤں سے خط و کتابت شروع کی لیکن تمام سیاسی جماعتوں نے اس کی پیش کردہ تجاویز کو مسترد کر دیا۔

مسلم لیگ کا رَدِ عمل:

۱۔ مسلم لیگ نے ان تجاویز کو رَد کرتے ہوئے کہا کہ کرپس کا مقصد دراصل ایک انڈین یونین قائم کرنا ہے اور ایک سے زائد یونینوں کا قیام محض فریب ہے مسلم لیگ چونکہ برِّعظیم کے مسائل کا حل تقسیمِ ہند کو سمجھتی ہے اس لئے وہ ایک یونین کے قیام کی مخالفت کرتی ہے۔ نیز کرپس نے اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ اگر یونین اور تاجِ برطانیہ میں کسی مسئلے پر اختلاف پیدا ہو جائے تو اس کا فیصلہ کس طرح ہوگا۔

۲۔ کرپس نے یہ کہا ہے کہ مجوزہ دستور ساز اسمبلی کثرتِ رائے سے فیصلہ کرے گی، جبکہ اسمبلی میں مسلمانوں کا تناسب صرف ۲۵ فیصد ہے۔ اس صورت میں ہندو جو چاہیں گے وہی ہوگا۔

۳۔ مسلمان کسی انڈین یونین میں اقلیت بن کر نہیں رہ سکتے۔

۴۔ کرپس نے یہ نہیں بتایا کہ دستور ساز اسمبلی کا قیام کس طرح ہوگا۔

۵۔ تجاویز میں اس کی بھی وضاحت نہیں کی گئی کہ کوئی صوبہ علیحدگی کا فیصلہ کس طرح کرے گا۔

۶۔ عبوری دَور کے متعلق جب تک پُوری تصویر سامنے نہیں آتی اس وقت تک رائے کا اظہار ممکن نہیں ہے۔

۷۔ مسلم لیگ اپنا نصب العین پاکستان قرار دے چکی ہے، اس لئے وہ اس سے کم کسی

چیز پر راضی نہیں ہو سکتی اور پاکستان کے علاوہ مسلم لیگ کا کوئی آپشن نہیں ہے۔

اس موقع پر قائداعظم نے ایک بیان میں فرمایا کہ کرپس نے جن صوبوں کا ذکر کیا ہے، ان کی حدود بہت پہلے متعین ہوئی تھیں۔ اب نئی حد بندی کی ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں کرپس کی تجاویز میں کسی ترمیم کی گنجائش نہیں رکھی گئی اور نہ ہی اس میں پاکستان کے قیام یا مسلمانوں کے حق خود ارادیت کا ذکر آیا ہے، اس لئے مسلم لیگ ان تجاویز کو کلیتہً مسترد کرتی ہے۔ قائداعظم نے یہ بھی فرمایا کہ کرپس کی پیش کردہ تجاویز مسلمانوں کو پھانسی کے تختے کی طرف لے جانے والی ہیں۔

کانگرس کا ردِ عمل:

اس وقت کانگرسی رہنما، خصوصاً کانگرس کے آمرِ مطلق گاندھی جی اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ انگریز جاپان اور جرمنی کے ہاتھوں مختلف محاذوں پر پٹ رہے ہیں اور عنقریب ہی انہیں شکست فاش ہونے والی ہے اور جاپان برِعظیم انگریزوں سے خالی کروا کے کانگرس کے سپرد کر دے گا اس لئے کانگرسی رہنما کرپس کے سامنے اینٹھ گئے۔

گاندھی جی نے کرپس کی پیش کردہ تجاویز پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک دیوالیہ بنک کا چیک ہے جس پر آئندہ کی تاریخ ڈال دی گئی ہو۔ کانگرس کو یہ تجاویز اس لئے بھی منظور نہ تھیں کہ اس میں تقسیم ہند کا اصول موجود تھا۔ ثانیاً کانگرس چاہتی تھی کہ ریاستوں کی نمائندگی راجے یا نواب نہ کریں وہاں کے عوام منتخب ہو کر اسمبلی میں آئیں۔ یہ نمائندے چونکہ کانگرسی ذہن کے حامل ہوں گے لہٰذا ان سے کانگرس کو مرکزی اسمبلی میں تقویت ملے گی۔

کانگرس کی یہ خواہش تھی کہ برطانیہ چونکہ ہار رہا ہے، اس لئے وہ فوراً اقتدار کانگرس کو سونپ دے۔ برِعظیم میں کانگرس کی حکومت ہو اور وہ اپنی اکثریت والی اسمبلی کے سامنے جواب دہ ہو۔ کانگرس کا یہ بھی مطالبہ تھا دفاع کا محکمہ بھی اس کے پاس ہو (تاکہ مسلمانوں کی بھرتی ختم کرکے ہندوؤں کو فوج میں ملازمت دی جائے)۔

انہی ایام میں وزیرِ امورِ ہند، ڈیوک آف ڈیون شائر نے دارالامراء میں

بیان دیا کہ کانگرس عبوری دور میں کُلی اختیار چاہتی ہے اور یہ صورتحال دوسری جماعتیں، خصوصاً مسلم لیگ قبول نہیں کر سکتی۔ برطانیہ کے ایک موقر جریدے "سپکٹیٹر" نے لکھا کہ کانگرس غیر ذمہ دار کابینہ بنا کر برِعظیم کو نیچا دکھانا چاہتی ہے۔

۱۰ اپریل کو کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے ان تجاویز کو مسترد کر دیا اور ۱۱ اپریل کو کانگرس کی ہائی کمان نے ورکنگ کمیٹی کے فیصلے کی توثیق کر دی۔ کرپس کی واپسی کے بعد گاندھی جی نے یہ بیان جاری کیا "برطانیہ اس حقیقت کا کیوں اعتراف نہیں کرتا کہ یہ معاملہ ہمارا داخلی ہے۔ انگریز یہاں سے چلے جائیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمام جماعتیں اتحاد کرنے میں فائدہ محسوس کریں گی۔ اس سے اتحاد کے موقف کو مدد ملے گی"۔

کرپس کی واپسی کے بعد کانگرس نے مایوس ہو کر ایک طوفان کھڑا کر دیا کانگرسیوں نے امریکی پریس میں بیانات جاری کروائے کہ برطانیہ نے برِعظیم کو کئی حصوں میں تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی تھی، اس لئے کانگرس نے کرپس کی تجاویز مسترد کر دی ہیں۔

سرتیج بہادر سپرو (م ۱۹۴۹ء) نے اس موقع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا اب حکومت اور سیاسی جماعتوں اور جماعتوں کے درمیان جھگڑے بڑھیں گے۔

آخری بات:

کرپس اگرچہ اپنے مشن میں ناکام ہوا لیکن مسلم لیگ کے نزدیک یہ مشن اس لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے کہ برطانوی حکومت نے پہلی بار متحدہ ہندوستان کی بجائے تقسیم کے اصول کو تسلیم کیا اور اسے برِعظیم کے سیاسی مسئلے کا ایک حل کہا۔ اس سے مسلم لیگ کو قیام پاکستان کی منزل قریب دکھائی دینے لگی۔

راجگوپال اچاریہ تقسیم ہند کے مؤید:

انہی ایام میں مدراس کے سابق وزیر اعلیٰ اور آزادی کے بعد بھارت کے پہلے گورنر جنرل راجگوپال اچاریہ نے یہ محسوس کیا کہ برِعظیم کے سیاسی مسائل مسلمانوں

کو اعتماد میں لئے بغیر حل نہیں ہو سکتے۔ اس لئے اگر ان کی خواہش کے مطابق برعظیم کے ایک حصے میں جہاں ان کی اکثریت ہے، انہیں علیحدہ وطن بنانے کی اجازت دے دی جائے تو یہ صورت حال اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ دونوں بڑی جماعتوں میں کوئی سمجھوتہ نہ ہو اور مسائل حل طلب پڑے رہیں۔

راجگوپال اچاریہ نے مدراس پریذیڈنسی کی معطل شدہ اسمبلی کے ارکان کو ۲۳ اپریل ۱۹۴۲ء کو طلب کرکے انہیں اصولی طور پر تقسیم ہند اور پاکستان کے قیام کا قائل کر لیا۔ حاضرین نے کانگرس کی ہائی کمان سے سفارش کی کہ وہ مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کو تسلیم کر لے اور مسائل کے حل کے لئے گفتگو شروع کرے۔

راجگوپال اچاریہ کے اس جرأت مندانہ اقدام سے کانگرسی حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔ کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے ۲۹ اپریل کو الہ آباد میں ایک خصوصی میٹنگ میں راجگوپال اچاریہ کی سفارش پر غور و خوض کے بعد اسے مسترد کر دیا۔ تاہم اس کے بعد بھی راجگوپال اچاریہ مسلم لیگ کے ساتھ مفاہمت پر زور دیتے رہے۔

راج گوپال اچاریہ فارمولا

پس منظر:

کانگرس کی طرف سے تحریک سول نافرمانی، جسے برطانوی حکومت کے خلاف کھلی بغاوت سے تعبیر کیا گیا تھا، شروع ہوتے ہی حکومت نے کانگرس کو خلاف قانون جماعت قرار دے کر اس کے رہنماؤں کو احمد نگر (دکن) کے قلعے میں نظر بند کر دیا اور اپنی پوری قوت استعمال کرکے تین چار ہفتوں میں اس بغاوت کو دبا دیا۔ نظر بندی کے دوران کانگرسی رہنماؤں کو اپنی حماقت کا احساس ہوا کیونکہ ان کے میدان سے ہٹنے کے بعد مسلم لیگ نے اپنی تنظیم نو کی طرف پوری توجہ دی اور ضلع و تحصیل کی سطح کے علاوہ قصبات میں بھی اس کی شاخیں کھل گئیں۔ اس سے جہاں ایک جانب مسلم لیگ کی مقبولیت میں اضافہ ہوا تو دوسری جانب قائداعظم ایک بہت بڑی شخصیت بن کر اُبھرے۔

مدراس کے سابق وزیراعلیٰ راجگوپال اچاریہ نے اس تحریک سول نافرمانی میں کانگرس کا ساتھ نہیں دیا تھا اور وہ واحد اہم کانگرسی رہنما تھے جو جیل سے باہر تھے۔ مسلم لیگ کی روز افزوں مقبولیت اور مطالبۂ پاکستان کی معقولیت کو دیکھتے ہوئے انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ برعظیم اس وقت تک برطانیہ کے چنگل سے آزاد نہیں ہو سکتا جب تک کانگرس اور مسلم لیگ میں کوئی سمجھوتہ طے نہیں پاتا۔ راجگوپال اچاریہ یہ بھی جان گئے تھے کہ مسلم لیگ پاکستان سے کم کسی بات پر راضی نہ ہو گی۔ اس لئے اگر کانگرس اس کا یہ مطالبہ تسلیم کر لے اور ملک آزاد ہو جائے تو یہ اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ ان جماعتوں میں کوئی سمجھوتہ نہ ہو اور ملک بدستور غلام رہے۔ اس بات کے ذہن نشین ہوتے ہی راجگوپال اچاریہ نے قرارداد لاہور کی اساس پر پاکستان کے قیام کی حمایت شروع کر دی۔

راجگوپال اچاریہ فروری ۱۹۴۳ء میں آغا خان محلس پونا میں جہاں گاندھی جی نظر بند تھے، ان سے ملے اور ان کے ساتھ صلاح و مشورہ کرکے اور ان کی منظوری حاصل کرکے انہوں نے ۱۰ جولائی ۱۹۴۳ء کو اپنی تجاویز شائع کر دیں جو "راجگوپال اچاریہ فارمولا" کے نام سے مشہور ہوئیں۔ انہوں نے درج ذیل متن اخبارات میں شائع کرایا۔

فارمولے کا متن:

۱۔ مسلم لیگ برعظیم کی آزادی کی مکمل حمایت کرتی ہے اور وہ عبوری دور کے لئے عبوری حکومت میں شریک ہونے پر بھی رضا مند ہے۔

۲۔ جنگ کے خاتمے پر ایک کمیشن قائم کیا جائے گا جو برعظیم کے شمال مشرقی علاقے (بنگال اور آسام) اور شمال مغربی علاقے (موجودہ پاکستان) میں جہاں مسلم اکثریت ہے، کے اضلاع کی حد بندی کرے گا۔ ان اضلاع کے باشندے استصواب کے ذریعے فیصلہ کریں گے اور اگر اکثریت نے الگ مملکت کے قیام کے حق میں ووٹ دیا تو اس کے مطابق عمل کیا جائے گا۔ البتہ سرحدی اضلاع کو یہ حق ہو گا کہ وہ جس مملکت میں چاہیں شامل ہو جائیں۔

۳۔ استصواب سے پہلے سیاسی جماعتوں کو یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ عوام کے سامنے اپنا اپنا نقطہ نظر واضح کر سکیں۔

۴۔ علیحدہ ریاست کے قیام کی صورت میں دفاع تجارت، مواصلات اور ضروری امور سے متعلق معاہدے کئے جائیں گے۔

۵۔ علیحدہ ریاست کے قیام کی صورت میں دونوں مملکتوں میں آبادی کا تبادلہ رضاکارانہ طور پر ہو گا۔

۶۔ مذکورہ باتوں پر اسی وقت عمل ہو گا جب برطانیہ، حکومت کے تمام اختیارات اور ذمہ داریاں برعظیم کے عوام کو منتقل کر دے گا۔

راجگوپال اچاریہ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ ان تجاویز میں ترمیم کی گنجائش نہیں ہے۔ قائداعظم ذاتی طور پر ان تجاویز پر غور کریں اور انہیں مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے سامنے نہ رکھیں۔ یہ شرط قائداعظم کسی طرح بھی قبول نہیں کر سکتے تھے۔

کیونکہ وہ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کی منظوری کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتے تھے۔

کراچی میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس:

ان تجاویز کی اخبارات میں تشہیر کے بعد دسمبر ۱۹۴۳ء کے آخری ہفتے میں کراچی میں مسلم لیگ کا ۳۱واں سالانہ جلسہ منعقد ہوا (جس کی کارروائی دیکھنے کا راقم کو بھی شرف حاصل ہے) یہ ایک فقید المثال جلسہ تھا جس میں برعظیم کے مختلف علاقوں سے لکھوکھا مسلمان کراچی میں جمع ہو گئے تھے۔ بی مارکیٹ سے جلسہ گاہ تک قائداعظم ایک جلوس کی شکل میں تشریف لے گئے۔ اس وقت عوام کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ قائداعظم نے جلسہ گاہ کے صدر دروازے پر جس کا نام "باب اسلام" رکھا گیا تھا اپنے ہاتھوں سے مسلم لیگ کا پرچم لہرایا اور اردو میں تقریر کی۔ اس جلسے میں مندوبین نے قرارداد لاہور کی اساس پر قیام پاکستان کا مطالبہ دہرایا اور مندوبین ایک نیا جوش و ولولہ لے کر اپنے گھروں کو لوٹے۔

راجگوپال اچاریہ فارمولا قائداعظم نے مسترد کر دیا:

راجگوپال اچاریہ نے ۸ اپریل ۱۹۴۴ء کو یہ تجاویز قائداعظم کو مذکورہ بالا شرط کے ساتھ بھجوائیں۔ قائداعظم نے فرمایا کہ وہ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے سامنے یہ تجاویز رکھیں گے۔ اس پر راجگوپال اچاریہ نے کہا کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا اگر یہ فیصلہ کرنا تھا تو وہ خود کرتے۔ دونوں رہنماؤں کے درمیان تاروں کا تبادلہ ہوا اور راجگوپال اچاریہ نے گاندھی جی سے مشورے کے بعد یہ اعلان کر دیا کہ قائداعظم نے ان تجاویز کو رد کر دیا ہے۔

ان تجاویز میں کئی ابہام تھے۔ راجگوپال اچاریہ نے یہ واضح نہیں کیا تھا کہ پہلے علیحدگی ہو گی اور پھر آزادی ملے گی یا پہلے ملک آزاد ہو گا اور پھر علیحدگی ہو گی یا یہ دونوں کام بیک وقت ہوں گے۔ اس بات کی وضاحت بھی نہیں کی گئی تھی کہ معاہدہ کرنے میں دونوں مملکتیں آزاد ہوں گی یا ان پر کوئی پابندی ہو گی۔ جس کمیشن کے قیام کا راجگوپال اچاریہ نے ذکر کیا تھا اسے کون قائم کرے گا۔ نیز عبوری حکومت میں سیاسی جماعتوں کی نمائندگی کا تناسب کیا ہو گا؟ علاوہ ازیں راجگوپال اچاریہ نے جن "ضروری

امور" کا ذکر کیا ہے ان سے کیا مراد ہے؟"

ان حالات میں قائداعظم نے فرمایا کہ اگر یہ تجاویز مان لی جائیں تو ہمیں کٹا پھٹا، لنگڑا لولا، مسخ شدہ اور کرم خوردہ پاکستان ملے گا۔ اگر آزادی کے بعد علیحدگی ہوتی تو شاید کانگرس ایسا نہ ہونے دیتی۔ اس لئے قائداعظم کی نظر میں یہ تجاویز محض فریب تھیں۔ انہی ایام میں ہندو مہاسبھا کے سابق جنرل سیکرٹری راجہ مہیشور دیال نے ایک بیان جاری کیا کہ راجگوپال اچاریہ نے جو فارمولا پیش کیا ہے یہ تو وہی ہے جسے ہندو مہاسبھا ۳۰ اگست ۱۹۴۲ء کو ایک قرارداد کے ذریعے منظور کر چکی ہے۔ چنانچہ راجگوپال اچاریہ کا فارمولا اپریل ۱۹۴۴ء کے پہلے عشرے میں فلوپ ہو گیا۔

گاندھی ۔ جناح ملاقات

عالمی سیاست میں تبدیلی:

۲۳ اکتوبر ۱۹۴۲ء کو لیبیا اور مصر کی سرحد پر العالمین کے مقام پر جرمنی اور اٹلی کی مشترکہ فوج کا اتحادیوں کے ساتھ مقابلہ ہوا۔ اس وقت دنیا بھر کی نظریں العالمین پر لگی ہوئی تھیں۔ جرمنی کا مشہور جرنیل رومیل پورے شمالی افریقہ پر قبضہ کرکے مصر کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس کا یہ منصوبہ تھا کہ وہ نہر سوئز پر قبضہ کرکے یورپ اور ایشیا کا رابطہ ختم کر دے۔ دوسری جانب سے مشہور انگریز کمانڈر فیلڈ مارشل منٹگمری جنرل رومیل کی پیش قدمی روکنے کے لئے بڑھا۔ طرفین کے مابین ٹینکوں کی خوفناک جنگ لڑی گئی جس میں بالآخر رومیل کو شکست ہوئی۔ ۷ اور ۸ نومبر ۱۹۴۲ء کو مزید اتحادی فوج مصر پہنچ گئی اور اس کی مدد سے فیلڈ مارشل منٹگمری نے مئی ۱۹۴۳ء میں پورے شمالی افریقہ کو جرمنی کے تسلط سے آزاد کرا لیا۔ اب عالمی جنگ میں اتحادیوں کی کامیابی کے امکانات روشن ہونے لگے۔

گاندھی ۔ ویول خط و کتابت:

ان حالات میں گاندھی جی نے جیل سے وائسرائے ہند لارڈ ویول کو ۲۷ جولائی ۱۹۴۴ء کو ایک خط لکھا جس میں اس سے کہا کہ اگر برطانیہ برعظیم کو فوراً آزاد کرکے یہاں ایک ایسی قومی حکومت قائم کر دے جو مرکزی اسمبلی کے سامنے جوابدہ ہو تو وہ (گاندھی جی) کانگرس کی ورکنگ کمیٹی سے سفارش کریں گے کہ وہ سول نافرمانی ختم کر دے۔ اس کے علاوہ برطانیہ برعظیم پر جنگی اخراجات کا بوجھ نہ ڈالے۔

وائسرائے نے ۱۵ اگست کو گاندھی جی کے خط کا جواب ارسال کیا اور اس میں لکھا کہ یہ تو ساری وہی باتیں ہیں جو کرپس کے سامنے کہی جا چکی ہیں اور انہیں ملکہ معظم کی حکومت مسترد کر چکی ہے البتہ جنگ کے خاتمے پر برعظیم کو آزاد کر دیا جائے گا

اور ایک قانون ساز اسمبلی قائم کر دی جائے گی۔

دراصل اب عالمی جنگ میں اتحادیوں کا پلہ بھاری ہوتا جا رہا تھا اور وہ پہلے جیسی کمزور پوزیشن میں نہیں تھے۔ اس لئے وائسرائے نے ڈٹ کر گاندھی جی کے خط کا جواب تحریر کیا۔

۶ اپریل ۱۹۴۴ء کو حکومت نے علالت کی بنا پر گاندھی جی کو غیر مشروط طور پر جیل سے رہا کر دیا۔ انہوں نے رہائی کے بعد وائسرائے سے خط و کتابت شروع کر دی۔ گاندھی جی اپنی پرانی ضد پر اڑے رہے۔ وائسرائے نے بدلے ہوئے عالمی حالات میں اگست میں خط و کتابت منقطع کر دی ہے۔

گاندھی جی کا خط بنام قائداعظم:

اسی دوران میں ۱۷ جولائی ۱۹۴۴ء کو گاندھی جی نے قائداعظم کو گجراتی زبان میں ایک دلفریب خط لکھا جس میں ان کے ساتھ ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس خط میں گاندھی جی نے یہ بھی لکھا کہ انہیں اسلام اور مسلمانوں کا دشمن نہ سمجھیں وہ قائداعظم اور پوری دنیا کے دوست اور خادم ہیں۔ آخر میں انہوں نے لکھا کہ انہیں مایوس نہ کریں۔ اس خط میں گاندھی جی نے "قائداعظم" کا لقب بھی استعمال کیا تھا۔

گاندھی۔ جناح ملاقات:

قائداعظم نے مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کی اجازت سے گاندھی جی کو لکھا کہ وہ ان کی رہائش گاہ مالابار ہل بمبئی میں ان سے مل سکتے ہیں۔ چنانچہ ۹ ستمبر کو گاندھی جی قائداعظم سے ملنے آئے اور انہوں نے پہلی ملاقات میں ہی یہ بات واضح کر دی کہ وہ کانگرس یا ہندوؤں کے نمائندے بن کر قائداعظم سے ملنے نہیں آئے بلکہ ذاتی حیثیت سے آئے ہیں۔ قائداعظم نے جواب دیا کہ اگر دونوں جماعتوں کے نمائندے بات چیت کریں تو وہ کسی مثبت نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔ گاندھی جی کسی جماعت کی نمائندگی نہیں کرتے اس لئے وہ مسلم لیگ کے ساتھ کس طرح سمجھوتہ کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد دونوں رہنماؤں میں کئی بالمشافہ ملاقاتیں ہوئیں اور خط و کتابت کے ذریعے بھی کئی وضاحتیں طلب کی گئیں۔ قائداعظم نے انہیں ایک خط میں

لکھا کہ ایک جماعت کا نمائندہ ایک عام آدمی سے جو کسی سیاسی جماعت کی نمائندگی کا دعویدار نہ ہو، کس حیثیت سے مل سکتا ہے؟ قائداعظم یہ جانتے تھے کہ اگر ان کے ساتھ ملاقات میں گاندھی جی نے کوئی بات مان بھی لی تو کانگرس اس کی پابند نہ ہو گی۔ وہ یہ بآسانی کہہ دے گی کہ گاندھی جی تو کانگرس کے بنیادی رکن بھی نہیں ہیں۔ اس لئے کانگرس نے انہیں یہ حق کب دیا تھا کہ وہ قائداعظم کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کریں۔

گاندھی جی کا موقف:

ثانیاً، دونوں رہنماؤں میں بہت سی بنیادی باتوں پر اختلاف تھا۔ گاندھی جی کا یہ موقف تھا:

۱۔ قرارداد لاہور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ الگ قومیں نہیں کہا گیا جن کے لئے لازماً دو الگ مملکتیں قائم کی جائیں۔

۲۔ اس قرارداد سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خاندان کا ایک فرد اپنے اہل خانہ کے ساتھ نہیں رہنا چاہتا اس کے لئے گھر کے اندر حد بندی کر دی جائے۔

۳۔ اس حد بندی کے بعد بھی پورے خاندان کے بعض مشترکہ معاملات اور ذمہ داریاں ایسی ہوں گی جس میں اسے شریک ہونا پڑے گا۔

۴۔ مکان کی تقسیم پر آزادی کے بعد عمل ہونا چاہیے نہ کہ پہلے۔

گاندھی۔ قائداعظم ملاقات ناکام رہی:

بہرحال یہ ملاقاتیں اور خط و کتابت ناکام رہیں۔ گاندھی جی کا اس سے صرف یہ مقصد تھا کہ وہ حکومت کو یقین دلا دیں کہ وہ مسلم لیگ کے ساتھ سمجھوتے کی کوشش میں بڑے مخلص ہیں۔ تاہم دنیا پر یہ بات واضح ہو گئی کہ گاندھی جی محض وقت ضائع کر رہے ہیں اور وہ اپنے مشن میں مخلص نہیں ہیں۔ اقوام عالم پر یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ گاندھی جی اور قائداعظم دو مختلف قوموں کے رہنما ہیں۔ ان ملاقاتوں سے قائداعظم کی شخصیت نکھر کر اقوام عالم کے سامنے آئی اور انہیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ گاندھی جی کسی حد تک تقسیم ہند کے قائل ہو گئے ہیں۔

سپرو تجاویز

گاندھی جی اور قائداعظم کی ملاقاتیں اور خط و کتابت ناکام رہی ۔ تحریک پاکستان کے مؤرخین کا یہ کہنا ہے کہ یہ بات خلاف توقع نہ تھی کیونکہ گاندھی جی کی ہٹ دھرمی اظہر من الشمس تھی اور ان ملاقاتوں کا یہی نتیجہ نکلنا تھا۔

ان ملاقاتوں کی ناکامی کے بعد مشہور قانون دان سرتیج بہادر سپرو نے کہا کہ کانگرس اور مسلم لیگ کے مابین سمجھوتہ ضرور ہونا چاہیے تاکہ آپس کے اختلافات ختم کرکے دونوں جماعتیں حصولِ آزادی کے لئے جد و جہد کریں ۔ چنانچہ سرتیج بہادر سپرو نے قائداعظم اور گاندھی جی سے اپیل کی کہ وہ دوبارہ بات چیت شروع کریں ۔ اس سلسلے میں وہ گاندھی جی سے ملے تو انہوں نے دوبارہ بات چیت شروع کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر سرتیج بہادر سپرو نے اپنی اپیل واپس لے لی۔

سرتیج بہادر سپرو نے اپنی کوشش جاری رکھی اور گاندھی جی سے کہا کہ وہ تمام جماعتوں کا نمائندہ اجلاس طلب کرکے فرقہ وارانہ مسائل کا حل تلاش کریں ۔ گاندھی جی نے ان کی یہ تجویز بھی مسترد کر دی ۔ ان حالات میں سرتیج بہادر سپرو نے غیر سیاسی کانفرنس کی سٹینڈنگ کمیٹی سے درخواست کی کہ وہ ایک کمیٹی مقرر کرے جو برِعظیم کے مستقبل کے بارے میں غور کرے اور تمام سیاسی جماعتوں کا نقطۂ نظر معلوم کرے ۔ یہ کمیٹی تمام سیاسی رہنماؤں سے رابطہ قائم کرے اور پھر مسائل کا حل تجویز کرے ۔ کمیٹی کی پیش کردہ تجاویز پر سیاسی جماعتیں غور کریں اور اگر چاہیں تو ان تجاویز کو مان لیں اور اگر چاہیں تو رَد کر دیں یا جتنی تجاویز ماننا چاہیں مان لیں اور بقیہ رَد کر دیں ۔ گاندھی جی ، سرتیج بہادر سپرو کی اس تجویز پر اس شرط پر رضا مند ہو گئے کہ کمیٹی میں کانگرس ، مسلم لیگ ، ہندو مہاسبھا یا کسی اور سیاسی جماعت کے ارکان شامل نہ ہوں ۔

۱۹ نومبر ۱۹۴۴ء کو دہلی میں سٹینڈنگ کمیٹی کی میٹنگ میں اس بات پر

اتفاق رائے ہو گیا کہ ایک کمیٹی بنائی جائے جو فرقہ وارانہ مسائل اور اقلیتوں کے معاملات کا سیاسی طور پر جائزہ لے ۔ یہ کمیٹی تمام سیاسی رہنماؤں سے رابطہ کرکے دو ماہ کے بعد رپورٹ پیش کرے اور اسی کی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ ایسی تجاویز پیش کی جائیں جنہیں تمام سیاسی جماعتیں قبول کر لیں ۔ اس موقع پر سرتیج بہادر سپرو نے یہ تجویز پیش کی کہ کمیٹی میں ہائی کورٹ کے سابق جج اور ایک یا دو انگریز ضرور شامل کئے جائیں اور حکومت اقلیتوں کے بارے میں ضروری معلومات اور اعداد و شمار فراہم کرنے میں کمیٹی سے تعاون کرے ۔

۳ دسمبر ۱۹۴۴ء کو الہ آباد میں سٹینڈنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں کمیٹی کے ارکان نامزد کئے گئے ۔ سرتیج بہادر سپرو اس کمیٹی کے صدر مقرر ہوئے اور ایم آر جیکار، بشپ فاس ویسٹ کوٹ ، رادھا کرشنن ، این آر سرکار ، فرینک انتھونی اور سنت سنگھ کو اس کمیٹی میں شامل کیا گیا (ایم آر جیکار نے کسی بھی میٹنگ میں شرکت نہ کی)۔

۴ دسمبر کو سرتیج بہادر سپرو نے قائداعظم کو خط لکھا کہ انہیں اور کمیٹی کے ایک یا دو ارکان کو ملاقات کے لئے وقت دیں تاکہ بعض مسائل کے حل کے لئے ان کا نقطۂ نظر معلوم کر سکیں ۔ قائداعظم نے ۱۲ دسمبر کو اس خط کے جواب میں تحریر فرمایا کہ وہ سٹینڈنگ کمیٹی اور اس کی نامزد کردہ کمیٹی کو تسلیم نہیں کرتے اور نہ ہی اس طریقِ کار سے متفق ہیں جو کمیٹی نے اختیار کیا ہے ۔ (یاد رہے کہ اس کمیٹی میں کوئی مسلمان شامل نہ تھا اور یہ کمیٹی مسلمانوں کے سیاسی مسائل حل کرنا چاہتی تھی)۔

کمیٹی کا آخری اجلاس دہلی میں منعقد ہوا جس میں تجاویز پر غور و خوض کرنے کے بعد ۸ اپریل ۱۹۴۵ء کو کمیٹی نے اپنی تجاویز شائع کر دیں ۔ ان میں سے چند تجاویز درج ذیل ہیں:

۱۔ برِعظیم کی تقسیم کی ، خواہ وہ کسی بھی صورت میں ہو ، مخالفت کی جائے ۔
۲۔ ۱۶۰ ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کی جائے جو مستقبل کے لئے آئین تیار کرے ۔
۳۔ دیسی ریاستیں انڈین یونین میں مدغم ہو جائیں ۔
۴۔ کوئی صوبہ یونین سے الگ نہیں رہے گا ۔

۵۔ دستور میں بنیادی حقوق کی وضاحت کر دی جائے گی۔
۶۔ اقلیتوں کے امور کے لئے ایک با اختیار کمیشن بنایا جائے گا۔
۷۔ جداگانہ انتخابات ختم کر کے مخلوط انتخابات کروائے جائیں۔
۸۔ دستور ساز ادارے اور وفاقی ایگزیکٹو میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی نمائندگی برابر ہو گی۔

کمیٹی نے یہ بھی سفارش کی اگر سیاسی جماعتیں ان تجاویز کو مسترد کر دیں تو سرکار عبوری حکومت قائم کرے۔ مذکورہ بالا تجاویز کی روشنی میں دستور کی تیاری شروع کر دے۔ سرکار اس دستور کو پارلیمنٹ سے منظور کروا کے جلد از جلد نافذ کر دے۔

ردِ عمل:

سپرو کمیٹی کی پیش کردہ تجاویز پر "اکھنڈ ہندوستان تحریک" کے رہنما، کے ایم منشی نے اظہارِ مسرت کرتے ہوئے اسے مسائل کا بہترین حل قرار دیا کیونکہ ان تجاویز میں برِعظیم کی تقسیم کی مخالفت کی گئی تھی جو "اکھنڈ ہندوستان تحریک" کا اصل مقصد تھا۔

ہندو مہاسبھا کے دو رہنماؤں، این این سرکار اور این سی چیٹرجی کے علاوہ تیرہ بنگالی ہندو رہنماؤں نے ان تجاویز کی اس بنا پر مخالفت کی کہ ان تجاویز میں دستور ساز ادارے اور وفاقی ایگزیکٹو میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعداد برابر تھی۔ سکھ رہنماؤں نے بھی ان تجاویز کی اس بنا پر مخالفت کی کہ ان میں سکھوں کے حقوق کی حفاظت کا ذکر نہیں تھا۔

مسلم لیگی رہنما نواب محمد اسمٰعیل خان (م ۱۹۵۸ء) نے بھی ان تجاویز کو کوئی اہمیت نہ دی۔ انہوں نے اس موقع پر فرمایا کہ مسائل کا حل اسی وقت ممکن ہے جب کانگرس اور مسلم لیگ مل کر مستقبل کے دستور کے بنیادی اصول طے کریں۔ قائداعظم نے ان تجاویز پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ کانگرسیوں کا تیار کردہ منصوبہ ہے جو گاندھی جی کی مرتب کردہ راگنی الاپ رہے ہیں۔ مسلم لیگ ایسا کوئی دستور قبول نہیں کرے گی جو متحدہ ہندوستان کی اساس پر تیار کیا گیا ہو۔

وی پی مینن (م ۱۹۶۶ء) کا یہ خیال ہے کہ ان تجاویز میں مخلوط انتخابات کی سفارش کی گئی تھی اور پاکستان کی نفی کر کے متحدہ ہندوستان کا تصور پیش کیا گیا تھا۔ اس لیے مسلم لیگ نے ان تجاویز کی مخالفت کی۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی (م ۱۹۸۱ء) لکھتے ہیں کہ برطانوی حکومت نے ۱۹۴۲ء میں سر کرپس کے ذریعے تقسیمِ ہند کا اصول تسلیم کر لیا تھا اور کرپس نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر کوئی صوبہ یونین سے الگ رہنا چاہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ گاندھی جی نے قائداعظم کے ساتھ اپنی ملاقاتوں میں مخلوط انتخابات کا مسئلہ نہیں اٹھایا تھا (جب بات یہاں تک بڑھ گئی تھی تو سر تیج بہادر سپرو نے جداگانہ انتخابات کے خاتمے اور تقسیمِ ہند کی مخالفت کر کے مسلمانوں کو ملی ہوئی مراعات چھیننے کی کوشش کی) انہوں نے دراصل کانگرس کے مہاسبھائی گروپ کا نقطہ نظر پیش کیا۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کو اس بات پر حیرت ہے کہ سپرو جیسا تجربہ کار اور سمجھدار شخص یہ کیونکر باور کر گیا کہ اس کی پیش کردہ تجاویز کو سنجیدہ مزاج لوگ قبول کر لیں گے۔

لیاقت۔ ڈیسائی معاہدہ:

۱۹۴۵ء کے اخبارات میں اس طرح کی خبریں شائع ہونے لگیں کہ کانگرس اور مسلم لیگ میں مفاہمت ہو رہی ہے اور عنقریب ہی باہمی تعاون کا معاہدہ طے پانے والا ہے۔ ان دنوں مرکزی اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا اور دونوں جماعتوں کے رہنما دہلی میں مقیم تھے۔ بھولا بھائی ڈیسائی مرکزی اسمبلی میں کانگرس کے قائد تھے اور نوابزادہ لیاقت علی خان مسلم لیگ کی قیادت کر رہے تھے۔ یہ دونوں رہنما ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کر رہے تھے اور اس زمانہ میں یہ افواہ گشت کر رہی تھی کہ یہ دونوں عبوری قومی حکومت کے اصول طے کرنے پر رضامند ہو گئے ہیں۔

۱۳ جنوری ۱۹۴۵ء کو بھولا بھائی ڈیسائی وائسرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری سر ایون جنکنز سے ملے اور اس نے ۲۰ جنوری کو وائسرائے کے ساتھ ان کی ملاقات کرائی۔ اس ملاقات میں ڈیسائی نے وائسرائے کو نوابزادہ لیاقت علی خان کے ساتھ اپنی ملاقات اور

بات چیت سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ اسے گاندھی جی کی تائید حاصل ہے۔ ڈیسائی نے اسے یہ بھی بتایا کہ قائداعظم بھی ان دونوں کی بات چیت سے آگاہ ہیں۔ ڈیسائی نے وائسرائے سے کہا کہ مندرجہ ذیل امور پر ان دونوں میں ایک معاہدہ طے پایا ہے۔

۱۔ کانگرس اور مسلم لیگ مرکز میں عبوری حکومت میں شرکت کریں گی۔ اس کے علاوہ وہ اس پر بھی رضا مند ہو گئے ہیں کہ مرکز میں دونوں جماعتوں کے وزیروں کی تعداد ایک جیسی ہو گی اور وزیر بننے کے لئے مرکزی اسمبلی کی رکنیت ضروری نہیں۔

۲۔ اچھوتوں اور سکھوں کو بھی وزارت میں نمائندگی دی جائے گی۔

۳۔ کمانڈر ان چیف ہندوستانی ہو گا۔

انہی ایام میں ڈیسائی نے اس کی بھی وضاحت کر دی کہ کانگرس اور مسلم لیگ کی حکومت ۱۹۳۵ء کے آئین کے تحت کام کرے گی اور وہ تمام امور میں آزاد ہو گی، نیز وائسرائے اس پر اپنا دباؤ نہیں ڈالے گا۔ ڈیسائی نے یہ بھی کہا کہ دونوں جماعتوں میں اس پر سمجھوتہ ہو گیا ہے کہ اگر عبوری حکومت قائم ہو گئی تو وہ سب سے پہلا کام یہ کرے گی کہ کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے ارکان کو رہا کرائے گی۔ اس سمجھوتے کے تحت وائسرائے سے کہا جائے گا کہ وہ عبوری حکومت کے قیام کی خواہش کا اظہار کرے اور قائداعظم اور ڈیسائی کو الگ الگ یا اکٹھے بلائے اور حکومت بنانے کی دعوت دے۔ ڈیسائی نے یہ بھی کہا کہ عبوری حکومت وائسرائے سے دفعہ ۹۳ اٹھانے اور صوبوں میں مخلوط حکومتیں قائم کرنے کی سفارش کرے گی۔

ڈیسائی نے یہ تجاویز لکھ کر وائسرائے کو بھجوائیں اور اس نے وزیر امور ہند کو یہ کہہ کر بھجوائیں کہ یہ سیاسی اور دستوری مسائل کے حل کا بہترین موقع ہے۔ اس کے بارے میں اس کی کیا رائے ہے " وزیر امور ہند نے وائسرائے کو جواب دیا کہ ملک معظم کی حکومت نے یہ دریافت کیا ہے کہ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ زمانۂ جنگ میں عبوری حکومت برطانیہ کی مدد کرتی رہے گی " کیا اس معاہدے سے یہ مراد ہے کہ وائسرائے سے اس کی ایگزیکٹو کونسل کے ارکان کے انتخاب کا حق واپس لے لیا جائے گا ' عبوری حکومت کے وزراء کس حد تک اپنی اپنی جماعتوں کے قواعد و ضوابط کی پابندی

کریں گے۔ کانگرس کس حد تک ڈیسائی کی حمایت کرے گی ' اقلیتوں، غیر کانگرسی ہندوؤں اور غیر مسلم لیگی مسلمانوں کو اس سے کیا ملے گا "

وائسرائے نے ان امور کی وضاحت چاہنے کے لئے قائداعظم اور ڈیسائی کو بلانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اسی زمانے میں قائداعظم نے اپنے ایک بیان میں لیاقت ڈیسائی معاہدے سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ قائداعظم ان دنوں بمبئی میں قیام فرما تھے۔ وائسرائے نے بمبئی کے گورنر سر جان کویل سے کہا کہ وہ قائداعظم سے ملے اور ان سے پوچھے کہ ڈیسائی کی پیش کردہ تجاویز اس لائق ہیں کہ ان پر عمل کیا جا سکے ' اگر وہ اس کا جواب اثبات میں دیں تو گورنر ان سے کہے کہ وہ دہلی جا کر وائسرائے اور ڈیسائی سے مل لیں۔ جب گورنر قائداعظم سے ملا تو انہوں نے اسے بتایا کہ ایسا کوئی معاہدہ ان کے علم میں نہیں ہے اور نہ ہی ایسا کوئی معاہدہ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے سامنے منظوری کے لئے پیش کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے خیال میں لیاقت اور ڈیسائی کے مابین بات چیت ضرور ہوئی تھی اور بات معاہدے تک پہنچ گئی تھی لیکن بد قسمتی سے اس کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ قائداعظم نے جان کویل سے ملاقات کے دوران بات ہی ختم کر دی۔ ڈاکٹر صاحب نے بالکل درست لکھا ہے کہ نوابزادہ لیاقت علی خان کو اس کا اختیار نہ تھا کہ وہ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی سے منظوری لئے بغیر اتنا بڑا قدم اٹھاتے اور اگر انہوں نے واقعی ڈیسائی کے ساتھ ایسا معاہدہ کیا تھا تو نوابزادہ صاحب نے اپنے اختیارات سے تجاوز کیا۔

دوسری جانب گاندھی جی کے علاوہ تمام کانگرسی رہنماؤں نے ڈیسائی کی لیاقت علی خان کے ساتھ بات چیت کی تردید کی اور ڈیسائی کی بڑی مذمت کی۔ انہیں اس کی اتنی زیادہ قیمت ادا کرنا پڑی کہ ان کا سیاسی کیریئر ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

لیاقت۔ ڈیسائی معاہدہ ہوا تھا یا نہیں، اس موضوع پر بحث کی گنجائش موجود ہے لیکن اس میں ذرہ برابر شک نہیں کہ اس " معاہدے " نے شملہ کانفرنس کے لئے راہ ہموار کر دی اور ڈیسائی کی پیش کردہ تجویز کے مطابق کانگرس اور مسلم لیگ مرکز میں عبوری حکومت میں وزراء کی مساوی تعداد پر رضا مند ہو گئیں۔ اس سے کانگرس اور

برطانوی حکومت نے یہ تسلیم کر لیا کہ مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے۔

باب(32)

"ہندوستان چھوڑ دو تحریک"

کرپس مشن کی ناکامی کے بعد ۱۴ جولائی ۱۹۴۲ء کو کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے ایک قرارداد پاس کی جس میں انگریزوں سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ فی الفور برعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش سے نکل جائیں۔ ۸ اگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی میں کانگرس کی ہائی کمان کا اجلاس منعقد ہوا جس میں شرکاء نے ورکنگ کمیٹی کے فیصلے کی توثیق کرتے ہوئے انگریزوں سے کہا کہ وہ اقتدار کانگرس کو سونپ کر یہاں سے فوراً چلے جائیں۔ اسی اجلاس میں کانگرس کی ہائی کمان نے انگریزوں پر یہ بات بھی واضح کر دی کہ وہ "وعدۂ فردا" پر یقین نہیں رکھتے اس لئے انہیں فوراً آزادی چاہیے۔ کانگرس نے اس موقع پر یہ بھی اعلان کیا کہ انگریزوں کے انخلا کے بعد یہاں عبوری حکومت قائم کی جائے گی جو ملک کے دفاع کا انتظام کرے گی اور کانگرس تمام اہم جماعتوں کو ساتھ لے کر چلے گی۔ کانگرس کی قائم کردہ عبوری حکومت مجلس قانون ساز تشکیل دے گی اور وہ مجلس ملک کے لئے آئین تیار کرے گی۔ مجوزہ آئین کا ڈھانچہ وفاقی طرز کا ہو گا جس میں صوبوں کو زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہو گی۔ اسی اجلاس میں کانگرس نے انگریزوں کے انخلاء اور اپنی حکومت کے قیام کے لئے حسب ضرورت تشدد یا عدم تشدد کے اصول پر وسیع پیمانے پر تحریک چلانے کا فیصلہ کیا۔

تحریک چلانے کے لئے وقت کا انتخاب:

اس زمانے میں عالمی جنگ ایک نازک مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ جاپانی افواج برق رفتاری کے ساتھ انڈونیشیا، جزائر انڈیمان ونکوبار، ملایا، سنگاپور اور برما پر قبضہ کرتی ہوئی آسام میں داخل ہو چکی تھیں۔ آسام کی دو ریاستیں منی پور اور امپھل پر جاپانیوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ جاپان کی فضائیہ نے کلکتہ پر بمباری کر کے وہاں

ہلچل مچا دی تھی ۔ گاندھی جی اور ان کے رفقاء کا یہ خیال تھا کہ اس بار برطانیہ کو فیصلہ کن شکست ہو گی اور وہ ہندوستان خالی کر کے بھاگ جائیں گے ۔ جاپانی افواج کے آسام میں داخلے سے گاندھی جی کو اپنی امید بر آتی نظر آنے لگی اور وہ لنگوٹ کس کر سیاسی اکھاڑے میں اترے ۔ انہوں نے " ہندوستان چھوڑ دو تحریک " کو " کھلی بغاوت " سے تعبیر کیا ۔

کانگرس کے رہنماؤں کی نظر بندی:

ایسے نازک مرحلے میں جب جاپانی افواج برِعظیم کے دروازے پر دستک دے رہی تھیں اور ان کے ہراول دستے آسام میں داخل ہو چکے تھے ، برطانوی حکومت گاندھی جی اور ان کے چیلوں کو " کھلی بغاوت " کی چھٹی نہیں دے سکتی تھی ۔ برطانوی حکومت کے لئے بیک وقت داخلی اور خارجی محاذوں پر لڑنا ممکن نہ تھا ۔ لہذا برطانوی حکومت نے ۹ اگست ۱۹۴۲ء کو کانگرس کو خلافِ قانون جماعت قرار دیتے ہوئے اس کے تمام بڑے بڑے رہنماؤں کو گرفتار کر کے احمد نگر کے قلعے میں نظر بند کر دیا ۔ البتہ گاندھی جی کے ساتھ اتنی رعایت ضرور برتی کہ انہیں احمد نگر کے قلعے کی بجائے پونا میں آغا خان محلس میں نظر بند کر دیا اور ان کی کبر سنی کی بنا پر ان کی دھرم پتنی کستورا بائی کو ان کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی ۔

کانگرسیوں کی وسیع پیمانے پر توڑ پھوڑ:

کانگرس کو خلافِ قانون جماعت قرار دینے اور کانگرسی رہنماؤں کی گرفتاری کے بعد کانگرسیوں نے ہندو اکثریت کے صوبوں میں وسیع پیمانے پر توڑ پھوڑ شروع کر دی ۔ یوپی کے مشرقی اضلاع غازی پور ، اعظم گڑھ ، جونپور ، بنارس اور الہ آباد میں باقی علاقوں کی نسبت زیادہ تشدد کے مظاہرے ہوئے ۔ کانگرسیوں نے " ستیہ اور اہنسا کے دیوتا " گاندھی جی کے ایماء پر ریلوے لائنیں اکھاڑ دیں ۔ پُلوں کو شدید نقصان پہنچایا ، ریلوے اسٹیشن جلا دیئے اور سگنل کا نظام تباہ کر دیا ۔ عدمِ تشدد کی پرچارک کانگرس کے تشدد پسند کارکنوں نے بنک اور ڈاک خانے لُوٹے اور جلائے ۔ ٹیلی فون اور

ٹیلیگراف کا نظام معطل کر دیا ، بجلی کے کھمبے اکھاڑ ڈالے ۔ ہوائی اڈوں کو نقصان پہنچانے سے بھی گریز نہ کیا ۔ برسات کا موسم تھا ، ریلوے ٹرینیں بند ہو جانے سے عوام کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ، اس کی روئداد ایک کانگرسی کارکن مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی ، مفتیِ اعظم دیوبند ، نے ماہنامہ "برہان" دہلی میں بڑے فخریہ پیرائے میں قلمبند کی ہے حالانکہ وہ خود بھی سیکڑوں میل پیدل چل کر ، گرتے پڑتے ، بھوکے پیاسے ، گرفتاری کے خوف سے چھپتے چھپاتے اور مسجدوں میں راتیں بسر کرتے ہوئے اپنے وطن پہنچے تھے ۔

آزاد ہند فوج:

کانگرس کے سابقہ صدر سبھاش چندر بوس ، ان کے رفقاء میں سے شاہنواز ، ڈھلوں اور سہگل بہت سے رضاکاروں کے ساتھ برِعظیم سے فرار ہو کر جاپانیوں سے جا ملے ۔ انہوں نے " آزاد ہند فوج " کے نام سے جاپانیوں کی سرپرستی میں ہندوستان کو انگریزوں کے شکنجے سے آزاد کرانے کے لئے ایک فوج تیار کر لی ۔ وہ جاپانی فضائیہ کی چھتری تلے جاپانی ٹینکوں پر بیٹھ کر برِعظیم میں داخل ہونے کا پروگرام بنا رہے تھے ۔ انہوں نے یہ کام بڑی پلاننگ کے ساتھ کیا تھا اور آزاد ہندوستان میں جاری کرنے کے لئے ڈاک کے ٹکٹ بھی چھپوا لئے تھے ، جو قیامِ پاکستان کے بعد بھی شائقین کے پاس فروخت کرنے کے لئے سنگاپور سے درآمد کئے جاتے تھے ۔

اتفاق سے سبھاش چندر بوس کا ایک ہوائی حادثے میں انتقال ہو گیا ۔ کانگرسی رہنما کئی سال تک لوگوں کو یہ کہہ کر تسلی دیتے رہے کہ انہیں فلاں ملک میں دیکھا گیا ہے اور وہ انگریزوں کے ہندوستان سے انخلاء کے بعد ہیرو بن کر آئیں گے ۔ جاپان کی شکست کے بعد " آزاد ہند فوج " گرفتار ہوئی اور ان پر لال قلعہ دہلی میں بغاوت کے جرم میں مقدمہ چلایا گیا جس میں پنڈت جواہر لعل نہرو اور متعدد کانگرسی وکلاء بطور وکیل صفائی پیش ہوتے رہے ۔

عوامی رَدِ عمل:

گاندھی جی کی توقع کے خلاف پس ماندہ طبقوں نے ان کے ساتھ تعاون نہ

کیا۔ اسی طرح اچھوت راہنما ڈاکٹر امبید کر نے بھی کانگرس کی پالیسی کو تنقید کا نشانہ بنایا ان کے ایما پر اچھوت اس تحریک سے الگ تھلگ رہے۔ دوسری جانب آزاد خیال کانگرسی راہنما سر تیج بہادر سپرو اور ایم آر جیکار نے گاندھی جی سے اتفاق نہ کیا۔ انڈین نیشنلسٹ لیگ نے "ہندوستان چھوڑ دو تحریک" کو گاندھی کی حماقت سے تعبیر کیا۔ اسی طرح کیمونسٹ پارٹی نے بھی اس تحریک کی مخالفت کی۔ ہندو مہاسبھا کے صدر وی ڈی ساورکر اور نائب صدر بھائی پرمانند نے مہاسبھائیوں سے پُر زور اپیل کی کہ وہ اس احمقانہ تحریک میں شامل نہ ہوں اور تو اور کانگرس کی حاشیہ بردار جماعت مجلسِ احرار کے راہنماؤں نے بھی اس تحریک میں کانگرس کا ساتھ دینے سے انکار کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ موجودہ نازک حالات میں سول نافرمانی غیر ضروری ہونے کے علاوہ غیر دانشمندانہ حرکت بھی ہے۔

مُسلم لیگ کا رویّہ:

مسلم لیگ اس تحریک سے کوسوں دُور رہی۔ سمجھدار مسلمان یہ جانتے تھے کہ اگر انگریز ہندو مسلم مسئلہ حل کئے بغیر یہاں سے نکل گیا تو کانگرس ہندو اکثریت کے بل بوتے پر ملک پر قابض ہو جائے گی اور مسلمانوں کو کانگرسی وزارتوں سے بھی زیادہ بُرا وقت دیکھنا پڑے گا۔ علاوہ ازیں کانگرس نے یہ تحریک شروع کرنے سے پہلے مسلم لیگ کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس جماعت نے حصول اقتدار کے بعد مسلمانوں کو تحفظات فراہم کرنے کی بھی کوئی ضمانت مہیا نہیں کی۔

مسلم لیگ کو اس کا احساس ہو گیا تھا کہ کانگرس انگریزوں کو اس نازک مرحلے میں مجبور کرکے برِعظیم سے نکالنا چاہتی ہے اور اس کے بعد وہ یہاں ہندو راج قائم کرے گی جس میں مسلمانوں کے علاوہ دوسری اقلیتیں بھی نقصان میں رہیں گی۔ اس صورت میں وہ مسلمانوں کو جبراً کانگرس میں شامل کریں گے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے کیا خوب کہا ہے کہ کانگرس کا مقصد حصولِ آزادی کی بجائے برِعظیم پاک وہند اور بنگلہ دیش میں ہندو راج قائم کرکے تحریکِ پاکستان کو کچلنا تھا۔ ان حالات میں قائداعظم نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ اس ہندوانہ اور مسلم مفادات کو کچلنے والی

تحریک سے الگ تھلگ رہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ہندوؤں پر یہ بھی واضح کر دیا کہ اگر انہوں نے موجودہ حالات میں مسلمانوں کے ساتھ کوئی زیادتی کی تو اس کا باقاعدہ جواب دیا جائے گا اور حالات خراب ہونے کی ذمہ داری عدم تشدد اور اہنسا کے دیوتا کے پیروؤں پر ہو گی۔

قائداعظم نے "ہندوستان چھوڑ دو تحریک" پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ کانگرس نے بندوق کی نوک پر اپنے مطالبات منوانے کی کوشش کی ہے اور یہ تحریک کی بجائے کھلی بغاوت اور خانہ جنگی ہے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے خیال میں کانگرس کی یہ تحریک غیر اخلاقی اور غیر آئینی تھی۔ کیونکہ اس کا سب سے بڑا مقصد قانون کے مطابق قائم شدہ حکومت کو ہٹانا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ملک کو خانہ جنگی کی طرف دھکیلنا تھا۔

قائداعظم نے اس موقع پر فرمایا کہ کانگرس کی بغاوت دراصل مسلم لیگ اور اپنی مخالف جماعتوں کے خلاف باقاعدہ اعلان جنگ ہے اور کانگرس نے ان جماعتوں کو اعتماد میں لئے بغیر اتنا بڑا قدم اٹھایا ہے۔

برطانوی پریس کا رَدِ عمل:

برطانوی پریس نے بھی اس تحریک کی پُر زور مذمت کی۔ لندن کے موقر رُوزنامہ ٹائمز (Times) نے جو برطانیہ کے اُونچے طبقے کا ترجمان ہے، ۱۰ اگست ۱۹۴۲ء کے شمارے میں اس صورت حال کو کرپس کی پیشکش ٹھکرانے کا نتیجہ قرار دیا۔ ٹائمز نے کانگرس اور خاص طور پر گاندھی جی کو کرپس کی پیشکش مسترد کرنے اور یہ ہنگامہ کھڑا کرنے کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ لندن ہی کے ایک کثیر الاشاعت اخبار ڈیلی ٹیلیگراف نے ۱۹ اور پھر ۲۳ اگست کے شمارے میں کانگرس کی اس تحریک کو "غیر ذمہ دارانہ حماقت" اور واردھا کے باسی گاندھی کی بے عقلی قرار دیا۔ اس اخبار نے یہ بھی لکھا کہ گاندھی اور اس کے رفقاء اقتدار حاصل کرنے کے لئے پاگل ہوئے جا رہے ہیں۔ ٹیلیگراف نے اس موقع پر یہ بھی تحریر کیا کہ اس تحریک کا مقصد برِعظیم میں انگریزوں کے اخراج کی بجائے جاپانیوں کے داخلے کے لئے راہ ہموار کرنا ہے۔

لندن کے ایک مقبول اخبار "آبزرور" نے ۱۹ جولائی کی اشاعت میں یہ لکھا کہ اسے ایک سیاسی جماعت (کانگرس) یا ایک فرد (گاندھی) کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہے، کیونکہ وہ فرد واحد گاندھی برِعظیم میں آمریت قائم کرنا چاہتا ہے جو بغاوت اور بدامنی پر منتج ہوگی اور حقائق کی رُوشنی میں یہ اقدام نادرست ہے۔ لندن ہی کے ایک اور اخبار "سپکٹیٹر" نے اپنی ۱۹ اگست کی اشاعت میں تحریر کیا کہ اس نازک مرحلے پر جب جاپانی ہندوستان کے دروازے پر دستک دے رہے ہیں اور جنرل رُومیل مصر پر قبضہ کرکے نہر پر کنٹرول حاصل کرنے کے لئے العالمین کی جانب پیش قدمی کر رہا ہے، گاندھی نے یہ ہنگامہ برپا کرکے جاپانیوں کو زیر بار احسان کیا ہے۔ لندن کے ایک موقر اخبار اکانومسٹ نے اس ہنگامے کو کانگرس کے ایسے جُرم سے تعبیر کیا جس کا اعتراف مجرم کو بھی ہو۔

جے سی فرنچ نامی ایک دانشور نے "نیشنل ریویو National Review" نامی ایک مجلّے میں "دی انڈین کانگرس ان ایکشن" کے عنوان سے دسمبر ۱۹۴۲ء کے شمارے میں ایک عالمانہ مضمون شائع کرایا، جس میں اس تحریک کو ایسی بغاوت قرار دیا جس کے ذریعے ایک فرعون مزاج اقلیت اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتی تھی۔

انگلستان کے علاوہ امریکہ اور یورپ کے پریس نے بھی اس نازک موقع پر کانگرس کے اس احمقانہ اقدام کی پُرزور مذمت کی۔ "دی نیویارک ٹائمز" نے ۱۱ اگست ۱۹۴۲ء کے شمارے میں لکھا کہ برِعظیم میں حالیہ بغاوت، جیسا کہ ہم اور ہندوستانیوں کی اکثریت جانتی ہے، حصولِ آزادی کی کوشش نہیں ہے۔ گاندھی کے "میٹھے بول" کے پیچھے صاف طور پر ہنگامہ پسند ہجوم کا شور اور زنجیروں کی جھنکار سنائی دے رہی ہے اور یہ زنجیریں یقیناً انگریزوں کی مہیا کردہ نہیں ہیں۔ کچھ اسی طرح کے اداریے سویڈن، آسٹریلیا اور ترکی کے اخبارات نے بھی شائع کیے۔

(بشکریہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی)

دنیا بھر کے انصاف پسند اخبارات نے کانگرس اور گاندھی جی کے آمرانہ اور احمقانہ اقدام کی پُرزور مذمت کی، جس سے برطانوی حکومت کے ہاتھ مضبوط ہوئے اور انگریزوں نے ہمت سے کام لیتے ہوئے چند ہفتوں کے اندر اس تحریک کو کچل کر رکھ

دیا اور "۔ سی جی کا ہندوستان میں بلا شرکتِ غیرے ہندو راج قائم کرنے کا خواب خاک میں ملا دیا۔

جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے:

اس زمانے میں ابوالکلام آزاد کانگرس کے صدر اور ہندوؤں کے ترجمان تھے۔ اسی بنا پر قائداعظم انہیں "شو بوائے آف کانگرس" کہا کرتے تھے۔ آزاد نے اپنی تصنیف "انڈیا وِنز فریڈم" میں اس حقیقت کا برملا اعتراف کیا ہے کہ کانگرس نے مئی ۱۹۴۲ء میں یہ پلان تیار کیا کہ جونہی جاپانی افواج بنگال میں داخل ہوں اور انگریزوں کی فوج بہار کی جانب پسپائی اختیار کرے تو کانگرسی نیتا (لیڈر) بنگال میں داخل ہو کر انتظام حکومت سنبھال لیں (اور وہ پورے ہندوستان کا حکمران ہونے کا دعویٰ کرکے گوریوں سے اپنی حکومت تسلیم کروالیں)۔

آزاد لکھتے ہیں کہ گاندھی جی اور ان کے رفقا، اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ جاپانی برِعظیم میں ہندوستانیوں کے دشمن بن کر نہیں، بلکہ انگریزوں کے دشمن بن کر آ رہے ہیں۔ کانگرسیوں کا یہ بھی خیال تھا کہ اگر انگریز جاپانیوں کی آمد سے قبل برِعظیم خالی کر گئے تو پھر جاپان برِعظیم پر حملہ نہیں کرے گا۔ آزاد رقمطراز ہیں کہ گاندھی جی کا یہ خیال تھا کہ ان حالات میں برطانیہ ان سے استدعا کرے گا کہ وہ جاپانیوں کو برِعظیم میں داخل ہونے سے رُوکنے کے لئے تحریک چلائیں۔ گاندھی جی یہ سمجھ رہے تھے کہ موجودہ حالات میں انگریز انہیں گرفتار نہیں کریں گے۔

"ہندوستان چھوڑ دو تحریک" کی کامیابی کا تمام تر دارو مدار جاپان کے برِعظیم پر حملے، انگریزوں کی ہزیمت اور یہاں سے انخلا پر تھا اور اس بحران سے فائدہ اٹھانے کے لئے بقول ایچ جی راولنسن عدم تشدد اور اہنسا کی علمبردار جماعت کانگرس نے "غنڈوں" کی ایک فوج بھی تیار کرلی تھی۔ کانگرس یہ جانتی تھی کہ اگر آزادی جنگ کے خاتمے تک ملتوی کر دی جائے، جیسا کہ کرپس نے کہا تھا تو اس وقت تک تقسیمِ ہند یقینی ہو جائے گی اور پاکستان بن جائے گا، لہٰذا جو کچھ بھی لینا ہے وہ فی الفور لے لو۔

کانگرس پورے برِعظیم پر حکومت کرنے کا خواب دیکھ رہی تھی لیکن

امریکہ کی جنگ میں شمولیت کے بعد عالمی سیاست کا نقشہ ہی بدل گیا اور گاندھی جی کا برِعظیم میں ہندو راج قائم کرنے کا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ نیز مسلم لیگ اور کانگرس کی مخالف جماعتوں کے عدمِ تعاون کی بنا پر یہ تحریک خود بخود دب گئی۔

دوسری جانب مسلم لیگ نے گاندھی جی کے اقدام کی پُر زور مذمت کی اور مسلمانوں کو اس تحریک میں شامل ہونے سے رُوکا۔ قائداعظم نے گاندھی جی کی تحریک "ہندوستان چھوڑ دو" کے جواب میں انگریزوں سے کہا- "تقسیم کرو اور چلے جاؤ" (Divide and Quit)

انگریزوں نے جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے پُوری سختی کے ساتھ تین چار ہفتوں کے اندر اس تحریک کو کچل کر رکھ دیا اور یوں مسلمان ہندوؤں کے غلام بن جانے سے رہ گئے۔

باب (33)

ویول پلان

وزیرِ امورِ ہند کا بیان:

وائسرائے ہند لارڈ ویول مئی ۱۹۴۵ء میں برِعظیم کے مسائل کے حل کے لئے بات چیت کرنے کی غرض سے لندن گیا۔ وہاں اس کی ملاقات وزیرِاعظم برطانیہ اور وزیرِ امورِ ہند سے ہوئی۔ ۱۴ جون ۱۹۴۵ء کو وزیرِ امورِ ہند نے برطانوی دارالعوام میں ایک بیان دیا کہ برطانوی حکومت نئے دستور کی تیاری میں ہندوستانیوں کی ہر ممکن مدد کرنا چاہتی ہے۔ نیز وہ ہندوستانیوں پر ادارے قائم کرکے مسلط نہیں کرنا چاہتے اور نہ ہی برِعظیم کے باشندوں کی مرضی کے خلاف وہاں کوئی تبدیلی عمل میں لائیں گے۔ برِعظیم کے سیاسی رہنما جاپان کے خلاف جنگ میں تعاون کریں اور اس کے لئے تجاویز بھی دیں فتح کے بعد برِعظیم کی تعمیرِ نَو پر خصوصی توجہ دی جائے گی۔ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کی تشکیلِ نَو ہونے والی ہے اور وائسرائے سیاسی جماعتوں سے ہی اپنی ایگزیکٹو کے لئے ممبر لے گا اور اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا تناسب مساوی ہو گا۔

وزیرِ امورِ ہند نے یہ بھی کہا کہ وائسرائے تمام سیاسی رہنماؤں کی کانفرنس بلائے گا اور ان کے سامنے مذکورہ بالا تجاویز رکھے گا۔ وہ سیاسی جماعتوں سے اپنی ایگزیکٹو کونسل کے لئے ارکان کی فہرست طلب کرے گا اور اس فہرست میں سے اپنی ایگزیکٹو کونسل کے لئے ممبر نامزد کرے گا۔ کمانڈر ان چیف کے علاوہ کونسل کے تمام ارکان ہندوستانی ہوں گے۔ اگر مرکز میں یہ تجربہ کامیاب رہا اور حکومت کو تعاون ملا تو پھر صوبوں میں دفعہ ۹۳ ختم کرکے وہاں وزارتیں قائم کی جائیں گی، جن میں بڑی سیاسی جماعتوں سے وزیر لئے جائیں گے۔

وزیرِ امورِ ہند نے اس بات کی بھی وضاحت کر دی کہ محکمہ امورِ خارجہ

بھی ہندوستانی وزیر کے سپرد کر دیا جائے گا ۔ البتہ قبائلی امور اور سرحدی معاملات جس کا دفاع سے تعلق ہے وہ وزیر خارجہ کے دائرہ اختیار سے باہر ہوں گے ۔

وائسرائے کی نشری تقریر:

اُسی روز لارڈ ویول نے ریڈیو پر اپنی تقریر نشر کی ۔ جس میں اس منصوبے کی وضاحت کی ۔ اس نے کہا کہ وزراء موجودہ دستور کے مطابق کام کریں گے اور وائسرائے بلاوجہ اپنے خصوصی اختیارات استعمال نہیں کرے گا ۔ وائسرائے نے اس بات کا بھی یقین دلایا کہ عبوری حکومت کا قیام دستور سازی میں رکاوٹ نہیں بنے گا ۔ وائسرائے نے شملہ میں کانفرنس بلانے کا اعلان کیا جس میں تمام صوبائی وزرائے اعلیٰ اور جہاں گورنر راج نافذ ہے وہاں کے سابق وزرائے اعلیٰ ، مرکزی اسمبلی میں کانگرس پارٹی کا قائد اور مسلم لیگ کا نائب صدر ، کانگرس اور مسلم لیگ کے کونسل آف سٹیٹ میں رہنما ، گاندھی جی اور قائداعظم ، اچھوتوں کے رہنما شیو راج اور سکھ رہنما ماسٹر تارا سنگھ مدعو کئے جائیں گے ۔ ان مدعوین کی تعداد ۲۱ تھی ۔

کانگرس کا ردِّ عمل:

۱۷ جون کو گاندھی جی نے وائسرائے کے نام تار ارسال کیا جس میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں ہندو اور مسلم ممبروں کی مساوی تعداد پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا تھا ۔ ۲۱ اور ۲۲ جون کو کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا ۔ جس میں کانگرسی نمائندوں کو اس بات کی ہدایت کی گئی کہ وہ اس بات کا خیال رکھیں کہ:

۱ ۔ یہ انتظامات بالکل عارضی ہوں گے ۔

۲ ۔ ایگزیکٹو کونسل میں فرقہ وارانہ مساوات ناقابلِ قبول ہے ۔

۳ ۔ اس مساوات کا اطلاق صوبوں پر بالکل نہیں ہوگا ۔

۴ ۔ مساوات کا اصول وقتی طور پر مان لینے سے یہ ہرگز مراد نہیں ہے کہ تمام نمائندے صرف مسلم لیگ سے لئے جائیں گے ۔

مسلم لیگ کا ردِّ عمل:

قائداعظم نے ۲۵ جون کو ایک بیان جاری کیا ۔ اس وقت تک کانگرس کا

نقطہ نظر کھل کر سامنے آ چکا تھا ۔ قائداعظم نے دو ٹوک الفاظ میں فرمایا کہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں تمام مسلمان ممبر صرف مسلم لیگ ہی نامزد کرے گی ۔ اچھوت اور سکھ لازمی طور پر کانگرس کا ساتھ دیں گے ، اس لئے کونسل میں کانگرس کے ووٹ بڑھ جائیں گے اور مذکورہ بالا تجاویز میں اس بات کی ضمانت نہیں دی گئی کہ کانگرس دوسری جماعتوں کو نہیں دبائے گی ۔ نیز کانگرس اکثریتی دونوں سے اپنی مرضی کے فیصلے کر سکے گی ۔ اس لئے مسلم لیگ اس مسئلے پر غور کرنے کے بعد ہی حکومت میں شرکت کا فیصلہ کرے گا ۔

شملہ کانفرنس:

۲۵ جون ۱۹۴۵ء کو شملہ میں لارڈ ویول نے کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے ۱۴ جون کو دارالعوام میں ہونے والی وزیر امورِ ہند کی تقریر اور اسی روز ریڈیو سے نشر ہونے والی اپنی تقریر کی وضاحت کی اور مندوبین کے سوالات کے جواب دیئے ۔ اسی روز کانفرنس کے دوسرے سیشن میں کانگرس کے نمائشی صدر (کیونکہ اصل آمر مطلق گاندھی جی تھے) ابُوالکلام آزاد نے اعتراضات شروع کر دیئے ۔ انہوں نے کہا کہ انگریز کا اپنا مزاج ہے اور کانگرس فرقہ وارانہ سطح سے بالاتر ہو کر سوچتی ہے اس لئے وہ ایسے کسی پلان میں شریک نہیں ہوگی جس سے اس کے اجتماعی کردار کو نقصان پہنچے ۔ قائداعظم نے اس سیشن میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ مسلم لیگ پاکستان سے کم کسی بات پر راضی نہیں ہوگی تاہم وہ ہندو مسلم مساوات کے اصول پر تعاون کے لئے تیار ہے ۔

۲۶ جون کو وائسرائے کے بیان پر غور و خوض کیا گیا اور فرقہ وارانہ مساوات پر تنازعہ شروع ہو گیا ۔ ابُوالکلام آزاد کا یہ کہنا تھا کہ مسلم لیگ برعظیم کے تمام مسلمانوں کی نمائندگی نہیں کرتی ، اس لئے کونسل میں ایک مسلم نمائندہ غیر مسلم لیگی ہونا چاہیے ۔ صوبہ سرحد کے کانگرسی وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب (م ۱۹۵۸ء) اور پنجاب کے وزیر اعلیٰ ملک خضر حیات خان ٹوانہ (م ۱۹۷۵ء) نے بھی ابُوالکلام آزاد کے مطالبے کی پُر زور تائید کی ۔ قائداعظم نے اس بات پر اصرار کیا کہ کونسل میں صرف اور صرف مسلم

لیگ ہی مسلم نمائندے بھیجے گی۔

۲۷ جون کو مختصر سی کارروائی کے بعد اجلاس اگلے رُوز تک کے لئے ملتوی کر دیا گیا اور قائداعظم اور پنڈت گووند ولبھ پنت (م ۱۹۶۱ء) سے کہا گیا کہ وہ مل کر چند امور پر غور کرلیں۔ اسی شام قائداعظم نے وائسرائے سے ملاقات کرکے اس پر یہ بات واضح کر دی کہ مسلم لیگ، کونسل میں غیر مسلم لیگی رکن کی نامزدگی کی مخالفت کرے گی۔

۲۸ جون کو جب کانفرنس کی کارروائی شروع ہوئی تو مندوبین کو مطلع کیا گیا کہ قائداعظم اور پنڈت گووند ولبھ پنت کی بات چیت ناکام ہو گئی ہے۔ وائسرائے نے قائداعظم سے کہا کہ مسلم لیگ کے نمائندوں کی ایک فہرست اسے دیدیں اور ابُوالکلام آزاد سے کہا کہ وہ کانگرس کے نمائندوں کے نام اسے بھجوا دیں۔ وائسرائے نے ان سے کہا کہ اس فہرست میں کم از کم آٹھ اور زیادہ سے زیادہ بارہ نام ہوں۔ اس کے بعد ۱۴ جولائی تک کانفرنس ملتوی کر دی گئی۔

کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے ۳ اور ۶ جولائی کو دو اجلاس منعقد کئے اور ایک فہرست تیار کرکے وائسرائے کو بھجوا دی۔ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ۶ جولائی کو منعقد ہوا فیصلے کے مطابق ۷ جولائی کو قائداعظم نے ویول کے نام ایک خط میں تین تجاویز پیش کیں:

۱۔ مسلم لیگ سے نمائندوں کی فہرست طلب نہ کی جائے۔ قائداعظم اور ویول بات چیت کے بعد ارکان نامزد کریں گے۔

۲۔ کونسل کے تمام مسلم ارکان، مسلم لیگ سے لئے جائیں گے۔

۳۔ کونسل میں تمام فیصلے چونکہ اکثریتی ووٹ سے کئے جائیں گے اور اچھوتوں اور سکھوں کے نمائندے لازماً کانگرس کی حمایت میں ووٹ ڈالیں گے لہذا مسلمانوں کے مفادات کی ضمانت فراہم کی جائے۔

۸ جولائی کو قائداعظم اور ویول کی اس موضوع پر گفتگو ہوئی اور ۹ جولائی کو ویول نے تحریری طور پر قائداعظم کو مطلع کیا کہ اسے افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ کونسل کے تمام مسلمان ارکان، مسلم لیگ سے نہیں لئے جا سکتے۔ اسی رُوز قائداعظم نے

وائسرائے کو تحریری طور پر مطلع کر دیا کہ ان حالات میں مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی اسے ناموں کی فہرست نہیں دے سکتی۔

۱۱ جولائی کو قائداعظم کی ویول کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ ویول نے ان سے کہا کہ مسلم لیگ ۴ ارکان نامزد کر دے پانچواں مسلمان رُکن پنجاب سے لیا جائے گا۔ قائداعظم نے وائسرائے سے کہا کہ مسلم لیگ ایسا نہیں کرنے دے گی اور ان حالات میں مسلم لیگ اس کے ساتھ تعاون نہیں کر سکتی۔

۱۴ جولائی ۱۹۴۵ء کو کانفرنس کا آخری اجلاس منعقد ہوا، جس میں وائسرائے نے یہ اعتراف کیا کہ اس کی تمام مساعی ناکام ہو چکی ہیں۔ اس نے ناکامی کا ذمہ دار کسی اور کو ٹھہرانے کی بجائے اس کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔

کانفرنس کی ناکامی پر قائداعظم نے ایک بیان میں فرمایا کہ کانگرس اور مسلم لیگ کا اپنا اپنا نقطۂ نظر ہے۔ کانگرس متحدہ ہندوستان کی حامی ہے اور مسلم لیگ تقسیم ہند اور پاکستان کی طرف دار ہے۔ ان حالات میں دونوں جماعتیں کونسل میں تمام امور پر دو مختلف زاویوں سے نظر ڈالتیں اور بحران پیدا ہو جاتا۔ اس کے علاوہ اچھوت اور سکھ نمائندوں کے وُوٹ بھی کانگرس کے حق میں جاتے۔ اس طرح وہ کونسل میں بالا دستی حاصل کر لیتی۔ علاوہ ازیں کانگرس حکومت کے اختیارات حاصل کرکے قیام پاکستان کو ناممکن بنا دیتی۔

برطانوی اور ہندو پریس کا رَدِّ عمل:

شملہ کانفرنس کی ناکامی پر، جیسا کہ متوقع تھا، برطانوی اور ہندو پریس نے اس کا ذمہ دار قائداعظم کو ٹھہرایا۔ لندن کے موقر رُوزنامہ "ٹائمز" (Times) نے جو برطانیہ کے اُونچے پائے کے سیاست دانوں کا ترجمان سمجھا جاتا ہے، لکھا کہ ویول نے اگرچہ کانفرنس کی ناکامی اپنے سر لے لی ہے لیکن قائداعظم اور مسلم لیگ بھی اس کے بڑی حد تک ذمہ دار ہیں۔ لندن کے ایک کثیر الاشاعت رُوزنامے "ڈیلی ٹیلی گراف" (Daily Telegrdph) نے لکھا کہ شملہ کانفرنس کی ناکامی کا سبب ہندوؤں اور مسلمانوں کی پُرانی مخاصمت ہے۔ اسی طرح لندن کے اخبار "نیوز کرانیکل" (News

(Chronicle) نے ناکامی کی تمام تر ذمہ داری قائداعظم پر ڈالی ۔ ایسے ہی خیالات کا اظہار "آبزرور" (Observer) نے بھی کیا (بشکریہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی) ۔ ہندو اخبارات نے بھی حسب عادت بڑا شور مچایا اور قائداعظم کو ضدی اور ہٹ دھرم تک کہنے سے بھی گریز نہ کیا۔

ہمارے نقادوں کا یہ کہنا ہے کہ قائداعظم اس بحران کے ذمہ دار نہ تھے ۔ اگر وہ یہ کہتے تھے کہ تمام مسلم ارکان مسلم لیگ سے لئے جائیں کیونکہ وہ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے تو وہ اس میں حق بجانب تھے ۔ اگلے انتخابات میں مسلم لیگ نے مرکزی اسمبلی میں سو فیصد کامیابی حاصل کرکے ان کے اس دعویٰ کی توثیق کر دی اور دوسری جانب مسلمانوں نے بھی مسلم لیگ کو کامیاب بنا کر ان کے دعوے کو سچ کر دکھایا ۔ ثانیاً ، قائداعظم شملہ کانفرنس میں صرف مسلمانوں ہی کی نمائندگی نہیں کر رہے تھے ۔ انڈین کرسچین ایسوسی ایشن اور ساؤتھ انڈین لبرل فیڈریشن کا کوئی نمائندہ شملہ کانفرنس میں مدعو نہ تھا ۔ قائداعظم ان کی نمائندگی بھی کر رہے تھے ۔

باب (34)

عام انتخابات

شملہ کانفرنس کی ناکامی غیر متوقع نہ تھی ۔ اس کے بعد کانگرس اور مسلم لیگ میں معرکہ آرائی تیز تر ہو گئی ۔ کانگرس برعظیم کے تمام باشندوں کی بلاتمیز مذہب و ملت ، نمائندہ جماعت ہونے کی دعویدار تھی اور مسلم لیگ مسلمانوں کی بلا شرکتِ غیرے نمائندگی کا دعویٰ کر رہی تھی ۔ ان دعووں کی تصدیق کا ایک ہی ذریعہ تھا کہ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کرائے جاتے ۔ یُوں بھی مسلم لیگ نے شملہ کانفرنس کے دوران ہی انتخابات کا مطالبہ کر دیا تھا ۔

وائسرائے کا اعلان:

۲۱ اگست ۱۹۴۵ء کو وائسرائے نے دو اہم اعلانات کئے ۔ اولاً یہ کہ آئندہ موسم سرما میں مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کرائے جائیں گے ۔ ثانیاً یہ کہ وہ جلد ہی برطانوی حکومت سے صلاح و مشورہ کی غرض سے لندن جا رہا ہے ۔

وائسرائے لارڈ ویول نے ۲۴ اگست تا ۱۶ ستمبر برطانیہ کا دورہ کیا اور ۱۹ ستمبر کو اس نے یہ اعلان کیا کہ انتخابات کے بعد دستور ساز اسمبلی قائم کی جائے گی اور سیاسی جماعتوں کے تعاون سے ایگزیکٹو کونسل تشکیل دی جائے گی ۔ اس اعلان پر تبصرہ کرتے ہوئے مسلم لیگ کے ترجمان نے کہا کہ ان کی جماعت پاکستان کے علاوہ اور کسی حل پر یقین نہیں رکھتی ۔ کانگرسی رہنماؤں نے کہا کہ وائسرائے کی تجاویز نا مناسب ، غیر تسلی بخش اور مبہم ہیں کیونکہ ان میں آزادی کا ذکر نہیں کیا گیا ۔

انتخابات کی تیاری:

وائسرائے کے اعلان کے بعد دونوں بڑی سیاسی جماعتیں انتخابات کی

تیاری میں مصروف ہوگئیں۔ آئندہ انتخابات اس لحاظ سے بڑے اہم تھے کہ ان کے نتائج پر برِّعظیم کے مستقبل کا دار و مدار تھا۔ مسلم لیگ نے اپنے منشور میں یہ کہا کہ وہ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے اور مسلمان برِّعظیم میں اقلیت نہیں بلکہ ایک قوم ہیں۔ ثانیاً برِّعظیم کے تمام سیاسی مسائل کا واحد سنجیدہ حل قیامِ پاکستان ہے۔ کانگرس نے حسبِ سابق برِّعظیم کے تمام باشندوں کی نمائندہ جماعت ہونے اور برِّعظیم کو متحد رکھنے کا نعرہ بلند کیا۔ اس طرح یہ انتخابی مہم نظریاتی جنگ میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔

قائداعظم نے پُورے ملک کا دَورہ کیا اور مسلمانوں سے یہ اپیل کہ وہ آپس کے اختلافات ختم کرکے متحد ہو جائیں اور مل کر دشمن کا مقابلہ کریں۔ انہوں نے اپنے دَوروں میں غیر مسلم لیگی مسلمانوں سے یہ اپیل کی کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو کر اس جماعت کو مضبوط بنائیں۔ اسی زمانے میں یہ نظم بڑی مقبول ہوئی جس کا ایک مصرع یوں ہے:

مُسلم ہے تو مُسلم لیگ میں آ

کانگرسی اخبارات اور رہنماؤں نے قائداعظم اور مسلم لیگ کے خلاف محاذ کھول دیا۔ دنیا کی کوئی برائی اور انسانی کمزوری ایسی نہ تھی جو انہیں قائداعظم کی ذات ستودہ صفات میں دکھائی نہ دیتی ہو۔ کانگرس کے زرخرید مُفتیوں اور زُلہ رُبا مولویوں نے ان کے خلاف کفر کے فتوے صادر کئے اور مشہور احراری رہنما مظہر علی اظہر (م ۱۹۷۳ء) نے انہیں "کافرِ اعظم" کے خطاب سے نوازا۔ جمعیتُ العلماء ہند پُورے ساز و سامان کے ساتھ مسلم لیگ کے خلاف میدان میں نکلی۔ لُدھیانہ میں کانگرس اور جمعیتُ العلماء ہند کے مشترکہ جلسے میں مولوی حبیب الرحمٰن لُدھیانوی (م ۱۹۵۶ء) نے یہ بڑ ہانکی کہ اس نے مُسلم لیگ کو لُدھیانہ میں دفن کر دیا ہے۔ احراریوں نے اس سے بھی زیادہ سخت زبان استعمال کی اور ان کے سب سے بڑے سیف زبان مقرر نے دہلی دروازے سے باہر ایک جلسے میں یہ اعلان کیا کہ اگر پاکستان بن گیا تو وہ گدھے کے پیشاب کے ساتھ اپنی داڑھی منڈوا دے گا۔ اس مخالفت کے طوفان میں قائداعظم نے ملک کے طول و عرض میں طوفانی دَورے کرکے مسلم لیگ کی کامیابی کو یقینی بنایا۔

کانگرس نے ہندوؤں میں یہ پروپیگنڈا شروع کیا کہ تقسیمِ ہند گئو ماتا کے

ٹکڑے کرنے کے مترادف ہوگی اس لئے اسے ہر قیمت پر رُوکا جائے گا۔ کانگرس نے مسلم لیگ کو رجعت پسند جماعت قرار دیا کیونکہ ان کے خیال میں یہ ملک کو چودہ سو سال پیچھے لے جانا چاہتی تھی۔ سیٹھ گھنشام داس برلا نے تقسیمِ ہند کو رُوکنے کے لئے اپنی تجوریوں کے مُنہ کھول دیئے اور مُومن کانفرنس، احرار، شیعہ پولیٹیکل کانفرنس، یُونینسٹ پارٹی، سُرخپوش اور جمعیتُ العلماء ہند کانگرس کی ہمنوا بن گئیں۔ ان سب جماعتوں نے مل کر انتخابات کے موقع پر بمبئی میں قائداعظم کے مقابلے میں ایک شیعہ سرمایہ دار سیٹھ حسین بھائی لالجی کو کھڑا کیا اور کانگرس نے سیکولرازم کی دعوے دار جماعت ہونے کے باوجود مذہب کے نام پر شیعہ حضرات سے اپیل کی کہ وہ حسین بھائی لالجی کو کامیاب کرائیں۔

انتخابات کے نتائج:

دسمبر ۱۹۴۵ء میں مرکزی اسمبلی کے انتخابات ہوئے تو مسلم لیگ نے مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی ۳۰ میں سے ۳۰ نشستیں حاصل کرکے سو فیصد کامیابی حاصل کی اور اپنے مخالفین کی ضمانتیں ضبط کرا دیں۔ مورخہ ۲۰ اگست ۱۹۸۴ء کو ہمارے اخبارات میں جمعیتُ العلماء ہند کی پاکستان میں صحیح جانشین جمعیتُ العلماء اسلام کے ایک رہنما مولوی فضل الرحمٰن کا بیان شائع ہوا ہے کہ مسلم لیگ کے علاوہ مسلمانوں کی دوسری تمام جماعتیں قیامِ پاکستان کے خلاف تھیں۔ اس سے قبل مولوی فضل الرحمٰن کے والد مُفتی محمود (م ۱۹۸۰ء) کا ایک بیان اخبارات میں چھپا تھا جس میں مفتی صاحب نے یہ کہا تھا: "خدا کا شکر ہے کہ وہ پاکستان بنانے کے گناہ میں شریک نہیں تھے"۔ دسمبر ۱۹۴۵ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کی سو فیصد کامیابی اجماعِ اُمت کا درجہ رکھتی تھی اور ان انتخابات میں مُفتی محمود اور فضل الرحمٰن کی جماعت کے امیدواروں کی ضمانتیں ضبط ہو گئی تھیں اور قیامِ پاکستان کی مخالف کوئی جماعت اپنا ایک بھی اُمیدوار مرکزی اسمبلی میں بھجوانے میں ناکام رہی تھی۔ ان انتخابات نے مسلم لیگ کے اس دعوے کی تصدیق کر دی کہ وہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور پاکستان مسلمانوں کا واحد مطمعِ نظر ہے۔ عوام نے ان انتخابات میں مسلم لیگ کے علاوہ

مسلمانوں کی تمام دوسری جماعتوں کو مسترد کر دیا۔

مرکزی اسمبلی میں جماعتوں کا تناسب:

انتخابات کے بعد مرکزی اسمبلی میں سیاسی جماعتوں کی نمائندگی کا تناسب یوں تھا:

کانگرس	۵۷ نشستیں
مسلم لیگ	۳۰ نشستیں
آزاد ارکان	۵ نشستیں
اکالی دَل	۲ نشستیں
یورپین	۸ نشستیں
کل نشستیں	۱۰۲

۱۰۲ کے ایوان میں کانگرس نے صرف ۵۷ نشستیں حاصل کی تھیں یعنی ۵۸ فیصد سے کم۔ اس طرح اس کا پورے برِّعظیم کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کا دعویٰ باطل ہو گیا اور اس کی ژلہ رُبا جماعتیں بغلیں جھانکنے لگیں۔

صوبائی انتخابات:

۱۹۴۶ء کے آغاز میں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات منعقد ہوئے۔ مسلمانوں کے لئے صوبائی اسمبلیوں میں ۴۹۲ نشستیں مخص تھیں جن میں سے مسلم لیگ نے ۴۲۸ نشستیں جیت لیں۔

سندھ میں مسلم لیگ اور اس کی مخالف جماعتوں کے نمائندوں کی تعداد برابر رہی تھی۔ اس طرح کوئی جماعت بھی وزارت بنانے سے قاصر تھی۔ ان حالات میں سندھ میں دوبارہ انتخابات کرائے گئے اور اس بار مسلم لیگ واضح اکثریت کے ساتھ کامیاب ہوئی اور سر غلام حسین ہدایت اللہ وزیرِ اعلیٰ مقرر ہوئے۔

آسام میں گوپی ناتھ باردولائی وزیرِ اعلیٰ مقرر ہوا۔ اس نے اپنی کابینہ میں لیگ کو دو وزارتوں کی پیشکش کی جو مسلم لیگ نے مسترد کر دی۔ اسی طرح یوپی، بہار، اڑیسہ، بمبئی، مدراس اور سی پی میں کانگرسی وزرائے اعلیٰ نے مسلم لیگ کو یہ پیشکش کی

(کانگرس کی پیش کردہ شرائط ایسی شرائط ۱۹۳۷ء میں ابُوالکلام آزاد نے چوہدری خلیق الزمان کے سامنے رکھی تھیں) پر کابینہ میں مسلم لیگی وزیر لئے جا سکتے ہیں۔ مسلم لیگ نے ان ذلت آمیز شرائط پر کانگرس کے ساتھ تعاون کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

صوبہ سرحد میں کانگرس اور سُرخپوش جو دراصل ایک ہی تصویر کے دو رُخ تھے، انتخابات میں اکثریت حاصل کر گئے۔ اس لئے وہاں ڈاکٹر خاں صاحب (م ۱۹۵۸ء) نے وزارت تشکیل دی۔

بنگال اسمبلی میں کل ۲۵۰ نشستیں تھیں۔ ان میں سے مسلم لیگ نے ۱۱۳ نشستیں حاصل کیں۔ حسین شہید سہروردی (م ۱۹۶۳ء) نے کانگرس کی طرف دستِ تعاون بڑھایا لیکن کانگرس تعاون کرنے پر رضامند نہ ہوئی۔ اس کے بعد حسین شہید سہروردی نے آزاد ارکان کی مدد سے کابینہ بنانے میں کامیابی حاصل کر لی۔

پنجاب میں کابینہ سازی کا مسئلہ:

پنجاب میں مسلمانوں کے لئے ۸۶ نشستیں مخص تھیں۔ ان میں سے مسلم لیگ نے ۷۵ نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ بعد ازاں یونینسٹ پارٹی کے ۴ ارکان مسلم لیگ میں شامل ہو گئے جس سے مسلم لیگ کے پاس ۷۹ نشستیں ہو گئیں۔ یونینسٹ پارٹی نے کل ۲۰ نشستیں حاصل کی تھیں۔ اس کے چار ارکان مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور ۴ ارکان آزاد ممبروں سے جا ملے۔ اس طرح یونینسٹ پارٹی کے پاس صرف ۲۰ نشستیں رہ گئیں۔ ان حالات میں کانگرسی راہنما ابُوالکلام آزاد نے لاہور میں چھاؤنی ڈال دی۔ آزاد نے مسلم لیگ کو وزارت سازی سے روکنے کے لئے کانگرسی اور سکھ ارکان اسمبلی کا پورا وزن یونینسٹ پارٹی کے پلڑے میں ڈال دیا اور یوں ملک خضر حیات خاں ٹوانہ کابینہ بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ یاد رہے کہ ان انتخابات کے دوران کانگرس نے مسلم لیگ کو پنشن خواروں، سَروں، خان بہادروں، زمینداروں، سرمایہ داروں اور ٹوڈیوں کی جماعت ہونے کا طعنہ دیا تھا (اس کا ذکر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے اپنی مشہور تصنیف "سٹرگل فار پاکستان" (Struggle For Pakistan) میں بھی کیا ہے)۔ آزاد کا مقصد ہر قیمت پر مسلم لیگ کو وزارت سازی سے روکنا تھا۔

کانگرس کے رہنما ابوالکلام آزاد نے سرّوں، زمینداروں اور ٹوڈیوں کی جماعت یونینسٹ پارٹی کو کامیاب کرانے کے لئے سر خضر حیات خان جیسے بڑے زمیندار اور ٹوڈی کا ساتھ دیا۔ اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ کانگرس مسلم لیگ کی مخالفت میں کوئی بھی حربہ استعمال کر سکتی تھی۔

آزادی کے بعد بھارت کے پہلے وزیرِ تعلیم ابوالکلام آزاد نے اپنی تصنیف "انڈیا ونز فریڈم" (India Wins Freedom) میں پنجاب میں مسلم لیگ کو کابینہ سازی سے محروم رکھنے کو اپنا بہت بڑا کارنامہ قرار دیا ہے۔ آزاد نے اسے اپنی دانشمندی کا شاہکار بتایا ہے۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ اگر ابوالکلام آزاد یونینسٹ پارٹی کے سربراہ سر خضر حیات خاں ٹوانہ سے مل کر سازش نہ کرتا اور مسلم لیگ پنجاب میں وزارت بنانے میں کامیاب ہو جاتی تو پھر ۱۹۴۷ء میں پنجاب کی تقسیم عمل میں نہ آتی اور ایک کروڑ سے زائد افراد ہجرت کرنے پر مجبور نہ ہوتے اور دس لاکھ افراد قتل و غارت سے بچ جاتے۔ اسی طرح ستّر ہزار کے قریب جو مسلم خواتین ہندوؤں اور سکھوں کے قبضے میں چلی گئیں ان کی عصمت بچ جاتی۔ واہگہ سے لے کر دہلی تک جتنا علاقہ مسلمانوں سے خالی ہوا اور وہاں مسلمانوں، اسلام، قرآن اور مساجد کے ساتھ جو گزری یہ آزاد کی اسی "دانشمندانہ" سیاست کا نتیجہ ہے جو اس نے سر خضر حیات خاں ٹوانہ کے ساتھ مل کر کی تھی۔

مسلم لیگی نمائندگان اسمبلی کا کنونشن:

اپریل ۱۹۴۶ء میں قائداعظم نے دہلی میں مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے مسلم لیگی ارکان کا ایک اجلاس طلب کیا۔ اس اجلاس میں پانصد کے لگ بھگ مسلم لیگی ارکان اسمبلی شریک ہوئے۔ سکھوں کی طرف سے گیانی کرتار سنگھ بطور مبصر شریک ہوا۔

اس اجتماع میں قائداعظم نے افتتاحی تقریر میں قیامِ پاکستان کے مقاصد بیان کرنے کے بعد اس کے حصول پر زور دیا۔ انہوں نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ پاکستان بن کر رہے گا۔ ہمارے دشمن قیامِ پاکستان میں تاخیر کا سبب تو

بن سکتے ہیں لیکن وہ اس کے قیام کو نہیں روک سکتے۔

اس اجلاس کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ قرارداد لاہور میں برِعظیم میں دو مسلم ریاستوں کے قیام کا ذکر تھا۔ حسین شہید سہروردی نے اس اجلاس میں دو کی بجائے ایک ریاست کے قیام کی قرارداد پیش کی جسے تمام حاضرین نے متفقہ طور پر منظور کر لیا۔ اجلاس کے اختتام سے قبل تمام ارکان اسمبلی نے اس بات کا حلف اٹھایا کہ وہ قیامِ پاکستان کے لئے جد و جہد کریں گے اور اس سلسلے میں کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ نیز مسلم لیگ کی ہائی کمان کی جانب سے جاری ہونے والی تمام ہدایات کی دل و جان کے ساتھ پابندی کریں گے۔

OOOO

باب (35)

کابینہ وفد

شملہ کانفرنس کی ناکامی اور انتخابات کے نتائج نے سیاسی مسائل کے فوری حل کی جانب برطانوی حکومت کی توجہ مبذول کرائی۔ وائسرائے چونکہ دونوں بڑی سیاسی جماعتوں میں مفاہمت کرانے میں ناکام رہ چکا تھا اس لئے اب برطانوی حکومت کی باری تھی۔ ۱۹ فروری ۱۹۴۶ء کو وزیر امورِ ہند لارڈ پیتھک لارنس نے دارالامراء (House of Lords) میں اور وزیرِ اعظم برطانیہ کلیمنٹ ایٹلی نے دارالعوام (House of Commons) میں بیک وقت یہ اعلان کیا کہ ملکِ معظم کی حکومت نے برِعظیم کے سیاسی مسائل کا حل تلاش کرنے کی غرض سے وزیر امورِ ہند لارڈ پیتھک لارنس، وزیر تجارت اسٹیفورڈ کرپس اور وزیر بحریہ اے وی الیگزینڈر پر مشتمل ایک وفد برِعظیم بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔ وائسرائے ہند لارڈ ویول ان کا مددگار ہو گا۔ اس موقع پر یہ بھی بتایا گیا کہ کابینہ وفد برِعظیم کی اسمبلیوں کے منتخب نمائندوں اور والیانِ ریاست سے مل کر دستور کی تیاری کے لئے پلان تیار کرے گا اور برِعظیم میں دستور ساز ادارہ قائم کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ اہم سیاسی جماعتوں کے تعاون سے ایگزیکٹو کونسل تشکیل دی جائے گی۔

برِعظیم میں اس اعلان کا ردِّ عمل:

برِعظیم میں اس اعلان کا خیر مقدم کیا گیا۔ عوام نے بھی اس پر مسرت کا اظہار کیا کہ چلیے کسی طرح کفر تو ٹوٹا۔ سیاسی راہنماؤں نے کہا کہ برطانوی حکومت سیاسی مسائل کے حل میں مخلص نظر آتی ہے۔ قائداعظم نے ایک بیان میں فرمایا کہ وہ وفد سے مل کر اسے صحیح صورت حال سے آگاہ کریں گے اور اسے بتائیں گے کہ تمام

مسائل کا صحیح حل تقسیم ہند ہے۔

۱۵ مارچ کو مسٹر ایٹلی نے دارالعوام میں یہ بیان دیا کہ برِعظیم کی اقلیتیں خائف نہ ہوں ان کے حقوق انہیں ضرور ملیں گے لیکن ملکِ معظم کی حکومت کسی اقلیتی جماعت کو یہ حق نہیں دے گی کہ وہ اکثریتی جماعت کے حقوق پامال کر کے انہیں آگے بڑھنے سے روکے۔ اس اعلان سے کانگرسی حلقوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور گاندھی جی نے بھی اس پر مسرت کا اظہار کیا۔ ہندو اخبارات اس پر خوش تھے کہ اب حکومت مسلمانوں کو نظرانداز کر کے مسائل کا حل تلاش کرے گی۔

اس موقع پر قائداعظم نے اپنے ایک بیان میں فرمایا کہ مسٹر ایٹلی جھوٹے پروپیگنڈے کے جال میں پھنس گیا ہے۔ بھلا اقلیت برِعظیم کی آزادی اور دستوری ترقی کو کیوں روکے گی، مسٹر ایٹلی کو معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمان اقلیت نہیں ہیں وہ ایک قوم ہیں۔

کابینہ وفد کی آمد:

کابینہ وفد ۲۴ مارچ ۱۹۴۶ء کو دہلی پہنچا۔ اگلے دو ہفتوں میں وفد نے صوبائی وزرائے اعلیٰ، اقلیتوں کے نمائندوں اور والیانِ ریاست سے بالمشافہ ملاقات کے علاوہ خط و کتابت بھی کی۔ ۳ اپریل کو کانگرس کے صدر ابوالکلام آزاد نے وفد سے مل کر کانگرس کا نقطۂ نظر واضح کیا۔ آزاد نے برِعظیم کی آزادی، مستقبل کے لئے دستور بنانے کے لئے دستور ساز ادارے کے قیام اور وفاقی طرزِ حکومت کے موضوع پر بات چیت کی۔ آزاد نے وفد کو بتایا کہ مرکز اپنے پاس صرف دفاع، مواصلات اور امورِ خارجہ کے محکمے رکھے اور باقی تمام محکمے صوبوں کے پاس ہونے چاہئیں۔ یہ صوبے داخلی طور پر آزاد ہوں۔ آزاد نے یہ بھی کہا کہ کانگرس کسی بھی صورت میں تقسیم ہند پر رضا مند نہیں ہو گی۔

آزاد کے علاوہ گاندھی جی نے بھی وفد سے ملاقات کی۔ انہوں نے مختصر مگر تیز لہجے میں بات کی اور قیام پاکستان کی ڈٹ کر مخالفت کی۔ انہوں نے قیام پاکستان کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ غیر قانونی غیر آئینی خواہشات کی تکمیل کے مترادف ہو گا۔

۴ اپریل کو قائداعظم کی وفد کے ساتھ ملاقات ہوئی انہوں نے تقسیم ہند

پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ ہندوؤں کے ساتھ ہمارے اختلافات یورپی ممالک کے باہمی اختلافات سے کہیں زیادہ ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بنیادی اختلافات ہیں۔

ان کی تہذیبیں بالکل مختلف ہیں۔ اس لئے تمام مسائل کا واحد حل تقسیم ہند ہے۔

۱۹ اپریل کو کابینہ کے ساتھ قائداعظم کی دوسری ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں لارڈ پیتھک لارنس نے ان سے کہا کہ ان کا مطالبہ ماننے کا بہت کم امکان ہے ان کے سامنے دو ہی راستے ہیں یا تو وہ چھوٹا سا آزاد پاکستان لے لیں یا کسی کے ماتحت بڑا وسیع پاکستان۔ قائداعظم نے جواب میں فرمایا کہ وہ ایک بار پاکستان کا مطالبہ تسلیم کر لیں، حد بندی کا معاملہ بعد میں طے کر لیں گے۔

۱۷ اپریل کو ابُوالکلام آزاد کابینہ وفد سے ملا۔ وفد کے ارکان نے آزاد کو قائداعظم کے ساتھ اپنی ملاقات اور بات چیت کے بارے میں بتایا۔ آزاد نے اس موقع پر کہا کہ وہ کانگرس کی ورکنگ کمیٹی سے صلاح و مشورہ کے بغیر کوئی تجویز پیش کرنے سے معذور ہے۔ انہیں ایام میں گاندھی جی اور جواہر لعل نہرو نے وفد کو مطلع کیا کہ کانگرس مسلم لیگ کے صدر (قائداعظم) کا مطالبہ نہیں مان سکتی۔

آزاد کے ساتھ ملاقات کے بعد کابینہ وفد کے ارکان تعطیلات گزارنے کے لئے کشمیر چلے گئے۔ کشمیر سے واپسی کے بعد ۲۶ اپریل کو آزاد کرپس سے ملا۔ اس وقت تک آزاد کے رویے میں بڑی تبدیلی آ چکی تھی۔ آزاد نے کرپس کو بتایا کہ وہ کانگرس کو ایک فیڈریشن بنانے پر رضامند کر لے گا جو دو حصوں پر مشتمل ہو گی۔ نیز وہ کانگرس کو اس پر آمادہ کرے گا کہ وہ وفد اور مسلم لیگ سے اس موضوع پر بات چیت کرے۔

اس واقعہ کے بعد کرپس اور قائداعظم کی ملاقات ہوئی۔ کرپس نے انہیں آزاد کے ساتھ اپنی ملاقات سے آگاہ کیا۔ قائداعظم نے کرپس کو یقین دلایا کہ وہ کانگرس اور کابینہ وفد کے ساتھ مشترکہ ملاقات میں اس مسئلے پر بات چیت کریں گے۔

۲۷ اپریل کو لارڈ پیتھک لارنس نے آزاد اور قائداعظم کو خط بھیجے اور ان سے کہا کہ وہ چار نمائندے وفد کے ساتھ بات چیت کے لئے نامزد کریں۔ ان سے مندرجہ ذیل امور پر بات ہو گی۔

۱۔ وفاقی حکومت قائم کی جائے جس کے پاس صرف امور خارجہ، دفاع اور مواصلات کے محکمے ہوں اور دوسرے تمام محکمے صوبوں کے پاس ہوں۔ وفاق میں شامل صوبے بڑی حد تک خود مختار ہوں۔

۲۔ صوبوں کے دو گروپ بنائے جائیں۔ ایک گروپ میں ہندو اکثریت کے صوبے شامل ہوں اور دوسرے گروپ میں مسلم اکثریت کے صوبے۔

مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے قائداعظم، نوابزادہ لیاقت علی خان، نواب محمد اسمٰعیل خان (م ۱۹۵۸ء) اور سردار عبدالرب نشتر (م ۱۹۵۸ء) کو اپنے نمائندے منتخب کیا اور کانگرس کی نمائندگی ابُوالکلام آزاد (م ۱۹۵۸ء)، پنڈت جواہر لعل نہرو (م ۱۹۶۴ء)، سردار ولبھ بھائی پٹیل (م ۱۹۵۰ء) اور عبدالغفار خان (م ۱۹۸۸ء) نے کی۔ یہ نمائندے ۵ مئی تا ۱۲ مئی وفد سے ملتے رہے۔ ۸ مئی کو وفد نے درج ذیل تجاویز پیش کیں۔

۱۔ ایک آل انڈیا یونین قائم کی جائے گی۔ یونین کے پاس صرف امورِ خارجہ، دفاع، مواصلات اور بنیادی حقوق کے محکمے ہوں گے۔

۲۔ ان محکمہ جات کے علاوہ دوسرے تمام محکمے صوبوں کے پاس ہوں گے۔

۳۔ صوبوں کے گروپ قائم کئے جائیں گے وہ مشترک امور اور دوسرے مسائل کا خود فیصلہ کر لیں گے۔

۴۔ گروپوں کی اپنی اپنی دستور ساز اسمبلیاں اور حکومتیں ہوں گی۔

۵۔ یونین کی مقننہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے نمائندوں کی تعداد مساوی ہو گی۔ والیان ریاست کے نمائندے بھی مقننہ میں شامل ہوں گے۔

۶۔ یونین کی حکومت میں بھی یونین کی مقننہ والا تناسب قائم رہے گا۔

۷۔ یونین کے دستور میں یہ شق رکھی جائے گی کہ دس سال کے بعد کوئی صوبہ اکثریتی ووٹوں سے فیصلہ کر کے دستور پر نظرثانی کی درخواست دینے کا مجاز ہو گا۔ اس کے دس سال بعد وہ پھر ایسا کر سکے گا۔

۸۔ قانون ساز ادارے میں قانون سازی درج ذیل اساس پر ہو گی:

الف۔ ہر صوبائی اسمبلی سے تمام سیاسی جماعتوں پر مشتمل نمائندے چنے جائیں

گے ۔ دس صوبائی ارکان، یونین کی اسمبلی میں ایک نمائندہ بھیجیں گے ۔
ب ۔ دیسی ریاستوں سے ان کی آبادی کے تناسب سے نمائندے لئے جائیں گے ۔

ج ۔ یہ دستور ساز اسمبلی بعجلت ممکنہ نئی دہلی میں اپنا کام شروع کرے گا ۔
د ۔ ابتدائی اجلاس میں اصولی باتیں طے کرنے کے بعد اسمبلی کے ارکان تین حصوں میں تقسیم ہو جائیں گے ۔
ان میں سے ایک حصہ ہندو اکثریت کے صوبوں کی نمائندگی کرے گا ۔
دوسرا حصہ مسلم اکثریت کے صوبوں کا نمائندہ ہو گا ۔
تیسرا حصہ دیسی ریاستوں کے نمائندوں پر مشتمل ہو گا ۔
ہ ۔ پہلے دونوں حصے الگ الگ اجلاس منعقد کرکے صوبوں کے لئے اور اگر چاہیں تو گروپ کے لئے دستور تیار کریں ۔
و ۔ جب یہ کام مکمل ہو جائے تو پھر یہ معاملہ صوبوں پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ مشترکہ طور پر رہنا چاہتے ہیں یا الگ الگ ۔
ز ۔ اس کے بعد تینوں حصوں کے نمائندے تجویز نمبر ۱ تا نمبر ۷ کی روشنی میں وفاق کا دستور تیار کریں ۔
ح ۔ کوئی ایسا قانون جس کی زد اقلیت پر پڑتی ہو اس وقت تک پاس نہیں ہو گا جب تک باقی دو اکثریتی گروپ اس کے حق میں ووٹ نہ دیں ۔
ط ۔ وائسرائے آٹھویں تجویز کے مطابق دستور سازی کے لئے نمائندے مدعو کرے گا ۔

۹ تا ۱۱ مئی ان تجاویز پر بحث جاری رہی ۔ کانگرس اور مسلم لیگی نمائندوں میں کئی تجاویز پر اختلاف پیدا ہو گیا ۔ ان حالات میں کابینہ وفد نے دونوں جماعتوں سے کہا کہ وہ جن تجاویز سے اختلاف رکھتی ہوں ان پر اپنی آراء سے وفد کو مطلع کریں ۔

مسلم لیگ کی تجاویز:

۱۲ مئی کو مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے درج ذیل تجاویز پر مشتمل ایک یادداشت وفد کو بھجوائی:

۱ ۔ چھ مسلم اکثریت کے صوبے جو پاکستان گروپ کہلائیں گے ۔ امور خارجہ، دفاع اور مواصلات کے علاوہ تمام امور میں خود مختار ہوں گے ۔
۲ ۔ اس گروپ کے لئے الگ دستور ساز ادارہ بنایا جائے گا ۔ جو گروپ کے لئے اور گروپ میں شامل صوبوں کے لئے دستور تیار کرے گا ۔
۳ ۔ دستور ساز ادارے میں انتخابات کا ایسا طریقہ اپنانا چاہیے کہ ہر صوبے میں تمام فرقوں کی آبادی کے تناسب سے نمائندگی ہو سکے ۔
۴ ۔ دستور سازی کے بعد ہر صوبے کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ استصواب کے ذریعے یہ فیصلہ کرے کہ وہ گروپ میں شامل ہونا چاہتا ہے یا الگ رہنا چاہتا ہے ۔
۵ ۔ یہ مسئلہ مشترکہ دستور ساز ادارے میں بحث کے لئے پیش کیا جائے کہ آیا یونین کا اپنا کوئی دستور ہونا چاہیے یا نہیں ۔ یونین کو رقوم کی فراہمی کا مسئلہ بھی وہیں حل کیا جائے لیکن یہ رقوم یونین ٹیکس لگا کر جمع نہ کرے ۔
۶ ۔ یونین میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مساوی نمائندگی ہو ۔
۷ ۔ فرقہ وارانہ مسائل اس فرقے کے نمائندوں کے اکثریتی ووٹوں سے حل کئے جائیں ۔
۸ ۔ یونین کوئی ایسا فیصلہ، جو قانون سازی، حکومت یا انتظامیہ سے متعلق ہو اور وہ متنازعہ ہو اس وقت تک نہ کرے جب تک ارکان کی 3/4 اکثریت اس کے حق میں ووٹ نہ دے ۔
۹ ۔ گروپ اور صوبوں کے دستور میں بنیادی حقوق، مذہب، تہذیب اور اقلیتوں کے دوسرے معاملات کے لئے تحفظات فراہم کئے جائیں ۔
۱۰ ۔ یونین کے دستور میں یہ شق رکھی جائے کہ کوئی صوبہ اکثریتی ووٹ سے قانون کی کسی شق پر نظر ثانی کی درخواست دے سکے یا دس سال کے بعد جب چاہے یونین سے الگ ہو سکے ۔

جس دن مسلم لیگ نے اپنی سفارشات کابینہ وفد کو بھجوائیں اسی روز کانگرس نے بھی مندرجہ ذیل تجاویز ارسال کر دیں:

۱۔ دستور ساز اسمبلی اس طرح بنائی جائے کہ اس کے نمائندوں کا انتخاب صوبائی اسمبلیاں کریں۔ ان ارکان کی تعداد صوبائی اسمبلیوں کے ارکان کے مقابلے میں 1/5 ہو۔ دیسی ریاستیں آبادی کے حساب سے نمائندے منتخب کر کے دستور ساز اسمبلی میں بھیجیں۔

۲۔ دستور ساز اسمبلی وفاق کا دستور تیار کرے۔ وفاق کے پاس صرف دفاع، مواصلات، امورِ خارجہ، بنیادی حقوق، کرنسی، کسٹم، پلاننگ اور ان سے متعلقہ امور ہوں۔ وفاق کے پاس اختیار ہو کہ وہ اپنے اخراجات کے لئے ٹیکس عائد کر سکے۔ وفاق کے پاس یہ بھی اختیار ہو کہ وہ دستور ٹوٹنے کے وقت یا ایمرجنسی میں طاقت استعمال کر سکے۔

۳۔ باقی تمام محکمے صوبوں کے پاس ہوں۔

۴۔ صوبوں کی گروپ بندی کر دی جائے اور وہ صوبوں کے اختیارات متعین کریں۔

۵۔ جب دستور ساز اسمبلی دستور تیار کرے تو صوبوں کے نمائندے گروپ بنا کر صوبوں کے لئے دستور بنالیں یا گروپ کے لئے دستور تیار کر لیں۔

۶۔ ایسا کوئی اہم قانون جو کسی فرقے کے بارے میں ہو، وفاقی اسمبلی اس وقت تک تیار نہ کرے جب تک متعلقہ فرقے کی اکثریت اس کی حمایت نہ کرے۔ اگر اس پر تنازعہ ہو جائے تو ثالث مقرر کیا جائے اور ابہام کی صورت میں سپیکر فیصلہ کرے یا فیڈرل کورٹ سے رجوع کیا جائے۔

۷۔ دستور سازی کے دوران اگر کسی مسئلہ پر جھگڑا کھڑا ہو جائے تو اس مسئلے کو ثالث کے سپرد کر دیا جائے۔

۸۔ دستور میں اس کی گنجائش رکھی جائے کہ اس پر نظرثانی ہو سکے یا ایسی شق دستور میں شامل کر دی جائے کہ دس سال کے بعد پورے دستور پر نظرثانی کی جائے۔

اختلافی نوٹ:

ان تجاویز کے ساتھ کانگرس نے ایک نوٹ بھجوایا جس میں مسلم لیگ کی تجاویز کے ساتھ اپنے اختلافات واضح کئے۔ کانگرس کو ان نکات پر اعتراض تھا:

۱۔ کانگرس مساوی نمائندگی کے اصول کو تسلیم نہیں کرتی۔

۲۔ آسام اور صوبہ سرحد کو پاکستان گروپ میں شامل نہ کیا جائے۔

۳۔ وفاقی حکومت کے پاس زیادہ محکمے ہوں۔

۴۔ وفاقی حکومت کو ٹیکس عائد کرنے کا حق دیا جائے۔

۵۔ کوئی صوبہ الگ نہیں ہو سکتا۔ کانگرس اس نظریے کی مخالفت کرتی ہے۔

۶۔ پاسنگ کے اصول کو ختم کرنے سے بعض صوبوں میں مشکلات پیدا ہوں گی۔

۷۔ وفاق کا اپنا الگ آئین ہو۔

۸۔ وفاق کے آئین میں یہ شق رکھی جائے کہ اس پر نظرثانی ہو سکے۔

۹۔ کانگرس یہ چاہتی ہے کہ مختلف فرقوں کے لئے تحفظات کا مسئلہ [illegible] اسمبلی میں اُٹھایا جائے۔ اس کے لئے اور کوئی پلیٹ فارم مناسب نہیں ہو گا۔

کانگرس کی تجاویز اور مسلم لیگ کی تجاویز میں بڑا اختلاف تھا۔ اس لئے دونوں جماعتوں میں اختلافات کی خلیج پہلے کی نسبت زیادہ وسیع ہو گئی۔

کابینہ وفد کا منصوبہ:

کانگرس اور مسلم لیگ میں وسیع اختلافات کی بنا پر وفد نے اپنی جانب سے ایک منصوبہ پیش کیا اور ۱۶ مئی کو یہ بیان بھی جاری کیا کہ وفد نے حالات کا بغور جائزہ لے کر تقسیمِ ہند پر بھی غور کیا ہے۔ تقسیمِ ہند کا مطالبہ اس لئے صحیح معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان ہندو اکثریت کی حکومت کے تحت نہیں رہنا چاہتے اور انہیں تحفظات کا تحریری یقین بھی مطمئن نہیں کر سکتا۔ اس کے باوجود پاکستان کا قیام ممکن نہیں ہے کیونکہ پاکستان میں غیر مسلم رہ جائیں گے اور بھارت میں مسلمان، اس لئے تقسیمِ ہند سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔

کابینہ وفد نے متحدہ ہندوستان کے حق میں یہ دلائل دیئے کہ تقسیم کی

صورت میں ٹرانسپورٹ، تار اور ڈاک کا نظام تباہ ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ برِعظیم کے لئے متحدہ دفاع ضروری ہے۔ تقسیم کی صورت میں دیسی ریاستوں کے لئے مسئلہ پیدا ہو جائے گا کہ وہ کس ملک کے ساتھ الحاق کریں۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان کئی سو میل کا فیصلہ ہو گا۔ امن اور جنگ دونوں صورتوں میں ان کے درمیان رابطہ بھارت کی مرضی پر منحصر ہو گا۔ ان حالات میں وفد، برطانوی حکومت سے یہ درخواست کرتا ہے کہ اقتدار دو ریاستوں کو منتقل نہ کیا جائے۔ اس پس منظر میں کابینہ وفد نے درج ذیل تجاویز پیش کیں:

۱۔ برِعظیم میں ایک وفاق قائم کیا جائے جس میں برطانوی ہند اور دیسی ریاستیں شامل ہوں۔
۲۔ وفاق کے پاس صرف امورِ خارجہ، دفاع اور مواصلات کے شعبے ہوں۔
۳۔ وفاق کو اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے ٹیکس عاید کرنے کا حق حاصل ہو۔
۴۔ وفاق میں دستور ساز اسمبلی اور ایگزیکٹو موجود ہوں۔
۵۔ فرقہ وارانہ مسائل ووٹنگ کے ذریعے حل کئے جائیں۔
۶۔ صوبوں کو گروپ بنانے کا حق حاصل ہو گا۔
۷۔ دس سال کے بعد کوئی صوبہ یا گروپ اکثریتی ووٹوں سے دستور میں نظرِ ثانی کی درخواست کرنے کے مجاز ہو گا۔
۸۔ دستور ساز اسمبلی میں ہر صوبے کا آبادی کے تناسب سے کوٹا مقرر کیا جائے گا۔ یہ کوٹہ فرقہ وارانہ بنیاد پر ہو گا۔ وفد کے خیال میں دستور ساز اسمبلی کا ایک رکن دس لاکھ افراد کی نمائندگی کرے گا۔ اس طرح برطانوی ہند کے ۲۹۲ نمائندے دستور ساز اسمبلی میں ہوں گے۔ دیسی ریاستیں ۹۳ نمائندے منتخب کریں گی۔ یوں مرکزی اسمبلی میں کل ۳۸۵ ارکان ہوں گے۔
۹۔ دستور کے نفاذ کے بعد نئے دستور کے تحت انتخابات کروائے جائیں گے اور کوئی صوبہ کثرتِ رائے سے کسی گروپ سے علیحدہ ہو سکے گا۔
۱۰۔ صوبوں کے تین گروپ بنائے جائیں گے۔

گروپ A:
اس میں ہندو اکثریت کے صوبے، یوپی، بہار، اڑیسہ، مدراس، بمبئی اور سی پی شامل ہوں گے۔

گروپ B:
اس میں مسلم اکثریت کے صوبے پنجاب، سرحد اور سندھ شامل ہوں گے (اس میں بلوچستان کا ذکر نہیں آیا۔ کیونکہ وہ اس وقت براہِ راست وائسرائے کے ماتحت تھا جہاں اس کی طرف سے اس کا ایجنٹ انتظام حکومت چلا رہا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ بلوچستان بھی اس میں شامل رکھا جائے گا)۔

گروپ C:
اس گروپ میں بنگال اور آسام شامل ہوں گے۔ کابینہ وفد نے یہ بھی اعلان کیا کہ فوری طور پر عبوری حکومت قائم کی جائے گی اور دفاع کا محکمہ بھی کسی ہندوستانی کے سپرد کیا جائے گا۔

رَدِّ عمل:
کابینہ وفد کی تجاویز پر سب سے پہلے گاندھی جی نے تبصرہ کیا حالانکہ بظاہر وہ کانگرس کے بنیادی رُکن بھی نہیں تھے۔ انہوں نے کہا کہ تمام معاملات دستور ساز اسمبلی پر چھوڑ دیئے جائیں۔ اسمبلی یہ تجاویز مانے یا رَد کرے یا مزید تجاویز اس میں شامل کرے۔ نیز کابینہ وفد نے جو ہندو اور مسلم میں امتیاز باقی رکھا ہے، اسے فوراً ختم کیا جائے۔ کوئی صوبہ اپنی مرضی کے خلاف کسی گروپ میں شامل نہ کیا جائے (صوبہ سرحد میں اس وقت کانگرس کی وزارت قائم تھی جس کا سربراہ ڈاکٹر خان صاحب تھا۔ اس لئے گاندھی جی نہیں چاہتے تھے کہ صوبہ سرحد کو مسلم گروپ میں شامل کیا جائے)۔

جواہر لعل نہرو نے اپنے ذاتی اخبار "نیشنل ہیرلڈ" میں بڑے فخر کے ساتھ یہ لکھا کہ کابینہ وفد نے جناح کا پاکستان دفن کر دیا ہے (یہی بات کانگرس کے ہمنوا مولوی حبیب الرحمٰن نے لدھیانہ میں ایک جلسہ عام میں کی تھی)۔ تمام ہندو اخبارات

نے کابینہ وفد کی تجاویز پر تبصرہ کرتے ہوئے ۔ نیشنل ہیرلڈ ۔ والا انداز اختیار کیا ۔

۲۲ مئی ۱۹۴۶ء کو قائداعظم نے ایک بیان جاری کیا جس میں انہوں نے فرمایا کہ انہیں اس بات پر بڑا افسوس ہے کہ کابینہ وفد نے مسلمانوں کے مطالبے (پاکستان) کی نفی کی ہے ۔ ان کے خیال میں اب بھی پاکستان تمام مسائل کا حل ہے ۔ قائداعظم نے اس موقع پر یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اس بات کا فیصلہ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کرے گی کہ کابینہ وفد کی پیش کردہ تجاویز مان لی جائیں یا رد کر دی جائیں ۔

۲۴ مئی کو کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ گروپنگ سے صوبائی خود مختاری متاثر ہو گی ۔ اس لئے یہ تجویز کانگرس کے لئے قابل قبول نہیں ہے ۔

۶ جون کو مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا جس میں یہ کہا گیا کہ پاکستان کا قیام ناگزیر ہے ۔ وفد نے تقسیم ہند کے خلاف جو دلائل دیئے تھے ورکنگ کمیٹی نے اس پر احتجاج کیا تاہم ورکنگ کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ دو شرطوں پر یہ تجاویز مان لیتے ہیں :

۱ ۔ سنگین نوعیت کے مسائل فوری طور پر حل کئے جائیں ۔ ان تجاویز کو ماننے کا بڑا مقصد یہی ہے کہ ایسے تمام سنگین مسائل حل ہو جائیں ۔

۲ ۔ کابینہ وفد نے اگرچہ تقسیم ہند کی مخالفت کی ہے لیکن پاکستان کی بنیاد تو وفد نے اپنی تجاویز میں رکھ دی ہے کیونکہ صوبوں کی گروپنگ ہی پاکستان کی اساس ہے ۔ اس گروپنگ سے بالآخر پاکستان قائم ہو جائے گا ۔

ورکنگ کمیٹی نے عبوری حکومت کے قیام اور اس میں شرکت کے لئے قائداعظم کو مکمل اختیار دیا اور انہیں اس سلسلے میں وائسرائے سے بات چیت کرنے کی اجازت دی ۔

۸ جون کو قائداعظم نے وائسرائے لارڈ ویول کے نام ایک خط لکھا جس میں اسے یہ یاد دلایا کہ ان کی باہمی گفتگو میں یہ بات طے پائی تھی کہ عبوری حکومت میں بارہ محکمے ہوں گے ۔ پانچ محکمے مسلم لیگ کے پاس ہوں گے اور پانچ محکمے کانگرس کو دیئے جائیں گے ۔ ایک محکمہ سکھوں کو دیا جائے گا اور ایک عیسائیوں کو ۔ عبوری حکومت میں اہم محکمے کانگرس اور مسلم لیگ میں مساوی طور پر تقسیم کئے جائیں گے ۔

ب اگر وائسرائے نے اس پر عمل نہ کیا تو پھر مسلم لیگ تعاون نہیں کرے گی ۔

وائسرائے نے قائداعظم کے خط کے جواب میں لکھا کہ اس نے انہیں ایسی کوئی ضمانت نہیں دی تھی ۔ اس کے باوجود وہ یہ فارمولا قبول کرنے کو تیار ہے ۔

۱۲ جون کو وائسرائے نے پنڈت جواہر لعل نہرو سے ملاقات کی ۔ نہرو نے لارڈ ویول سے کہا کہ عبوری حکومت میں ۱۲ کی بجائے ۱۵ وزیر ہونے چاہئیں ۔ ان میں سے ۵ وزیر کانگرس سے لئے جائیں اور وہ سب کے سب ہندو ہوں ۔ چار وزیر مسلم لیگی ہوں اور ایک وزیر غیر مسلم لیگی مسلمان ہو ۔ اسی طرح ایک ایک وزیر غیر کانگرسی ہندوؤں ، اچھوتوں سکھوں اور ہندوستانی عیسائیوں میں سے لیا جائے ۔ نہرو نے وائسرائے کے سامنے یہ تجویز بھی رکھی کہ وہ ایک عورت کو بھی وزیر کا منصب عطاء کرے اور وہ عورت کانگرسی ہو ۔

لارڈ ویول نے پنڈت نہرو کی تجاویز مسترد کر دیں ۔

۱۳ جون کو ابوالکلام آزاد نے کانگرس کے صدر کی حیثیت سے وائسرائے سے ملاقات کی اور اس پر یہ بات واضح کر دی کہ کانگرس ہندوؤں اور مسلمانوں کی مساوی نمائندگی کی مخالفت جاری رکھے گی ۔ لہذا وہ اس کی ۱۲ وزیروں والی تجویز مسترد کرتا ہے ۔

اس کے بعد ویول نے ۱۳ وزیروں پر مشتمل کابینہ کا فارمولا پیش کیا ۔ اس فارمولے کے تحت ۶ وزیر کانگرس سے ، ۵ مسلم لیگ سے اور دو اقلیتوں سے لینے تھے ۔ کانگرس نے اپنی روایتی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے بھی رد کر دیا ۔

۱۶ جون کو ویول اور کابینہ وفد نے مل کر یہ تجویز پیش کی کہ ۱۴ وزراء پر مشتمل کابینہ بنائی جائے گی ۔ اس میں کانگرس سے ۶ اور مسلم لیگ سے ۵ وزیر لئے جائیں گے ۔ ایک ایک وزیر سکھوں ، ہندوستانی عیسائیوں اور پارسیوں سے لیا جائے گا ۔ ویول نے یہ بھی کہا کہ دونوں بڑی سیاسی جماعتوں نے یا دونوں میں سے ایک جماعت نے اس تجویز کو نہ مانا ، تو پھر وہ کسی کو بھی حکومت بنانے کی دعوت دے گا ۔ ۲۵ جون کو کانگرس نے اس کی یہ تجویز بھی ٹھکرا دی ۔ البتہ پنڈت نہرو نے یہ اعلان کیا کہ کانگرس نئی دستور ساز اسمبلی میں دستور بنانے کے سلسلے میں تعاون کرے گی تاکہ برعظیم آزادی حاصل کر سکے اور متحد رہ سکے ۔

مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے ۲۵ جون کو یہ فیصلہ کیا کہ وہ ۱۶ جون کے اعلان کے مطابق عبوری حکومت میں شامل ہو گی۔ قائداعظم نے وائسرائے اور کابینہ وفد کے ارکان سے کہا کہ وہ کانگرس کے انکار کے بعد اپنے فیصلے کے مطابق مسلم لیگ کو حکومت بنانے کی دعوت دیں۔ قائداعظم نے اس سلسلے میں ۲۷ جون کو وائسرائے کے نام خط ارسال کیا۔ اگلے روز وائسرائے نے ان کے خط کے جواب میں لکھا کہ اسے ان کے خط کے مندرجات سے اختلاف ہے۔ قائداعظم نے اسی روز لکھا کہ وائسرائے اپنے وعدے سے پھر گیا ہے۔ قائداعظم نے اپنے خط میں بڑے وزنی دلائل دیئے جن کا وائسرائے کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ وائسرائے اور کابینہ وفد نے یہ کہا تھا کہ اگر دونوں سیاسی جماعتوں نے یا ان میں کسی ایک جماعت نے کابینہ میں شرکت سے انکار کیا تو پھر وائسرائے کسی کو بھی حکومت بنانے کی دعوت دے گا۔ اس اعلان کے مطابق کانگرس کے انکار کے بعد وہ مسلم لیگ کو حکومت بنانے کی دعوت دینے کا پابند تھا لیکن وہ اپنے وعدے سے پھر گیا۔

اس کے بعد ویول نے عبوری حکومت کے قیام کا منصوبہ یہ کہتے ہوئے ملتوی کر دیا کہ کانگرس کی حکومت میں شمولیت کے بغیر حکومت بنانی نا مناسب ہے۔ ان حالات میں کابینہ وفد ۲۹ جون کو لندن روانہ ہو گیا اور مسائل کے حل کی ذمہ داری وائسرائے پر ڈال دی۔

کابینہ وفد کی روانگی کے بعد کانگرس کی ہائی کمان میں تبدیلی عمل میں لائی گئی۔ ابوالکلام آزاد کو استعمال شدہ کارتوس سمجھ کر کانگرس کی صدارت سے ہٹا دیا گیا کیونکہ کانگرس اس سے مسلم لیگ کے خلاف جتنا کام لینا چاہتی تھی، اٹھا لے چکی تھی۔ ابوالکلام آزاد کی جگہ پنڈت جواہر لعل نہرو نے کانگرس کی صدارت سنبھالی۔ نہرو نے صدارت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد سخت قسم کے بیانات اخبارات میں شائع کرائے اور کابینہ وفد کی گروپنگ سکیم کو اپنی بیرحمانہ تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس پر وزیرِ امورِ ہند نے لندن سے وضاحتی بیان جاری کیا۔ ان حالات میں مسلم لیگ بھی اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور ہو گئی اور اس نے کابینہ وفد کا مجوزہ پلان مسترد کرتے ہوئے اپنی تمام تر توجہ حصولِ پاکستان پر مرتکز کر دی۔

آل انڈیا سُنّی کانفرنس بنارس:

جس زمانے میں کابینہ وفد برِعظیم کے سیاسی رہنماؤں سے مل کر سیاسی مسائل کا حل تلاش کر رہا تھا اسی زمانے میں بنارس میں حضرت پیر سید جماعت علی شاہ محدّث علی پوری (م ۱۹۵۱ء) کی صدارت میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا جس میں پانصد کے لگ بھگ مشائخ کرام، سات ہزار علماء اور دو لاکھ کے قریب سُنّیوں نے شرکت کی۔ ناظمینِ جلسہ نے کابینہ وفد کے ارکان کو بھی بطور مبصر اس اجلاس میں شرکت کی دعوت دی تاکہ وہ مسلمانوں کے اس اجلاس کی شان و شوکت دیکھ لیں، لیکن وفد نے اپنی مصروفیات کی بنا پر معذرت کر لی۔

اس اجلاس میں قائداعظم کی مکمل حمایت کا اعلان کیا گیا اور ان کے مطالبہ پاکستان کی پُر زور تائید کی گئی۔ کابینہ وفد نے یہ کہا تھا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے مابین صدہا میلوں کا فاصلہ ہو گا اور ان دونوں حصوں کے درمیان رابطہ ہندوستان کی مرضی پر منحصر ہو گا۔ ان کے اس عذر کا جواب ناظمینِ جلسہ نے یہ دیا کہ ان دونوں حصوں کو ملانے کے لئے کوریڈور (Corridor) دیا جائے۔

اس اجلاس کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ اجلاس کے شرکاء نے یہ اعلان کیا کہ اب اگر قائداعظم بھی مطالبۂ پاکستان سے دستبردار ہو جائیں تو بھی سُنّی کانفرنس اس معاملے میں ان کی موافقت نہیں کرے گی اور سُنّی کانفرنس مطالبۂ پاکستان کو لے کر آگے بڑھے گی۔ قیامِ پاکستان مسلمانوں کا حق ہے اور یہ حق انہیں ہر صورت ملنا چاہیے (اس کانفرنس کی روائیداد "دبدبۂ سکندری" رام پور میں شائع ہو چکی ہے۔ میں اس کے عکس کے لئے میاں محمد صادق قصوری کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں)۔

دیو بندی حلقوں کی جانب سے اس کانفرنس کی کارروائی پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کانفرنس میں شرکاء کا سیاسی وزن کتنا تھا اور ان کی ملکی سیاست میں کیا حیثیت تھی، راقم آثم دیو بندی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتا ہے اس کے باوجود یہ عرض کرتا ہوں کہ ان مشائخ اور علماء کا عوام پر بڑا اثر تھا۔ خود لاہور میں تحریکِ پاکستان کے لئے بریلوی مکتبِ فکر کے علماء میں سے مولانا محمد بخش مُسلم (م ۱۹۸۷ء) اور مولانا غلام الدین

اشرفی (م ۱۹۷۰ء) نے جو کام کیا وہ محتاج تعارف نہیں ہے ۔ موخرالذکر کی تقریریں راقم آثم نے سنی ہیں ۔ جس انداز سے وہ گاندھی اور نہرو کو لتاڑتے تھے اور جس بری طرح سے گاندھی اور نہرو کا جوٹھا میٹھا کھانے والے کانگرسی مولویوں کے لتے لیتے تھے یہ ان ہی کا حصہ تھا ۔

اسی طرح سرحد کے ریفرینڈم میں پیر صاحب مانکی شریف امین الحسنات (م ۱۹۶۰ء) اور پیر صاحب زکوڑی شریف عبداللطیف (م ۱۹۷۸ء) نے جس طرح سے حصہ لیا اور سرحد میں کانگرس کی حکومت ہونے کے باوجود عوام کو پاکستان میں شمولیت کے حق میں تیار کیا اس سے چشم پوشی ممکن نہیں ہے ۔ ابھی حال ہی میں حکومت پاکستان نے پائنیرز آف پاکستان کے عنوان سے جن ۲۷ حضرات کی خدمات کا اعتراف ڈاک کے ٹکٹ چھاپ کر کیا ہے ان میں یہ دونوں پیر صاحبان بھی شامل ہیں ۔ اللھم اغفر لہما و ارحمہما ۔

عبوری حکومت کا قیام

۲۲ جولائی کو وائسرائے لارڈ ویول نے قائداعظم اور پنڈت جواہر لعل نہرو کے نام خط لکھے اور انہیں ۱۴ ارکان پر مشتمل کابینہ بنانے کی دعوت دی ۔ اس فارمولے کے تحت کانگرس سے ۶، مسلم لیگ سے ۵ اور اقلیتوں سے ۳ وزیر لینے تھے ۔ وائسرائے نے انہیں یہ بھی لکھا کہ کانگرس اور مسلم لیگ مخالف جماعت کے نامزد کردہ ارکان پر اعتراض نہیں کریں گی اور اہم عہدے دونوں جماعتوں میں مساوی طور پر تقسیم کئے جائیں گے ۔

پنڈت جواہر لعل نہرو نے ۲۹ جولائی کو وائسرائے کو یہ پیغام بھیجا کہ کانگرس کو یہ فارمولا قبول نہیں ہے ۔ قائداعظم نے ۳۱ اگست کو وائسرائے کو مطلع کیا کہ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے بھی اس کی تجویز رد کر دی ہے ۔

ان حالات میں وزیر امور ہند نے وائسرائے سے کہا کہ وہ قائداعظم کو نظر انداز کرتے ہوئے پنڈت جواہر لعل نہرو کو حکومت بنانے کی دعوت دے ۔ چنانچہ ویول نے ۶ اگست کو پنڈت جی کو حکومت بنانے کی دعوت دی ۔ ۸ اگست کو کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے اس دعوت کو قبول کرتے ہوئے حکومت بنانے کی ذمہ داری پنڈت جی پر ڈال دی ۔

مسلم لیگ نے یہ محسوس کیا کہ وائسرائے نے برعظیم کے دس کروڑ مسلمان کو جن کی نفری یورپ کے کئی ملکوں کی مجموعی آبادی سے زیادہ ہے ، نظر انداز کرکے مسلمانوں کی سخت توہین کی ہے ۔ چنانچہ ورکنگ کمیٹی کے فیصلے کے مطابق ۱۶ اگست کو "یوم راست اقدام" منانے کا اعلان کیا گیا ۔ اس روز مسلم لیگ نے ملک کے طول و عرض میں احتجاجی جلوس نکال کر اور جلسے منعقد کرکے انگریزوں کی جانبدارانہ پالیسی اور نامنصفانہ رویے پر شدید قسم کا احتجاج کیا ۔

۱۷ اگست کو پنڈت جواہر لعل نہرو نے وائسرائے کو اس کی پیش کش کا

مثبت جواب دیا اور اسے لکھا کہ اگر مسلم لیگ عبوری حکومت میں شرکت پر آمادہ نہ ہوئی تو وہ کابینہ میں ۵ غیر مسلم لیگی مسلمانوں کو شامل کر لے گا۔ وائسرائے نے پنڈت جی کی اس تجویز سے اختلاف کرتے ہوئے کہا وہ ۵ نشستیں خالی رہنے دے لیکن پنڈت جی نے یہ تجویز مسترد کر دی۔ ان حالات میں وائسرائے نے عبوری حکومت کی تشکیل ملتوی کرنے کی غرض سے برطانوی حکام سے رابطہ قائم کیا۔ برطانیہ کے وزیر اعظم کلیمنٹ ایٹلی نے ویول سے کہا کہ مسلم لیگ کے بغیر بھی کام چلایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ وائسرائے نے ۲۴ اگست کو یہ اعلان کیا کہ عبوری حکومت ۲ ستمبر سے کام شروع کر دے گی۔

انہی ایام میں بنگال میں فرقہ وارانہ فساد شروع ہو گیا اور صدہا افراد خون میں نہا گئے۔ حالات کا جائزہ لینے کے لئے وائسرائے خود بنگال گیا۔ وہاں کے حالات دیکھ کر اسے یہ اندازہ ہوا کہ اگر کانگرس اور مسلم لیگ میں سمجھوتہ نہ ہوا تو پورے ملک میں خونریزی شروع ہو جائے گی۔ بنگال سے واپسی کے بعد ویول ۲۷ اگست کو گاندھی جی اور پنڈت نہرو سے ملا اور اس نے مرکز اور بنگال میں مخلوط حکومتیں قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔

گاندھی جی وائسرائے کی اس تجویز سے سخت ناراض ہوئے۔ وہ تو مسلم لیگ کو نظر انداز کر کے برعظیم میں ہندو راج قائم کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے اور وائسرائے نے مخلوط حکومتیں قائم کرنے کی تجویز پیش کر دی۔ گاندھی جی نے طیش میں آ کر مسٹر ایٹلی کے نام ایک خط ارسال کیا جس میں یہ لکھا کہ ویول کا دماغ چل گیا ہے لہٰذا وہ اپنی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لائق نہیں رہا۔ دوسری جانب پنڈت جواہر لعل نہرو نے لندن میں مقیم اپنے انگریز دوستوں کے نام خط ارسال کرنے شروع کئے جس میں گاندھی جی والا رویہ اختیار کیا۔ پنڈت جی نے بھی وائسرائے پر یہ الزام لگایا کہ وہ طبعاً کمزور ہے اور اس کا دماغی توازن بگڑ چکا ہے۔ وہ سر فرانسس موڈی اور جان ایبل کے مشوروں پر چلتا ہے اور یہ دونوں مشیر مسلمانوں کے حامی ہیں۔ اس لئے وائسرائے کی تبدیلی ناگزیر ہے لہٰذا اسے فوراً واپس بلا لینا چاہیے۔

اس کے باوجود ۲ ستمبر کو عبوری حکومت قائم ہو گئی۔ اس پر کانگرسی حلقوں میں بڑی مسرت کا اظہار کیا گیا۔ اس موقع پر ہسٹری آف انڈین نیشنل کانگرس

کے مصنف سیتا بھائی پٹا رامیہ نے یہ [illegible]
قومی [illegible] گی۔ مسلم لیگ عبوری حکومت میں شامل ہو [illegible]
آگے بڑھتا ہی جائے گا۔ اب [illegible] کانگرسی ہندو اس ملک کے حکمران [illegible]

پنڈت جی کی عبوری حکومت میں یہ حضرات شامل تھے

پنڈت جی خود، سردار ولبھ بھائی پٹیل، ڈاکٹر راجندر پرشاد، مسٹر آصف علی، راج گوپال اچاریہ، سرت چندر بوس، ڈاکٹر جان متھائی، سردار بلدیو سنگھ، شفاعت احمد، جگ جیون رام، نرسوائے عام کمیونسٹ سید علی ظہیر اور کاؤس جی ہومز جی بھابھا۔ پنڈت جی نے اعلان کیا کہ دو اور مسلمان وزیر کابینہ میں شامل ہو جائیں گے۔

ردِ عمل

مسلم لیگ کے علاوہ برطانیہ کے بعض سنجیدہ مزاج سیاستدانوں کو برعظیم میں ایک پارٹی کی حکومت کے قیام پر بڑی تشویش ہوئی۔ کیونکہ اس سے ان دس کروڑ مسلمانوں کے مفاد پر زد پڑتی تھی جن کی واضح اکثریت نے گزشتہ انتخابات میں مسلم لیگ کو ووٹ دیئے تھے اور مرکزی اسمبلی میں سو فیصد کامیابی حاصل کی تھی۔ قائداعظم نے ۲۵ اگست کو اپنے ایک بیان میں فرمایا کہ وائسرائے نے بڑا غلط قدم اٹھایا ہے۔ اس نے مسلم لیگ کے ساتھ جو وعدے کئے تھے وہ اس نے فراموش کر دیئے ہیں اور کانگرس کو مسلمانوں کی گردنوں پر سوار کر دیا ہے۔ مسلم لیگ نے ۲ ستمبر کو جس روز عبوری حکومت نے کام شروع کرنا تھا یوم سیاہ منانے کا اعلان کر دیا۔ اس روز مسلمانوں نے اپنے گھروں اور دکانوں پر سیاہ پرچم لہرائے اور غم و غصے کا اظہار کیا۔ برطانیہ کے دارالعوام میں حزب اختلاف کے قائد سر ونسٹن چرچل نے بھی حکومت کے اس غیر دانشمندانہ فیصلے پر کڑی تنقید کی۔ انہوں نے اس موقع پر یہ بھی کہا کہ اس اقدام سے خونریزی شروع ہو سکتی ہے جو ۱۸۵۷ء میں ہونے والی خونریزی سے کہیں زیادہ شدید ہو گی۔ اس طرح اور بھی کئی انگریز سیاستدانوں نے یہ کہا کہ برعظیم میں ایک پارٹی کی حکومت کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ برطانیہ کے اخبارات نے بھی حکومت کے اس فیصلے پر کڑی تنقید کرتے ہوئے لکھا کہ اس نے برعظیم میں ایک فاشسٹ جماعت کو

اقتدار سونپ دیا ہے۔ (کانگرس نے "ہندوستان چھوڑ دو تحریک" کے دوران جو توڑ پھوڑ اور قتل و غارت کی تھی اس کی بنا پر اسے فاشسٹ جماعت کا خطاب مرحمت ہوا تھا)۔

مسلم لیگ کی عبوری حکومت میں شرکت:

کانگرسی حکومت کو قائم ہوئے ایک ماہ گزرا تو مسلم لیگ کو اس بات کا احساس ہوا کہ کانگرسی اقتدار میں رہتے ہوئے مسلمانوں کے مفادات کو عظیم نقصان پہنچا سکتی ہے اور وہ حصولِ پاکستان کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ بن سکتی ہے لہٰذا مسلم لیگ نے اپنی پالیسی بدلی۔ اب اس نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ باہر رہنے کی بجائے وہ حکومت میں شامل ہو کر قیامِ پاکستان کے لئے زیادہ مؤثر انداز میں کام کر سکتی ہے۔ اسی دوران میں وائسرائے کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا اور وہ برطانوی اخبارات اور برطانیہ کے سلجھے ہوئے سیاستدانوں کی تنقید کا نشانہ بن چکا تھا۔ اس نے پنڈت نہرو اور قائداعظم سے بات چیت شروع کی اور ۲۵ اکتوبر کو مسلم لیگ بھی حکومت میں شامل ہو گئی۔ پنڈت جی کو کانگرس کے پانچ وزیر نکال کر مسلم لیگ کے لئے جگہ بنانی پڑی۔ وائسرائے کی یہ خواہش تھی کہ امورِ خارجہ، وزارت داخلہ یا دفاع میں سے ایک اہم محکمہ مسلم لیگ کو ملے لیکن پنڈت جی نہ مانے۔ مسلم لیگ کی شمولیت کے بعد محکموں کی تقسیم اس طرح ہوئی:

۱۔ پنڈت جواہر لعل نہرو	امورِ خارجہ اور دولتِ مشترکہ سے تعلقات
۲۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل	داخلہ، اطلاعات، نشریات
۳۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد	خوراک و زراعت
۴۔ راج گوپال اچاریہ	تعلیم اور فنون
۵۔ آصف علی	ٹرانسپورٹ، ریلوے
۶۔ جگ جیون رام	لیبر
۷۔ نوابزادہ لیاقت علی خاں	خزانہ
۸۔ اسماعیل ابراہیم چندریگر	تجارت
۹۔ سردار عبدالرب نشتر	مواصلات

۱۰۔ راجہ غضنفر علی خان	صحت
۱۱۔ جوگندر ناتھ منڈل	قانون
۱۲۔ جان متھائی	صنعت، سپلائی
۱۳۔ کاوس جی ہرمزجی بھابھا	معدنیات، بجلی، تعمیرات
۱۴۔ بلدیو سنگھ	دفاع

مسلم لیگ کی عبوری حکومت میں شمولیت پنڈت جواہر لعل نہرو پر بڑی گراں گزری کیونکہ اس سے کانگرس کی اجارہ داری ختم ہو گئی۔ کانگرس اور ہندو اخبارات پنڈت جی کو وزیر اعظم لکھتے تھے لیکن مسلم لیگ انہیں وزیر اعظم تسلیم نہیں کرتی تھی۔ مسلم لیگ کا یہ کہنا تھا کہ وہ وائسرائے کی مرضی سے عبوری حکومت میں شامل ہوئی ہے نہ کہ پنڈت جی کی مرضی سے۔ دوسری جانب مسلم لیگ نے اپنی ایک سیٹ اچھوت رہنما جوگندر ناتھ منڈل کو دے کر یہ بات واضح کر دی کہ صرف کانگرس ہی اچھوتوں کی ہمدرد اور خیر خواہ نہیں ہے، مسلم لیگ کو بھی ان کی خاطر عزیز ہے۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ مسلم لیگ فرقہ پرست جماعت نہیں ہے اور وہ اپنے علاوہ دوسری اقلیتوں کا بھی خیال رکھتی ہے۔

عبوری حکومت میں شمولیت کے بعد مسلم لیگ مسلمانوں کے مفادات کا بہتر طریقے سے تحفظ کرنے لگی۔ کانگرس اگر مسلمانوں کے مفادات کو کوئی نقصان پہنچانا چاہتی تو مسلم لیگ کے پاس اس کا مداوا موجود تھا۔ اسی بنا پر پنڈت جی کی طرح گاندھی جی بھی مسلم لیگ کے عبوری حکومت میں شمولیت سے ناراض ہوئے۔ یاد رہے کہ یہ وہی ذاتِ شریف ہے جس نے گاندھی جناح ملاقات سے پہلے قائداعظم کو خط لکھا تھا کہ اسے مسلمانوں کا دشمن نہ سمجھیں۔ وہ تو دنیا بھر کے عوام کے دوست اور خیر خواہ ہیں۔

کانگرس اپنی جانب سے مسلم لیگ کو "غیر اہم" محکمے دے کر مطمئن تھی۔ اس کا یہ خیال تھا کہ دفاع، امورِ خارجہ اور وزارتِ داخلہ میں سے کوئی وزارت مسلم لیگ کے پاس نہیں ہے۔ کانگرس نے بڑے غور و خوض کے بعد وزارتِ خزانہ مسلم لیگ کو دی تھی۔ کانگرسیوں کا یہ خیال تھا کہ مسلمان حساب کتاب میں کمزور

نشستیں ہیں اس لئے وزارتِ خزانہ مسلم لیگ کو دے دی جائے۔ جب مسلم لیگ بجٹ بنانے اور اسے اسمبلی میں پیش کرنے سے قاصر رہے گی، تو جگ ہنسائی ہو گی لیکن جلد ہی کانگرس کو اپنی حماقت کا احساس ہو گیا۔ کسی کانگرسی وزیر کو اپنے محکمے کے لئے رقم درکار ہوتی تو وزیرِ خزانہ نوابزدہ لیاقت علی خان اس کی درخواست پر لکھ دیتے کہ حکومت کے پاس فنڈز کی کمی ہے۔ ایک بار وزیرِ داخلہ سردار ولبھ بھائی پٹیل نے اپنے دفتر کے لئے چپراسی بھرتی کرنے کے لئے کچھ رقم مانگی تو وزیرِ خزانہ نے فنڈز کی کمی کی بنیاد پر اس کی درخواست مسترد کر دی۔ چنانچہ بہت جلد کانگرس کو اس بات کا احساس ہو گیا کہ مسلم لیگ کو وزارتِ خزانہ دے کر انہوں نے بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔

غریب آدمی کا بجٹ:

وزارتِ خزانہ کا قلمدان سنبھالنے کے بعد نوابزادہ لیاقت علی خاں بجٹ کی تیاری میں لگ گئے۔ چوہدری محمد علی (م ۱۹۸۰ء) نے ان کی اس سلسلے میں بڑی مدد کی۔ کانگرس کا یہ خیال تھا کہ مسلم لیگ کے وزیرِ خزانہ بجٹ بنانے میں ناکام رہیں گے اور مسلم لیگ کی جگ ہنسائی ہو گی۔ لیاقت علی خان نے بجٹ پیش کرتے وقت نمک پر سے محصول ختم کر دیا۔ ایک زمانے میں کانگرس نمک پر محصول کے خلاف باقاعدہ تحریک چلا چکی تھی اور گاندھی جی اسی سلسلے میں ڈانڈی تک مارچ کر چکے تھے۔ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی (م ۱۹۸۴ء) نے اس زمانے میں یہ فتویٰ دیا تھا کہ حدیث شریف میں نمک کو محصول سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ اسی فتوے سے گاندھی جی کی ڈانڈی مارچ میں حوصلہ افزائی ہوئی تھی اور پھر اسی فتوے نے غریب آدمی کا بجٹ پیش کرنے میں مدد دی (قبلہ مفتی صاحب نے یہ بات راقم آثم کو اپنی زبانی سنائی تھی)۔ نوابزادہ لیاقت علی خاں کے بجٹ پیش کرنے سے پہلے دو ہزار روپے سالانہ آمدنی ٹیکس سے مستثنیٰ تھی۔ انہوں نے نئے بجٹ میں دو ہزار روپے کی بجائے اڑھائی ہزار روپے تک سالانہ آمدنی ٹیکس فری کر دی۔ زمانہ جنگ میں ہندو سرمایہ داروں نے لاکھوں روپے کمائے تھے لیکن وہ ٹیکس سے بچنا چاہتے تھے۔ وزیرِ خزانہ نے ایک لاکھ روپے سالانہ سے زیادہ آمدنی پر بیس فیصد ٹیکس عائد کر دیا۔ اس پر ہندو سرمایہ دار جو کانگرس کو چندہ دیا کرتے تھے،

بڑے پیچ پا ہوئے اور انہوں نے کانگرسی رہنماؤں پر دباؤ (ان ...) قائل کر لیا کہ آئندہ ہندو ٹیکس ادا کیا کریں گے اور مسلمان ... خزانہ نے کارپوریشن ٹیکس کی شرح ایک آنے ... روپے سالانہ سے زیادہ آمدنی پر ایک تدریجی ٹیکس ... اسی طرح انہوں نے ریزرو بنک آف انڈیا ... جاندی کی منڈیوں میں سٹہ بازی پر کنٹرول کرنے کی بھی تجویز ... اور اس کے ساتھ ہی ناجائز طریقوں سے کمائی ہوئی دولت کا پتہ چلانے کے لئے ایک کمیشن قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔

نوابزادہ لیاقت علی خان کا پیش کردہ بجٹ "غریب آدمی کا بجٹ" کہلاتا ہے۔ ہندو سرمایہ داروں نے اس کی بڑی مخالفت کی کیونکہ اس کی بیشتر زد ان پر پڑتی تھی۔ ان ہندو سرمایہ داروں نے سردار ولبھ بھائی پٹیل جیسے متعصب ہندو کو، جو قیامِ پاکستان کا سخت ترین مخالف تھا، قیامِ پاکستان کا قائل کر لیا۔ پٹیل کے علاوہ پنڈت جواہر لعل نہرو بھی تقسیمِ ہند کا قائل ہو گیا اور حصولِ پاکستان کا امکان روشن ہو گیا۔

لندن کانفرنس:

مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ اور کانگرس کے مابین وسیع اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ کانگرس کی جانب سے الزام تراشی کی مہم بھی شروع کی گئی۔ مسلم لیگ نے نہرو کو وزیرِ اعظم تسلیم نہیں کیا اور درحقیقت وہ وائسرائے کی کونسل کے ایک رکن تھے اور ان کا درجہ عام کونسلروں جیسا تھا۔ مسلم لیگ کا یہ کہنا تھا کہ وہ اپنے کانگرسی گروپ کے تو سربراہ ہو سکتے ہیں لیکن پوری کونسل کے نہیں۔ اس طرح کے بہت سے اختلافات دور کرنے کی غرض سے برطانوی حکومت کی دعوت پر ۲ دسمبر ۱۹۴۶ء کو قائد اعظم، لیاقت علی خان، پنڈت نہرو اور بلدیو سنگھ لندن پہنچے۔ برطانوی زعما کے ساتھ ان کی میٹنگ ناکام رہی اور ۶ دسمبر کو سرکاری طور پر میٹنگ کی ناکامی کا اعلان کر دیا گیا۔ ناکامی کی سب سے بڑی وجہ صوبوں کی گروپنگ تھی جو کابینہ وفد نے پیش کی تھی۔

باب (36)

انتقالِ اقتدار کی طرف

نوابزادہ لیاقت علی خان کے بجٹ پیش کرنے کے بعد کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان اختلافات کی خلیج وسیع تر ہو گئی یہاں تک کہ ولبھ بھائی پٹیل جیسا متعصب ہندو اور مہاسبھائی ذہنیت رکھنے والا کانگرسی بھی تقسیم ہند کا قائل ہو گیا۔

۵ فروری ۱۹۴۷ء کو غیر مسلم لیگی ارکان ایگزیکٹو کونسل نے وائسرائے سے مطالبہ کیا کہ وہ مسلم لیگی کونسلروں (یعنی وزیروں) سے جبراً استعفےٰ لے لے۔ ۳ فروری کو پنڈت جواہر لعل نہرو نے وائسرائے کے نام ایک خط لکھا جس میں اس سے کہا کہ وہ مسلم لیگیوں کو ایگزیکٹو کونسل سے نکال دے۔ اس کے دو روز بعد ولبھ بھائی پٹیل نے یہ دھمکی دی کہ اگر مسلم لیگ نے از خود وائسرائے کی کونسل سے علیحدگی اختیار نہ کی تو کانگرس، ایگزیکٹو کونسل سے اپنے نمائندوں کو واپس بلا لے گی۔

ایٹلی کا اعلان:

۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو برطانیہ کے وزیراعظم مسٹر ایٹلی نے یہ اعلان کیا کہ موجودہ بے یقینی کی کیفیت زیادہ دیر تک نہیں چل سکتی۔ لہٰذا ملک معظم کی حکومت کی یہ خواہش ہے کہ جون ۱۹۴۸ء تک اقتدار منتقل کر دیا جائے۔ اگر اس وقت تک دستور ساز اسمبلی متفقہ آئین نہ بنا سکی تو حکومت جسے مناسب سمجھے گی اسے اقتدار سونپ دے گی۔

لارڈ ویول کی واپسی:

اسی روز مسٹر ایٹلی نے یہ اعلان بھی کیا کہ وائسرائے ہند لارڈ ویول کو واپس بلایا جا رہا ہے اور اس کی جگہ لوئی مونٹ بیٹن کو وائسرائے بنا کر بھیجا جائے گا۔

برطانیہ کے بیشتر موقر اخبارات نے مسٹر ایٹلی کے بیان پر اداریے لکھے جن میں یہ بھی لکھا کہ ایٹلی کا یہ اعلان برعظیم کے حالات کو مزید خراب کر دے گا۔ قائداعظم نے ایٹلی کے پہلے بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ مسلم لیگ پاکستان سے کم کسی بات پر راضی نہیں ہو گی۔

لارڈ ویول (م ۱۹۵۰ء) کی واپسی کی وجوہات ہنوز پردۂ غیب میں ہیں۔ ویول شروع شروع میں کانگرس کے سیاسی حلقوں میں بڑا مقبول تھا کیونکہ اس نے وعدہ کرنے کے باوجود مسلم لیگ کو حکومت سازی کی دعوت نہیں دی تھی۔ آہستہ آہستہ کانگرس اور ویول کے تعلقات کشیدہ ہوتے گئے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بنگال میں مسلم کش فسادات کے بعد ویول نے بنگال کا دورہ کیا اور اپنی آنکھوں سے ہندوؤں کے مظالم دیکھے۔ اس نے ان فسادات کے بارے میں جو بیان دیا اس سے کانگرس ناراض ہو گئی۔ دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کانگرس نے اس سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ وہ مسلم لیگ کو ایگزیکٹو کونسل سے نکال دے اور اس نے یہ مطالبہ ماننے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ تیسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ گاندھی جی نے ایٹلی کو اور پنڈت جواہر لعل نہرو نے برطانیہ میں اپنے دوستوں کو خط لکھے کہ ویول کو فوراً واپس بلایا جائے۔ ان حالات میں مسٹر ایٹلی نے ویول کو واپس بلانے کا فیصلہ کر لیا۔

مونٹ بیٹن کی آمد:

۲۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو ویول کی جگہ لارڈ لوئی مونٹ بیٹن نے، جن کا شاہی خاندان سے بڑا قریبی تعلق تھا، ہندوستان کے وائسرائے کا عہدہ سنبھالا۔ اس کی تقرری پر کانگرس نے بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ پنڈت نہرو نے لارڈ مونٹ بیٹن سے دوستی گانٹھ لی۔ دوسری جانب پنڈت جی نے لیڈی مونٹ بیٹن کے ساتھ خوشگوار تعلقات استوار کر لئے جو اب منظر عام پر آ چکے ہیں۔ پنڈت جی لیڈی مونٹ بیٹن اور وائسرائے کے سٹاف میں شامل ہندو افسر وی پی مینن (م ۱۹۶۶ء) کے ذریعے وائسرائے پر اپنا دباؤ ڈالنے لگے۔ مینن تمام خفیہ باتوں سے پنڈت جی کو مطلع کرتا اور پنڈت جی فوراً اس کا تدارک کر دیتے تھے۔

ماؤنٹ بیٹن نے ۲۵ مارچ کو پنڈت نہرو سے قائداعظم کے بارے میں ان کی رائے دریافت کی۔ نہرو نے نمک مرچ لگا کر قائداعظم کی کردار کشی کی بھرپور کوشش کی۔ جب ماؤنٹ بیٹن نے قائداعظم سے ملاقات کی تو دوران گفتگو پنڈت نہرو کا ذکر بھی نہیں آیا۔

ماؤنٹ بیٹن کی ذمہ داری:

ماؤنٹ بیٹن کے ذمہ یہ کام لگایا گیا تھا کہ وہ کابینہ وفد کے منصوبے کی روشنی میں برعظیم کو متحد رکھنے کا حل تلاش کرے۔ یہاں آنے کے بعد اس نے یہ محسوس کیا کہ بدلے ہوئے حالات میں متفقہ حل تلاش کرنا دشوار ہے لہذا اس نے مسٹر اٹیلی کے ۲۰ فروری والے بیان کی روشنی میں مسئلے کا حل تلاش کرنا شروع کیا۔ اس نے ایک پلان بنا کر لندن بھیجا اور برطانوی حکومت سے یہ درخواست کی کہ وہ ۲۰ مئی تک ہر صورت میں اسے منظور کرے۔ ۱۰ مئی کو اس نے سیاسی رہنماؤں کو بلا کر ان کی رائے دریافت کی۔ اس دوران میں وی پی مینن نے ماؤنٹ بیٹن سے کہا کہ اس نے جو پلان لندن بھجوایا ہے وہ بالکل بیکار ہے۔ اس کے بلد بعد ۸ مئی کو نہرو شملہ جا کر وائسرائے کے مہمان کی حیثیت سے اس کے ساتھ ٹھہرا۔ اس موقع پر وائسرائے نے وی پی مینن سے کہا کہ وہ پنڈت نہرو کی موجودگی میں اس پلان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ ۱۰ مئی کو مینن نے پنڈت نہرو کو بتایا کہ ڈومینین سٹیٹس کی بنیاد پر دو ہندوستان ہوں گے۔ گروپ سسٹم ختم کر دیا گیا ہے اور صوبے بھی آزاد نہیں ہوں گے۔ ۱۰ مئی کو پنڈت نہرو نے ماؤنٹ بیٹن سے اس موضوع پر بات کی اور اسی روز لندن سے پلان منظور ہو کر آ گیا۔ ماؤنٹ بیٹن نے یہ پلان نہرو کو دکھایا تو اس نے آپے سے باہر ہو کر کہا کہ وہ اور کانگرس اس پلان کو نہیں مانیں گے۔ ۱۱ مئی کو ماؤنٹ بیٹن نے مینن سے پوچھا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ مینن نے وائسرائے سے کہا کہ ۹ اور ۱۰ مئی کو ان کے درمیان جو بات ہوئی تھی اس پر سمجھوتہ ہو جائے گا۔

ماؤنٹ بیٹن نے نہرو کے ساتھ ایک ملاقات میں اس کے اعتراضات نوٹ کئے۔ اس کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے اس سے پوچھا کہ اسے مینن کا پلان منظور ہے۔

نہرو نے کہا کہ وہ پلان اسے تحریری طور پر دکھایا جائے۔ ماؤنٹ بیٹن کے کہنے پر مینن نے بڑی عجلت میں اور وہ بھی زیادہ مقدار میں شراب پی کر خالص ہندو ذہن سے ایک پلان تیار کیا۔ پنڈت نہرو نے اسے دیکھ کر اسے منظور کر لیا۔

ماؤنٹ بیٹن ۱۸ مئی کو یہ پلان لے کر لندن روانہ ہوا۔ اس نے اس پلان کے بارے میں یہ دھمکی دی کہ اگر ملک معظم کی حکومت نے اسے منظور نہ کیا تو پھر وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو جائے گا۔ اس کی یہ دھمکی کام دے گئی اور کابینہ نے صرف پانچ منٹ میں اس پلان کی منظوری دے دی۔ ایک ثقہ روایت کے مطابق کابینہ نے اس پر بحث نہیں کی۔ صرف اتنا پوچھا کہ پنڈت نہرو کو یہ پلان منظور ہے؟ جب کابینہ کو یہ بتایا گیا کہ پنڈت جی نے اسے پر صاد کر دیا ہے تو کابینہ نے اس کی منظوری دے دی۔

۳ جون پلان:

برطانوی کابینہ نے جس پلان کی منظوری دی وہ یہ تھا:

الف ۔ بنگال اور پنجاب کی اسمبلیوں کے مسلم اور غیر مسلم ارکان کے الگ الگ اجلاس منعقد ہوں گے۔ ان میں سے اگر ایک گروپ نے بھی معمولی اکثریت سے ان صوبوں کی تقسیم کا مطالبہ کیا تو وائسرائے ان صوبوں کی تقسیم کے لئے باؤنڈری کمیشن مقرر کرے گا۔

ب ۔ سندھ کی اسمبلی یہ فیصلہ کرے گی کہ سندھ نے پاکستان یا بھارت کے ساتھ شامل ہونا ہے۔

ج ۔ سرحد میں استصواب کے ذریعے فیصلہ کیا جائے گا کہ وہاں کے عوام پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا بھارت میں۔

د ۔ بلوچستان کا شاہی جرگہ اور کوئٹہ میونسپل کمیٹی کے غیر سرکاری ارکان پاکستان یا بھارت میں شامل ہونے کا فیصلہ کریں گے۔

ہ ۔ اگر بنگال کی تقسیم کا فیصلہ ہوا تو اس صورت میں آسام کے ضلع سلہٹ میں استصواب کے ذریعے عوام سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس مملکت میں شامل ہونا

چاہتے ہیں۔

۲ جون کو وائسرائے نے پنڈت نہرو، ولبھ بھائی پٹیل، اچاریہ کرپلانی، قائداعظم، نوابزادہ لیاقت علی خان، سردار عبدالرب نشتر اور بلدیو سنگھ کے سامنے یہ منصوبہ پیش کیا اور انہوں نے اسے منظور کر لیا۔ اس کے بعد موئنٹ بیٹن نے گاندھی جی سے ملاقات کی۔ انہوں نے کہا کہ وہ اب بھی برِعظیم کی تقسیم کے خلاف ہیں۔

۳ جون کو لارڈ موئنٹ بیٹن نے ریڈیو پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مورخہ ۱۵ اگست کو اقتدار منتقل کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد پنڈت نہرو، قائداعظم اور بلدیو سنگھ نے بھی تقریریں کیں۔ یہی موقعہ تھا جب قائداعظم نے آل انڈیا ریڈیو پر پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا۔

۹ جون کو مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا۔ ورکنگ کمیٹی نے اپنے جملہ اختیارات قائداعظم کو تفویض کر دیئے۔ ۱۴ جون کو کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے بھی ان تجاویز کی منظوری دے دی۔ اس موقع پر ابوالکلام آزاد نے یہ بیان دیا کہ ہندوستان کی تقسیم عارضی ہے۔ یہ دونوں ملک جلد ہی متحد ہو جائیں گے۔ آزاد کے بیان کو ہی ہندو مہاسبھا کے رہنماؤں نے دہرا دیا۔ ہندو اخبارات نے بھی اس قسم کے اداریے لکھنے شروع کر دیئے کہ پاکستان کے مالی وسائل بہت کم ہوں گے اس لئے وہ اقتصادی طور پر چل نہیں سکے گا اور وہ دوبارہ بھارت میں شامل ہو جائے گا۔ گاندھی جی نے بھی ۱۵ جون کو بڑے پُراعتماد لہجے میں کہا کہ دونوں ملک بہت جلد ایک ہو جائیں گے۔

موئنٹ بیٹن کی اَنا کا مسئلہ:

موئنٹ بیٹن کا یہ خیال تھا کہ وہی دونوں مملکتوں کا گورنر جنرل ہو۔ اسی زمانے میں قائداعظم نے اس خیال کا اظہار کیا کہ دونوں مملکتوں کے الگ الگ گورنر جنرل ہوں اور ان کے اوپر ایک سپر گورنر جنرل ہو جو تقسیم کے وقت حالات کو کنٹرول کر سکے۔ موئنٹ بیٹن خود ہی دونوں مملکتوں کا گورنر جنرل بننا چاہتا تھا۔ اس لئے اسے سپر گورنر جنرل بننا منظور نہ تھا۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے اسے بھارت کا پہلا گورنر

جنرل بننے کی دعوت دی جو اس نے فوراً قبول کر لی۔ انہی ایام میں اس نے کہا کہ اسے ایسی ہی دعوت مسلم لیگ کی طرف سے بھی ملنی چاہیے۔ اس نے اس سلسلے میں قائداعظم سے بھی ملاقات کی اور ان کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ قائداعظم نے فرمایا کہ وہ سوچ کر اس کا جواب دیں گے۔ اس نے اس پر اصرار کیا کہ سوچ کر نہیں بلکہ ابھی اس کا جواب دیں۔ اس پر قائداعظم کو اس کی نیت پر شبہ ہوا۔ قائداعظم نے کہا کہ وہ تحریری طور پر اسے مطلع کریں گے۔

لندن سے واپسی پر موئنٹ بیٹن کا اصرار بڑھا اور ۲۰ جون کو اس کا نمائندہ نوابزادہ لیاقت علی خان سے اسی سلسلے میں ملا اور ان سے کہا کہ وہ قائداعظم سے جلد ہی اس سلسلے میں بات کریں۔ لیاقت علی خان نے اس سلسلے میں قائداعظم سے بات کرنے کا وعدہ کیا۔

۲۳ جون کو موئنٹ بیٹن نے قائداعظم سے ملاقات کی اور ان سے کہا کہ دو مملکتوں کا ایک گورنر جنرل مقرر کرنے میں بڑی مصلحت ہے۔ قائداعظم نے اس سے کہا کہ وہ ذاتی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے۔ چند روز میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرکے جواب دیں گے۔ ۲ جولائی کو قائداعظم نے موئنٹ بیٹن کو مطلع کیا کہ انہوں نے خود ہی پاکستان کا گورنر جنرل بننے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس پر موئنٹ بیٹن نے اپنے سٹاف کی میٹنگ بلائی اور قائداعظم کے گورنر جنرل بننے کے عواقب پر غور کیا۔ موئنٹ بیٹن نے نواب حمید اللہ خان والئ بھوپال (م ۱۹۶۰ء) کو قائداعظم کے پاس بھیجا کہ وہ انہیں کسی طرح اس پر آمادہ کرے کہ وہ خود گورنر جنرل بننے کی بجائے موئنٹ بیٹن کو ہی پاکستان کا گورنر جنرل تسلیم کر لیں۔ نواب بھوپال قائداعظم سے ملے لیکن انہیں اپنا فیصلہ بدلنے پر رضامند نہ کر سکے۔ اس موقع پر موئنٹ بیٹن نے قانونی ماہرین کی طرف بھی رجوع کیا لیکن وہ کسی طرح بھی پاکستان کا گورنر جنرل نہ بن سکا۔ ہندوؤں کی طرف اس کا جھکاؤ دیکھ کر قائداعظم نے خود پاکستان کا گورنر جنرل بننے کا فیصلہ کیا۔ اگر موئنٹ بیٹن پاکستان کا بھی گورنر جنرل بن جاتا تو وہ تقسیم کے وقت پاکستان کو اس سے کہیں زیادہ نقصان پہنچاتا جتنا اس نے پہنچایا۔ اس نے مہاراجہ کشمیر ہری سنگھ کو بھارت کے ساتھ الحاق پر مجبور کیا۔ راجستھان کی سرحد پر واقع کئی ہندو ریاستوں کو پاکستان میں شامل

ہونے سے روکا۔ ماؤنٹ بیٹن نے سر سیرل ریڈکلف کے ساتھ مل کر حد بندی کے وقت دھاندلی کی۔ اسلحہ کی تقسیم کے سلسلے میں فیلڈ مارشل آکنلک کو مجبور کیا کہ وہ پاکستان کے حصے کا اسلحہ اسے نہ دے۔ اس پر آکنلک نے اختلاف کرتے ہوئے استعفیٰ پیش کر دیا۔ تقسیم کے وقت مسلمانوں پر مشتمل فوج ابھی برعظیم سے باہر تھی۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد سے وہ مختلف مقبوضہ علاقوں میں ڈیوٹی دے رہے تھے۔ بلدیو سنگھ وزیر دفاع تھا۔ اس نے کانگرس اور وائسرائے کے ایما پر مسلمان فوجیوں کو غیر ملکوں میں ہی رہنے دیا، ورنہ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا اتنا کشت و خون نہ ہوتا۔ ماؤنٹ بیٹن نے پاکستان کا گورنر جنرل بننے کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا۔ وہ جاہ پسند انسان تھا اور تعصب میں اندھا ہوا جا رہا تھا۔

۳ جون پلان پر عمل:

بنگال اسمبلی کے مسلم اور غیر مسلم ارکان کے ۲۰ جولائی کو الگ الگ اجلاس منعقد ہوئے۔ مسلم ارکان اسمبلی نے ۹۰ کے مقابلے میں ۱۲۶ ووٹوں سے پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ دوسری جانب ۲۱ کے مقابلے میں ۵۸ ووٹوں سے غیر مسلم ارکان اسمبلی نے تقسیم بنگال کا فیصلہ کیا اور بھارت میں شامل ہونے پر رضا مندی ظاہر کی۔

پنجاب اسمبلی کے غیر مسلم ارکان نے اکثریت رائے سے تقسیم پنجاب پر زور دیا اس طرح بنگال اور پنجاب کی نئی سرحد کا فیصلہ باؤنڈری کمیشن نے کرنا تھا۔ سندھ کی اسمبلی نے ۲۶ جون کو کثرت رائے سے پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ کیا۔ بلوچستان کے شاہی جرگے اور کوئٹہ میونسپل کمیٹی کے غیر سرکاری ارکان نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا۔

سلہٹ، جو جمعیت العلماء ہند کا عظیم مرکز سمجھا جاتا تھا، جہاں مولانا حسین احمد مدنی (م ۱۹۵۷ء) کے ہزاروں مرید موجود تھے اور مولانا مدنی ماہ رمضان سلہٹ میں گزارا کرتے تھے، وہاں مولانا ظفر احمد عثمانی (م ۱۹۷۴ء) نے قائداعظم کے ایما پر عوام کو پاکستان کے حق میں ووٹ دینے پر تیار کیا اور جب وہاں ریفرنڈم ہوا تو وہاں کے عوام

کی اکثریت نے پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ صوبہ سرحد میں کانگرس کی وزارت قائم تھی اور ڈاکٹر خانصاحب وزیراعلیٰ کے منصب پر فائز تھے۔ بقول ابوالکلام آزاد کانگرس اس غلط فہمی میں مبتلا رہی کہ صوبہ سرحد مکمل طور پر اس کے کنٹرول میں ہے۔ جب صوبہ سرحد میں ریفرنڈم کا فیصلہ ہوا تو سرحدی گاندھی عبدالغفار خان نے ایک نیا شوشہ چھوڑا۔ سرحدی گاندھی نے کہا کہ سرحد کے عوام کو پاکستان یا ہندوستان میں شامل ہونے کے علاوہ پختونستان کے حق میں بھی ووٹ دینے کا موقع دیا جائے۔ اس پر وائسرائے نے ہندوؤں کا طرفدار اور پاکستان کا مخالف ہونے کے باوجود یہ رولنگ دی کہ ۳ جون کے پلان میں اس کا ذکر نہیں آیا۔ اس لئے وہاں کے عوام بھارت یا پاکستان کے حق میں ہی ووٹ دینے کے مجاز ہیں۔ اس زمانے میں حضرت محمد امین الحسنات پیر صاحب مانکی شریف (م ۱۹۶۰ء) اور حضرت عبداللطیف پیر صاحب زکوڑی شریف (م ۱۹۷۸ء) نے سرحد کے عوام کو پاکستان کے حق میں ووٹ دینے کے لئے تیار کیا۔ پنجاب مسلم لیگ کے شعبہ خواتین نے سرحد جا کر وہاں کی عورتوں کو پاکستان کا طرف دار بنا دیا۔ جب سرحد میں ریفرنڈم ہوا تو ۲۸۷۴ کے مقابلے میں ۲۸۹۲۴۴ ووٹوں سے پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ ہوا۔ اس سے سرحدی گاندھی اور ڈاکٹر خان صاحب کی صوبہ سرحد میں مقبولیت کا بھرم کھل گیا۔

انٹی پاکستان لیگ: (Anti-Pakistan League)

۳ جون پلان کا اعلان ہوتے ہی پنجاب کے ہندوؤں اور سکھوں نے جن میں لاہور کے سکھ طلبہ پیش پیش تھے، انٹی پاکستان لیگ کے نام سے ایک جماعت قائم کی۔ اسی زمانے میں اکالی رہنما ماسٹر تارا سنگھ (م ۱۹۶۷ء) نے پنجاب اسمبلی کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر اپنی تلوار نیام سے نکال کر ہوا میں لہراتے ہوئے کہا کہ پنجاب پر حکومت کرنے کا فیصلہ تلوار کے ذریعے ہوگا۔

سکھ نیشنل کالج، جس کی عمارت اب یونیورسٹی آف انجینیئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور کا حصہ بن چکی ہے، کے طلبہ نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ قیام پاکستان کو روکنے کی غرض سے ایک جلوس نکالا۔ سکھوں نے اعلان کیا کہ وہ ہتھیار

لے کر چناب تک کا علاقہ سکھستان (بعد میں یہی نام خالصتان ہو گیا) میں شامل کر کے دم لیں گے ۔ اس جلوس کے شرکاء نے اشتعال انگیز نعرے لگائے اور چوک متی میں ۲ مسلمانوں کو شہید کر دیا ۔ اسی دن سے پنجاب میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے ۔ سکھ نیشنل کالج کے طلبہ نے قرب و جوار کی مسلم بستیوں پر حملے شروع کر دیئے ۔ راقم سکھ نیشنل کالج سے چند صد گز کے فاصلے پر رہتا تھا ۔ یہ تمام واقعات راقم کے چشم دیدہ ہیں ۔ لاہور کے بعد امرتسر میں فسادات شروع ہو گئے اور رفتہ رفتہ پورا صوبہ فسادات کی لپیٹ میں آ گیا ۔ مشرقی پنجاب کی سکھ ریاستوں پٹیالہ ، نابھہ ، فرید کوٹ ، جیند اور کلسیہ نے سکھ مفسدوں کی دل کھول کر مدد کی اور ان مفسدوں نے مسلم دیہاتوں پر حملے شروع کر دیئے ۔ ان حالات میں مغربی پنجاب سے ہندوؤں اور سکھوں نے اور مشرقی پنجاب سے مسلمانوں نے نقل مکانی شروع کر دی ۔

باؤنڈری کمیشن کا قیام:

۳ جون کو وائسرائے نے اپنی تقریر میں یہ کہا تھا کہ پنجاب اور بنگال کی اسمبلیوں کے مسلم اور غیر مسلم ارکان کے الگ الگ اجلاس ہوں گے ۔ اگر ایک گروپ نے معمولی اکثریت کے ساتھ ان صوبوں کی تقسیم کا مطالبہ کیا تو پھر ایک باؤنڈری کمیشن قائم کیا جائے گا جو ان صوبوں کی نئی حد بندی کرے گا ۔

جب ان دونوں صوبوں کے غیر مسلم ارکان نے تقسیم کے حق میں فیصلہ دیا تو وائسرائے نے باؤنڈری کمیشن قائم کیا جس کا صدر سر سیرل ریڈ کلف کو بنایا بنگال اور پنجاب کی نئی حد بندی کے لئے ریڈ کلف کی صدارت میں دو کمیشن قائم کئے گئے بنگال کے لئے جو کمیشن مقرر کیا گیا اس میں جسٹس ابو صالح محمد اکرم (م ۱۹۶۸ء) جسٹس ایس اے رحمن (م ۱۹۷۹ء) جسٹس سی سی بسواس اور جسٹس بی کے مکرجی شامل تھے ۔ پنجاب کے لئے جو کمیشن مقرر کیا گیا اس میں جسٹس دین محمد (م ۱۹۶۵ء) ، جسٹس محمد منیر (م ۱۹۸۱ء) ، جسٹس مہر چند مہاجن اور جسٹس تیجا سنگھ شامل تھے ۔ جب کمیشن کے ارکان میں کسی بات پر اختلاف ہوتا تو اس کا فیصلہ ریڈ کلف کرتا ۔ وائسرائے نے اپنی روایتی رُوباہ بازی سے کام لیتے ہوئے کانگرس اور مسلم لیگ سے یہ پہلے ہی منوا لیا تھا کہ

ریڈ کلف ایوارڈ کو کسی ملکی یا بین الاقوامی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جائے گا اور ریڈ کلف کا فیصلہ حرفِ آخر متصور ہو گا ۔

حد بندی کا اصول یہ طے پایا تھا کہ مسلم اکثریت کے علاقے پاکستان میں اور ہندو اکثریت کے علاقے بھارت میں شامل کئے جائیں گے ۔ حد بندی کرتے وقت ماؤنٹ بیٹن نے ریڈ کلف پر دباؤ ڈال کر بڑی دھاندلی کا مظاہرہ کیا ۔ ایک روایت کے مطابق لیڈی ماؤنٹ بیٹن پنڈت نہرو کے پیچھے لگی ہوئی تھی ۔ وہ پنڈت جی کے کہنے پر ماؤنٹ بیٹن پر دباؤ ڈالتی اور وہ پنڈت جی کے حسبِ منشا ریڈ کلف کو دھاندلی پر آمادہ کرتا یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن اور ریڈ کلف نے ہندوؤں سے بھاری رشوت کے عوض حد بندی کرتے وقت دھاندلی کا مظاہرہ کیا ۔ پہلے کوئی اور نقشہ تیار کیا گیا تھا لیکن عین آخری وقت پر اس میں تبدیلی کر دی گئی ۔ جسٹس دین محمد نے قائد اعظم کو ریڈ کلف کے عزائم سے آگاہ کیا لیکن وہ زبان دے چکے تھے کہ ریڈ کلف ایوارڈ کو چیلنج نہیں کریں گے ۔ چوہدری محمد علی نے جو اس زمانے میں وفاقی حکومت میں سیکرٹری کے عہدے پر فائز تھے انہوں نے لارڈ اِسے (م ۱۹۶۰ء) کے گھر میں تبدیل شدہ نقشہ دیکھا تو انہوں نے لارڈ اِسے سے اس کے بارے میں استفسار کیا تو وہ بات ٹال گیا ۔

طے شدہ اصول کے مطابق ضلع گورداسپور ، ضلع ہوشیار پور ، ضلع جالندھر ، ضلع فیروز پور کی دو تحصیلیں فیروز پور اور زیرہ ، ضلع امرتسر کی تحصیل اجنالہ پاکستان میں شامل ہونی چاہئیں تھیں ۔ بعض حضرات کے خیال میں دریائے ستلج کو بھارت اور پاکستان کی سرحد مقرر کرنا چاہیے تھا لیکن کشمیر کے بھارت میں شامل کرنے کی غرض سے عین آخری موقع پر مسلم اکثریت کے علاقے بڑی چالاکی کے ساتھ بھارت میں شامل کر دیئے گئے ۔ یہاں تک کہ ضلع لاہور کی تحصیل قصور کا کچھ علاقہ بشمول پتی بھارت کو دے گیا ۔ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ کشمیر کی سرحد بھارت کی سرحد سے مل جائے اور وہاں کا ہندو حکمران ہری سنگھ ڈوگرہ اپنی ریاست کا الحاق بھارت کے ساتھ کر دے ۔ اسی طرح کلکتہ پاکستان کو ملنا چاہیے تھا وہ بھی بھارت میں شامل کر دیا گیا ۔

ریڈ کلف ایوارڈ کے ذریعے ماؤنٹ بیٹن نے زبردست دھاندلی کا مظاہرہ کیا اور پاکستان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ۔ اگر وہ یہ دھاندلی نہ کرتا تو پنجاب کے

تمام دریا پاکستان کے حصے میں آتے اور نہری پانی کا مسئلہ ہی پیدا نہ ہوتا۔

قیامِ پاکستان:

۲۰ جولائی ۱۹۴۷ء کو پاکستان اور بھارت کے لئے عبوری حکومتیں قائم ہو گئیں۔ ۷ اگست کو قائد اعظم بذریعہ ہوائی جہاز کراچی پہنچے جہاں ان کا والہانہ استقبال کیا گیا۔ ۱۱ اگست کو کراچی میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی اجلاس ہوا جس میں قائد اعظم کو اسمبلی کا صدر چنا گیا۔ ۱۳ اگست کو ماؤنٹ بیٹن کراچی آیا جہاں اگلے روز اس نے دستور ساز اسمبلی کو خطاب کیا۔ اس خطاب میں اس نے پاکستان کے قیام کا باقاعدہ اعلان کیا اور آزادی کی دستاویزات قائد اعظم کے حوالے کیں۔ ۱۴ اگست کی رات بارہ بجے انگریزی اقتدار کا خاتمہ ہو گیا اور انگریزوں کا پرچم یونین جیک اتارا گیا اور اس کی جگہ پاکستان کا قومی پرچم لہرایا گیا۔ قائد اعظم کی خواہش کے مطابق مشرقی پاکستان میں مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۹۴۳ء) کے بھانجے مولانا ظفر احمد عثمانی (م ۱۹۷۴ء) نے پاکستان کا پرچم لہرایا اور کراچی میں یہ کام شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی (م ۱۹۴۹ء) کے مقدس ہاتھوں سے انجام پایا۔

۱۵ اگست کو پاکستان کے چیف جسٹس سر عبد الرشید (م ۱۹۸۱ء) سے قائد اعظم نے گورنر جنرل کے عہدے کا حلف لیا اور قائد اعظم نے لیاقت علی خان کو وزیر اعظم مقرر کر کے ان سے وزیر اعظم کے عہدے کا حلف لیا اور کابینہ کے اجلاس کی صدارت کی۔ یوں قائد اعظم کی ولولہ انگیز قیادت میں مسلمانانِ برعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش نے ایک ناممکن کام کو ممکن کر دکھایا۔ پاکستان پائندہ باد۔

اہم واقعات

۱۵۵۶ء۔۔۔ جلال الدین اکبر کی تخت نشینی (۱۵ اکتوبر) کلانور

۱۵۵۶ء۔۔۔ پانی پت کی دوسری لڑائی (۵ نومبر) ہیموں بقال کا قتل

۱۵۶۱ء۔۔۔ بیرم خان کا قتل (جنوری) بمقام پٹن گجرات

۱۵۶۲ء۔۔۔ وفات شیخ محمد غوث گوالیاری شطاری مدفین مقبرہ خاص گوالیار

۱۵۶۳ء۔۔۔ حضرت مجدد الف ثانی کی ولادت (۲۶ جون) بمقام سرہند

۱۵۶۷ء۔۔۔ شیخ علی متقی صاحب کنز العمال کی وفات (مکہ مکرمہ)

۱۵۷۰ء۔۔۔ وفات شاہ عبداللہ شطاری مدفین اندرون قلعہ مانڈو (مالوہ) بعمر ۹۰ سال

۱۵۷۴ء۔۔۔ سکھوں کے تیسرے گورو امر داس کی وفات

۱۵۷۴ء۔۔۔ وفات شیخ داؤد کرمانی شیر گڑھی مدفین شیر گڑھ ضلع اوکاڑہ

۱۵۷۶ء۔۔۔ ہلدی گھاٹ کی لڑائی میں رانا پرتاپ کو شکست ہوئی (۱۸ جون)

۱۵۷۹ء۔۔۔ اکبر نے محضر نامہ پر علماء سے دستخط کروائے (ماہ ستمبر)

۱۵۸۱ء۔۔۔ سکھوں کے چوتھے گورو رام داس کی وفات

۱۵۸۹ء۔۔۔ شیخ وجیہ الدین گجراتی کا انتقال (۸ دسمبر) بعمر ۸۸ سال۔ مدفین مقبرہ خاص احمد آباد

۱۵۸۹ء۔۔۔ راجہ ٹوڈر مل (۱۳ نومبر) اور راجہ بھگوان داس (ماہ نومبر) کی وفات

۱۵۹۳ء۔۔۔ شیخ مبارک ناگوری کی وفات (۱۵ اگست) مدفین روضہ لاڈلی بیگم، سکندرہ، آگرہ

۱۵۹۴ء۔۔۔ سیواجی کے والد شاہ جی کی ولادت

۱۵۹۵ء۔۔۔ ملک الشعراء فیضی کا انتقال لاہور (۵ اکتوبر) مدفین روضہ لاڈلی بیگم سکندرہ، آگرہ

۱۵۹۵ء۔۔۔ سکھوں کے چھٹے گورو ہر گوبند کی ولادت

۱۵۹۷ء۔۔۔ رانا پرتاپ والئی میواڑ کی وفات

۱۶۰۰ء۔۔۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام

۱۶۰۲ء۔۔۔ ابو الفضل کا قتل (۱۲ اگست) در نواح سرونج

۱۶۰۳ء۔۔۔ وفات خواجہ باقی باللہ دہلوی (۱۲ نومبر) مدفین مقبرہ خاص قطب روڈ دہلی

۱۶۰۵ء۔۔۔ مغل فرمانروا اکبر کی وفات (۱۷ اکتوبر) جہانگیر کی تخت نشینی (۲۳ اکتوبر)

۱۶۰۶ء۔۔۔سکھوں کے پانچویں گورو ارجن دیو کی وفات (۳۰ مئی) بحالت قید سمادھی نزد بادشاہی مسجد لاہور

۱۶۱۰ء۔۔۔میر محمد معصوم بھکری مصنف تاریخ سندھ کی وفات مدفن مقبرۂ خاص سکھر

۱۶۱۱ء۔۔۔جہانگیر کی نور جہاں سے شادی

۱۶۱۵ء۔۔۔وفات شاہ ابو المعالی کرمانی قادری مدفن مقبرۂ خاص لاہور

۱۶۱۶ء۔۔۔نواب مرتضیٰ خاں فرید بخاری کی وفات پٹھانکوٹ، مدفن دہلی

۱۶۲۱ء۔۔۔سکھوں کے نویں گورو تیغ بہادر کی ولادت

۱۶۲۲ء۔۔۔شہزادہ خسرو کی وفات (۲۶ جنوری)، مدفن خسرو باغ، الہ آباد

۱۶۲۴ء۔۔۔حضرت مجدد الف ثانی کی رحلت (۱۰ دسمبر) بمقام سرہند

۱۶۲۶ء۔۔۔ملک عنبر کی وفات، مہابت خان کی بغاوت، جہانگیر کی گرفتاری

۱۶۲۷ء۔۔۔سیواجی کی ولادت (۱۶ اپریل)

۱۶۲۷ء۔۔۔عبد الرحیم خانخاناں کی وفات مدفن مقبرۂ خاص دہلی

۱۶۲۷ء۔۔۔جہانگیر کی وفات (۲۹ اکتوبر) شاہجہان کی تخت نشینی

۱۶۳۰ء۔۔۔شاہ محب اللہ الہ آبادی کے مرشد حضرت ابو سعید گنگوہی چشتی صابری کی رحلت مدفن مقبرۂ خاص گنگوہ

۱۶۳۰ء۔۔۔سکھوں کے ساتویں گورو ہر رائے کی ولادت

۱۶۳۱ء۔۔۔ملکہ ممتاز محل کی وفات بمقام برہانپور (۷ جون) مدفن تاج محل آگرہ

۱۶۴۰ء۔۔۔حضرت محب اللہ الہ آبادی کی رحلت (۲۵ اکتوبر) مدفن مقبرۂ خاص کیڈگنج الہ آباد

۱۶۴۲ء۔۔۔وفات شیخ عبد الحق محدث دہلوی (۱۹ جون) مدفن مقبرۂ خاص مہرولی دہلی

۱۶۴۳ء۔۔۔وفات حضرت آدم بنوری (۲۳ جنوری) مدفن جنت البقیع مدینہ منورہ نزد مزار مبارک حضرت عثمانؓ

۱۶۴۴ء۔۔۔سکھوں کے چھٹے گورو ہرگوبند کی وفات (مارچ) بمقام کرتپور

۱۶۵۱ء۔۔۔وفات ملا محمود صاحب شمس بازغہ (۱۸ جولائی) مدفن نزد پنجابی گوردوارہ جونپور

۱۶۵۶ء۔۔۔سکھوں کے آٹھویں گورو ہرکشن کی ولادت

۱۶۵۷ء۔۔۔مولانا عبد الحکیم سیالکوٹی کی وفات مدفن سیالکوٹ

۱۶۵۸ء۔۔۔جنگ ساموگڑھ (۲۹ مئی)

۱۶۵۸ء۔۔۔اورنگ زیب عالمگیر کی تخت نشینی (۲۱ جولائی)

۱۶۶۰ء۔۔۔وفات خواجہ محمد سعید سرہندی (۱۰ مارچ) مدفن درگاہ مجدد الف ثانی سرہند

۱۶۶۳ء۔۔۔وفات شیخ نور الحق محدث دہلوی (۷ مئی) مدفن در مقبرہ شیخ عبد الحق محدث مہرولی دہلی

۱۶۶۴ء۔۔۔شیواجی کا اعلان بادشاہت

۱۶۶۴ء۔۔۔فرنچ ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام

۱۶۶۱ء۔۔۔شیخ طریقت ملا شاہ بدخشی کی وفات (۱۰ اکتوبر) مدفن مقبرۂ خاص میاں میر لاہور

۱۶۶۴ء۔۔۔سکھوں کے آٹھویں گورو ہرکشن کی وفات

۱۶۶۶ء۔۔۔سکھوں کے دسویں گورو گوبند سنگھ کی ولادت

۱۶۶۸ء۔۔۔خواجہ محمد معصوم سرہندی کی رحلت (۷ اگست) مدفن روضۂ خاص سرہند

۱۶۷۱ء۔۔۔شہزادی روشن آرا بیگم کی وفات مدفن باغ روشن آرا، دہلی

۱۶۷۴ء۔۔۔سیواجی کی تخت نشینی (۶ جون) بمقام رائے گڑھ

۱۶۷۵ء۔۔۔اورنگ زیب کے حکم پر سکھوں کے نویں گورو (۱۱ نومبر) تیغ بہادر کا قتل بمقام دہلی

۱۶۷۸ء۔۔۔راجہ جسونت سنگھ کی وفات (۱۰ دسمبر) بمقام جمرود

۱۶۸۰ء۔۔۔سیواجی کی وفات (۳ اپریل)

۱۶۸۱ء۔۔۔شہزادی جہاں آرا بیگم کی وفات مدفن درگاہ حضرت نظام الدین دہلی

۱۶۸۵ء۔۔۔خواجہ سیف الدین سرہندی کا وصال (۲۵ اپریل) مدفن مقبرۂ خاص سرہند

۱۶۸۵ء۔۔۔حضرت محمد یحییٰ ابن حضرت مجدد الف ثانیؒ کی رحلت

۱۶۸۹ء۔۔۔سنبھاجی کا قتل بحکم اورنگ زیب، راجا رام سنبھاجی کا جانشین ہوا

۱۶۹۲ء۔۔۔شہادت مولانا قطب الدین سہالوی (۷ فروری) مدفن سہالی ضلع بارہ بنکی

۱۷۰۳ء۔۔۔شاہ ولی اللہ محدثؒ کی ولادت (۲۱ فروری) بمقام پھلت (مظفر نگر)

۱۷۰۵ء۔۔۔مرشد قلی خان کا تقرر بحیثیت صوبیدار بنگال

۱۷۰۷ء۔۔۔اورنگ زیب کی وفات (۲۰ فروری) مدفن درگاہ حضرت زین الدین خلد آباد دکن

۱۷۰۷ء۔۔۔جنگ جاجو مابین شہزادہ معظم و شہزادہ اعظم (۱۷ جون)

۱۷۰۷ء۔۔۔نواب نجیب الدولہ کی ولادت بمقام مصری (پشاور)

۱۷۰۷ء۔۔۔شاہ عالم اول کی تخت نشینی

۱۷۰۸ء۔۔۔سیواجی کے پوتے ساہو کا اعلان بادشاہت

۱۷۰۸ء۔۔۔ناندیڑ (دکن) میں گورو گوبند سنگھ کا قتل (۷ اکتوبر) بندہ بیراگی کا عروج

۱۷۰۹ء۔۔۔شہزادہ کام بخش کی وفات (جنوری)

۱۷۱۰ء۔۔۔حضرت عبد الاحد وحدت مرشد شاہ گلشن کی رحلت، مدفن صحن مسجد درگاہ مجدد الف ثانی سرہند

۱۷۱۲ء۔۔۔شاہ عالم اول کی وفات (۲۷ فروری) بمقام لاہور، جہاندار شاہ کی تخت نشینی

۱۷۱۲ء۔۔۔ پٹنہ میں فرخ سیر کا اعلان بادشاہت (۶ مارچ)

۱۷۱۳ء۔۔۔ فرخ سیر کی تخت نشینی (ماہ جنوری)، عبد الصمد خان کا تقرر بطور ناظم لاہور

۱۷۱۶ء۔۔۔ دہلی میں بندہ بیراگی کا قتل (۱۹ جون)

۱۷۱۸ء۔۔۔ شاہ ولی اللہ کے والد محترم شاہ عبد الرحیم دہلوی کا انتقال (۲۳ دسمبر) مدفن مہندیاں دہلی

۱۷۱۹ء۔۔۔ وفات حضرت میراں بھیک چشتی صابری مدفن گھڑام نزد پٹیالہ

۱۷۱۹ء۔۔۔ سید حسین علی خان کا دہلی میں باقیادہ داخلہ اور قبضہ (۱۹ فروری)

۱۷۱۹ء۔۔۔ فرخ سیر کی معزولی (۲۷ فروری)

۱۷۱۹ء۔۔۔ آگرہ میں نکو سیر کی تخت نشینی (۱۸ اپریل) و معزولی (۱۲ اگست)

۱۷۱۹ء۔۔۔ رفیع الدرجات کی تخت نشینی (۲۸ فروری) اور دستبرداری (۳ جون)

۱۷۱۹ء۔۔۔ رفیع الدولہ شاہجہان ثانی کی تخت نشینی (۳ جون) اور وفات (۱۷ ستمبر) فتح پور (نزد فتح پور سیکری)

۱۷۱۹ء۔۔۔ محمد شاہ کی تخت نشینی (۱۸ ستمبر) بمقام فتح پور

۱۷۲۰ء۔۔۔ ممتاز شاعر عبد القادر بیدل کی رحلت (۲۳ نومبر) مدفن باغ بیدل نئی دہلی

۱۷۲۰ء۔۔۔ محمد امین خان کا تقرر بحیثیت وزیر (۹ اکتوبر)

۱۷۲۰ء۔۔۔ شہزادہ محمد ابراہیم کا اعلان بادشاہت (اکتوبر) و شکست

۱۷۲۰ء۔۔۔ بادشاہ گر سید برادران میں سے ایک حسین علی خان کا قتل (۸ اکتوبر) بمقام تورہ بھیم، مدفن اجمیر

۱۷۲۱ء۔۔۔ وزیر محمد امین خان کی وفات (۱۶ جنوری)

۱۷۲۲ء۔۔۔ سلطان حیدر علی کی ولادت

۱۷۲۲ء۔۔۔ بادشاہ گر سید عبد اللہ خان کی وفات (۳۰ ستمبر)

۱۷۲۳ء۔۔۔ خواجہ نور محمد بدایونی نقشبندی کی وفات، مدفن نزد بستی نظام الدین، دہلی

۱۷۲۴ء۔۔۔ شاہ عبد الرزاق پانسوی کی وفات (۲۸ جون) مدفن مقبرۂ خاص بانسہ شریف ضلع بارہ بنکی

۱۷۲۴ء۔۔۔ سعادت خان کا تقرر بحیثیت صوبیدار اودھ

۱۷۲۴ء۔۔۔ بخشی سید ابو الحسن صلابت خان مجاہد جنگ کی وفات (۷ جون) دہلی

۱۷۲۴ء۔۔۔ جنگ شکر کھیڑا مابین مبارز خان و نظام الملک آصفجاہ (۱۱ اکتوبر)

۱۷۲۶ء۔۔۔ عبد الصمد خان ناظم لاہور کی جگہ زکریا خان کا تقرر بطور ناظم لاہور

۱۷۲۷ء۔۔۔ مرشد قلی خان صوبیدار بنگال کی وفات وسط ۱۷۲۷ء، مدفن مرشد آباد

۱۷۲۸ء۔۔۔ شاہ سعد اللہ گلشن کی وفات (ماہ جنوری) مزار عقب رگھو لندن بلڈنگ کناٹ سرکل، نئی دہلی

۱۷۲۹ء۔۔۔ شاہ کلیم اللہ ولی جہان آبادی کی وفات (۱۷ اکتوبر) مزار نزد جامع مسجد، دہلی

۱۷۳۱ء۔۔۔ نواب روشن الدولہ خواجہ مظفر طُرّہ باز خان کی وفات، مدفن درگاہ قدم شریف، دہلی

۱۷۳۲ء۔۔۔ تحریک ولی اللّٰہی کا آغاز

۱۷۳۲ء۔۔۔ شاہ اودھ نواب شجاع الدولہ (مرزا جلال الدین حیدر) کی ولادت (۱۹ جنوری) دہلی

۱۷۳۸ء۔۔۔ حضرت خواجہ محمد زبیر سرہندی کی رحلت مدفن روضۂ خاص سرہند

۱۷۳۹ء۔۔۔ نادر شاہ کا حملہ، جنگ کرنال (۲۴ فروری) صوبیدار اودھ سعادت خان کی وفات

۱۷۳۹ء۔۔۔ ناظم بنگال شجاع الدین کی وفات (۱۳ مارچ)

۱۷۴۰ء۔۔۔ بنگال کے نواب سرفراز خان کا قتل (۱۰ اپریل) علی وردی خان کی گدی نشینی (۱۲ اپریل)

۱۷۴۲ء۔۔۔ ڈوپلے کا تقرر بحیثیت گورنر پانڈی چری

۱۷۴۲ء۔۔۔ مرہٹوں کا بنگال پر حملہ

۱۷۴۵ء۔۔۔ زکریا خان ناظم لاہور کی وفات (یکم جولائی) مدفن بیگم پورہ، لاہور

۱۷۴۶ء۔۔۔ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کی ولادت (۱۱ اکتوبر)

۱۷۴۷ء۔۔۔ نادر شاہ کا قتل در نواح مشہد (۹ جون) احمد شاہ ابدالی کی تخت نشینی

۱۷۴۸ء۔۔۔ احمد شاہ ابدالی کا پہلا حملہ اور شکست بمقام منو پور نزد سرہند

۱۷۴۸ء۔۔۔ وزیر قمر الدین کی وفات (۱۱ مارچ) بمقام منو پور، مدفن مدرسہ غازی الدین بیرون اجمیری گیٹ، دہلی

۱۷۴۸ء۔۔۔ محمد شاہ کی رحلت (۲۶ اپریل) مدفن درگاہ حضرت نظام الدین اولیا، دہلی

۱۷۴۸ء۔۔۔ احمد شاہ کی تخت نشینی بمقام کرنال

۱۷۴۸ء۔۔۔ نظام الملک آصف جاہ اول کا انتقال (۲ جون) مدفن خلد آباد، دکن

۱۷۴۸ء۔۔۔ ملا نظام الدین بانیٔ درس نظامی کی وفات (۷ مئی) مدفن باغ انوار، لکھنؤ

۱۷۴۸ء۔۔۔ میر معین الملک بن وزیر قمر الدین کا تقرر بطور ناظم لاہور (اپریل)

۱۷۴۹ء۔۔۔ مرہٹہ حکمران شاہو کی وفات

۱۷۴۹ء۔۔۔ کرناٹک کے نواب انوار الدین کی وفات

۱۷۵۰ء۔۔۔ ٹیپو سلطان کی ولادت (۲۰ نومبر) دیون ہلی

۱۷۵۰ء۔۔۔ نظام الملک آصف جاہ کے جانشین اور فرزند، ناصر جنگ کی شکست اور وفات

۱۷۵۱ء --- مظفر جنگ نبیرۂ نظام الملک کی وفات اور صلابت جنگ کی تخت نشینی

۱۷۵۲ء --- الطاف اللہ خان انتظار کی ولادت بمقام مرشد آباد (دسمبر)

۱۷۵۲ء --- سورج مل جاٹ نے ۹ مئی کو دہلی کو لوٹا

۱۷۵۳ء --- میر معین الملک کی وفات (۳ نومبر) تدفین نزد گنڈا بازار لاہور

۱۷۵۴ء --- احمد شاہ کی وفات ، عالمگیر ثانی کی تخت نشینی

۱۷۵۴ء --- صفدر جنگ والیٔ اودھ کی وفات تدفین مقبرۂ خاص ، دہلی

۱۷۵۶ء --- علی وردی خان نواب بنگال کی وفات (۱۰ اپریل) اور سراج الدولہ کی تخت نشینی

۱۷۵۷ء --- جنگ پلاسی (۲۳ جون)

۱۷۵۷ء --- میر جعفر کا تقرر بحیثیت ناظم بنگال

۱۷۵۷ء --- حضرت عضد الدین امروہوی چشتی صابری کا وصال بمقام امروہہ

۱۷۵۸ء --- لاہور پر ایک دن کے لئے طہماس خان کا قبضہ (۲۰ اپریل)

۱۷۵۸ء --- لاہور پر مرہٹوں کا قبضہ (۲ اپریل)

۱۷۵۸ء --- آدینہ بیگ خان کی وفات (۵ ستمبر) تدفین چہڑ و خان پور (ہوشیار پور)

۱۷۵۹ء --- عالمگیر ثانی کا قتل ، شاہجہان ثالث کی تخت نشینی

۱۷۵۹ء --- خواجہ میر درد کے والد محترم میر ناصر عندلیب کی وفات

۱۷۶۰ء --- سدا شو بھاؤ مرہٹہ سردار کا دہلی پر قبضہ (۱۰ اگست)

۱۷۶۰ء --- میر قاسم کا تقرر بحیثیت ناظم بنگال (اوائل اکتوبر)

۱۷۶۰ء --- نواب نجابت خان والیٔ ریاست کنج پورہ کا قتل بدست سدا شو بھاؤ (۱۷ اکتوبر)

۱۷۶۰ء --- سدا شو بھاؤ اور وشواس راؤ کی پانی پت آمد (۲۹ اکتوبر)

۱۷۶۰ء --- کلائیو کی انگلستان روانگی (۲۵ فروری) امین ابن نواب جعفر کی وفات

۱۷۶۰ء --- شاہجہان ثالث کی معزولی

۱۷۶۱ء --- شاہ عالم ثانی کی تخت نشینی

۱۷۶۱ء --- لاہور پر سکھوں کا قبضہ اور سکے کا اجراء

۱۷۶۱ء --- پانی پت کی تیسری لڑائی (۱۴ جنوری) اور مرہٹوں کو فیصلہ کن شکست

۱۷۶۱ء --- حیدر علی میسور کا حکمران بنا

۱۷۶۲ء --- شاہ ولی اللہ دہلوی کی وفات (۲۲ اگست) تدفین قبرستان مہندیاں ، دہلی

۱۷۶۴ء --- جنگ بکسر (۲۲ اکتوبر)

۱۷۶۵ء --- انگریزوں کو بنگال ، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی مل گئی

۱۷۶۵ء --- غدار اعظم میر جعفر کی وفات

۱۷۶۶ء --- ممتاز شاعر شیخ علی حزیں کی وفات تدفین امام باڑہ فاطمین ، بنارس

۱۷۶۶ء --- ملہار راؤ ہلکر بانیٔ ریاست اندور کی وفات

۱۷۶۷ء --- کلائیو کی انگلستان واپسی

۱۷۷۰ء --- نواب نجیب الدولہ کی وفات (۳۰ اکتوبر)

۱۷۷۱ء --- پانی پت کی تیسری جنگ کے ہیرو نواب احمد خان بنگش کی وفات (۱۱ جولائی) تدفین بہشت باغ ، فرخ آباد

۱۷۷۲ء --- احمد شاہ ابدالی کی وفات (۱۷ اکتوبر) تدفین مقبرۂ خاص قندھار

۱۷۷۳ء --- ریگولیٹنگ ایکٹ کا نفاذ

۱۷۷۴ء --- وارن ہیسٹنگز کا تقرر بحیثیت گورنر جنرل

۱۷۷۴ء --- رنجیت سنگھ کے دادا چڑت سنگھ شکرچکیہ کی وفات

۱۷۷۵ء --- نند کمار کو پھانسی کی سزا ملی

۱۷۷۵ء --- حافظ رحمت خان کی شہادت در جنگ میراں پور کٹرہ (۲۳ اپریل)

۱۷۷۵ء --- حاکم اودھ نواب شجاع الدولہ کی وفات (۲۶ جنوری) تدفین گلاب باڑی ، فیض آباد

۱۷۷۶ء --- حضرت شاہ عبد الہادی چشتی صابری کی رحلت تدفین امروہہ

۱۷۷۷ء --- شاہ محمد مجیب بانی خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کی وفات (۲۹ جولائی) تدفین روضۂ خاص پھلواری شریف

۱۷۷۹ء --- مغلانی بیگم بیوہ نواب میر معین الملک کی وفات در نواح جموں

۱۷۸۰ء --- مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ولادت (۱۳ نومبر)

۱۷۸۱ء --- حضرت مرزا مظہر جانجاناں کی شہادت بمقام دہلی (۸ جنوری) تدفین درگاہ شاہ ابو الخیر ، دہلی

۱۷۸۱ء --- حاجی شریعت اللہ کی ولادت بمقام شمائل نزد مدار کھولہ (بنگلہ دیش)

۱۷۸۱ء --- بنارس کے حکمران چیت سنگھ کی معزولی

۱۷۸۲ء --- سلطان حیدر علی کی وفات (۷ دسمبر) بمقام چتور ، شاہی ارکاٹ ٹیپو سلطان کی تخت نشینی

۱۷۸۲ء --- نجف خان کی وفات (اپریل) تدفین شاہ مرداں ، دہلی

۱۷۸۳ء --- مرہٹہ سردار رگھوناتھ راؤ کی وفات

۱۷۸۳ء --- سندھ میں کلہوڑا خاندان کا خاتمہ

۱۷۸۵ء --- خواجہ میر درد کی وفات (۶ جنوری) تدفین ٹھکور کی منڈی، بیرون ترکمان دروازہ، دہلی

۱۷۸۵ء --- شاہ فخر الدین دہلوی کا انتقال (۸ مئی) بمقام دہلی تدفین درگاہ قطب صاحب، مہرولی

۱۷۸۵ء --- گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کا استعفیٰ اور دہلی میگ میکفرسن کا پارجی تھا۔

۱۷۸۵ء --- نواب افراسیاب خان بخشی الملک کی وفات (۱۲ اکتوبر) تدفین شاہ مرداں، دہلی

۱۷۸۵ء --- گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کا استعفیٰ

۱۷۸۵ء --- ملا حسن فرنگی محلی کی وفات تدفین مدرسہ کہنہ، رام پور

۱۷۸۶ء --- لارڈ کارنوالس کا تقرر بحیثیت گورنر جنرل

۱۷۸۶ء --- سید احمد بریلوی کی ولادت (۲۸ نومبر) تکیہ شاہ علم اللہ، رائے بریلی

۱۷۸۹ء --- غلام قادر روہیلہ نے مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی کو اندھا کیا (۹ اگست)

۱۷۹۱ء --- خواجہ نور محمد مہاروی کی رحلت (۳ اگست) تدفین چشتیاں شریف

۱۷۹۱ء --- یکے از سہ حاکمان لاہور گوجر سنگھ کی وفات

۱۷۹۱ء --- شاہ رفیع الدینؒ نے قرآن مجید کا اُردو ترجمہ مکمل کیا

۱۷۹۲ء --- مہاں سنگھ کی وفات اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی تخت نشینی

۱۷۹۲ء --- مادھوجی سندھیا کی وفات

۱۷۹۳ء --- سرجان شور کا تقرر بحیثیت گورنر جنرل

۱۷۹۳ء --- قائم چاند پوری تلمیذ خواجہ میر درد کی وفات تدفین مدرسہ کہنہ، رام پور

۱۷۹۳ء --- حضرت حافظ جمال اللہ نقشبندی مجددی کی رحلت تدفین مقبرۂ خاص، رام پور

۱۷۹۵ء --- نواب محمد علی والا جاہ نواب کرناٹک کی وفات (۱۳ اکتوبر)

۱۷۹۷ء --- نواب آصف الدولہ والئی اودھ کی وفات، تدفین بڑا امام باڑہ، لکھنؤ

۱۷۹۷ء --- یکے از سہ حاکمان لاہور شوبھا سنگھ کی وفات

۱۷۹۸ء --- سرجان شور کی انگلستان واپسی

۱۷۹۸ء --- یکے از سہ حاکمان لاہور لہنا سنگھ کی وفات

۱۷۹۸ء --- لارڈ ولزلی کا تقرر بحیثیت گورنر جنرل

۱۷۹۹ء --- ٹیپو سلطان کی شہادت (۴ مئی) بمقام سرنگا پٹم

۱۷۹۹ء --- لاہور پر رنجیت سنگھ کا قبضہ (۷ جولائی)

۱۸۰۰ء --- مرہٹہ دانش ور اور سیاست دان نانا فرنویس کی وفات

۱۸۰۲ء --- علامہ تفضل حسین کاشمیری ماہر ریاضی کی وفات (یکم مارچ)

۱۸۰۳ء --- دہلی پر انگریزوں کا قبضہ

۱۸۰۳ء --- طہماس خان کی وفات تدفین درگاہ شاہ آباد ائی پن چکیاں، کشمیری گیٹ، دہلی

۱۸۰۳ء --- ڈیگ کی فتح بدست لارڈ لیک

۱۸۰۵ء --- لارڈ ولزلی کی انگلستان واپسی

۱۸۰۵ء --- بار دوم لارڈ کارنوالس کا تقرر بحیثیت گورنر جنرل (۳۰ جولائی تا ۵ اکتوبر)

۱۸۰۶ء --- سر جی بارلو کا تقرر بحیثیت گورنر جنرل

۱۸۰۶ء --- شاہ عالم ثانی کی وفات (۱۹ نومبر) تدفین درگاہ قطب صاحب مہرولی دہلی، اکبر شاہ ثانی کی تخت نشینی

۱۸۰۷ء --- لارڈ منٹو اول کا تقرر بحیثیت گورنر جنرل

۱۸۱۰ء --- قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی صاحب تفسیر مظہری کی وفات (۱ اگست) تدفین پانی پت

۱۸۱۰ء --- علامہ عبد العلی بحر العلوم کی وفات بمقام مدراس (۱۲ اگست)

۱۸۱۱ء --- شاہ عبد الباری چشتی صابری کی رحلت تدفین امروہہ

۱۸۱۱ء --- وفات شاہ درگاہی نقشبندی تدفین مقبرۂ خاص، رام پور

۱۸۱۲ء --- محسن فنڈ ہگلی کے بانی حاجی محمد محسن کی وفات (نومبر)

۱۸۱۳ء --- لارڈ منٹو کی اپنے عہدے سے سبکدوشی

۱۸۱۳ء --- لارڈ ہیسٹنگز کا تقرر بحیثیت گورنر جنرل

۱۸۱۴ء --- حاکم اودھ نواب سعادت علی خان کی وفات (۱۰ جولائی) تدفین مقبرۂ خاص قیصر باغ، لکھنؤ

۱۸۱۵ء --- شاہ عبد القادر مترجم قرآن مجید کی وفات (۷ جون) تدفین قبرستان مہندیاں، دہلی

۱۸۱۷ء --- سر سید احمد خان کی ولادت (۱۷ اکتوبر) بمقام دہلی

۱۸۱۷ء --- مشہور شاعر انشاء اللہ خان انشا کی وفات بمقام لکھنؤ (۱۹ مئی)

۱۸۱۸ء --- شاہ رفیع الدین محدث دہلوی کا انتقال (۶ اگست) تدفین قبرستان مہندیاں، دہلی

۱۸۱۸ء --- وارن ہیسٹنگز کی وفات

۱۸۲۰ء --- علامہ دلدار علی مجتہد کی وفات (۳۰ مئی) لکھنؤ

۱۸۲۱ء --- شاہ محمد اجمل الہ آبادی کی رحلت (۲۰ اگست) تدفین دائرہ شاہ اجمل الہ آباد

۱۸۲۱ء --- سید احمد بریلوی کی روانگی برائے حج (۳۰ جولائی)

۱۸۲۳ء --- شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کی وفات (۷ جولائی) تدفین قبرستان مہندیاں، دہلی

۱۸۲۳ء --- لارڈ ہیسٹنگز کی انگلستان واپسی (یکم جنوری)

۱۸۲۳ء --- لارڈ ایمہرسٹ کا تقرر بحیثیت گورنر جنرل (ماہ اگست)

۱۸۲۴ء --- شاہ غلام علی دہلوی کی رحلت (۲۲ اکتوبر) مدفون درگاہ شاہ ابو الخیر، دہلی

۱۸۲۴ء --- سوامی دیانند سرسوتی بانی آریہ سماج کی ولادت بمقام ٹنکارا (کاٹھیاواڑ)

۱۸۲۴ء --- سید احمد بریلوی کی حج سے واپسی (۱۹ اپریل)

۱۸۲۵ء --- جرنل سر ڈیوڈ اختر لونی کی وفات (۲۵ جولائی) میرٹھ

۱۸۲۶ء --- تحریک جہاد کا آغاز (۷ جنوری)

۱۸۲۶ء --- معرکہ اکوڑہ خٹک (۲۰ دسمبر)

۱۸۲۷ء --- سید احمد بریلوی کی بیعت امامت (۱۱ جنوری)

۱۸۲۷ء --- حاکم اودھ غازی الدین حیدر کی وفات (۹ اکتوبر) مدفون امام باڑہ شاہ نجف، لکھنؤ

۱۸۲۸ء --- لارڈ ایمہرسٹ کا استعفیٰ (ماہ مارچ)

۱۸۲۸ء --- لارڈ ولیم بینٹنک کا تقرر بحیثیت گورنر جنرل

۱۸۲۸ء --- موضع نچر میں مولانا عبدالحی بڈھانوی کی وفات (۲۳ فروری)

۱۸۲۹ء --- مولانا فضل امام خیرآبادی کی رحلت (۹ مئی) مدفون درگاہ شیخ سعد، خیرآباد

۱۸۲۹ء --- رسم ستی کا خاتمہ

۱۸۲۹ء --- اُستاد العلماء مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کی وفات مدفون نزد عیدگاہ، کاندھلہ

۱۸۳۰ء --- سید احمد شاہ بٹالوی مصنف تاریخِ ہندوستان کی وفات (مدفون خانقاہ فاضلیہ بٹالہ)

۱۸۳۱ء --- نثار علی تیتو میر کی رحلت

۱۸۳۱ء --- بانیِ تحریکِ حُر پیر سید صبغت اللہ شاہ اوّل کی رحلت (۷ فروری) مدفن پیر جو گوٹھ

۱۸۳۱ء --- معرکہ بالاکوٹ سید احمد بریلوی و شاہ اسمٰعیل کی شہادت (۶ مئی)

۱۸۳۱ء --- مہاراجہ رنجیت سنگھ اور لارڈ ولیم بینٹنک کی ملاقات بمقام روپڑ

۱۸۳۲ء --- آغا میر نائب السلطنت اودھ کی وفات (۷ مئی) کانپور

۱۸۳۲ء --- مولانا محمد قاسم نانوتوی کی ولادت

۱۸۳۳ء --- صاحب جواہر علویہ شاہ رؤف احمد رافت کی وفات (۵ اپریل) دوران سفر حج عرشہ جہاز

۱۸۳۳ء --- برہمو سماج کے بانی راجہ رام موہن رائے کی وفات (۲۷ دسمبر) بمقام برسٹل

۱۸۳۴ء --- شاہ نیاز احمد بریلوی کی رحلت (۱۳ اکتوبر) مدفون درگاہ قطب صاحب، بریلی

۱۸۳۵ء --- انگریز ریذیڈنٹ ولیم فریزر کا قتل (۲۲ مارچ)

۱۸۳۵ء --- شاہ ابو سعید مجددی کی وفات ٹونک (۳ جنوری) مدفون درگاہ شاہ ابو الخیر، دہلی

۱۸۳۵ء --- سعادت یار خاں رنگین کی وفات (اکتوبر)

۱۸۳۵ء --- نواب شمس الدین کو سزائے موت بجرم قتل ولیم فریزر

۱۸۳۵ء --- لارڈ ولیم بینٹنک کی جگہ سر چارلس مٹکاف کا تقرر بحیثیت گورنر جنرل

۱۸۳۶ء --- ولادت ڈپٹی نذیر احمد (۹ دسمبر) بمقام ریہڑ، ضلع بجنور

۱۸۳۶ء --- سرسید احمد خان کے والد سید متقی کا انتقال، مدفون درگاہ شاہ ابو الخیر، دہلی

۱۸۳۶ء --- لارڈ آک لینڈ کا تقرر بحیثیت گورنر جنرل (ماہ مارچ)

۱۸۳۷ء --- حاکم اودھ نصیر الدین حیدر کی وفات ماہ (جولائی)

۱۸۳۷ء --- مولانا الطاف حسین حالی کی ولادت

۱۸۳۷ء --- محسن الملک سید مہدی علی کی ولادت (۹ دسمبر) بمقام اٹاوہ

۱۸۳۷ء --- ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی، اکبر شاہ ثانی کی وفات، (۲۸ ستمبر) مدفون درگاہ قطب صاحب مہرولی، دہلی

۱۸۳۷ء --- بہادر شاہ ظفر کی تاجپوشی

۱۸۳۸ء --- ممتاز شاعر شاہ نصیر کی وفات مدفون درگاہ موسیٰ قادری، حیدرآباد

۱۸۳۹ء --- لارڈ ولیم بینٹنک کی وفات

۱۸۳۹ء --- مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات (۲۷ جون) کھڑک سنگھ کی تخت نشینی

۱۸۴۰ء --- حضرت شریعت اللہ بانی فرائضی تحریک کی وفات اور دادو میاں کی جانشینی

۱۸۴۰ء --- مہاراجہ کھڑک سنگھ کی وفات (۵ نومبر) سمادھی نزد بادشاہی مسجد، لاہور

۱۸۴۰ء --- کنور نونہال سنگھ کا انتقال (۶ نومبر) سمادھی نزد بادشاہی مسجد، لاہور

۱۸۴۰ء --- امیر المجاہدین مولانا سید نصیر الدین کی وفات بمقام ستھانہ

۱۸۴۱ء --- مہاراجہ شیر سنگھ کی تخت نشینی (۱۸ جنوری)

۱۸۴۱ء --- وقار الملک مولوی مشتاق حسین کی ولادت (۲۴ مارچ)

۱۸۴۲ء --- لارڈ ایلن برا کا تقرر بحیثیت گورنر جنرل (ماہ فروری)

۱۸۴۲ء --- حاکم اودھ محمد علی شاہ کی وفات (۷ مئی)

۱۸۴۲ء --- ہجرت شاہ محمد اسحٰق نبیرۂ شاہ عبدالعزیز جانب حجاز

۱۸۴۳ء --- مہاراجہ شیر سنگھ کا قتل (۱۵ ستمبر) سمادھی کوٹ خواجہ سعید، لاہور

۱۸۴۳ء — دلیپ سنگھ کی تخت نشینی

۱۸۴۳ء — انگریزوں اور امیرانِ سندھ کے مابین جنگ بمقام میانی (۱۷ فروری)

۱۸۴۳ء — حاکم میرپور خاص شیر محمد خان اور انگریزوں کے مابین جنگ بمقام دوآبہ (۲۴ مارچ)

۱۸۴۳ء — الحاقِ سندھ (اگست)

۱۸۴۳ء — جھنجھانہ میں شیخِ طریقت میانجیو نور محمد جھنجھانوی کا انتقال (۲۸ ستمبر)

۱۸۴۴ء — لارڈ ایلن برا کی سبکدوشی

۱۸۴۴ء — لارڈ ہارڈنگ کا تقرر بحیثیت گورنر جنرل (ماہ جولائی)

۱۸۴۶ء — شاہ محمد اسحاق محدث کی وفات مکہ مکرمہ (۱۰ جولائی) تدفین جنت معلیٰ

۱۸۴۶ء — معاہدہ امرتسر (۱۶ مارچ) کی رو سے کشمیر کی فروخت بدست گلاب سنگھ ڈوگرہ

۱۸۴۷ء — خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی کی وفات (۱۳ جنوری) مدفن خانہ خود، مادھو لال کی چڑھائی، لکھنؤ

۱۸۴۷ء — نواب امجد علی والیِ اودھ کی وفات (۱۳ فروری) تدفین چھوٹا امام باڑہ، لکھنؤ

۱۸۴۸ء — لارڈ ڈلہوزی کا تقرر بحیثیت گورنر جنرل (ماہ جنوری)

۱۸۴۹ء — الحاقِ پنجاب (۲۹ مارچ)، سید امیر علی کی ولادت (۶ اپریل) بمقام کٹک (اڑیسہ)

۱۸۵۰ء — شاہ سلیمان تونسوی کی وفات (۱۳ صفر) تدفین درگاہ خاص تونسہ شریف

۱۸۵۰ء — سر سید اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے استاد مولانا مملوک العلی کی وفات تدفین صحن کی مسجد مہندیان دہلی

۱۸۵۰ء — سکم کے کچھ علاقے کا برطانوی ہند سے الحاق

۱۸۵۲ء — غالب کے متبنّیٰ زین العابدین عارف کی وفات

۱۸۵۲ء — مومن خان مومن کی رحلت (۱۴ مئی) تدفین قبرستان مہندیاں، دہلی

۱۸۵۲ء — غیاث اللغات کے مصنف غیاث الدین عزت کی وفات (۸ اکتوبر) تدفین مسجد زاہدہ وارہ، رامپور

۱۸۵۲ء — مجاہدِ کبیر مولانا ولایت علی عظیم آبادی کی وفات (۵ نومبر)

۱۸۵۳ء — الحاق ناگپور اور برار

۱۸۵۳ء — فاتح سندھ چارلس جیمز نیپیئر کی وفات (۲۹ اگست) انگلستان

۱۸۵۳ء — بمبئی تا تھانہ ریلوے لائن کا افتتاح

۱۸۵۴ء — خاقانیِ ہند محمد ابراہیم ذوق کی وفات (۱۶ نومبر) تدفین عقب میر قتو قطب روڈ، دہلی

۱۸۵۵ء — شاہ مخصوص اللہ کا انتقال، تدفین قبرستان مہندیاں، دہلی

۱۸۵۶ء — واجد علی شاہ کی معزولی، الحاق اودھ (۷ فروری)

۱۸۵۶ء — بہادر شاہ ظفر کے ولی عہد مرزا فخرو کی وفات (۱۰ جولائی) تدفین درگاہ قطب صاحب مہرولی، دہلی

۱۸۵۶ء — لارڈ ڈلہوزی کی انگلستان واپسی

۱۸۵۶ء — لارڈ کیننگ کا تقرر بحیثیت گورنر جنرل (ماہ فروری)

۱۸۵۶ء — لارڈ ہارڈنگ سابق گورنر جنرل کی وفات

۱۸۵۷ء — شبلی نعمانی کی ولادت (مئی) بمقام بندول نزد اعظم گڑھ

۱۸۵۷ء — جنگِ آزادی کا آغاز از میرٹھ (۱۰ مئی)

۱۸۵۸ء — ایسٹ انڈیا کمپنی کا خاتمہ، ملکہ وکٹوریہ کی حکومت کا آغاز

۱۸۵۸ء — ملکہ وکٹوریہ کا عام معافی کا اعلان (یکم نومبر)

۱۸۵۸ء — مجاہدِ اعظم مولانا عنایت علی کی وفات (۲۲ مارچ)

۱۸۵۹ء — تانتیا ٹوپی کو سزائے موت

۱۸۶۱ء — وفات علامہ فضل حق خیرآبادی (۱۹ اگست) بمقام سالاتھ پوائنٹ نزد جزیرہ روس، انڈیمان

۱۸۶۱ء — انڈین کونسلز ایکٹ کا نفاذ

۱۸۶۲ء — فرائضی تحریک کے سربراہ محسن الدین دادو میاں کا وصال (۲۴ ستمبر) ڈھاکہ

۱۸۶۲ء — بہادر شاہ ظفر کا انتقال بمقام رنگون

۱۸۶۲ء — سر سید احمد خان کے ہاتھوں غازی پور میں سائنٹیفک سوسائٹی کی تاسیس

۱۸۶۳ء — انگریزوں اور مجاہدین کے مابین معرکہ امبیلا

۱۸۶۴ء — سر جان لارنس کا تقرر بحیثیت گورنر جنرل

۱۸۶۵ء — ہندوستان کا یورپ کے ساتھ رابطہ بذریعہ ٹیلی گرام

۱۸۶۵ء — نواب یوسف علی خان ناظم والیِ رامپور کی وفات (۲۱ اپریل) مدفن امام باڑہ، رامپور

۱۸۶۷ء — اردو ہندی جھگڑے کا آغاز از بنارس

۱۸۶۷ء — دارالعلوم دیوبند کی تاسیس (۳۰ مئی) در مسجد چھتہ، دیوبند

۱۸۶۸ء — مولانا یحییٰ علی کی وفات بمقام جزیرہ روس (انڈیمان) (۲۰ فروری)

۱۸۶۸ء — خلد نشین نواب سکندر جہاں بیگم والیہ بھوپال کی رحلت (۳۰ اکتوبر) مدفن باغ نظر محمد خان، بھوپال

۱۸۶۹ء — لارڈ میو کا تقرر بحیثیت گورنر جنرل

۱۸۶۹ء — مرزا غالب کی وفات (۱۵ فروری) تدفین مقبرہ خاص بستی نظام الدین، دہلی

۱۸۶۹ء — سر سید احمد خان کی انگلستان روانگی

۱۸۶۹ء۔۔۔ مفتی صدر الدین آزردہ کی وفات (۱۶ جولائی) مدفین (احاطہ مالک رام) درگاہ چراغ دہلی، دہلی

۱۸۶۹ء۔۔۔ موہن داس کرم چند گاندھی کی ولادت (۲ اکتوبر) پور بندر، کاٹھیاواڑ

۱۸۶۹ء۔۔۔ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کا انتقال مدفین درگاہ حضرت نظام الدین، دہلی

۱۸۷۰ء۔۔۔ مجلہ تہذیب الاخلاق کا اجراء، از علی گڑھ

۱۸۷۲ء۔۔۔ وائسرائے ہند لارڈ میو کا قتل (۲۴ جنوری) جزیرہ انڈیمان بدست شیر علی

۱۸۷۲ء۔۔۔ ولادت مولانا عبید اللہ سندھی (۱۰ مارچ) در خاندان رام سنگھ بمقام چیانوالی (سیالکوٹ)

۱۸۷۲ء۔۔۔ لارڈ نارتھ بروک کا تقرر بحیثیت گورنر جنرل (ماہ مئی)

۱۸۷۳ء۔۔۔ مولوی کرامت علی جونپوری کی وفات (۳۰ مئی) رنگپور (بنگلہ دیش)

۱۸۷۴ء۔۔۔ مشہور مرثیہ گو میر ببر علی انیس کی وفات (۱۰ دسمبر) مدفین محلہ چوپداری، لکھنؤ

۱۸۷۴ء۔۔۔ ڈاکٹر اردشیر طابع یار نے تقسیم ہند کی تجویز پیش کی

۱۸۷۵ء۔۔۔ ایم اے او ہائی سکول علی گڑھ کا اجراء

۱۸۷۶ء۔۔۔ لارڈ لٹن کا تقرر بحیثیت گورنر جنرل

۱۸۷۶ء۔۔۔ قائد اعظم کی ولادت (۲۵ دسمبر)

۱۸۷۶ء۔۔۔ دارالعلوم دیوبند کی جدید عمارت کا سنگ بنیاد بدست مولانا احمد علی محدث سہارنپوری

۱۸۷۷ء۔۔۔ علامہ سر محمد اقبال کی ولادت (۹ نومبر) بمقام سیالکوٹ

۱۸۷۷ء۔۔۔ جان برائٹ نے تقسیم ہند کی تجویز پیش کی

۱۸۷۷ء۔۔۔ سنٹرل محمڈن ایسوسی ایشن کا قیام بدست سید امیر علی

۱۸۷۷ء۔۔۔ صاحب سوات اخوند عبد الغفور کا وصال (۱۲ جنوری) بمقام سیدو شریف

۱۸۷۷ء۔۔۔ ایم اے او کالج علی گڑھ کی تاسیس

۱۸۷۷ء۔۔۔ مولانا فیض الحسن سہارنپوری کی وفات بمقام لاہور (۹ فروری) مدفین سہارنپور

۱۸۷۸ء۔۔۔ مسند وقت شاہ عبد الغنی مجددی کی وفات (۳۱ دسمبر) مدفین جنت البقیع، مدینہ شریف

۱۸۷۸ء۔۔۔ مولانا محمد علی جوہر کی ولادت (۱۰ دسمبر)

۱۸۷۹ء۔۔۔ شیخ محمد تھانوی خلیفہ میاں جیو نور محمد جھنجھانوی کا وصال، مدفین تھانہ بھون

۱۸۷۹ء۔۔۔ مسدس حالی کی اشاعت

۱۸۷۹ء۔۔۔ سابق گورنر جنرل جان لارنس کی وفات (ماہ جون)

۱۸۸۰ء۔۔۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی کا انتقال (۱۵ اپریل) مدفین خطہ صالحین دیوبند

۱۸۸۰ء۔۔۔ لارڈ رپن کا تقرر بحیثیت گورنر جنرل

۱۸۸۰ء۔۔۔ نواب کلب علی خان کے مرشد شاہ محمد عمر مجددی کی رحلت (۵ دسمبر) مدفین درگاہ شاہ جمال، رامپور

۱۸۸۰ء۔۔۔ مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کی وفات (۶ اپریل) سہارنپور

۱۸۸۰ء۔۔۔ غوث علی شاہ قلندر پانی پتی کا وصال (۹ مارچ) مدفین مقبرہ خاص، پانی پت

۱۸۸۱ء۔۔۔ مولانا عبد اللہ غزنوی کی وفات (۵ فروری) مدفین بیرون دروازہ سلطان ونڈ برکنار تالاب میر صمد، امرتسر

۱۸۸۱ء۔۔۔ نواب قدسیہ بیگم والیہ بھوپال کی وفات (۱۷ دسمبر) مدفین باغ نظر محمد خان، بھوپال

۱۸۸۳ء۔۔۔ اجمیر میں سوامی دیانند سرسوتی بانی آریہ سماج کی وفات (۳۱ اکتوبر)

۱۸۸۳ء۔۔۔ البرٹ بل کی منظوری

۱۸۸۴ء۔۔۔ لارڈ ڈفرن کا تقرر بحیثیت گورنر جنرل

۱۸۸۴ء۔۔۔ سر سید نے پنجاب کا دورہ کیا اور پنجابیوں کو زندہ دلان پنجاب کا خطاب دیا

۱۸۸۵ء۔۔۔ ایلن اوکٹیوین ہیوم کے ہاتھوں انڈین نیشنل کانگرس کی تاسیس

۱۸۸۶ء۔۔۔ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی تاسیس (۲۷ دسمبر)

۱۸۸۶ء۔۔۔ وفات مولانا عبد الحی فرنگی محلی، مدفین باغ انوار، لکھنؤ

۱۸۸۷ء۔۔۔ ملکہ وکٹوریہ نے قیصرۂ ہند کا لقب اختیار کیا

۱۸۸۷ء۔۔۔ نواب کلب علی خان والئ رامپور کی رحلت (۲۳ مارچ) مدفین درگاہ حضرت جمال اللہ، رامپور

۱۸۸۸ء۔۔۔ لارڈ لینسڈاؤن کا تقرر بحیثیت گورنر جنرل

۱۸۸۸ء۔۔۔ ابو الکلام آزاد کی ولادت (۱۷ اگست)

۱۸۸۸ء۔۔۔ واجد علی شاہ سابق حکمران اودھ کی وفات بمقام مٹیا برج کلکتہ (۲۱ ستمبر)

۱۸۸۸ء۔۔۔ سید احمد خان کو "سر" کا خطاب ملا

۱۸۸۸ء۔۔۔ وفات شاہ نیاز احمد بریلوی، جانشین نظام قادری، مدفین درگاہ خاص، بریلی

۱۸۹۰ء۔۔۔ مولانا عبد الحلیم شرر نے تقسیم ہند کی تجویز پیش کی (۲۳ اگست)

۱۸۹۰ء۔۔۔ نواب صدیق حسن خان قنوجی ثم بھوپالی کی وفات (۲۰ فروری) مدفین بھوپال

۱۸۹۱ء۔۔۔ وفات مولانا رحمت اللہ کیرانوی (یکم مئی) مدفین جنت المعلیٰ، مکہ مکرمہ

۱۸۹۲ء۔۔۔ انڈین کونسلز ایکٹ کا نفاذ

۱۸۹۳ء۔۔۔ مولانا شبلی نعمانی کے استاد مولانا ارشاد حسین مجددی کی وفات (۲۵ دسمبر) مدفین مقبرہ خاص، رامپور

۱۸۹۴ء۔۔۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ کا قیام

۱۸۹۴ء۔۔۔لارڈ الگن ثانی کا تقرر، بحیثیت گورنر جنرل

۱۸۹۵ء۔۔۔شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادی کا وصال (۱۲ ستمبر) مدفن گنج مراد آباد (ضلع اناؤ)

۱۸۹۵ء۔۔۔کراچی میں خان بہادر حسن علی آفندی کی وفات

۱۸۹۵ء۔۔۔مولوی چراغ علی نواب اعظم یار جنگ کی وفات (۱۵ جون) بمقام بمبئی

۱۸۹۶ء۔۔۔مرزا غلام احمد قادیانی کے مخالف ڈپٹی عبداللہ آتھم مناظر کی وفات (۲۷ جولائی) فیروزپور

۱۸۹۷ء۔۔۔استنبول میں مولانا سید جمال الدین افغانی کی رحلت (۹ مارچ) مدفن کابل

۱۸۹۷ء۔۔۔پنڈت لیکھ رام آریہ سماجی مناظر کا قتل (۶ مارچ) راولپنڈی

۱۸۹۸ء۔۔۔ندوۃ العلماء لکھنؤ کا افتتاح (۲۹ ستمبر)

۱۸۹۸ء۔۔۔سر سید احمد خان کی وفات (۲۷ مارچ) مدفن یونیورسٹی مسجد، علی گڑھ

۱۸۹۹ء۔۔۔لارڈ کرزن کا تقرر، بحیثیت وائسرائے ہند

۱۸۹۹ء۔۔۔تھیوڈور ماریسن نے تقسیم ہند کی حمایت کی

۱۸۹۹ء۔۔۔ایم اے او کالج علی گڑھ کے پرنسپل تھیوڈور بیک کی وفات (۲ ستمبر) بمقام شملہ

۱۸۹۹ء۔۔۔مولانا عبدالحق خیرآبادی کی رحلت (۹ مارچ) مدفن درگاہ شیخ سعد خیرآباد، ضلع سیتاپور

۱۸۹۹ء۔۔۔حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی رحلت (۱۸ اکتوبر) مدفن جنت معلیٰ، مکہ مکرمہ

۱۹۰۰ء۔۔۔ہندو مہا سبھا کا قیام

۱۹۰۰ء۔۔۔حضرت امیر مینائی کی وفات (۱۳ اکتوبر) مدفن درگاہ یوسفین نامپلی، حیدرآباد دکن

۱۹۰۰ء۔۔۔یوپی کے دفاتر میں اردو کی جگہ ہندی زبان کا اجرا (۱۸ مارچ)

۱۹۰۱ء۔۔۔شمال مغربی سرحدی صوبے کا قیام

۱۹۰۱ء۔۔۔ملکہ وکٹوریہ کا انتقال (۲۲ جنوری) مدفن چرچ ونڈسر کاسل

۱۹۰۱ء۔۔۔نواب شاہجہان بیگم والیہ بھوپال کی رحلت (۱۹ جون) مدفن ناریل کھیڑہ، بھوپال

۱۹۰۲ء۔۔۔لارڈ ڈفرن سابق وائسرائے ہند کا انتقال

۱۹۰۲ء۔۔۔ہردوار میں آریہ سماجیوں کی گوروکل یونیورسٹی کی تاسیس

۱۹۰۲ء۔۔۔میاں نذیر حسین محدث سورج گڑھی کا وصال بمقام دہلی (۱۳ اکتوبر) مدفن قبرستان شیدی پورہ، دہلی

۱۹۰۲ء۔۔۔امیر المجاہدین مولانا عبداللہ عظیم آبادی کی وفات (۲۹ مارچ)

۱۹۰۳ء۔۔۔سید محمود ابن سر سید احمد خان کی وفات سیتاپور (۸ مئی) مدفن یونیورسٹی مسجد، علی گڑھ

۱۹۰۴ء۔۔۔مشہور مصنف اور شاعر مولانا وکیل احمد سکندرپوری کی وفات حیدرآباد دکن

۱۹۰۵ء۔۔۔لارڈ منٹو کا تقرر، بحیثیت گورنر جنرل

۱۹۰۵ء۔۔۔سلسلہ وارثیہ کے بانی حاجی وارث علی کی رحلت (۳۰ مارچ) مدفن مقبرہ اساس دیوہ شریف، ضلع بارہ بنکی

۱۹۰۵ء۔۔۔مولانا رشید احمد گنگوہی کا وصال (۱۱ اگست) بمقام گنگوہ، ضلع سہارنپور

۱۹۰۵ء۔۔۔سر سید احمد خان کے ساتھی سید زین العابدین کی وفات (۲۷ ستمبر) مدفن یونیورسٹی مسجد، علی گڑھ

۱۹۰۵ء۔۔۔تقسیم بنگال (۱۶ اکتوبر)

۱۹۰۵ء۔۔۔فصیح الملک مرزا خان داغ کی وفات (۱۳ فروری) مدفن درگاہ یوسفین نامپلی، حیدرآباد

۱۹۰۶ء۔۔۔شملہ وفد کی لارڈ منٹو سے ملاقات (یکم اکتوبر)

۱۹۰۶ء۔۔۔مسلم لیگ کی تاسیس (۳۰ دسمبر) بمقام ڈھاکہ

۱۹۰۷ء۔۔۔محدث کبیر علامہ شوق نیموی کی رحلت

۱۹۰۷ء۔۔۔یکے از بانیان دارالعلوم دیوبند شاہ فضل الرحمٰن عثمانی کی رحلت

۱۹۰۷ء۔۔۔شملہ میں نواب محسن الملک کی وفات (۱۶ اکتوبر) مدفن یونیورسٹی مسجد، علی گڑھ

۱۹۰۸ء۔۔۔سر سید کے ساتھی سمیع اللہ خان کی وفات (۷ اپریل) مدفن صحن کی مسجد "مہندیان" دہلی

۱۹۰۸ء۔۔۔مرزا غلام احمد قادیانی کا انتقال بمقام لاہور (۲۶ مئی) مدفن قادیان اور حکیم نورالدین کی جانشینی

۱۹۰۸ء۔۔۔مسلم لیگ کی لندن برانچ کا قیام

۱۹۰۹ء۔۔۔مولانا شبلی نعمانی کے استاد مولانا محمد فاروق چڑیا کوٹی کی وفات (۲۸ اکتوبر) غازی پور

۱۹۰۹ء۔۔۔منٹو مارلے اصلاحات کا نفاذ، مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق ملا

۱۹۱۰ء۔۔۔ایڈورڈ ہفتم کی وفات (۶ مئی) مدفن چرچ ونڈسر کاسل۔ جارج پنجم کی تخت نشینی

۱۹۱۰ء۔۔۔لارڈ کریو کا تقرر، بحیثیت وزیر امور ہند

۱۹۱۰ء۔۔۔تاریخ ہندوستان کے مصنف منشی ذکاء اللہ کا انتقال (۷ نومبر) مدفن درگاہ عبدالسلام کناٹ پلیس، نئی دہلی

۱۹۱۰ء۔۔۔شمس العلماء محمد حسین آزاد کی وفات (۲۲ جنوری) مدفن مقبرہ اساس کربلائے گامے شاہ، لاہور

۱۹۱۱ء۔۔۔مولانا احمد حسن امروہوی تلمیذ مولانا محمد قاسم نانوتوی کا انتقال، مدفن افضل المدارس، امروہہ

۱۹۱۱ء۔۔۔مولانا محمد علی جوہر نے کلکتہ سے "کامریڈ" جاری کیا۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۲ء سے کامریڈ دہلی سے شائع ہونے لگا

۱۹۱۱ء۔۔۔عماد الملک علی بلگرامی مترجم تمدن عرب کی وفات (۳ مئی) ہردوئی

۱۹۱۱ء۔۔۔میر محبوب علی خان نظام دکن تلمیذ داغ کی وفات (۳۰ اگست) مدفن مکہ مسجد، حیدرآباد

۱۹۱۱ء۔۔۔تنسیخ تقسیم بنگال (۱۲ دسمبر)

۱۹۱۱ء۔۔۔کلکتہ کی بجائے دہلی کو دارالحکومت بنانے کا اعلان (۱۲ دسمبر)

۱۹۱۱ء --- اٹلی کا طرابلس (موجودہ لیبیا) پر قبضہ

۱۹۱۲ء --- ڈپٹی نذیر احمد کی رحلت (۳ مئی) مدفین درگاہ خواجہ باقی باللہ، دہلی

۱۹۱۲ء --- ابوالکلام آزاد نے "الہلال" جاری کیا

۱۹۱۲ء --- ایلن اوکٹیوین ہیوم بانی انڈین نیشنل کانگرس کی وفات (۳۱ جولائی) نارووڈ، انگلستان

۱۹۱۲ء --- جنگ بلقان

۱۹۱۳ء --- سانحۂ مسجد کانپور (یکم جولائی)

۱۹۱۳ء --- قائداعظم کی مسلم لیگ میں شمولیت

۱۹۱۳ء --- مولانا محمد علی جوہر نے "ہمدرد" جاری کیا (ماہ جون)

۱۹۱۳ء --- مولانا عبدالجبار غزنوی کی وفات (۲۸ اگست) امرتسر

۱۹۱۳ء --- کامریڈ میں مولانا محمد علی کے مضمون چوائس آف دی ٹرکس کی اشاعت

۱۹۱۴ء --- حکیم نورالدین بھیروی کا انتقال بمقام قادیان اور بشیرالدین محمود کی مسند نشینی

۱۹۱۴ء --- لارڈ منٹو سابق وائسرائے ہند کی وفات

۱۹۱۴ء --- مولانا شبلی نعمانی کا انتقال (۱۸ نومبر) مدفین دارالمصنفین، اعظم گڑھ

۱۹۱۴ء --- مولانا الطاف حسین حالی کی رحلت (۳۱ دسمبر) مدفین صحن درگاہ بو علی قلندر، پانی پت

۱۹۱۴ء --- پہلی عالمی جنگ کا آغاز (۴ اگست)

۱۹۱۵ء --- چوہدری رحمت علی نے اسلامیہ کالج لاہور میں ایک تقریب میں تقسیم ہند کی تجویز پیش کی

۱۹۱۵ء --- معتدل مزاج ہندو رہنما گوپال کرشنا گوکھلے کا انتقال

۱۹۱۵ء --- بمبئی میں مسلم لیگ کا اجلاس (دسمبر)

۱۹۱۵ء --- مولانا عبیداللہ سندھی کی کابل روانگی (اکتوبر)

۱۹۱۵ء --- نواب ڈھاکہ سلیم اللہ خان کی وفات (۱۶ جنوری)

۱۹۱۵ء --- متکلم محدث مولوی عبداللہ چکڑالوی کی وفات (۳۰ دسمبر) تارو جبل (ڈیرہ اسمٰعیل خان)

۱۹۱۶ء --- مولانا لطف اللہ علی گڑھی کا انتقال (۸ اکتوبر) مدفین قبرستان شاہ جمال، علی گڑھ

۱۹۱۶ء --- ہوم رول لیگ کی تاسیس بدست بال گنگادھر تلک (اپریل) و اینی بیسنٹ (ستمبر)

۱۹۱۶ء --- حضرت شیخ الہند محمود حسن کی مکہ مکرمہ میں گرفتاری (۲۰ ستمبر)

۱۹۱۶ء --- میثاق لکھنؤ (دسمبر)

۱۹۱۶ء --- لارڈ چیمسفورڈ کا تقرر بحیثیت گورنر جنرل

۱۹۱۷ء --- نواب وقارالملک مولوی مشتاق حسین کی وفات (۲۷ جنوری) بمقام امروہہ

۱۹۱۷ء --- شیخ الہند مولانا محمود حسن کی مالٹا میں نظربندی

۱۹۱۸ء --- نواب محمد اسحٰق خان رئیس جہانگیر آباد کا انتقال (۷ نومبر) مدفین درگاہ حضرت نظام الدین، دہلی

۱۹۱۸ء --- پہلی عالمی جنگ کا خاتمہ

۱۹۱۹ء --- رولٹ ایکٹ کی منظوری

۱۹۱۹ء --- شاہ عبدالرحیم رائے پوری کا وصال (۲۹ جنوری) مدفین گلزار رحیمی، رائے پور (سہارنپور)

۱۹۱۹ء --- مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کا نفاذ

۱۹۱۹ء --- سانحہ جلیانوالہ باغ امرتسر (۱۳ اپریل)

۱۹۱۹ء --- حکیم نصرت حسین کا انتقال بمقام مالٹا (۹ اگست)

۱۹۱۹ء --- خلافت کانفرنس کی تاسیس (۲۰ مئی)

۱۹۲۰ء --- متعصب مرہٹہ رہنما گنگادھر تلک کی وفات

۱۹۲۰ء --- قاضی عزیزالدین احمد بلگرامی نے ہفت روزہ "ذوالقرنین" بدایوں میں تقسیم ہند کی تجویز پیش کی

۱۹۲۰ء --- علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس بدست مولانا محمد علی جوہر

۱۹۲۰ء --- مجاہد جنگ آزادی خواجہ غلام حسین امرتسری تختۂ دار پر لٹکائے گئے (۱۵ اپریل)

۱۹۲۰ء --- سوامی شردھانند نے شدھی تحریک کا آغاز کیا

۱۹۲۰ء --- مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے فتوے پر تحریک ہجرت شروع ہوئی

۱۹۲۰ء --- شیخ الہند مولانا محمود حسن کی رہائی (۸ جون) اور وفات بمقام دہلی (۳۰ نومبر) مدفین مقبرۂ صالحین دیوبند

۱۹۲۱ء --- مولانا احمد رضا خان بریلوی کی رحلت (۲۸ اکتوبر) مدفین سوداگری محلہ، بریلی

۱۹۲۱ء --- مشہور شاعر اکبر الہ آبادی کی وفات (۹ ستمبر) مدفین قبرستان کالا ڈانڈا، الہ آباد

۱۹۲۱ء --- لارڈ ریڈنگ کا تقرر بحیثیت گورنر جنرل

۱۹۲۱ء --- بمبئی پریذیڈنسی میں موپلا بغاوت

۱۹۲۱ء --- خالق دینا ہال کراچی میں علی برادران پر مقدمۂ بغاوت

۱۹۲۱ء --- پرنس آف ویلز کی آمد (۱۷ نومبر)

۱۹۲۱ء --- مہدی افادی کی وفات (۲۲ نومبر) مدفین [illegible]، گورکھپور

۱۹۲۱ء --- ہندو مہاسبھا کی سرگرمیوں میں اضافہ

۱۹۲۱ء --- لارڈ ریڈنگ کا تقرر بحیثیت گورنر جنرل

۱۹۲۲ء۔۔۔ نادر علی ناگپوری نے تقسیم ہند کی تجویز پیش کی

۱۹۲۲ء۔۔۔ سابق وزیر امور ہند لارڈ ایڈون مانٹیگو کا استعفیٰ

۱۹۲۲ء۔۔۔ چوری چورا کا واقعہ (۳ فروری) گاندھی جی کی تحریک خلافت سے علیحدگی

۱۹۲۲ء۔۔۔ حکیم عبدالمجید بانی ہمدرد دواخانہ دہلی کی وفات (۲۲ جون) مدفن درگاہ خواجہ باقی باللہ، دہلی

۱۹۲۳ء۔۔۔ سنگٹھن کی تاسیس

۱۹۲۳ء۔۔۔ شیخ طریقت حضرت شاہ ابوالخیر مجددی کی رحلت (۱۹ فروری) مدفن درگاہ شاہ ابوالخیر، دہلی

۱۹۲۳ء۔۔۔ سردار محمد گل خان نے تقسیم ہند کی تجویز پیش کی

۱۹۲۴ء۔۔۔ سابق وزیر امور ہند ایڈون مانٹیگو کی وفات

۱۹۲۴ء۔۔۔ ترکی میں خلافت کا خاتمہ (۳ مارچ) خلیفہ عبدالمجید خان کی جلاوطنی (۳ مارچ)

۱۹۲۴ء۔۔۔ بی اماں (آبادی بیگم) کا انتقال (۱۳ نومبر) مدفن درگاہ شاہ ابوالخیر، دہلی

۱۹۲۵ء۔۔۔ متعصب بنگالی رہنما سُریندر ناتھ بینرجی کا انتقال

۱۹۲۵ء۔۔۔ بابا تاج الدین ناگپوری کا وصال (۱۷ اگست) مدفن مقبرۂ خاص، ناگپور

۱۹۲۵ء۔۔۔ مشہور ہندو سیاست دان سی آر داس کی وفات

۱۹۲۶ء۔۔۔ تبلیغی جماعت کی تاسیس بدست مولانا محمد الیاس کاندھلوی

۱۹۲۶ء۔۔۔ عماد الملک حسین بلگرامی کی وفات (۳ جنوری) بمقام حیدرآباد، دکن

۱۹۲۶ء۔۔۔ دہلی میں شُدھی تحریک کے بانی سوامی شردھانند کا قتل بدست غازی عبدالرشید (۲۳ دسمبر)

۱۹۲۶ء۔۔۔ علامہ اقبال پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے

۱۹۲۶ء۔۔۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی رحلت (۲۰ جنوری) مدفن باغ ملّا انوار، لکھنؤ

۱۹۲۶ء۔۔۔ عبدالحلیم شرر کی وفات (۲۳ دسمبر) بمقام لکھنؤ

۱۹۲۷ء۔۔۔ سرامیر علی کی رحلت (۳ اگست) سسکس، انگلستان

۱۹۲۷ء۔۔۔ مولانا برکت اللہ بھوپالی کی وفات (۲۷ ستمبر) مدفن میرز ویل (سان فرانسسکو)

۱۹۲۷ء۔۔۔ وفات مولانا خلیل احمد انبیٹھوی صاحب بذل المجہود (۱۱ نومبر) مدفن جنت البقیع، مدینہ منورہ

۱۹۲۷ء۔۔۔ مولانا محمد علی مونگیری کی وفات (۲۰ ستمبر) مدفن خانقاہ رحمانیہ مونگیر (بہار)

۱۹۲۷ء۔۔۔ مسیح الملک حکیم محمد اجمل خان کی وفات (۲۷ دسمبر) مدفن درگاہ حضرت رسول نما، دہلی

۱۹۲۷ء۔۔۔ سائمن کمیشن کی آمد (جنوری)

۱۹۲۷ء۔۔۔ بشیر الدین احمد مصنف واقعات دارالحکومت دہلی کی وفات (۲۳ اگست) مدفن درگاہ باقی باللہ دہلی

۱۹۲۷ء۔۔۔ جلیانوالہ باغ امرتسر میں قتل عام کے ذمہ دار جنرل ڈائر کی وفات

۱۹۲۷ء۔۔۔ سر گنگا رام کی وفات (۱۰ جولائی) انگلستان، سمادھی راوی روڈ، لاہور

۱۹۲۸ء۔۔۔ لالہ لاجپت رائے کی وفات (۱۷ نومبر) بمقام لاہور

۱۹۲۸ء۔۔۔ پہلے ہندوستانی لارڈ، لارڈ سنہا کا انتقال

۱۹۲۸ء۔۔۔ مفتیٔ اعظم دیوبند مولانا عزیز الرحمٰن عثمانی کی رحلت (یکم دسمبر) مدفن خطۂ صالحین دیوبند

۱۹۲۸ء۔۔۔ آل پارٹیز کانفرنس دہلی

۱۹۲۸ء۔۔۔ عالم بے بدل حکیم سید برکات احمد ٹونکی کی رحلت (۱۸ اگست) ٹونک

۱۹۲۸ء۔۔۔ میاں شیر محمد شرقپوری کی رحلت (۲۰ اگست) مدفن مقبرۂ خاص، شرقپور

۱۹۲۸ء۔۔۔ مرتضیٰ احمد خان میکش نے تقسیم ہند کی تجویز پیش کی

۱۹۲۸ء۔۔۔ نہرو رپورٹ

۱۹۲۹ء۔۔۔ جناح لیگ اور شفیع لیگ کا ادغام (۲۸ مارچ)

۱۹۲۹ء۔۔۔ مجاہد ملت مولانا تاج محمود امروٹی کا انتقال (۵ نومبر) بمقام امروٹ (سندھ)

۱۹۲۹ء۔۔۔ قائد اعظم کے چودہ نکات کا اعلان

۱۹۲۹ء۔۔۔ رتی جناح کا انتقال (۲۰ فروری) مدفن قبرستان آرام باغ، بمبئی

۱۹۲۹ء۔۔۔ غازی علم الدین کی شہادت (۳۱ اکتوبر) بمقام میانوالی جیل مدفن مقبرۂ خاص، میانی صاحب، لاہور

۱۹۲۹ء۔۔۔ سندھ کے نامور فاضل مرزا قلیچ بیگ کی وفات (۳ جولائی)

۱۹۲۹ء۔۔۔ کانگرس کا سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور

۱۹۳۰ء۔۔۔ علامہ اقبال کا خطبہ الہ آباد (۳۰ دسمبر)

۱۹۳۰ء۔۔۔ پروفیسر تھامس آرنلڈ کی رحلت بمقام لندن (۱۰ جون)

۱۹۳۰ء۔۔۔ متھرا میں مولانا حمید الدین فراہی کا انتقال (۱۱ نومبر) مدفن متھرا

۱۹۳۰ء۔۔۔ لندن میں پہلی گول میز کانفرنس کا انعقاد (۱۲ نومبر)

۱۹۳۰ء۔۔۔ علی گڑھ میں صاحبزادہ آفتاب احمد خان کی وفات (۱۸ جنوری) مدفن ادارہ برائے نابینان، علی گڑھ

۱۹۳۰ء۔۔۔ بیگم سلطان جہاں والیہ بھوپال کی رحلت (۱۲ مئی) مدفن صوفیہ مسجد، بھوپال

۱۹۳۰ء۔۔۔ گاندھی جی نے ڈانڈی کی جانب مارچ کرکے تحریک سول نافرمانی شروع کی (۶ اپریل)

۱۹۳۰ء۔۔۔ نواب حمید اللہ خان والی بھوپال کی تخت نشینی

۱۹۳۰ء۔۔۔ مولوی نور احمد امرتسری کی وفات (۱۳ جنوری) مدفن نور مسجد، امرتسر

۱۹۳۱ء۔۔۔راجہ صاحب محمود آباد محمد علی خان کا انتقال

۱۹۳۱ء۔۔۔لندن میں دوسری گول میز کانفرنس کا انعقاد (۷ ستمبر)

۱۹۳۱ء۔۔۔مکہ کانفرنس ۱۹۲۶ء کے مندوب مولانا عبد الماجد بدایونی کی وفات (۱۳ دسمبر)

۱۹۳۱ء۔۔۔مولانا محمد علی جوہر کی رحلت (۴ جنوری) بمقام لندن تدفین بیت المقدس

۱۹۳۱ء۔۔۔سردار بھگت سنگھ کو پھانسی پر لٹکایا گیا (۲۳ مارچ) آتم سنسکار گنڈا سنگھ والا بر کنارہ ستلج

۱۹۳۱ء۔۔۔گاندھی ارون سمجھوتہ (۵ مارچ) موتی لعل نہرو کی وفات (۶ فروری)

۱۹۳۱ء۔۔۔نامور شاعر فیروز الدین طغرائی کی وفات (۸ فروری) امرتسر

۱۹۳۲ء۔۔۔وفات سر علی امام (۱۰ اکتوبر) انیس کاسل نزد رانچی

۱۹۳۲ء۔۔۔کمیونل ایوارڈ (۱۶ اپریل)

۱۹۳۲ء۔۔۔کمیونل ایوارڈ ختم کرانے کے لئے گاندھی جی نے مرن برت شروع کیا (۶ ستمبر)

۱۹۳۲ء۔۔۔پونا پیکٹ مابین گاندھی جی و ڈاکٹر امبیدکر (ستمبر)

۱۹۳۲ء۔۔۔لندن میں تیسری گول میز کانفرنس کا آغاز (۷ نومبر)

۱۹۳۲ء۔۔۔سر محمد شفیع کا انتقال (۷ جنوری) تدفین باغبانپورہ، لاہور

۱۹۳۳ء۔۔۔تقسیم ہند کے حامی نواب مالیر کوٹلہ ذوالفقار علی خاں کی رحلت ڈیرہ دون (۲۶ مئی) تدفین مالیر کوٹلہ

۱۹۳۳ء۔۔۔چودھری رحمت علی نے مسلمانوں کے علیحدہ وطن کا نام "پاکستان" تجویز کیا۔

۱۹۳۳ء۔۔۔دیوبند میں محدث کبیر مولانا انور شاہ کاشمیری کا انتقال (۲۹ مئی) تدفین عید گاہ دیوبند

۱۹۳۳ء۔۔۔ہوم رول لیگ کی بانی اینی بیسنٹ کی وفات (۲۰ اکتوبر)

۱۹۳۳ء۔۔۔مولانا سلیمان اشرف کی وفات (۲۵ اپریل) تدفین یونیورسٹی قبرستان، علی گڑھ

۱۹۳۴ء۔۔۔قائد اعظم کی انگلستان سے واپسی

۱۹۳۵ء۔۔۔مولانا عبد الرحمٰن مبارک پوری صاحب تحفۃ الاحوذی شرح جامع الترمذی کی وفات (۲۲ جنوری)

۱۹۳۵ء۔۔۔مشرقی بنگال کے پہلے گورنر سر بمفیلڈ فلر کا انتقال

۱۹۳۵ء۔۔۔عبد اللہ المامون سہروردی کا انتقال

۱۹۳۵ء۔۔۔۲ جولائی کو نئے آئین کا نفاذ

۱۹۳۵ء۔۔۔مولوی سر رحیم بخش وزیر اعظم بہاولپور کا انتقال بمقام خشکہ میراں جی (۱۳ مئی) احمد پور

۱۹۳۵ء۔۔۔شاہ سلیمان پھلواروی کی وفات (۱۳ مئی) تدفین سنگی مسجد، پھلواری شریف

۱۹۳۶ء۔۔۔آل انڈیا ریڈیو کی نشریات کا آغاز (یکم جنوری)

۱۹۳۶ء۔۔۔جارج پنجم کی وفات (۲۰ جنوری) ایڈورڈ ہشتم کی تخت نشینی اور دستبرداری (۱۰ دسمبر)

۱۹۳۶ء۔۔۔پرنسپل ایم اے او کالج علی گڑھ تھیوڈور ماریسن کی وفات

۱۹۳۶ء۔۔۔ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی رحلت (۹ مئی) مابین ڈیرہ دون و دہلی در ٹرین، تدفین جامعہ ملیہ (دہلی)

۱۹۳۶ء۔۔۔سر فضل حسین کی وفات (۹ جولائی) تدفین ٹنگ وڑے والا، بٹالہ

۱۹۳۶ء۔۔۔شاہ وارث حسن جہاں آبادی کی رحلت (۶ اگست) تدفین ٹیلہ، لکھنؤ

۱۹۳۶ء۔۔۔نواب علی حسن خان بھوپالی کا انتقال (۱۰ نومبر) تدفین لکھنؤ

۱۹۳۶ء۔۔۔بیدم وارثی کی وفات (۲۴ نومبر) تدفین دیوہ شریف

۱۹۳۶ء۔۔۔لارڈ لنلتھگو کا تقرر بحیثیت وائسرائے ہند

۱۹۳۷ء۔۔۔مجاہد کبیر فضل واحد المعروف بہ حاجی صاحب ترنگزئی کی وفات بمقام غازی آباد علاقہ مہمند (۱۴ ستمبر)

۱۹۳۷ء۔۔۔کانگریسی وزارتوں کا قیام

۱۹۳۷ء۔۔۔پیر سید مہر علی شاہ گولڑوی کا وصال (۱۱ مئی) تدفین گولڑہ شریف

۱۹۳۷ء۔۔۔سر راس مسعود کی وفات (۳۰ جولائی) تدفین یونیورسٹی مسجد، علی گڑھ

۱۹۳۸ء۔۔۔مسلم لیگ کا اجلاس پٹنہ

۱۹۳۸ء۔۔۔۱۵ نومبر کو راجہ صاحب پیرپور نے مسلم لیگ ہائی کمان میں اپنی رپورٹ پیش کی

۱۹۳۸ء۔۔۔علامہ سر محمد اقبال کی وفات (۲۱ اپریل) تدفین حضوری باغ، لاہور

۱۹۳۸ء۔۔۔مولانا شوکت علی کی رحلت (۲۸ نومبر) تدفین نزد جامع مسجد، دہلی

۱۹۳۸ء۔۔۔نواب سر مزمل اللہ خان کا انتقال (۲۸ ستمبر) تدفین بھیکم پور

۱۹۳۹ء۔۔۔دوسری عالمی جنگ کا آغاز (یکم ستمبر) برطانیہ کی شرکت (۳ ستمبر)

۱۹۳۹ء۔۔۔فلاڈلفیا (امریکہ) میں غدر پارٹی کے رہنما لالہ ہردیال کی وفات

۱۹۳۹ء۔۔۔کانگریسی وزارتوں کے استعفے پر یوم نجات (۲۲ دسمبر)

۱۹۴۰ء۔۔۔فاضل بے بدل مولانا معین الدین اجمیری کی وفات تدفین درگاہ خواجہ معین الدین چشتی، اجمیر

۱۹۴۰ء۔۔۔سر مائیکل اڈوائر سابق گورنر پنجاب کا قتل بدست اودھم سنگھ (۱۳ مارچ) لندن

۱۹۴۰ء۔۔۔مدار المہام حیدر آباد دکن مہاراجہ سر کشن پرشاد کا انتقال (۹ مئی) سمادھی بر کنارہ موسیٰ ندی، حیدر آباد

۱۹۴۰ء۔۔۔لاہور میں خاکساروں کے جلوس پر گولی چلی (۱۹ مارچ)

۱۹۴۰ء۔۔۔قرار داد لاہور کی منظوری (۲۳ مارچ)

۱۹۴۰ء۔۔۔اودھم سنگھ کو بجرم قتل سر مائیکل اڈوائر پھانسی ملی (۱۳ جولائی)

۱۹۴۱ء---رابندر ناتھ ٹیگور کی وفات (۷ اگست) بمقام کلکتہ

۱۹۴۱ء---جاپان کا پرل ہاربر پر حملہ اور دوسری عالمی جنگ میں شرکت (۷ دسمبر)

۱۹۴۲ء---سر محمد شاہنواز خاں کی وفات (۸ مارچ) مدفن میانی صاحب لاہور

۱۹۴۲ء---کرپس مشن کی آمد دہلی (۲۳ مارچ)

۱۹۴۲ء---سر عبداللہ ہارون کی رحلت (۲۷ اپریل) مدفن یتیم خانہ کھڈہ، کراچی

۱۹۴۲ء---مدیر مجلّہ "زمانہ" کانپور منشی دیانرائن نگم کی وفات (۱۹ نومبر) بمقام کانپور

۱۹۴۲ء---سر سکندر حیات خاں کی وفات (۲۶ دسمبر) مدفن حضوری باغ لاہور

۱۹۴۲ء---سر محمد یعقوب کا انتقال (۲۳ نومبر)

۱۹۴۲ء---رئیس الاحرار چوہدری افضل حق کا انتقال (۸ جنوری) مدفن میانی صاحب، لاہور

۱۹۴۲ء---ہندوستان چھوڑدو تحریک کا آغاز (۸ اگست) کانگرسی رہنماؤں کی گرفتاری (۹ اگست)

۱۹۴۳ء---حُروں کے رہنما پیر صبغت اللہ شاہ کو سزائے موت (۲۰ مارچ)

۱۹۴۳ء---حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کا وصال (۲۰ جولائی) بمقام تھانہ بھون مدفن قبرستان متصل باغ تھانہ بھون

۱۹۴۳ء---وائسرائے لارڈ لنلتھگو کی انگلستان واپسی

۱۹۴۳ء---خان بہادر اللہ بخش وزیر اعلیٰ سندھ کا قتل (۱۴ مئی)

۱۹۴۳ء---لارڈ ویول کا تقرر بحیثیت گورنر جنرل (اکتوبر)

۱۹۴۴ء---کستورا بائی (کستوربا) اہلیہ گاندھی جی کی وفات بمقام پونا

۱۹۴۴ء---تبلیغی جماعت کے بانی مولانا محمد الیاس کی وفات (۱۳ جولائی) مدفن بنگلہ مسجد حضرت نظام الدین، دہلی

۱۹۴۴ء---جنرل سر عمر حیات خان ٹوانہ کی وفات (۲۴ مارچ) مدفن کالرہ (سرگودھا)

۱۹۴۴ء---مولانا عبید اللہ سندھی کی رحلت (۲۲ اگست) بمقام دین پور شریف نزد خانپور

۱۹۴۴ء---نواب بہادر یار جنگ کی وفات (۲۵ جون) مدفن حظیرہ مرشد آباد، حیدر آباد دکن

۱۹۴۴ء---بمبئی میں قائد اعظم کی رہائش گاہ پر گاندھی جناح ملاقات (۹ ستمبر)

۱۹۴۵ء---لیاقت-ڈیسائی معاہدہ

۱۹۴۵ء---شملہ کانفرنس کا آغاز (۲۵ جون)

۱۹۴۵ء---سبھاش چندر بوس کی ہوائی حادثے میں ہلاکت (۱۸ اگست)

۱۹۴۵ء---یورپ میں دوسری عالمی جنگ کا خاتمہ (۷ مئی کو جرمنی نے ہتھیار ڈال دیے)

۱۹۴۶ء---سید طفیل احمد منگلوری مصنف "مسلمانوں کا روشن مستقبل" کی وفات (۳۰ مارچ) مدفن منگلور (یو۔پی)

۱۹۴۶ء---ملک برکت علی کی وفات (۵ اپریل) مدفن میانی صاحب، لاہور

۱۹۴۶ء---پنڈت مدن موہن مالویہ کی وفات

۱۹۴۶ء---انتخابات میں مسلم لیگ کی شاندار کامیابی

۱۹۴۶ء---کابینہ وفد کی آمد (۲۳ مارچ)

۱۹۴۶ء---آل انڈیا سُنّی کانفرنس بنارس (۲۷-۳۰ اپریل)

۱۹۴۶ء---عبوری حکومت کا قیام (۲ ستمبر) اسی روز مسلم لیگ نے یوم سیاہ منایا

۱۹۴۶ء---تقسیم ہند کے ایک مجوز ایف کے خان درانی کی وفات مدفن میانی صاحب، لاہور

۱۹۴۶ء---مسلم لیگ نے یوم راست اقدام منایا (۱۶ اگست)

۱۹۴۶ء---محمد مالک کی شہادت (۱۰ مارچ) بمقام لاہور مدفن پائیں غازی علم الدین میانی صاحب، لاہور

۱۹۴۶ء---مسلم لیگ کی کابینہ میں شمولیت (۲۵ اکتوبر)

۱۹۴۷ء---افضل الملک علوی کاکوروی مدیر "الناظر" کی وفات (فروری) مدفن کاکوری نزد لکھنؤ

۱۹۴۷ء---میاں فیروز الدین واضع لقب قائد اعظم کی وفات، مدفن درگاہ حضرت شاہ محمد غوث، لاہور

۱۹۴۷ء---لارڈ ویول وائسرائے ہند کی انگلستان واپسی (مارچ)

۱۹۴۷ء---لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا تقرر بحیثیت وائسرائے ہند (۲۲ مارچ)

۱۹۴۷ء---۳ جون پلان

۱۹۴۷ء---قائد اعظم کی کراچی آمد (۷ اگست)

۱۹۴۷ء---قیام پاکستان (۱۴ اگست)

وہ سیاسی اور نامور شخصیات
جو
آزادی کے بعد فوت ہوئیں

۱۹۴۷ء۔۔۔سرائیکی صوفی شاعر مولانا محمد یار فریدی کی وفات بمقام لاہور، تدفین گڑھی اختیار خان، ضلع رحیم یار خان

۱۹۴۷ء۔۔۔سر ضیاء الدین احمد (۲۳ دسمبر) تدفین یونیورسٹی مسجد، علی گڑھ

۱۹۴۸ء۔۔۔سر شفاعت احمد خان بمقام شملہ

۱۹۴۸ء۔۔۔قائد اعظم محمد علی جناح (۱۱ ستمبر)

۱۹۴۸ء۔۔۔صاحب امیر الجیب مولانا عبد الرؤف داناپوری (۲۰ فروری) تدفین قبرستان مانک تلہ، کلکتہ

۱۹۴۸ء۔۔۔گورنر سندھ سر غلام حسین ہدایت اللہ (۲ اکتوبر) تدفین عید گاہ ایم اے جناح روڈ، کراچی

۱۹۴۸ء۔۔۔وفات مؤرخ شہیر مولانا عبد الرزاق کانپوری (۱۸ فروری) تدفین محبّ اسن شاہ، بھوپال

۱۹۴۸ء۔۔۔سلہٹ کے مسلم لیگی رہنما عبد المتین چوھدری (۲۸ دسمبر) تدفین قبرستان میوہ شاہ، کراچی

۱۹۴۸ء۔۔۔مولانا امجد علی اعظمی مصنف "بہار شریعت" (۶ ستمبر) بمبئی

۱۹۴۸ء۔۔۔موہن داس کرم چند گاندھی (۳۰ جنوری) سمادھی راج گھاٹ، دہلی

۱۹۴۸ء۔۔۔ہندو مہا سبھا کے راہنما ڈاکٹر مونجے

۱۹۴۸ء۔۔۔مولانا ثناء اللہ امرتسری (۱۶ مارچ) بمقام سرگودھا

۱۹۴۸ء۔۔۔تحریک آزادی کشمیر کے راہنما خواجہ غلام نبی گلکار (۱۰ اپریل) تدفین بمقام میانی صاحب، لاہور

۱۹۴۹ء۔۔۔چوھدری سر شہاب الدین (۶ جون) تدفین میانی صاحب، لاہور

۱۹۴۹ء۔۔۔بلبل ہند سروجنی نائیڈو (۲ مارچ) سمادھی بر کنار گومتی، لکھنؤ

۱۹۴۹ء۔۔۔ڈاکٹر سید ظفر الحسن مجوزّ تقسیم ہند (۱۹ جون) تدفین میانی صاحب، لاہور

۱۹۴۹ء۔۔۔مسلم لیگ راہنما سر رضا علی مصنف "اعمال نامہ" (۱۵ اگست) تدفین علی باغ، کراچی

۱۹۴۹ء۔۔۔سر تیج بہادر سپرو (۲۰ جنوری) الہ آباد

۱۹۴۹ء۔۔۔شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی (۱۳ دسمبر) بہاولپور، تدفین اسلامیہ کالج، کراچی

۱۹۵۰ء۔۔۔نواب حبیب الرحمن خان شروانی صدر یار جنگ بہادر (۱۱ اگست) تدفین حبیب گنج ضلع علی گڑھ

۱۹۵۰ء۔۔۔سردار ولبھ بھائی پٹیل (۱۵ دسمبر) بمقام بمبئی

۱۹۵۰ء۔۔۔لارڈ ویول سابق وائسرائے ہند (۲۳ مئی) لندن بعمر ۶۷ سال

۱۹۵۱ء۔۔۔پیر سید جماعت علی شاہ علی پوری (۳۰ اگست) تدفین علی پور سیداں

۱۹۵۱ء۔۔۔ساحل حریت رئیس المتغزلین مولانا فضل الحسن حسرت موہانی (۱۵ مئی) تدفین باغ مولانا انوار، لکھنؤ

۱۹۵۱ء۔۔۔نوابزادہ لیاقت علی خان (۱۶ اکتوبر) راولپنڈی، تدفین مقبرہ قائد، کراچی

۱۹۵۱ء۔۔۔چوھدری رحمت علی (۳ فروری) تدفین کیمبرج

۱۹۵۲ء۔۔۔سر عبد الرحیم (۱۵ اگست) تدفین قبرستان میوہ شاہ، کراچی

۱۹۵۲ء۔۔۔مفتی اعظم ہند مولانا کفایت اللہ (۳۱ دسمبر) تدفین درگاہ قطب صاحب مہرولی، دہلی

۱۹۵۲ء۔۔۔بدر الدین اُو گھٹ شاہ وارثی (۲۷ ستمبر) بنگرایوں (ضلع مراد آباد)

۱۹۵۳ء۔۔۔علامہ سید سلیمان ندوی (۲۲ نومبر) تدفین اسلامیہ کالج، کراچی

۱۹۵۳ء۔۔۔کانگریسی راہنما آصف علی بیرسٹر (۲ اپریل) برن سوئٹزرلینڈ، تدفین بستی نظام الدین، دہلی

۱۹۵۴ء۔۔۔رفیع احمد قدوائی وزیر خوراک حکومت ہند (۲۴ اکتوبر) تدفین مسولی (بارہ بنکی)

۱۹۵۵ء۔۔۔محمد سعد اللہ وزیر اعلیٰ آسام (۹ جنوری) شیلانگ

۱۹۵۶ء۔۔۔مولانا ظفر علی خان مدیر روزنامہ زمیندار (۲۷ نومبر) تدفین کرم آباد (وزیر آباد)

۱۹۵۶ء۔۔۔رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی (۲ ستمبر) تدفین نزد جامع مسجد، دہلی

۱۹۵۷ء۔۔۔آغا خان سر سلطان محمد شاہ سوم (۱۱ جولائی) بمقام جنیوا، تدفین آسوان، مصر

۱۹۵۶ء۔۔۔اچھوت راہنما ڈاکٹر بھیم راؤ رام جی امبیدکر

۱۹۵۷ء۔۔۔مولانا عبد القادر آزاد سبحانی (۲۴ جون) تدفین پکی باغ، گورکھپور

۱۹۵۷ء۔۔۔سر شاہنواز بھٹو (۹ نومبر) تدفین گڑھی خدا بخش، ضلع لاڑکانہ

۱۹۵۷ء۔۔۔شیخ العرب والعجم مولانا حسین احمد مدنی (۵ دسمبر) تدفین خطۂ صالحین دیوبند

۱۹۵۸ء۔۔۔سردار عبد الرب نشتر (۱۴ فروری) تدفین مزار قائد، کراچی

۱۹۵۸ء۔۔۔مولانا ابو الکلام آزاد (۲۲ فروری) تدفین نزد جامع مسجد، دہلی

۱۹۵۸ء۔۔۔نواب محمد اسمٰعیل خان (۲۸ جون) تدفین درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء، دہلی

۱۹۵۸ء۔۔۔ڈاکٹر خان صاحب (عبد الجبار خان) لاہور (۹ مئی) تدفین اتمان زئی نزد چار سدہ (پشاور)

۱۹۵۸ء۔۔۔تحریک خلافت کے راہنما پیر غلام مجدد سرہندی (۷ جنوری) ٹنڈو جام، ضلع حیدر آباد

۱۹۵۹ء۔۔۔سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی (۴ دسمبر) تدفین درگاہ قطب صاحب مہرولی، دہلی

۱۹۶۰ء۔۔۔وزیر اعظم پاکستان اسمٰعیل ابراہیم چندریگر (۲۶ ستمبر) تدفین قبرستان سوسائٹی، کراچی

۱۹۶۰ء۔۔۔ محمد امین الحسنات پیر صاحب مانکی شریف (۲۸ جنوری) ٹریفک حادثہ، مدفن: مانکی شریف

۱۹۶۱ء۔۔۔ کانگرسی رہنما اور وزیر اعلیٰ یوپی پنڈت گووند ولبھ پنت (۷ مارچ)

۱۹۶۱ء۔۔۔ مجاہد آزادی مرزا علی خان المعروف بہ فقیر ایپی (۱۶ اپریل)

۱۹۶۱ء۔۔۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق (۱۶ اگست) مدفن: اُردو کالج، کراچی

۱۹۶۱ء۔۔۔ رئیس الاحرار سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری (۲۱ اگست) مدفن: باغ لانگے خان، ملتان

۱۹۶۲ء۔۔۔ مولوی ابوالقاسم فضل الحق (۲۷ اپریل) مدفن: احاطہ ہائی کورٹ ڈھاکہ

۱۹۶۲ء۔۔۔ حمید نظامی مدیر روزنامہ نوائے وقت لاہور (۲۵ فروری) مدفن: میانی صاحب، لاہور

۱۹۶۲ء۔۔۔ سابق صدر پنجاب کانگرس میاں افتخار الدین (۶ جون) مدفن: باغبانپورہ، لاہور

۱۹۶۲ء۔۔۔ مجاہد آزادی محمد اسحاق مانسہروی (۸ دسمبر) حویلیاں

۱۹۶۲ء۔۔۔ جمعیت العلماء ہند کے رہنما مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی (۲ اگست) مدفن: قبرستان مہندیاں، دہلی

۱۹۶۲ء۔۔۔ شیخ طریقت شاہ عبدالقادر رائپوری (۱۶ اگست) بمقام لاہور مدفن: ڈھڈیاں، سرگودھا

۱۹۶۳ء۔۔۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہوریہ بھارت (۲۸ فروری)

۱۹۶۳ء۔۔۔ متعصب ہندو صحافی مہاشہ رادھا کرشن مدیر روزنامہ پرتاپ لاہور / دہلی (۲۳ فروری)

۱۹۶۳ء۔۔۔ مسلم لیگی رہنما راجہ غضنفر علی خان (۲۷ اپریل) مدفن: پنڈ دادن خان

۱۹۶۳ء۔۔۔ وزیر اعظم پاکستان حسین شہید سہروردی (۵ دسمبر) بمقام بیروت مدفن: احاطہ ہائی کورٹ ڈھاکہ

۱۹۶۳ء۔۔۔ مولانا داؤد غزنوی (۱۶ دسمبر) مدفن: میانی صاحب، لاہور

۱۹۶۳ء۔۔۔ خاکسار تحریک کے بانی علامہ عنایت اللہ خان مشرقی (۲۷ ستمبر) مقبرہ خاص، اچھرہ

۱۹۶۳ء۔۔۔ سیف الدین کچلو (۱۰ اکتوبر) مدفن: جامعہ ملیہ، دہلی

۱۹۶۳ء۔۔۔ سیّد میراں محمد شاہ سپیکر سندھ اسمبلی (۱۶ نومبر)

۱۹۶۴ء۔۔۔ گورنر جنرل پاکستان خواجہ ناظم الدین (۲۲ اکتوبر) مدفن: ہائی کورٹ ڈھاکہ

۱۹۶۴ء۔۔۔ پنڈت جواہر لعل نہرو (۲۷ مئی) سمادھی راج گھاٹ، دہلی

۱۹۶۵ء۔۔۔ محدث شہیر مولانا بدر عالم میرٹھی (۲۹ اکتوبر) مدفن: جنت البقیع، مدینہ شریف

۱۹۶۶ء۔۔۔ ہندو مہاسبھا کے رہنما ونائک دامودر ساورکر (۲۶ دسمبر)

۱۹۶۶ء۔۔۔ وزیر اعظم بھارت لال بہادر شاستری (۱۱ جنوری) تاشقند، سمادھی راج گھاٹ، دہلی

۱۹۶۶ء۔۔۔ مسلم لیگی رہنما نواب مشرف حسین خان (۱۳ نومبر) کلکتہ

۱۹۶۷ء۔۔۔ مجاہد تحریک پاکستان میر جعفر خان جمالی (۷ اپریل)

۱۹۶۷ء۔۔۔ نواب محمد یامین خان مصنف "نامۂ اعمال" (۲۷ مارچ) مدفن: پاپوش نگر، کراچی

۱۹۶۷ء۔۔۔ میر عثمان علی خان نظام دکن (۲۴ فروری) مدفن: مسجد جودی، حیدر آباد

۱۹۶۷ء۔۔۔ احراری رہنما شیخ حسام الدین (۲۲ جون) مدفن: میانی صاحب، لاہور

۱۹۶۷ء۔۔۔ محترمہ مس فاطمہ جناح (۹ جولائی) مدفن: مزار قائد، کراچی

۱۹۶۷ء۔۔۔ اکالی رہنما ماسٹر تارا سنگھ (۲۲ نومبر) بمقام چنڈی گڑھ

۱۹۶۷ء۔۔۔ قائد تحریک آزادی کشمیر چوہدری غلام عباس (۱۸ دسمبر) مدفن: فیض آباد، راولپنڈی

۱۹۶۸ء۔۔۔ مسلم لیگی رہنما میاں عبدالباری (۲۸ اکتوبر) مدفن: ۴۲ چک جھنگ

۱۹۶۸ء۔۔۔ الطاف حسین مدیر "ڈان" (۲۵ مئی) مدفن: قبرستان پاپوش نگر، کراچی

۱۹۶۸ء۔۔۔ قائد تحریک آزادی کشمیر میر واعظ محمد یوسف (۷ دسمبر) مدفن: ہائی کورٹ میرپور

۱۹۶۹ء۔۔۔ وزیر اعلیٰ پنجاب نواب افتخار حسین خان ممدوٹ (۱۸ اکتوبر) مدفن: میانی صاحب، لاہور

۱۹۶۹ء۔۔۔ مولانا امداد اللہ پانی پتی مدفن: درگاہ کبیر الاولیا، پانی پت

۱۹۶۹ء۔۔۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ بھارت (۳ مئی) مدفن: جامعہ ملیہ، دہلی

۱۹۶۹ء۔۔۔ پروفیسر ہمایوں کبیر (۱۸ اگست) مدفن: جامعہ ملیہ، دہلی

۱۹۷۰ء۔۔۔ ملک فیروز خان نون (۹ دسمبر) مدفن: موضع نون، سرگودھا

۱۹۷۰ء۔۔۔ احراری رہنما ماسٹر تاج الدین انصاری (یکم مئی) مدفن: میانی صاحب، لاہور

۱۹۷۰ء۔۔۔ قرار داد لاہور کے موید مولانا عبدالحامد بدایونی (۲۰ جولائی) مدفن: عبدالحامد بدایونی کالج، کراچی

۱۹۷۰ء۔۔۔ مجاہد اعظم دکن سیّد قاسم رضوی (۱۵ جنوری) مدفن: قبرستان پاپوش نگر، کراچی

۱۹۷۱ء۔۔۔ کانگرسی رہنما ڈاکٹر سیّد محمود (۳۰ ستمبر) مدفن: قبرستان مہندیاں، دہلی

۱۹۷۲ء۔۔۔ راجگوپال اچاریہ گورنر جنرل بھارت (۲۶ دسمبر) مدراس

۱۹۷۲ء۔۔۔ تحریک پاکستان کے مجاہد ضمیر الحسن لاری (۱۳ مارچ) مدفن: منگھو پیر روڈ، کراچی

۱۹۷۲ء۔۔۔ سیّد حسن ریاض، مصنف "پاکستان ناگزیر تھا" (۱۸ اکتوبر) مدفن: قبرستان جامعہ کراچی

۱۹۷۳ء۔۔۔ صدر پاکستان مسلم لیگ چوہدری خلیق الزمان (۱۸ مئی) مدفن: قبرستان میوہ شاہ، کراچی

۱۹۷۳ء۔۔۔ مسلم لیگ کے رہنما امیر احمد خان راجہ صاحب محمود آباد (۱۴ اکتوبر) وفات لندن مدفن: کربلا

۱۹۷۳ء۔۔۔ عبدالصمد خان اچکزئی بلوچستانی گاندھی (۲ دسمبر) حادثہ بم

۱۹۷۳ء۔۔۔ نواب صدیق علی خان مصنف "بے تیغ سپاہی" (۵ جنوری) مدفن: مسجد پی ای سی ایچ سوسائٹی بلاک، کالونی، کراچی

۱۹۷۴ء۔۔۔صدر لاہور مسلم لیگ نواب زادہ رشید علی خان (۱۵ جولائی) مدفن قبرستان میانی صاحب، لاہور

۱۹۷۴ء۔۔۔قائد اعظم کے معتمد مولانا ظفر احمد عثمانی (۸ دسمبر) مدفن قبرستان پاپوش نگر، کراچی

۱۹۷۴ء۔۔۔شاہ معین الدین احمد ندوی مصنف "تاریخ اسلام" (۱۳ دسمبر) مدفن رُدولی شریف

۱۹۷۴ء۔۔۔نور الامین نائب صدر پاکستان (۲ اکتوبر) مدفن مزار قائد، کراچی

۱۹۷۴ء۔۔۔احراری رہنما مظہر علی اظہر (۲۰ نومبر) مدفن قبرستان مومن پورہ، لاہور

۱۹۷۴ء۔۔۔محمد ایوب خان صدر پاکستان (۲۰ اپریل) مدفن ریحانہ (ہری پور)

۱۹۷۵ء۔۔۔تحریک آزادی کے بے لوث کارکن علامہ راغب احسن (۲۸ نومبر) مدفن سخی حسن، کراچی

۱۹۷۵ء۔۔۔ملک خضر حیات خان ٹوانہ (۲۰ جنوری) مدفن کالرہ، سرگودھا

۱۹۷۵ء۔۔۔صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کے روح رواں پیر بخش خان (۳ دسمبر) بعمر ۷۰ سال، پشاور

۱۹۷۵ء۔۔۔وزیر اعلیٰ سندھ پیر الٰہی بخش (۸ جنوری) مدفن مسجد پیر الٰہی بخش کالونی، کراچی

۱۹۷۵ء۔۔۔شیخ مجیب الرحمٰن صدر بنگلہ دیش کا قتل (۱۵ اگست) ڈھاکہ

۱۹۷۵ء۔۔۔قائد حزب اختلاف سردار بہادر خان (۳۱ دسمبر) بمقام ایبٹ آباد

۱۹۷۵ء۔۔۔ڈاکٹر رادھا کرشنن صدر جمہوریہ بھارت (۱۷ اپریل)

۱۹۷۶ء۔۔۔ریاست علی ندوی مصنف "تاریخ اندلس" (۳ نومبر) اینگہ، گیا بہار

۱۹۷۶ء۔۔۔مولانا عبدالحمید خان بھاشانی (۱۷ نومبر) بمقام سنتوش (بنگلہ دیش)

۱۹۷۶ء۔۔۔تحریک پاکستان میں صف اوّل کے رہنما مفتی محمد شفیع دیوبندی (۶ اکتوبر) مدفن دارالعلوم کورنگی، کراچی

۱۹۷۶ء۔۔۔بلوچستان میں مسلم لیگ کے روح رواں قاضی محمد عیسیٰ (۱۹ جون) مدفن پشین

۱۹۷۷ء۔۔۔فخر الدین علی احمد صدر جمہوریہ بھارت (۱۱ فروری) مدفن عقب جامع مسجد نئی دہلی

۱۹۷۸ء۔۔۔صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کے روح رواں عبداللطیف پیر صاحب زکوڑی شریف (۲ فروری) مدفن زکوڑی شریف

۱۹۷۸ء۔۔۔شیخ عبدالمجید سندھی تحریک ریشمی رومال کے بڑے کردار (۲۳ مئی) مدفن درگاہ مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھہ

۱۹۷۹ء۔۔۔مؤرخ شہیر ڈاکٹر یوسف حسین خان (۲۱ فروری) دہلی

۱۹۷۹ء۔۔۔مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (۲۲ ستمبر) بمقام بفلو (امریکہ) مدفن در رہائش گاہ اچھرہ، لاہور

۱۹۷۹ء۔۔۔بلوچستان میں مسلم لیگ کے روح رواں نواب محمد خان جوگیزئی (۳ نومبر) قلعہ سیف اللہ

۱۹۷۹ء۔۔۔ذوالفقار علی بھٹو (۴ اپریل) مدفن گڑھی خدا بخش، ضلع لاڑکانہ

۱۹۷۹ء۔۔۔بیگم جہاں آرا شاہنواز (۲۷ نومبر) مدفن باغبانپورہ، لاہور

۱۹۷۹ء۔۔۔راجہ مہندر پرتاپ صدر حکو [illegible]

۱۹۷۹ء۔۔۔سوشلسٹ رہنما جے پرکاش نرائن (۸ اکتوبر) بمقام بمبئی

۱۹۸۰ء۔۔۔رئیس الحسن اصفہانی (۱۸ نومبر) مدفن قبرستان مسلح افواج عقب گورا قبرستان، کراچی

۱۹۸۰ء۔۔۔جمعیت العلماء اسلام کے رہنما مفتی محمود (۱۴ اکتوبر) کراچی مدفن عبدالخیل، ڈیرہ اسمٰعیل خان

۱۹۸۰ء۔۔۔وزیر اعلیٰ سندھ محمد ایوب کھوڑو (۲۰ اکتوبر) مدفن موضع ماتلی، ضلع لاڑکانہ

۱۹۸۰ء۔۔۔وی وی گری سابق صدر جمہوریہ بھارت (۲۴ جون) مدراس

۱۹۸۰ء۔۔۔جنرل یحییٰ خان صدر جمہوریہ پاکستان (۹ اگست) پشاور

۱۹۸۰ء۔۔۔وزیر اعظم پاکستان چوہدری محمد علی (یکم دسمبر) مدفن قبرستان سوسائٹی، کراچی

۱۹۸۱ء۔۔۔خان عبدالقیوم خان وزیر اعلیٰ سرحد (۲۲ اکتوبر) مدفن امان گڑھی، پشاور

۱۹۸۱ء۔۔۔جمعیت العلماء اسلام کے رہنما مولانا غلام غوث ہزاروی (۳ فروری) مدفن بٹہ (مانسہرہ)

۱۹۸۲ء۔۔۔شیخ محمد عبداللہ کشمیری (۸ ستمبر) مدفن سری نگر

۱۹۸۲ء۔۔۔شیخ الحدیث مولانا زکریا (۲۴ مئی) مدفن جنت البقیع، مدینہ شریف

۱۹۸۲ء۔۔۔مسلم لیگی رہنما چوہدری ظہور الٰہی قتل (۲۵ ستمبر) لاہور مدفن گجرات

۱۹۸۲ء۔۔۔چوہدری فضل الٰہی صدر پاکستان (یکم جون) مدفن مرالہ ضلع گجرات

۱۹۸۲ء۔۔۔یوپی کے پہلے مسلمان گورنر احمد سعید خان نواب آف چھتاری (۹ جنوری) مدفن موضع چھتاری ضلع بلند شہر

۱۹۸۲ء۔۔۔خالق قومی ترانہ حفیظ جالندھری (۲۱ دسمبر) مدفن علامہ اقبال پارک، لاہور

۱۹۸۴ء۔۔۔وزیر اعظم بھارت مسز اندرا گاندھی (۳۱ اکتوبر) سمادھی راج گھاٹ، دہلی

۱۹۸۵ء۔۔۔مخلص مسلم لیگی سید حسین امام (۱۹ جنوری) مدفن قبرستان پاپوش نگر، کراچی

۱۹۸۵ء۔۔۔وفات مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مدیر برہان دہلی (۲۴ مئی) مدفن دارالعلوم کورنگی، کراچی

۱۹۸۵ء۔۔۔علامہ انور صابری (رونق علی شاہ) ۱۳ اگست مدفن دیوبند

۱۹۸۶ء۔۔۔مخدوم الملک غلام میراں شاہ (۳ اگست) مدفن جمال دین والی (صادق آباد)

۱۹۸۷ء۔۔۔ماہر قانون اے کے بروہی (اللہ بخش خان بروہی) (۱۳ ستمبر) مدفن قبرستان مسلح افواج، کراچی

۱۹۸۷ء۔۔۔مؤرخ شہیر سید صباح الدین عبدالرحمٰن (۱۸ نومبر) مدفن دارالمصنفین، اعظم گڑھ

۱۹۸۸ء۔۔۔خان عبدالغفار خان سرحدی گاندھی (۲۰ جنوری) مدفن جلال آباد، افغانستان

۱۹۸۸ء۔۔۔قائد اعظم کے ساتھی حاجی عبدالستار اسحاق سیٹھ (۳ مئی) مدفن قبرستان کچی میمن، گھاس منڈی، کراچی

۱۹۸۸ء۔۔۔جنرل ضیاء الحق (۱۷ اگست) کوٹ کمال، مدفن نزد شاہ فیصل مسجد اسلام آباد

۱۹۸۹ء۔۔۔جلاوطن حریت پسند ظفر حسن ایبک کی رحلت استانبول مدفن قبرستان زنجیرلی قویو پلاٹ ۹، ۷ نمبر ۳۔

۱۹۸۹ء۔۔۔ غوث بخش بزنجو (۱۱ اگست) مدفن موضع نال، بلوچستان

۱۹۸۹ء۔۔۔ مسلم لیگی رہنما میاں امیر الدین (۱۰ اگست) مدفن میانی صاحب لاہور

۱۹۹۰ء۔۔۔ کانگریس کی رہنما اور سفارتکار وجے لکشمی پنڈت (یکم دسمبر)

۱۹۹۱ء۔۔۔ مولانا معراج الحق صدر مدرس دارالعلوم دیوبند (۱۸ اگست) مدفن خطۂ صالحین دیوبند

۱۹۹۱ء۔۔۔ امیر شریعت بہار مولانا منت اللہ رحمانی (۱۹ مارچ) مونگیر، بہار

۱۹۹۱ء۔۔۔ وزیر اعظم بھارت راجیو گاندھی (۲۱ مئی) پیرم دورا، انتم سنسکار راج گھاٹ، دہلی

۱۹۹۱ء۔۔۔ نامور عالم دین مولانا زین العابدین سجاد میرٹھی (۳۱ مارچ) میرٹھ

۱۹۹۱ء۔۔۔ مسلم لیگی رہنما خواجہ محمد صفدر (۱۳ اکتوبر) سیالکوٹ

۱۹۹۱ء۔۔۔ شیخ طریقت محمد احمد پرتاب گڑھی (۲۰ اکتوبر) پرتاپ گڑھ، یوپی

۱۹۹۱ء۔۔۔ مسلم لیگ کے بے لوث رہنما عبد القدوس بہاری (۱۳ فروری) بمقام کراچی

۱۹۹۱ء۔۔۔ مولانا ظفر احمد انصاری (۲۰ دسمبر) مدفن قبرستان اسلام آباد

۱۹۹۲ء۔۔۔ حکیم عبد القوی لکھنوی مدیر "صدق جدید" مدفن دریاباد، ضلع بارہ بنکی

۱۹۹۲ء۔۔۔ محدث کبیر حبیب الرحمٰن اعظمی (۷ مارچ) مؤناتھ بھنجن، ضلع اعظم گڑھ

۱۹۹۲ء۔۔۔ کرنل بشیر حسین زیدی وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (۲۹ مارچ) دہلی

۱۹۹۲ء۔۔۔ نواب مولوی عبید الرحمٰن خان شروانی (۹ مئی) مدفن قبرستان شاہ جمال، علی گڑھ

۱۹۹۲ء۔۔۔ شیخ طریقت مولانا مسیح اللہ خان شروانی (۱۳ اکتوبر) جلال آباد، ضلع مظفر نگر

۱۹۹۳ء۔۔۔ مرارجی ڈیسائی (۱۰ اپریل) بمقام احمد آباد سمادھ کنار سابرمتی

۱۹۹۳ء۔۔۔ مولانا عبید اللہ درخواستی امیر جمعیت العلماء اسلام (۲۸ اگست) مدفن دین پور شریف

۱۹۹۴ء۔۔۔ گیانی ذیل سنگھ صدر جمہوریہ بھارت (۲۵ دسمبر) وفات چنڈی گڑھ، انتم سنسکار راج گھاٹ، دہلی

۱۹۹۵ء۔۔۔ جی ایم سید (غلام مرتضیٰ سید) ۲۵ اپریل مدفن موضع "سن" (ضلع دادو)

۱۹۹۵ء۔۔۔ مولانا انعام الحسن کاندھلوی امیر تبلیغی جماعت (۱۰ جون) مدفن بنگلہ مسجد حضرت نظام الدین، دہلی

۱۹۹۵ء۔۔۔ میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ (۳۰ جون) بمقام لاہور، مدفن لڈن (وہاڑی)

۱۹۹۵ء۔۔۔ بیگم سلمیٰ تصدق حسین (۷ اگست) مدفن قبرستان شیر شاہ ولی نزد اچھرہ، لاہور

۱۹۹۶ء۔۔۔ مولانا اظہار الحسن امیر عالمی تبلیغی جماعت (۱۳ اگست) مدفن بنگلہ مسجد حضرت نظام الدین، دہلی

وہ لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیئے
ڈھونڈا تھا آسمان نے جنہیں خاک چھان کر